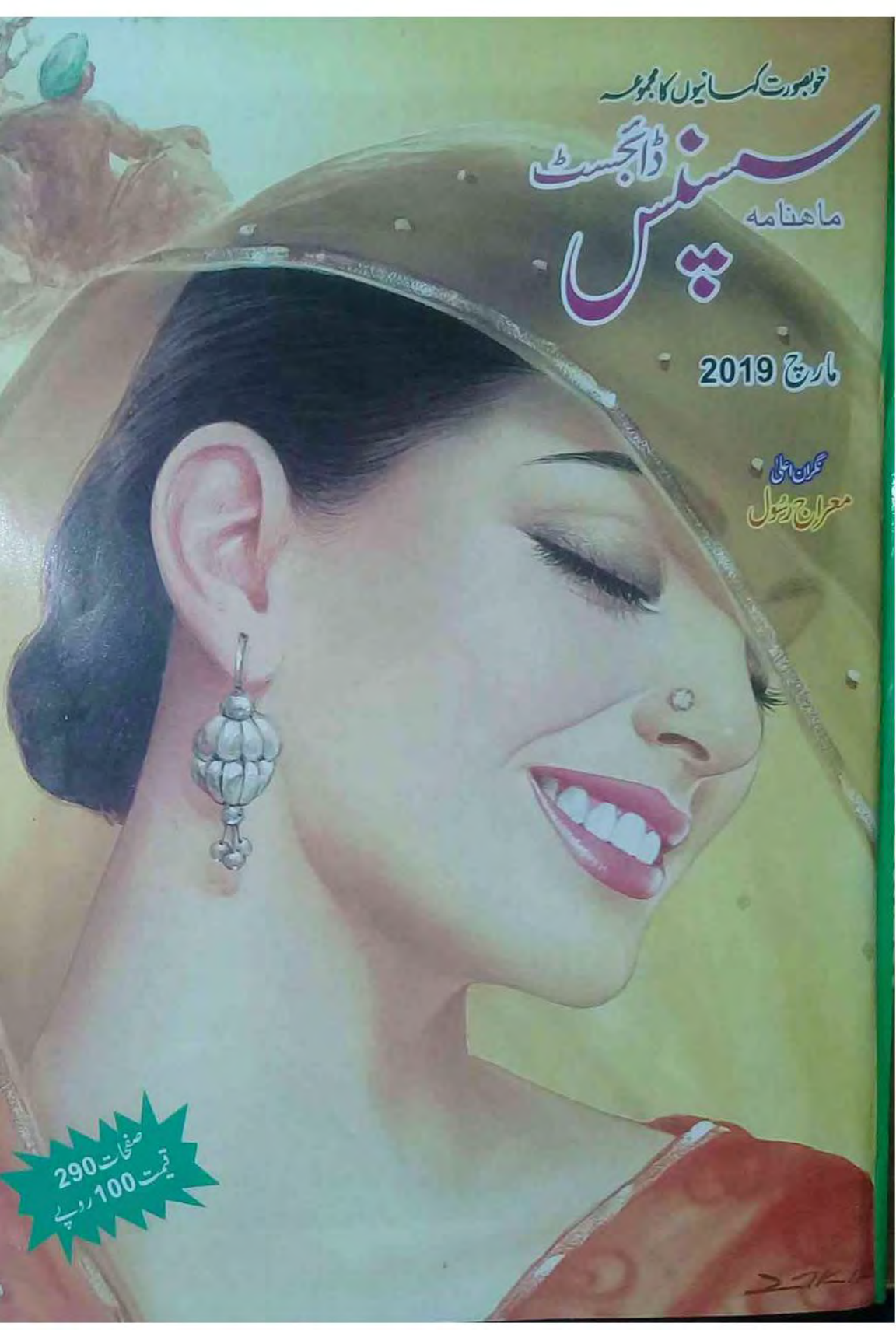
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
مارچ 2019
نگران اعلیٰ
معراج رسول
صفحات 290
قیمت 100 روپے

سسپنس ڈائجسٹ

CPNE

MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین

انشائیہ
جون ایلیا 07
دنیا میں خسارہ ہی خسارہ ہے...... اگر کوئی نفع ہے تو صرف حسن عمل...... ماضی سے انتخاب

آپ کے خط
مدیرِ اعلیٰ 08
سسپنس کی مجلس مشاورت وقارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

ہنگامہ زن
الیاس سیتاپوری 14
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

گرفتار بلا
ابوالفرح ہمایوں 47
حسرت و یاس کی تصویر بنے ایک عاشق کی انتقامی کارروائی

خود اپنے دام میں
آصفہ ضیا احمد 53
خود اپنے دام میں آنے والے دلدار کا فسانہ

قصوروار
تنویر ریاض 67
ایک مینجر کی کوتاہی اور شرمندگی پر دلچسپ تحریر

رنگ آسماں
اے آر راجپوت 76
شرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی خوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

قہر
فہمی فردوس 105
منفی جذبات کی نفرتوں میں گم چند گمراہ انسانوں کا سبق آموز ماجرا

عجیب
شاکر لطیف 113
بھلائی کے ارادے سے سمت بدلنے والے ایک نیک انسان کی جنگ

جلد 48 • شمارہ 03 مارچ 2019 • زرِ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

ٹام اینڈ جیری
مرزا امجد بیگ — 126

ایک مکار مجازی خدا کی فریب کاریوں کی عبرت اثر داستان

مشن
شاہ زین رضوان — 159

پل پل حوصلہ شکنی کا شکار ہونے والی لڑکی کا ایک انوکھا کارنامہ

محفلِ شعر و سخن
قارئین — 168

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

اصل بات
نمر عباس — 171

ایک قاتل محبوبہ کا قصہ جسے محبوب سے جدائی کا کوئی غم نہ تھا

وقت
حسام بٹ — 180

ایک پرعزم بازی گر کی بازی گری..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

احمق
ماہ رخ ارباب — 215

دو بہنوں کی ضدی طبیعت اور محبت کا عجیب سنگم

حقیقت
نادیہ نور — 223

آخری جرم کر کے جرائم کی دنیا سے نکلنے والے ایک مجرم کی روداد

حضرت عیسیٰ علیہ السلام
رضوانہ ساجد — 231

اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر کے حالاتِ زندگی

روایت
اعتزاز سلیم وصلی — 243

قاتل و مقتول کے درمیان ہونے والی رسا کشی کا دلچسپ احوال

آسمان سے گرا
بابر نعیم — 251

محنت سے جی چرانے مگر دولت مند بننے کے خواب دیکھنے والوں کا انجام

شکست پا
اسما قادری — 260

جلتے انگاروں پر چلنے والے چند مجبور و بے کس لوگوں کی آبلہ پائی کا انجام ایک اذیت بھری روداد

کترنیں
ادارہ — **

دنیا بھر کے ادھر ادھر سے لطیفے چٹکلے اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

75500

ٹام اینڈ جیری
مرزا امجد بیگ — 126

ایک مکار مجازی خدا کی فریب کاریوں کی عبرت اثر داستان

مشن
شاہ زین رضوان — 159

پل پل حوصلہ شکنی کا شکار ہونے والی لڑکی کا ایک انوکھا کارنامہ

محفلِ شعر و سخن
قارئین — 168

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

اصل بات
نمر عباس — 171

ایک قاتل محبوبہ کا قصہ جسے محبوب سے جدائی کا کوئی غم نہ تھا

وقت
حسام بٹ — 180

ایک پرعزم بازی گر کی بازی گری..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

احمق
ماہ رخ ارباب — 215

دو بہنوں کی ضدی طبیعت اور محبت کا عجیب سنگم

حقیقت
نادیہ نور — 223

آخری جرم کر کے جرائم کی دنیا سے نکلنے والے ایک مجرم کی روداد

حضرت عیسیٰ علیہ السلام
رضوانہ ساجد — 231

اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر کے حالاتِ زندگی

روایت
اعتزاز سلیم وصلی — 243

قاتل و مقتول کے درمیان ہونے والی رسا کشی کا دلچسپ احوال

آسمان سے گرا
بابر نعیم — 251

محنت سے جی چرانے مگر دولت مند بننے کے خواب دیکھنے والوں کا انجام

شکست پا
اسما قادری — 260

جلتے انگاروں پر چلنے والے چند مجبور و بے کس لوگوں کی آبلہ پائی کا انجام ایک اذیت بھری روداد

کترنیں
ادارہ — **

دنیا بھر کے ادھر ادھر سے لطیفے چٹکلے اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

75500

جون ایلیا

لبِ مہران

لبِ مہران مہربان اس بار یہ میری تیسری یا چوتھی شام ہے۔ میں نے لبِ مہران مہربان اپنی نوجوانی اور جوانی کی کتنی ہی حسین ترین اور سنگین ترین شامیں گزاری ہیں۔ جذبوں کی سرشاری اور تہ داری اور آرزوؤں کی تشنہ کامی اور شکستہ حالی کے کتنے ہی دور بسر کیے ہیں۔

میں نے کسی بھی دریا کے ساحلوں پر خوابوں اور سرابوں کے اتنے سکھ نہیں پائے اور اتنے دکھ نہیں اٹھائے جتنے سکھ اور دکھ مہران کے ساحلوں پر پائے ہیں اور اٹھائے ہیں۔ جانے کیوں اس بار میں نے یہاں وہ حالت خیزی اور کیفیت انگیزی نہیں پائی جو میرے خیال کو سیراب اور شاداب کیا کرتی تھی اور ہاں میرے ملال کو بھی ...... ملال کو بھی......؟

ہاں ملال کو بھی۔ خیال ہی نہیں ملال بھی سیرابی اور شادابی چاہتا ہے۔ ہے کچھ یوں کہ احساسِ ذات کی ساری حالتیں رسد چاہتی ہیں۔ اندر اور باہر کی رسد۔ سو خیال ہو یا ملال دونوں کو اندر اور باہر کی رسد چاہیے۔ اس بار لبِ مہران میری نسل کے وہ قلندر اور وہ شوریدہ سر میرے ساتھ نہیں ہیں جو اپنے لبوں پر سندھی اور اردو شاعری کے سروں کو آباد کرکے میرے ساتھ رقص کیا کرتے تھے۔ ہم یہاں کتنی دھوم مچایا کرتے تھے۔ ہم پر یہاں کیا کیا حالتیں طاری ہوتی تھیں اور کیا کیا عالم گزرتے تھے۔ اپنا ایک شعر یاد آیا۔

دکھائیں کیا تمہیں داغوں کی لالہ انگیزی
گزر گئیں وہ بہاریں وہ فصل ہی نہ رہی

میرے امروہے کے ایک بزرگ غلام ہمدانی مصحفی نے کہا ہے۔

بادِ ایامِ بےقراری دل
وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

عجب زمانہ تھا۔ ہم اپنی حالتوں اور اپنے عالموں میں مشتاقی اور مجبوری اور حضوری اور دوری کے کتنے ہی معرکے سر کیا کرتے تھے۔ سرکشی اور سرشوری کی اک عجب ماجرا پروری تھی جو ہمیں لحہ لحہ پرحال رکھتی تھی۔ ہم شوق انقلاب میں ہر مزاحم سے جا ٹکرایا کرتے تھے۔ کوئی نہیں تھا جو ہمارے شعلہ زن نعروں کو دبا سکتا اور ہمارے ہونٹوں کے انگاروں کو بجھا سکتا۔ مگر اب ہمارے شعلۂ زن نعرے سیاست کی سنگینی نے دبا دیے ہیں۔ ہمارے ہونٹوں کے انگارے راکھ کردیے گئے ہیں اور ہم ہیں کہ ہمیں اپنے زیاں اور اپنے زوال کا کوئی غم نہیں ہے۔

کوئی غم نہیں ہے! جون ایلیا یہ کیوں نہیں کہتے کہ کوئی احساس نہیں ہے۔

ہاں، یاد دلانے والے، تو نے مجھے صحیح بات یاد دلائی۔ ہاں، ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی احساس نہیں ہے۔ حسن حمیدی تو زیر خاک سوتے ہیں۔ میں کراچی کی طرف رخ کرکے کہتا ہوں کہ اے شیخ قبیلہ، اے فیخ ایاز! ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی احساس نہیں ہے۔ کوئی بھی احساس۔ ہم اب وہ نہیں رہے جو تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا گیا ہے۔ ہمیں بانٹ دیا گیا ہے۔

مہران بہہ رہا ہے، لبِ مہران کی شام بہہ رہی ہے اور میں اداس ہوں اور بہت پر احساس ہوں۔ مجھے سرِ شام ایک شعر بہت یاد آتا ہے، جو میرے افسانہ آفریں بھائی معراج رسول کے شہر میں کہا گیا تھا۔

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

کراچی، لاہور، دلی اور لکھنؤ کے شاعرو! اگر تم شام پر ایسا حالت انگیز شعر کہہ دو تو قبلہ و کعبہ میاں بادا میر تقی میر کی قسم میں شعر کہنا چھوڑ دوں...... کیوں میاں جمال احسانی! میں غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح؟

خیال آفریں شام کا مہران بہہ رہا ہے۔ ماضی سے مستقبل کی طرف، اپنے منبع سے اپنی منزل کی طرف۔ اور میں اپنی ایک خاص حالت انس کے ساتھ اس کی خدمت میں کورنش بجالاتا ہوں اور تاریخ اور وقت میں ایک گہرا سانس لیتا ہوں۔ اور پھر مجھے اچانک یہ احساس ہوا ہے کہ سندھی بولنے والا ایک ذہین اور شائستہ نوجوان مانی سنجرانی جو اردو میں شعر کہتا ہے، میرے ساتھ ہے اور میں ایک عجیب بات محسوس کررہا ہوں۔ اور وہ یہ کہ جیسے مہران، گنگا اور جمنا کی وادی میں بہہ رہا ہے۔ یا جیسے گنگا اور جمنا دونوں بہ یک وقت مہران کی وادی میں بہہ رہے ہیں۔

اور اے مانی سنجرانی! تو لبِ مہران میری ایک خاص بات سن اور اپنا سر دھن۔ اور وہ بات یہ ہے کہ مہران کو سنسکرت میں سندھو کہا گیا ہے، یونانی میں سنتھوس اور لاطینی میں سندس۔ ہم پاکستانی اور ہندوستانی پنجاب، کشمیر، ہریانے، دلی، اتر پردیش اور بہار سے سندھ کی طرف ہجرت کرنے والے شمالی سرزمینوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سندھو ہمارا سب سے عظیم اور قدیم پیش رو ہے جو شمال سے نکل کر یہاں آیا ہے۔ وہ تبت کی برفانی چٹانوں سے نکلا اور اس نے سندھ کی مثلث نما شمالی سرزمین کو اپنی تہذیب پرور گزرگاہ بنایا۔ وہ بھی ہجرت زدہ ہے اور ہم اور تم بھی ہجرت زدہ ہیں۔ مانی! تم سامیوں کی سرزمین سے بلوچستان آئے تھے اور وہاں سے سندھ آگئے اور میں سامیوں کی سرزمین سے روانہ ہوکر پنجاب کے علاقے میں آیا اور وہاں سے وادی گنگ و جمن کی طرف چلا گیا اور وہاں سے یہاں آگیا۔ جو جہاں بھی ہے وہ کہیں اور سے ہجرت کرکے آیا ہے۔ مگر سندھو کی ہجرت ہر لحہ جاری ہے۔ آؤ ہم سب اس ہجرت کو اپنا رشتہ بنالیں، تاریخ اور زمانوں میں پھلنے پھولنے والا رشتہ۔

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

لیجیے جناب اسال نو کا تیسرا شمارہ بھی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ماہ مارچ پاکستان کی تاریخ میں ایک یادگار مہینا سمجھا جاتا ہے جب 23 مارچ کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور مسلمانانِ ہند کے سامنے ایک درست سمت کا تعین ہوا مگر..... آج کے حالات کے تناظر میں ان قربانیوں اور تکالیف کی اذیت مزید بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کیونکہ محنت اور قربانیوں کے بعد جیسا سوچا جائے ویسا نتیجہ نہ ملے تو دکھ تو ہوتا ہی ہے۔ مختلف جگہوں، شعبہ جات اور دیگر معاملات کی اکھاڑ پچھاڑ سے ملک میں جہاں رفتہ رفتہ معاشی بحران کا خدشہ لاحق ہوتا جارہا ہے وہاں آئے دن بجلی، گیس اور پٹرول کی قیمتوں کے اضافے نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ گیس کی طویل لوڈ شیڈنگ نے معصوم بچوں کو بھی بھوکا رہنے پر مجبور کردیا ہے اور اس بار تو طبقہ اشرافیہ بھی گیس کی لوڈ شیڈنگ کی زد میں آگیا ہے مگر یہاں بحث طبقاتی کشمکش کی نہیں بلکہ بنیادی سہولت کی عدم فراہمی سے پیدا ہونے والے مسائل کی ہے جس کے بے تحاشا قدرتی وسائل سے اللہ نے ہمیں نوازا ہے مگر..... بدقسمتی سے غلط پالیسیوں کی وجہ سے نہ صرف گھروں کے چولہے ٹھنڈے ہوگئے بلکہ صنعتی تباہی کو بھی دعوت دی جارہی ہے۔ جبکہ دوسری جانب سی این جی پمپ پر گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاروں نے ٹریفک کا سارا نظام درہم برہم کرکے رکھ دیا ہے۔ سونے پر سہاگا جب دل چاہے کہیں سے بھی سڑکیں ادھیڑ دی جاتی ہیں اور ان ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر جمناسٹک کرنے والی ٹریفک بآسانی حادثات کا شکار ہوجاتی ہے مگر کسی کے کاندھوں سے کوئی گرد نہیں جھڑتی جبکہ مریضوں کو فوری طبی امداد پہنچانے کے لیے دوڑنے والی ایمبولینس تک کتنی مشکل کا شکار ہوجاتی ہیں..... کوئی بتائے کہ ان اذیت بھری مشکلات سے کیسے چھٹکارا پایا جائے.....؟ اُف جدھر دیکھو ایک حبس کا عالم ہے، خدارا اس گھٹن کو ختم کرتے ہوئے عوام کو بھی کچھ ریلیف دیا جائے۔ اللہ پاک نے پاکستان کی سرزمین کو اتنی نعمتوں سے نوازا ہے مگر افسوس کہ اس میں رہنے والے باشندے کیسی تباہ حال زندگی جینے پر مجبور ہیں..... چلیں جناب مجبوریاں اپنی جگہ اور بے حسی اپنی جگہ لیکن محفل کی رونق سے انکار نہیں تو..... دعائے خیر کرتے ہوئے ذرا خطوط کی بھی کچھ خبر لیتے ہیں۔

✠ چلبلی ہیر، جھنگ سٹی سے چلی آرہی ہیں ''رواں سال کا دوسرا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ 17 جنوری کو مل گیا۔ سرورق پر بلی نما چھوٹی سی نانی والی گرل اچھی لگی۔ ویسے یہ ماڈرن لڑکیاں کانچ کی چوڑیاں تو نہیں پہنتیں، جیسے مجھے کانچ کی چوڑیاں بالکل پسند نہیں۔ انشائیے میں خوبصورت لفظوں کے موتی بکھیرتے ایلیا جی آخری الیہ پیش کررہے تھے۔ ساتھ بھائی معراج رسول صاحب کو شیریک کیے ہوئے تھے۔ آخری الیہ واقعی بھی ہے۔ کاش ہم اس الیے پر قابو پاسکیں اور اداریہ کی میں ہمنوا ہوں۔ حکومت کی یہ تجاوزات کے نام پر توڑ پھوڑ ناانصافی ہے..... ابھی تک اس نئے پاکستان کی سمجھ نہیں آئی۔ اپنی محفل میں بڑے نام والے صاحب صدارت پر تھے۔ مبارک باد جناب عبدالجبار رومی انصاری صاحب۔ جھنگ کی چلبلی ہیر تو پیدائشی عقلمند ہیں جی، باقی جو کام دل جمعی سے کیا جائے، اس کا صلہ تو ملتا ہے نا۔ زرین صاحبہ بھی سیکنڈ نمبر پر تھیں۔ تبصرے تو ان کے بھی زبردست ہوتے ہیں۔ مبارک باد دینے کا شکریہ۔ ڈیئر رمضان پاشا انکل جی بہت اچھا لگا آپ نے اپنی عمر بتادی۔ اب آپ سے تمیز کے دائرے میں بات ہوا کرے گی۔ ریاض بٹ صاحب تبصرہ پسند کرنے کا از حد شکریہ۔ عبدالحکیم صاحب کا کچھ مایوسانہ ٹائپ کا تبصرہ تھا۔ اللہ سائیں سے ہر وقت بہتری کی دعا کرتے رہا کریں۔ محمد زبیر کا تبصرہ پڑھ کر اندازہ ہوگیا کہ ان کی کہانیاں کس قسم کی ہوں گی۔ میرا خیال ہے سسپنس والے کافی جینئس لوگ ہیں۔ محمد خواجہ صاحب نے انت میں آکر محفل کا بھی انت (آخیر) کردیا۔ بہرحال تبصرہ اچھا تھا۔ اس محفل کی ایک تبصرہ نگار محترمہ زویا اعجاز تاریخی صفحات میں روایت گزیدہ کے ساتھ حاضر تھیں۔ یونانی ہسٹری مجھے ویسے بھی بہت پسند ہے۔ یونائیڈس بہترین جنگجو اور بہادر بادشاہ تھا۔ داستان کافی دلچسپ تھی۔ نشور ہادی صاحب سے معذرت کے ساتھ، مجھے ان کی تحریریں پسند نہیں آتیں اچھا بھلا لکھتے لکھتے کہیں نہ کہیں گڑبڑ کر جاتے ہیں۔ خوبصورت دھوکا بس دھوکا ہی رہی۔ ہوم ورک جاوید مرتضیٰ صاحب کی ایک لیکچر سراغ رساں کافی دلچسپ اسٹوری تھی۔ مارتھا نے آخر جونی کے گھر سے قتل کا سراغ لگا ہی لیا۔ جرأت رندانہ ملک صفدر حیات کا ایک اور کارنامہ بہت لاجواب۔ غلط وقت کے غلط فیصلے ایسے ہی حالات پیدا کرتے ہیں۔ انسان کے اندر خیر اور شر کو ایک ساتھ رکھ کر فیصلہ انسان پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ مثبت راہ اختیار کرتا ہے یا منفی راستہ اپناتا ہے۔ غزالہ یاسمین کی مقید خاک بھی اچھی رہی، سلیم انور بھی ساس میں پاس ہوئے۔ سلسلہ وار کہانیاں تو سپر ڈوپر جارہی ہیں۔ اے آر راجپوت کی رنگ آسماں سمٹ رہی ہے۔ بہترین انجام ہوگا۔ رابرٹ کے لیے چالاک

(ریپیو) اور اناکو نیکا (رشیا) اس میں وہ جیسیکا کی جو انگلش کے علاوہ اسپینش، فرنچ، اٹالین، جرمنی اور روسی زبان بھی جانتی ہے۔ زبردست۔ رضوانہ ساجد صاحبہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی سے روشناس کروانا شروع کیا ہے۔ جزاک اللہ، اچھی بہن۔ محفل شعروسخن کے بھی اشعار بہت شاندار تھے۔'' (پسندیدگی کا بہت شکریہ جناب!)

☩ محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے تشریف لائے ہیں ''میری پیاری آپی عذرا رسول صاحبہ، السلام علیکم۔ عرض یہ ہے کہ فروری کا سسپنس میرے ہاتھوں میں ہے لیکن کیا کروں ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی دل کو جھٹکا سا لگا۔ ایک خوبصورت دوشیزہ جس کی آنکھیں ناگن جیسی خوبصورت زلفیں، ہاتھ میں چوڑیاں، ایسی حسینہ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ دل ڈر گیا کہیں یہ ناگن ہمیں ڈس نہ لے لیکن پھر بھی بار بار اس ناگن جیسی حسینہ کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ٹائٹل کے کیا کہنے، بہت پیارا لگا۔ آپ نے میرا خط شائع کیا مہربانی۔ تمام تبصرہ نگاروں کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ سبھی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ ابھی تو سسپنس لے کر آیا ہوں۔ آپ نے انعامی سلسلہ شروع کر کے بہت اچھا کیا لیکن ایک ماہ 28 فروری تک چالیس صفات کی کہانی لکھنا بہت مشکل کام ہے ویسے تو نئے رائٹروں کی حوصلہ افزائی ہے لیکن کیا بڑی کہانی کے بجائے چھوٹی کہانی ٹھیک رہے گی۔'' (جناب! جو شرائط لکھی گئی ہیں اس کے مطابق اپنا مسودہ ارسال کیجیے گا...... اور ہاں ایک بات کا خیال رکھیے، اپنے خطوط میں بسم اللہ نہ لکھا کریں۔ اس سے بے ادبی کا احتمال ہوتا ہے)

☩ رمضان پاشا کا خط طارق روڈ، کراچی سے ''فروری 2019ء کا سرورق بہت ہی دلکش تھا لیکن مصور کا نام نہیں تھا۔ فہرست سادہ تھی۔ انشائیہ پرمغز تھا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے عبدالجبار رومی انصاری صاحب کو مبارکباد۔ زرین خان نے اپنے تبصرے میں اچھے تبصرہ نگاروں میں اس ناچیز کا ذکرِ خیر بھی کیا، ان کا شکریہ! ریاض بٹ صاحب نے بھی اپنے تبصرے میں مجھ حقیر فقیر کا ذکر خیر کیا، ان کا بھی شکریہ۔ دیگر تبصرہ نگاروں میں چلبلی ہیر، محمد خواجہ، عبدالحکیم صاحب کے تبصرے اچھے تھے اور کہانیوں پر تبصرہ۔ ''روایت گزیدہ'' کمال ہے۔ زویا اعجاز تاریخی کہانی بھی لکھ لیتی ہیں۔ ان کا انداز بیان دل کو بھایا۔ پہلی بار تاریخی کہانی پڑھنے میں مزہ آیا، یونانیوں کے نام ایسے ہیں کہ حلق سے ہی نہیں اترتے...... رنگ آسماں کہانی میں دیومالائی اور دھار مک واقعات شامل کرنے سے کہانی کا لطف دوبالا ہو گیا۔ اے آر راجپوت کو داد دیتا ہوں۔ وقت کی یہ قسط بہت پھڑکدار تھی، خاص کر فیڈرک کی لیبارٹری میں جو جیس پٹاس ہوئی، اس وقت تو میری سانسیں رُک گئیں۔ ایسی ہی کیفیت خوبصورت دھوکا پڑھ کر ہوئی۔ باران رحمت بور کہانی تھی۔ منظر امام نے پہلے ہمیں بہت اچھی کہانیاں پڑھنے کو دیں لیکن اس بار انہوں نے بہت مایوس کیا۔ مقید خاک پڑھ کر دل پرشگاف پڑتا محسوس ہوا، ایسی دلفگار کہانی پہلے کبھی نہیں پڑھی۔ ساس اتنی اچھی کہانی آخر میں ادھوری چھوڑ دی۔ جرأت رندانہ ملک صاحب کی کہانی بڑی غضب کی تھی۔ قاتل بھی خاصی دلچسپ تھی۔ چور میں مزہ نہیں آیا البتہ حق دار بہت اچھی کہانی تھی، لطف آ گیا۔ ہوم ورک، یہ کہانی اتنی اچھی تھی کہ اسے اسٹوری آف دی منتھ کہنا چاہیے۔'' (بہت شکریہ جناب! آپ کی جانب سے اس پذیرائی کا۔ اپنے مشوروں سے بھی نوازیے)

☩ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''لڑکی کا فیس تو بلا کا خوبصورت تھا مگر آنکھیں اتنی چھوٹی کہ بس ڈرا ہی رہی تھیں۔ نوع انسانی کے ذہنی اعجاز میں جو عالی شان ارتقائی سفر طے ہوا وہ علمی اور فنی اعتبار سے عظیم تر ہے مگر یہ کائنات جس آخری المیے کی منتظر ہے اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ جون ایلیا کے کائناتی نفع ونقصان کا حساب کتاب اچھا لگا۔ گزشتہ سے پیوستہ اداریے میں ملکی حالات پر بحث اچھی لگی۔ محفل صدارت ملی اس کے لیے ڈھیروں شکریہ۔ دوسرے نمبر پر زرین خاں کا تبصرہ عمدہ رہا۔ بابا رمضان پاشا اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی دے اور مزید لمبی عمر عطا کرے۔ آمین۔ چلبلی ہیر کا خط اچھا لگا۔ ریاض بٹ نے بھی عمدہ تبصرہ کیا۔ عبدالحکیم خانیوال کا تبصرہ بھی ٹھیک رہا۔ یہ عبدالحکیم سٹی کا نام ہے یا موصوف تبصرہ نگار کا کیونکہ خانیوال میں عبدالحکیم سٹی بھی ہے۔ محمد زبیر ساگر بھی اپنی محبتیں نچھاور کرتے اچھے لگے۔ آخر میں محمد خواجہ نے بھرپور تبصرے کے ساتھ میدان مار لیا۔ بہت اچھے جی۔ زویا اعجاز کی روایت گزیدہ زبردست کہانی تھی لاکھوں کی فوج رکھنے والے زرکسیز کو لیسڈیمونی لیونائیڈس نے اپنی حکمت عملی سے جنگ میں دھول چٹادی۔ آخر سپاہ کی کمی نے لیونائیڈس کو اس کی محبوبہ موت نے گلے لگایا اور پھر اس کا بدلہ اس کی بیوی گورگو نے زرکسیز کو پسپا کر کے لیا۔ عمدہ کہانی۔ رنگ آسماں میں سدھا نے شوکی اور رینا کو ملایا تو خود بھی اپنے ولی کے ساتھ غائب ہو گئی۔ نجو بائی اور اس کا بیٹا اقتدار کے لیے الگ الگ سرگرم ہو گئے ہیں۔ دیکھیں اس میں آتما شکلہ کس طرح بچھو رام بنتا ہے۔ طوفان میں گھرے شفیق نے سوجنا کو بچالیا، ایسے ہی قزاقوں سے نبردآزما علی اور زمان نے دو کو ٹھکانے لگایا، تیسرے کی باری آئی تو طوفان نے آلیا۔ زوروشور سے جاری کہانی بے حد اچھی ہے۔ سازش سے شاہ نواز کو قتل کرنے اور ماہ رخ کو حاصل کرنے کے لیے منور نے تنویر کو بھی پھنسوانا چاہا مگر تنویر نے

چال کو سمجھتے ہوئے منور سے سچ اگلوا کر اسے ہی جیل پہنچا دیا۔ یوں ماہ رخ اور تنویر بھی مل گئے۔ علامتی کہانی اچھی رہی۔ بڑے آپس میں لڑیں مریں جو چاہے کریں۔ آپس میں پیار کرنے والوں کو کیوں چھپ چھپا کے ملنے پر مجبور کر رہے ہو اور پھر چودھری نے گھر کے چور کو گھر میں ہی سدھار لیا۔ محمد الیاس کی ننھی منی کہانی بہت پسند آئی۔ اونئی علی اختر کی تحریر جہالت کے اندھیرے میں ڈوبے لوگوں پر مشتمل بہترین کہانی تھی۔ آخری صفحات کی تحریر بہترین تھی۔ مقدمہ تو بنے گا چاہے کار چوری کا ہی بنے۔ ہاشمی نے یہ کہہ کر طاہرہ کو پریشان کیے رکھا اور وہ بھی ایسی ثابت قدم کہ ارسلان کو اپنا فیصل بنا کے ہی رہی اور ہاشمی نے بھی اپنے ملزم کا بڑا خیال رکھا۔ ارشد کا قتل اس کی بیوی کے پلے پڑا اور ارسلان بچ گیا۔ ہاں ڈاکٹر طاہرہ اور ارسلان کی قربت سے ایک خوبصورت دھوکے کا آغاز ضرور ہوا، عمدہ کہانی۔ جرأت رندانہ میں رانا مصدق کی اپنے بھائی کے آگے زمین داری معاملے پر کوئی پیش نہ چلی تو اس نے شیریں کو اغوا کروا کے فیکا کو مروا دیا۔ ملک صاحب کی تفتیش بروئے کار آئی تو مجبوراً سمیت رانا مصدق بھی حوالات میں موجود ہوا اور جہاں تک ہمارے ذہانتی گھوڑوں کا تعلق ہے تو لگتا ہے وہ چھ ماہ تک ہی دوڑ سکے ہوں گے۔ مطلب مصدق کو چھ ماہ سزا ہوئی ہوگی۔ باقی اس کا حق بھی محفوظ ہو گیا ہوگا۔ اللہ کے پیارے نبی حضرت عیسیٰؑ کی پیاری باتیں دل میں اترتی جاتی ہیں۔ بچپن میں ہی حیرت انگیز باتیں ظاہر ہو رہی ہیں کہ عورتیں اپنے بچوں کو ان کے ساتھ کھیلنے سے ہی منع کر رہی ہیں اور پھر حضرت عیسیٰؑ کو بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ بھی سبب پیدا فرماتا ہے۔ رضوانہ ساجد کی پراثر تحریر پہلے کی طرح دل میں گھر کرتی جاتی ہے، بہت عمدہ۔ محفل شعروسخن سے شہباز مغل، نبیل احمد اور مہناز خان کے شعر اچھے لگے۔''

✠ جرار احمد جعفری، ایف بی ایریا، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں'' آج 15 جنوری ہے۔ رات کے دس بجے ہیں۔ فروری کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ سرورق بہت شاندار ہے۔ اچھا لگا۔ اس کے بعد مضامین کی فہرست پر نظر ڈالی۔ اس دفعہ بھی میری کوئی کہانی شائع نہیں ہوئی۔ افسوس صد افسوس، ہر شمارے میں کچھ نہ کچھ جگہ تو نئے لکھنے والوں کے لیے نکال لیا کریں (تھوڑا وقت تو لگتا ہے۔ پلیز انتظار کریں) حسب سابق تھانیدار صفدر حیات کا کارنامہ بقلم جناب حسام بٹ پڑھی۔ بہت اچھی لگی۔ بٹ صاحب اسی طرح سلسلہ وار کہانی ''وقت'' بھی لکھا کریں۔ تمام ترجمہ شدہ کہانیاں پڑھ لی ہیں۔ سب ہی بہت خوب ہیں۔ سلسلہ وار کہانیوں کے آٹھ دس پیج پڑھتا ہوں پھر چھوڑ دیتا ہوں۔ وجہ...... کہانیاں قاری کا ذہن متوجہ کرنے میں ناکام ہیں۔ مدیرہ صاحبہ، تنقید کو ہمیشہ ویلکم کیا کیجیے۔'' (آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر۔ ہم ہر تنقید کو ویلکم کرتے ہیں اور آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کو ہرگز بھی بلیک لسٹ نہیں کیا)

✠ عبداللہ ترین، کوئٹہ سے محفل کی رونق بنے'' پہلی بار آپ کی محفل میں انٹری کر رہا ہوں۔ امید ہے ویلکم کریں گے۔ (جی ضرور خوش آمدید) اپنے دوست کے والد صاحب کو پڑھتے دیکھا تھا یہ ڈائجسٹ تو میں نے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر ہر ماہ ان سے لے کر آنا میرا معمول بن گیا۔ چھ سات ماہ سے اس رسالے کا قاری ہوں۔ خط لکھنے کی وجہ دونوں سلسلہ وار داستانیں ہیں۔ پاکستان کے تمام صوبوں اور شہروں کے نام محفل میں شامل ہوتے ہیں مگر کوئٹہ کا نام نہیں ہوتا۔ محفل میں آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ (ہمیں جو بھی جہاں سے بھی یاد کرتا ہے، ہم ضرور اسے شامل کرتے ہیں) میں سسپنس ڈائجسٹ کی خاص اسٹوریز پڑھتا ہوں۔ جیسا کہ مرزا امجد بیگ، ملک صفدر حیات کی پیش کردہ اسٹوریز اور سلسلہ وار کہانیاں۔ حسام بٹ صاحب کی وقت موسٹ فیورٹ ہے۔ اے آر راجپوت صاحب کی رنگ آسماں بھی لاجواب داستان ہے۔ اب لگتا ہے یہ اختتام پذیر ہے۔ ایک دو حصے مزید ہوں گے۔ وقت میں حسام بٹ صاحب ہمیں امریکا اور یورپ کی معلومات انتہائی خوبصورت انداز میں دیتے ہیں۔ ان کی داستان پڑھ کر لگتا ہے جیسے کوئی ہالی ووڈ کی موودی دیکھ رہے ہوں۔ اسد علی از گریٹ ہیرو...... ملک صفدر حیات کی جرأت رندانہ بہت پسند آئی ہے۔ پہلے کے پولیس والے بہت ایمان دار اور اپنے کام سے مخلص ہوتے تھے، آج کل کے پولیس والے پتا نہیں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ رنگ آسماں میں سدھا کی کہانی پوری ہوئی۔ ادھر رینا اور شوکی بھی مل گئے۔ تبصروں کی محفل بھی کافی دلچسپ ہوتی ہے۔ منشی محمد عزیز نے تو کمال کر دیا۔ پورے سال کی رپورٹ پیش کر دی۔ بہن چلبلی ہیرا اپنے نام کی طرح چلبلے تبصرے کرتی ہیں۔ ویسے تو آج کل وہ گوبھی کا پھول بنی ہوئی ہیں۔ چلبلی بہن آپ اکثر مزاحیہ کہانی کی فرمائش کرتی ہیں۔ کلاسک سسپنس میں تو آپ کے لیے مشورہ ہے کہ آپ خود اچھی مزاحیہ کہانی لکھ سکتی ہیں اور لکھ کر سسپنس ڈائجسٹ میں بھیج دیں۔ زرین آپی، ام عبداللہ آپی اور ناہید یوسف آپی سب اچھا تبصرہ دیتی ہیں۔''

✠ ریاض بٹ، حسن ابدال سے محفل کی زینت بنے ہیں'' سرورق خوبصورت ہے اور ہمارے پیارے اور من موہنے پرچے کی شان بڑھا رہا ہے۔ جون ایلیا کا لکھا ہوا آخری المیہ ہمیشہ کی طرح دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ ان کی ایک ایک بات قابل توجہ، قابل تقلید اور سنہری ہے۔ وہ ایک ایسے کیمیا گر ہیں جو لفظوں کو سونا بنا دیتے ہیں اور ان کے لکھے میں ذرا کھوٹ بھی تلاش نہیں کی جا سکتی...... اس کے بعد اپنی پیاری محفل آپ کے خط میں پہنچے...... وہاں مدیر اعلیٰ صاحب حقیقت ہمارے سامنے آشکار کر رہی ہیں۔ جس حکومت نے ایک کروڑ

ملازمتیں دینے کا وعدہ کیا تھا، انہوں نے مزید کئی کروڑ لوگوں کو بے روزگار کر دیا ہے...... خیر یہ باتیں دل جلانے والی ہیں...... الا سے [illegible] ہیں جن کے گھر کے چولہے بجھ گئے ہیں...... یہ تو آٹے کے ساتھ گھن پسنے والی بات ہے...... اس کے بعد بوجھل دل لیے بڑھے اپنی محفل کی طرف۔ عبدالجبار رومی انصاری کرسی صدارت پر براجمان ہیں۔ بھائی آپ کا طویل اور مدلل خط بہترین ہے۔ مجھے اچھے لفظوں سے یاد کرنے کا شکریہ۔ بہن زرین خان کا تبصرہ بھی خوبصورت ہے۔ تقریباً ہر کہانی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ رمضان پاشا بھائی اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے۔ اس عمر میں ریگولر تبصرہ کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش اور صحت مند رکھے، آمین۔ بہن چلبلی ہیر آپ بھی باقاعدگی سے تبصرہ کرتی ہیں۔ اچھا لگتا ہے۔ بہن بھائی کا مان بڑھانے کا شکریہ۔ اس دفعہ ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات زویا اعجاز لے کر آئیں جو آخری صفحات کے لیے طویل کہانیاں لکھ کر اپنی دھاک بٹھا چکی ہیں۔ تاریخی واقعات بھی بڑے اچھے انداز میں لکھے۔ ویل ڈن۔ تویر ریاض کی باران رحمت بھی گزارے لائق تھی۔ اب بات ہو جائے ملک صفدر حیات صاحب کی تفتیشی کہانی جرأت رندانہ کی۔ زن، زر اور زمین ایک ایسی تکون ہے جس کی خاطر ازل سے جرائم ہوتے آئے ہیں اور ابد تک ہوتے رہیں گے۔ مجرم نے اپنی طرف سے بڑی ذہانت سے جرم کے تانے بانے بنے تھے...... لیکن جب پالا ملک صفدر حیات جیسے تھانیدار سے ہو تو (جو اپنے وقت میں تنکے کا سہارا لے کر تفتیش کے دریا پار کر جاتے تھے) مجرم ہزار جتن اور ذہانت کے باوجود قانون کے شکنجے میں ضرور آ جاتا تھا۔ غزالہ یاسمین کی مقید خاک ایک حساس موضوع پر لکھی ایک رلا دینے والی تحریر ہے۔ ایک بار میں پھر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ جذبات میں ہلچل مچانے والی تحریریں ہم تک پہنچانا صرف سسپنس کا کام ہے۔ ویل ڈن۔ سلیم انور کی چھوٹی سی کہانی ساس بھی ایک جرم کی کہانی سنا رہی ہے۔ ہیلن مارٹن نے جو کچھ چاہا، اس کے بالکل برعکس ہوا...... اور آخر وہ پکڑی گئی...... یہ تو ایک مغربی معاشرے کی عکاس کہانی ہے لیکن ہمارے ہاں بھی آج کل رشتوں کی پہچان اور احترام مفقود ہو چکا ہے...... محمد الیاس کی چور بھی ایک چبھتی ہوئی کہانی ہے۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے دو دلوں میں جدائی ڈالنا انا پرستوں کی پرانی عادت ہے۔ بہرحال انسان ہے اور اس کی نفسیات ایسے گل کھلاتی رہتی ہے۔ شاید اسی لیے ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ ذہن لاشعور ایک تاریک غار کی طرح ہے جس کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔ علی اختر کی تحریر کردہ کہانی اونچی بھی ایک متاثر کن کہانی ہے۔ واقعی جاہلانہ رسمیں آج کل بھی رائج ہیں۔ کم علمی اور توہمات کی وجہ سے جن لوگوں کی عقلوں پر پتھر پڑے ہوئے ہیں وہ واقعی کھوٹے کھرے کی پہچان بھول چکے ہیں...... سلسلے وار کہانیاں وقت اور رنگ آسماں کی اس ماہ کی قسطیں بھی متاثر کن تھیں...... اب ان کہانیوں میں تیزی آ گئی ہے۔ دیکھیں آگے آگے ہوتا ہے کیا۔''

✠ عابد علی کا خط راولپنڈی سے ''میری اس محفل میں پہلی باری ہے (اچھا...... خوش آمدید بھئی) میں ایف ایس سی کے دوسرے سال میں ہوں۔ مجھے ادب کا انتہائی شوق ہے۔ نئی زمانہ ادب کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ اگر کسی کو شوق بھی ہوتا ہے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ ''اس کو لڑکیوں والا شوق کدھر سے پڑ گیا ہے۔'' انتہائی افسوس ناک بات ہے۔ (یہ تو آپ نے درست کہا...... مگر ادب اور کتاب بینی ہر دور کا حصہ رہی ہے اور یہ ختم نہیں ہو سکتی) خطوط میں رمضان پاشا انکل کی عمر دراز پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اللہ آپ کو اور لمبی عمر عطا فرمائے آمین۔ رسالے میں اگرچہ پرانے لکھاری نہیں رہے لیکن رسالے میں اب بھی جان باقی ہے جن میں نمایاں نام طاہر جاوید مغل ہیں۔ اے آر راجپوت صاحب کی رنگ آسماں پوری شان و شوکت سے منزل کی جانب گامزن ہے۔ رسالے میں سب سے پہلے بھی پڑھتا ہوں۔ طاہر جاوید مغل صاحب ہر دل عزیز لکھاری ہیں۔ ان کی کہانیاں اور ناول ذہن میں سالوں تک یاد رہتی ہیں۔ ان کا انداز تحریر اور کہانیوں کا پس منظر دل خوش کر دیتا ہے۔ ان سے ایک فین ہونے کے ناتے گزارش ہے کہ سسپنس کے لیے بھی کوئی سلسلے وار کہانی شروع کریں۔ میری طرف سے طاہر جاوید مغل صاحب کو سلام۔ جرم و سزا پر مبنی کہانیاں ملک صفدر حیات اور مرزا امجد بیگ کی ہر دل موہ لینے والی ہیں۔ گاؤں کے پس منظر میں ہونے والے واقعات دل کو خوش کر دیتے ہیں۔ پہلی دفعہ کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ خطوط میں کسی کے ساتھ دوستی نہیں ہے، اس لیے گپ شپ بھی نہیں لگا سکتے۔ ویسے گپ شپ کے لیے دوستی ضروری تو نہیں۔ خیر، جان پہچان ہو جائے گی۔ آخری صفحات پر سسپنس کلاسک سلسلے کی کہانی کب شائع کر رہے ہیں، کئی ماہ سے انتظار کر رہا ہوں۔'' (ان شاء اللہ جلد ہی آخری صفحات پر بھی سسپنس کلاسک کے حوالے سے تحریر شائع ہوگی مگر تاریخی صفحات پر سسپنس کلاسک کا آغاز ہو چکا ہے)

✠ مہتاب احمد حیدرآباد سے شریک محفل ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ یوں تو بہت شوق سے پڑھتے ہیں مگر خط لکھنے کا ٹائم نہیں مل پاتا۔ اب موقع ملا تو خط لکھ رہے ہیں۔ امید ہے ہمارا خط شامل محفل ہوگا۔ سب سے پہلے وقت پڑھی۔ علی کا کردار بہت جاندار ہے۔ یہودی اس کے پیچھے پڑے ہیں اور وہ بہادری کے ساتھ سینہ تان کر ان کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا ہے۔ کہانی زبردست جا رہی ہے۔ دوسرا سلسلہ رنگ آسماں میں واقعات کچھ عجیب سے ہیں۔ ہماری سمجھ کے مطابق ماورائی کہانی سے مشابہ رنگ آسماں میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کہانی کا مقصد کیا ہے، یہ ابھی تک واضح نہیں ہو پایا۔ البتہ عجیب و غریب واقعات تسلسل کے ساتھ جاری ہیں۔

معذرت کے ساتھ۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر کوئی اس سے متفق ہو۔ زویا اعجاز کی روایت گزیدہ اچھی رہی۔ اسپارٹا کی تاریخ اور وہاں کے جنگجو لوگوں کی بہادری کے واقعات زبردست تھے۔ لیونائیڈس نے دشمن کو ناکوں چنے چبوائے۔ کہانی زبردست تھی۔ تنویر ریاض کی باران رحمت بس ٹھیک رہی۔ منظر امام کی علامتی کہانی کچھ خاص نہ لگی۔ اعتزاز سلیم کی قاتل بھی ٹھیک رہی۔ ملک صاحب کی جرأت رندانہ میں ملک صاحب نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے رانا مصدق کو گرفتار کرلیا اور شیریں کو بھی بازیاب کروالیا۔ ویلڈن۔ کہانی بہترین تھی۔ غزالہ یاسمین کی مقید خاک بہت ہی بہترین کہانی رہی۔ رائٹر نے بہت ہی حساس کہانی لکھی۔ بالے کا ماں کے لیے پریشان ہونا، کھلونے بیچنا اور پھر اس کی غذائی ضرورت کو پورا کرنے کی فکر..... واہ! کیا حساس موضوع تھا۔ بالے کے آنسو ہمارے دل پر گر رہے تھے۔ ویلڈن۔ کافی دیر تک کہانی کے سحر میں کھوئے رہے۔ سلیم انور کی ساس کہانی بہتر رہی۔ شاہ زین رضوان کی حق دار بس سو سو رہی۔ علی اختر کی کہانی اونٹنی پڑھی۔ واقعی ہمارے اردگرد اب بھی نہ جانے کتنی لڑکیاں ایسی ہیں جو جاہلانہ رسوم ورواج کا شکار بن کر اپنی زندگی تباہ کر بیٹھتی ہیں۔ جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اس طرح کی تحریر معاشرے میں سدھار کا سبب بنتی ہے۔ ویلڈن یاسمین۔ حضرت عیسیٰ کا ایمان افروز سلسلہ پڑھا۔ دل مطمئن ہوگیا۔ جاوید مرتضیٰ کی ہوم ورک کہانی تجسس سے بھرپور تھی۔ جونی نے ہوم ورک میں گھر میں پیش آنے والا واقعہ لکھ دیا جس کے سبب قاتل پکڑے گئے۔ اچھا آئیڈیا تھا۔ خوبصورت دھوکا واقعی بہت خوبصورت تھا۔ ارسلان سے جرم سرزد ہوا مگر اسے جو سزا ملی وہ بہت ہی حسین تھی۔ محفل شعر وسخن بھی اچھی رہی۔ محفل خطوط بھی دلچسپ رہی۔ دعا ہے سسپنس مزید ترقی کرے، آمین۔''

✠ ناہید یوسف اسلام آباد سے حاضر محفل ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ ملا تو ہم اس وقت کراچی میں ہی تھے کیونکہ کراچی میں ایک عزیز کے ہاں شادی کی تقریب تھی۔ شادی کے ہنگاموں میں مطالعہ تو نہ کر پائے تاہم فہرست پر اک نگاہ ضرور ڈال لی تھی۔ سب سے پہلے جس نام نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا، وہ تھا زویا اعجاز صاحبہ کا۔ لہٰذا واپسی کے سفر کے دوران سب سے پہلے تاریخی کہانی روایت گزیدہ سے شروع کیا۔ اسپارٹا کے شہری جنگجو اور بلا کے بہادر تھے۔ ان کی تربیت کے معیار سے ہی ان کی بے خوفی کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ ایک آدمی بھی کئی لوگوں پر بھاری تھا۔ زبردست کہانی تھی۔ پڑھ کر مزہ آگیا۔ زویا اعجاز نے کمال منظر کشی کی ہے۔ ویلڈن۔ رنگ آسماں کے بارے میں کیا کہیں۔ حقیقت سے دور ایسی داستان پڑھنے کو مل رہی ہے کہ ذہن ماننے کو تیار نہیں اور جب ایسی صورت حال ہوتی ہے تو کہانی اپنی دلچسپی کھو دیتی ہے۔ کہانی پڑھ کر نہایت بدمزہ ہوگئے۔ البتہ مقید خاک نے ساری بدمزگی دور کردی۔ بہترین کہانی تھی۔ معصوم ذہن نے اپنے تئیں ماں کی بھوک مٹانے کی کوشش کی۔ یقین جانیے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بہت ہی حساس اور دل کو چھو لینے والی کہانی تھی۔ ہم کتنی دیر خیالوں میں کھوئے رہے۔ واقعی ماں کا رشتہ ایسا ہے کہ اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ معصوم بالا اپنی ماں کو ڈھونڈتا رہا مگر وہ اس سے بہت دور جاچکی تھی۔ میرے خیال سے اس دفعہ کی بیسٹ کہانی یہی تھی۔ سلیم انور کی ساس کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ واقعی ساس بہو کا مسئلہ مشرقی ہی نہیں، مغربی دنیا میں بھی درپیش ہے۔ تبھی بہو نے ساس کو ٹھکانے کے لیے دوا کا استعمال کیا مگر اس کا شکار شوہر بن گیا۔ اچھی کہانی تھی۔ حق دار میں پولیس افسر نے لڑکی کو اس کا حق دلا دیا مگر راستہ غلط تھا لیکن اس نے ایک اچھا کام کیا۔ چور کہانی بھی بہتر تھی۔ وقت کہانی تھوڑی بہتری کی جانب گامزن ہے۔ کہانی میں تھوڑی تیزی آگئی ہے تاہم کہانی ابھی پوری طرح گرفت میں لینے سے قاصر ہے۔ واقعات کافی دیر تک ایک ہی جگہ گھومتے رہتے ہیں۔ علی اختر کی اونٹنی زبردست کہانی تھی۔ جاہلانہ رسوم ورواج نے ہمارے معاشرے میں بگاڑ پیدا کر رکھا ہے۔ دور جدید میں بھی مختلف جگہوں سے ایسے واقعات سننے کو ملتے رہتے ہیں جنہیں سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اونٹنی کہانی بھی یہی سب ظاہر کر رہی تھی۔ کم عقیدہ لوگ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں، چاہے کسی کی زندگی تباہ وبرباد کیوں نہ ہوجائے اور جعلی پیر وغیرہ اپنی تسکین کا سامان کرتے رہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کا قصہ پڑھا۔ ایمان افروز واقعات۔ ویلڈن رضوانہ ساجد۔ اللہ آپ کو جزا دے۔ جاوید مرتضیٰ کی ہوم ورک کہانی بھی اچھی تھی۔ کبھی کبھی ہم بچوں کی باتوں پر توجہ نہیں دیتے۔ حالانکہ وہ اپنی باتوں میں سچائی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہوم ورک ایسی ہی ایک کہانی تھی۔ مارتھا نے جونی کی باتوں سے قتل کا سراغ لگا لیا تھا۔ لیکن سراغ رساں کینڈال ماننے کو تیار نہ تھا۔ خوبصورت دھوکا بس گزارے لائق لگی۔ ارسلان کچھ زیادہ ہی بزدل تھا۔ کہانی کچھ خاص اثر نہ چھوڑ پائی۔ تنویر ریاض کی باران رحمت بس ٹھیک لگی۔ ملک صفدر حیات کی کہانی ہم دلچسپی سے نہیں پڑھتے مگر پھر بھی پڑھتے ہیں۔ وہی روایتی پولیس والوں کی تفتیش۔ بہرحال کہانی اچھی تھی۔ ملک صاحب حاضر دماغی سے قاتل کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا تھا۔ محفل شعر وسخن بھی خوب رہی۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے خطوط محفل میں شامل نہیں ہوسکے۔

عاصمہ احمد، حیدرآباد، ناصر محمود، سرگودھا۔ امبرین ناز، نواب شاہ۔ اسلم کھوکھر، میرپور خاص۔ مہوش خان، پنڈی۔ اظہر سلیم، ملتان۔ ارباب احمد، پشاور۔ مونا رضوان، کورنگی، کراچی

ایک دن سب کو اس عالم فانی سے چلے جانا ہے لیکن جانے والوں کے کام ان کی یاد زندہ رکھتے ہیں ..... مرحوم مصنفین کی یادگار تحریروں کو خراجِ تحسین۔

سسپنس کلاسک

مقبول اور ناقابلِ فراموش کہانیوں کا انتخاب

سسپنس کا ایک نیا سلسلہ

ہنگامۂ زن

الیاس سیتاپوری

چاہے فقیر کی کٹیا ہو یا بادشاہ کا محل... محبت بہت فرصت اور گھمنڈ کے ساتھ قیام کرتی ہے اور اسے کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ عشق کا یہی جذبہ ان دونوں کو بھی صحرا کے سفر پر مجبور کیے ہوئے تھا اور اسی دشت نوردی نے انہیں تاریخ میں محبت کے کفن میں لپیٹ کر دفن کر دیا۔ دونوں اپنے عہد کے برترین شاعر اور زمانہ شناس تھے لیکن ان کے اپنے خیالات اور مبہم مزاج نے ہی انہیں الجھا دیا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ یکجا ہونے سے ڈرتے تھے۔ وحدانیت کا تقاضا کرنے والی اس محبت سے منکر ہو کر بھی وہ جیسے بس ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ بہت عجیب، بہت الجھے ہوئے خیالات کے مالک یہ دونوں ایک دوسرے کا مقدر کبھی نہ ہو سکے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

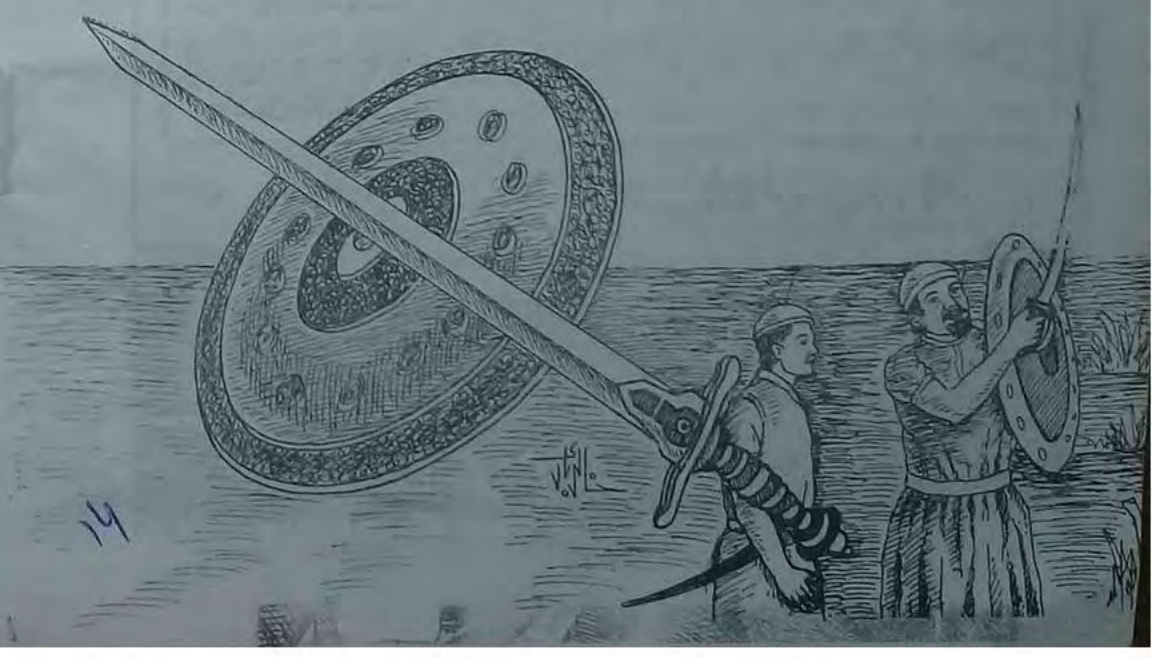

بنی کہلان کا ایک یمنی قبیلہ بھی ان قسمت آزماؤں میں شامل تھا جو عرب اور شام سے اندلس کی طرف بھاگے چلے جارہے تھے۔ اس قبیلے کا تعلق مشہور صحابی رسول عمار بن یاسرؓ سے تھا۔ اس قبیلے میں سحصب نامی کوئی بزرگ زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ یہ لوگ غرناطہ سے بیس میل دور شطیر نامی جگہ پر رک گئے۔ اس جگہ کو شطیر اس لیے کہتے تھے کہ یہاں سے قریب ہی شطیر نام کا ایک چشمہ بہتا تھا۔ یہ جگہ اپنی سرسبزی میں بے مثل تھی۔ اس کے چاروں طرف سرسبز پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے اور ان کی ڈھلوان سطح پر اگے ہوئے ساگوان کے طویل القامت درختوں میں سے پہاڑی چٹانیں اس طرح نظر آتیں جیسے کوئی بہت ساری حسینائیں اپنے نقابوں سے جھانک رہی ہوں۔ تارکینِ وطن کو یہ جگہ بہت پسند آئی اور انہوں نے یہیں ڈیرا ڈال کر اس جگہ کا نام قلعہ سحصب رکھ دیا۔ بعد میں اس خاندان نے بڑی ترقی کی اور ان میں وزیر، سپہ سالار، قاضی، کاتب اور شاعر پیدا ہوتے رہے۔ جب اس خاندان میں سعید نامی ایک اور شخص نے غیر معمولی شہرت حاصل کرلی تو یہ لوگ بنوسعید کہلانے لگے۔

اس خاندان سے وابستہ عبدالملک کو جب یہ معلوم ہوا کہ عبدالمومن مرابطین کو شکستیں دے کر خود ایک عظیم القدر فاتح کی حیثیت سے تاریخ سازی میں مصروف ہے تو وہ غرناطہ میں اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ عبدالملک کے تینوں بیٹے ابوجعفر، محمد اور عبدالرحمٰن خاصی شہرت اور ناموری کے حامل تھے۔ محمد اور عبدالرحمٰن میدانِ جنگ کے فرد تھے اور ابوجعفر بساط شاعری کا بادشاہ تھا عبدالملک اپنے تینوں بیٹوں کو اس دن کے انتظار میں مستعد اور تیار کیے ہوئے تھا جب عبدالمومن اندلس میں خود آئے اور اندلس والوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع ہونے کی دعوت دے۔

1165ء میں عبدالمومن جبل الطارق پہنچا۔ اس نے تاریخی پہاڑ کے ایک حصے پر بطور یادگار اپنے تیار کردہ نقشے کے مطابق ایک جدید قلعہ تعمیر کیا۔ تعمیر کا کام اس عہد کے مشہور معمار اور ریاضی داں حاجی یعیش کی نگرانی میں انجام پایا۔ اس نامی معمار نے پہاڑ پر پانی چڑھانے کے لیے ایک ہوائی کل ایجاد کی تھی جس سے نیچے کا پانی بہ آسانی پہاڑ کی بلندی تک پہنچنے لگا تھا۔ عبدالمومن نے اس مقام کو جبل الفتح اور قلعے کو مدینۃ الکبریٰ سے موسوم کیا پھر اس جبل الفتح پر جشنِ فتح منانے کا اعلان کردیا گیا۔ اندلس کے دور دراز حصوں سے ہنرمند، فنکار اور فنونِ حربیہ کے ماہر جبل الفتح کی طرف روانہ ہونے لگے۔

عبدالملک بھی اپنے بیٹوں کے ساتھ جبل الفتح پہنچنے کی تیاری کرنے لگا۔ عبدالملک کا شاعر بیٹا ابوجعفر عین وقت پر باپ کا ساتھ دینے سے گریز کرنے لگا۔ وہ روانگی سے ذرا پہلے گھر سے غائب ہوگیا۔ اس کی اپنی ہم عصر شاعرہ حفصہ سے بڑی دوستی تھی۔ دونوں نے شعری تربیت ایک ساتھ حاصل کی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ یہ عزت محبت میں بدل گئی اور ابوجعفر کے عین وقت پر باپ کے ساتھ جانے سے انکار کردینے میں حفصہ کی محبت کو بڑا دخل تھا۔ حفصہ بھی ابوجعفر کے مقابلے میں کسی کی پروا نہ کرتی تھی۔

حفصہ کو پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا کہ ابوجعفر اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ جبل الفتح جارہا ہے۔ ابوجعفر کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حفصہ یہ سمجھی کہ شاید ابوجعفر اس سے رخصتی ملاقات کرنے آیا ہے۔ وہ شوخی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

''میں تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ تو مجھ سے ملے بغیر ہی اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ چلا جائے گا لیکن تو مجھے نہیں بھولا، اس کا میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''حفصہ! میں نے عین وقت پر اپنے باپ اور بھائیوں کا ساتھ دینے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ اب میں نہیں جاؤں گا۔''

حفصہ کی پیشانی پر حیرت اور سوال نے شکنیں ڈال دیں، پوچھا۔ ''یہ کیوں! تو اپنے باپ کے ساتھ کیوں نہیں جائے گا؟''

ابوجعفر نے کہا۔ ''ذرا تو میرے ساتھ چل، اگر میں یہاں زیادہ دیر تک رکا رہا تو میرا باپ یا دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک مجھے یہاں آکر پکڑ لے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم کہیں اور چلے چلیں اور دنیا سے چھپ کر باتیں کریں۔''

حفصہ نے کہا۔ ''خیر، میں تیری بات تو نہیں ٹالوں گی لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ جب تیرے گھر والے مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے گھر آئیں گے اور یہاں مجھے بھی نہ پاکر ہم دونوں کو ہر اس خفیہ جگہ پر تلاش کرتے پھریں گے جو دنیا کی نظروں سے دور یا چھپی ہوگی۔''

ابوجعفر سرتاپا نیازمند ہوگیا، بولا۔ ''بس تیری انہی باتوں نے تو مجھے گرویدہ... کر رکھا ہے۔''

وہ دونوں وہاں سے دور شمال میں اس شاہراہ کی طرف روانہ ہوگئے جو غرناطہ سے متصل شہر جیان کو جاتی تھی۔ حفصہ کے گھر والے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ حفصہ کی آزاد خیالی اور بے باکی نے پورے خاندان کو

مرعوب کر رکھا تھا اور کسی میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ حفصہ کے ذاتی معاملات میں دخل دے سکتا۔ وہ دونوں جیان جانے والی شاہراہ کے کنارے انار کے ایک چھوٹے سے باغ میں گھس گئے۔ اس باغ کے پہلو میں ایک چشمہ رواں تھا اور اس چشمے سے اس باغ کو سیراب کیا جاتا تھا۔ انار کے درختوں میں سرخ سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ ابوجعفر اور حفصہ چند درختوں کی آڑ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

حفصہ نے ابوجعفر کے سرخ وسفید چہرے کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابوجعفر! شاعری نے تجھے بزدل بنا دیا ہے۔ تجھے اپنے باپ کے ساتھ عبدالمومن کے دربار میں ضرور جانا چاہیے۔''

ابوجعفر نے حفصہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حفصہ کی مخروطی انگلیاں اس کے ہونٹوں سے جا لگیں، انہیں بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ''حفصہ! دنیا کے سارے غم میرے اس غم کے مقابلے میں ہلکے اور معمولی ہیں، جو تیری مفارقت اور مہجوری میں میرے دل کو لگ سکتا ہے۔''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''لیکن ہم دونوں کی یہ مفارقت یا مہجوری دائمی تو نہیں ہوگی، عارضی اور وقتی ہوگی۔''

ابوجعفر نے حفصہ کی ہتھیلی اپنے گالوں پر پھیری اور کہا۔ ''آہ حفصہ! شاید تو ان شدید جذبات اور کیفیات کا شکار نہیں ہے جن میں میں مبتلا ہوں۔ تو میری اس بات پر یقین رکھ کہ میری جان تیرے سوا کوئی اور نہیں لے سکتا۔ میں ایک نہ ایک دن تجھ پر اپنی جان دے دوں گا۔''

حفصہ ہنسنے لگی، شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا، بولی۔ ''کیا خیال ہے، کیا میں تجھے نہیں چاہتی؟ کیا میں تجھ سے محبت نہیں کرتی؟''

ابوجعفر نے حفصہ کی پیشانی چوم لی، بولا۔ ''میں نہیں کہتا کہ تو مجھ سے محبت نہیں کرتی بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ تو مجھے اتنا نہیں چاہتی جتنا میں تجھے چاہتا ہوں۔''

حفصہ نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور شاید تو یہ دعویٰ بھی اس لیے کر رہا ہے کہ تو ہمیشہ بوس وکنار میں پہل کر دیا کرتا ہے اور میں ہمیشہ تیری معمول بن جاتی ہوں، حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ تو مرد ہے جسے خدا نے شرم وحیا کی زیادہ مقدار نہیں بخشی اور میں عورت ہوں جس کے خمیری اجزا میں شرم وحیا کی وافر مقدار شامل کر دی گئی ہے۔''

ابوجعفر نے تلخی سے پوچھا۔ ''تو تیری کیا منشا ہے؟ کیا میں اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ جبل الفتح چلا جاؤں؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''اس میں سوچنے یا منظوری لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تجھے عبدالمومن کے دربار میں ضرور پہنچنا چاہیے۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''خوب، یعنی یہ تو کہہ رہی ہے جو ایک طرف تو میری محبت کا دم بھرتی ہے اور دوسری طرف ہجرت اور مفارقت اختیار کرنے کا حکم دے رہی ہے۔''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''محض اس لیے کہ اس حسد اور رشک سے بچنا چاہتی ہوں جو تیری عدم موجودگی میں تیرے بھائیوں کے اعلیٰ عہدے یا منصب حاصل کرنے کے بعد میرے دل میں پیدا ہوگا۔ میں یہ غم برداشت نہیں کر سکتی کہ تیرے بھائی تو اونچے مرتبے پر پہنچ جائیں اور تو محض شاعر ہی بنا رہ جائے۔''

ابوجعفر نے بڑے افسوس سے کہا۔ ''لیکن حفصہ! میں تو اپنے بھائیوں کی طرح مردِ میدان نہیں اور عبدالمومن کی نظروں میں وہی شخص اعلیٰ مرتبہ یا منصب حاصل کر سکے گا جو اس کی طرح بہادر اور فنونِ حربیہ کا ماہر ہوگا۔''

''تیرا خیال غلط ہے، یہ فاتح اور حکمران اپنے ساتھ شاعروں اور دانش مندوں کو بھی رکھتے ہیں جو زمانۂ امن میں ان کے بہترین مشیر اور رفیق ثابت ہوتے ہیں۔ تو عبدالمومن یا اس کے بیٹوں کا مشیر یا دوست تو بن سکتا ہے اور پھر یہ کہ تو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر بھی تو ہے۔''

ابوجعفر سوچ میں پڑ گیا اور اس نے سوچا، حفصہ درست ہی کہہ رہی ہے۔ حکمران اور فاتح اپنے آس پاس شاعروں کو بھی تو رکھتے ہیں۔ حفصہ سے پوچھا۔ ''اچھا اگر میں تیری بات مان لوں اور عبدالمومن کے دربار میں چلا جاؤں تو مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا یعنی مجھے وہ ترکیب بتا جس پر عمل کر کے میں اس کے دربار کا کوئی اچھا سا منصب حاصل کر لوں؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''تو اس کی شان میں زوردار قصیدہ لکھ اور ان شعراء کی صف میں شامل ہو جا جو ملک کے دوسرے حصوں سے کھنچ کھنچ کر انعام واکرام کی امید میں وہاں پہنچیں گے۔ اگر تو دوسرے شعراء پر حاوی رہا تو ضرور کوئی نہ کوئی عہدہ یا مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''بہتر ہے، میں تیرے مشورے پر عمل کروں گا۔''

حفصہ نے کہا۔ ''عبدالمومن کے دو شاندار بیٹے بھی تو ہیں، ابوسعید اور ابوحفص!''

ابوجعفر نے حفصہ کا ہاتھ چھوڑ دیا، جل کر بولا۔ ''شاید ابوحفص کا نام تو اس لیے لے رہی ہے کہ وہ تیرے

نام کی تذکیر ہے اور لفظ شاندار سے شاید تو اپنے اس اندرونی جذبے کا اظہار کر رہی ہے جو حکمرانوں کے اشتیاق نے تجھ میں پیدا کر دیا ہے۔"

حفصہ نے بدستور شوخی سے کہا۔ "اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ابوسعید اپنے بھائی ابوحفص سے زیادہ شاندار اور خوبرو ہے اور اس کی پیشانی پر اعلیٰ حکمران کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔"

ابوجعفر نے بے دلی سے جواب دیا۔ "لیکن میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ ابوسعید کا رنگ سیاہی مائل گندمی ہے، رہا اس کی پیشانی پر حکمرانی کی علامتوں کا پایا جانا، تو میں ایسے بہت سارے حکمرانوں کے نام گنوا سکتا ہوں جن کی پیشانیوں پر کوئی خاص علامت تو نہیں پائی جاتی لیکن وہ اپنے زمانے کے بڑے حکمران تھے۔ اس طرح میں ایسے لوگوں کی نشاندہی بھی کر سکتا ہوں جن کی پیشانیاں تو بہت شاندار تھیں لیکن ان کی زندگیاں دریوزہ گری میں گزر گئیں۔"

حفصہ نے کہا۔ "ابوجعفر! تو بڑا شکی ہے۔ میری زبان سے کسی مرد کی تعریف سن ہی نہیں سکتا۔"

ابوجعفر نے جواب دیا۔ "ہاں اور اس صورت میں تو بالکل ہی نہیں سن سکتا جبکہ وہ مرد دنیاوی اعتبار سے مجھ سے برتر اور افضل بھی ہو۔"

حفصہ نے ابوجعفر کو جلانے کے لیے کہا۔ "ابوجعفر! تو جانتا ہے کہ میں شاعری میں تجھ سے کم نہیں ہوں۔ اگر میرا بس چلتا تو میں بھی تیرے ساتھ چلتی اور عبدالمومن کے دربار میں قصیدہ گوئی میں تیری حریف بنتی۔" پھر خود ہی ہنستے ہوئے بولی۔ "نہیں نہیں، میں تیری حریف ہرگز نہ بنتی بلکہ تو عبدالمومن کی شان میں قصیدہ سنا رہا ہوتا اور میں ابوسعید کا قصیدہ پڑھتی۔"

ابوجعفر حفصہ کی شوخی و شرارت سے اچھی طرح واقف تھا۔ مشتعل ہونے کے بجائے سوگوار سی مسکراہٹ پر قناعت کر لی، بولا۔ "حفصہ! صبر کر شاید وہ دن دور نہیں جب یہ لوگ یہیں غرناطہ میں آجائیں، اس وقت تو انہیں جی بھر کے اپنے قصائد سنا سکے گی۔"

اچانک درختوں سے سرسراہٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دونوں ملے ملے بیٹھے تھے، ذرا کھسک کر دور دور ہو گئے۔ یکایک ایک درخت کی شاخوں میں سے ایک چہرہ نمودار ہوا، مسکراتا، طنز کرتا چہرہ۔ اس نے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "وہ دونوں یہاں موجود ہیں۔ میں نے تو حفصہ کی بو سونگھ لی تھی۔"

ابوجعفر نے اس چہرے کو پہچان لیا تھا۔ یہ اس کے چچا کا بیٹا حاتم تھا اور حاتم بھی اس کے ساتھ ہی عبدالمومن کے دربار میں جانے والا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انار کا پیڑ حاتم، ابوجعفر کے باپ اور دونوں بھائیوں سے بھر گیا۔ ابوجعفر کے باپ نے کہا۔ "ارے تو یہاں چھپا بیٹھا ہے اور میں تجھے معلوم نہیں کہاں کہاں تلاش کر آیا ہوں۔"

حفصہ نے پوچھا۔ "کیا تم لوگ میرے گھر بھی گئے تھے؟"

"ہاں، ہم لوگ وہاں بھی گئے تھے اور وہیں ہمیں معلوم ہوا کہ ابوجعفر اور تم ایک ساتھ وہاں سے نکلے ہو۔"

اس جواب پر ابوجعفر اور حفصہ نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور خوب ہنسے۔

پھر یہ لوگ وہاں سے چل کر قلعہ حسب پہنچے۔ حاتم، ابوجعفر کی شکل دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ حفصہ ابوجعفر کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ابوجعفر کے باپ نے حفصہ سے کہا۔ "حفصہ! تو ابوجعفر کو سمجھاتی کیوں نہیں؟ آخر یہ درباروں سے بھاگتا کیوں ہے؟"

حفصہ نے جواب دیا۔ "میں نے ابوجعفر کو سمجھا دیا ہے۔ اب یہ عبدالمومن کے دربار میں جائے گا اور وہاں ایک شاندار قصیدہ بھی پڑھے گا۔"

ابوجعفر اپنے باپ کے ساتھ کسی کام سے باہر چلا گیا۔ ابوجعفر کے چچازاد بھائی حاتم نے حفصہ سے کہا۔ "بخدا حفصہ! ابوجعفر بڑا خوش قسمت ہے کہ اسے تیری محبت حاصل ہے۔"

حفصہ نے شرارتاً کہا۔ "اور تو بدقسمت ہے کہ تجھے میری محبت حاصل نہیں ہے۔"

حاتم نے جواب دیا۔ "بے شک، تو نے میرے دل کی بات کہہ دی۔"

حفصہ نے کہا۔ "حاتم! حفصہ کو نہ تو سمجھ سکا ہے اور نہ ابوجعفر۔ یہ درست ہے کہ میں ابوجعفر کو بہت پسند کرتی ہوں اور شاید اس سے عشق بھی کرتی ہوں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ میں ابوجعفر کے سوا کسی اور کو پسند ہی نہ کروں گی۔ میرا دل ایک ایسا وسیع گھر ہے جس میں کوئی بھی شخص اس شرط پر داخل ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بھی طرح غیر معمولی، منفرد اور یکتا ہو۔ میرے دل میں معمولی اور غیر اہم شخص کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔"

حاتم نے امید افزا لہجے میں پوچھا۔ "اور میرے بارے میں کیا خیال ہے تیرا؟"

حفصہ نے جواب دیا۔ "تو بڑا بن کے دکھا، پھر دیکھ کہ تو میرے دل میں جگہ پاتا ہے یا نہیں۔"

حاتم نے کہا۔ ''حفصہ! شاعر تو میں بھی ہوں لیکن ابوجعفر جیسا بڑا شاعر نہیں ہوں۔''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''پھر تو میدانِ جنگ کا شہسوار بن جا۔''

حاتم نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ''حفصہ! اگر تیرے دل میں واقعی اتنی گنجائش ہے کہ ابوجعفر کے ساتھ ہی میں بھی رہ سکوں تو میں کسی نہ کسی طرح بڑا آدمی ضرور بن جاؤں گا۔ میں اپنے لیے نہیں تیرے لیے، تیری خاطر بڑا اور اہم آدمی بنوں گا اور اس جدوجہد اور کوشش میں چاہے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔''

حفصہ مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔

ابوجعفر اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ جبل الفتح روانہ ہوگیا۔ اس کا چچازاد بھائی حاتم بھی اس کا ہم سفر تھا۔ ابوجعفر نے راہ میں جہاں بھی قیام کیا، اس کی توجہ ایک شاندار قصیدہ لکھنے ہی کی طرف راغب رہی۔ جو کچھ وہ لکھ چکتا اس کا باپ اسے نہایت تنقیدی نظروں سے دیکھتا اور اس کے بعد ابوجعفر کا باپ قصیدے کے اشعار اپنے بیٹوں کو فخریہ دکھاتا اور کہتا۔ ''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اندلس کا کوئی دوسرا شاعر اتنا شاندار قصیدہ نہیں کہہ سکتا۔ ابوجعفر کوئی مرتبہ حاصل کر کے ہی رہے گا۔''

ابوجعفر کے بھائی بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

ابھی جبل الفتح ایک دن کی مسافت پر تھا۔ ابوجعفر کے باپ نے کہا۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے کہ آج ہی جبل الفتح پہنچ جاؤں۔ میں تو اس وقت تک یہیں اسی جگہ رکا رہوں گا جب تک ابوجعفر اپنا قصیدہ پورا نہ کرلے گا۔ ہاں اگر کسی کو عبدالمومن کی خدمت میں پہنچنے کی جلدی ہو تو وہ بصد شوق ہمیں چھوڑ کر جاسکتا ہے۔''

لیکن ان میں سے ایک بھی پہلے جانے پر رضامند نہ ہوا کیونکہ وہ اس حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف تھے کہ برکتوں کا نزول ہمیشہ جماعتوں ہی کی طرف ہوا کرتا ہے۔

ابوجعفر نے ایک دن اور ایک رات بڑے کرب میں گزارا اور ایک یادگار قصیدہ کہہ لیا۔ اس کا چچازاد بھائی حاتم اس قصیدے کو پڑھ کر ابوجعفر سے کہنے لگا۔ ''اگر تو یہ قصیدہ مجھے دے دے تو میں اس کے عوض اپنی قیمتی سے قیمتی چیز تجھے دے سکتا ہوں۔''

ابوجعفر نے پوچھا۔ ''اس قصیدے سے تجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟''

حاتم نے جواب دیا۔ ''ابوجعفر! اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ اس قصیدے کے ذریعے تو عبدالمومن سے کوئی بلند منصب حاصل کرلے گا تو یہ بلند منصب تجھے مبارک ہو۔ میں تو اس قصیدے کو اپنے نام سے منسوب کر کے حفصہ کے دل پر قبضہ جمانا چاہتا ہوں۔''

ابوجعفر نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''حاتم! تو میرے چچا کا بیٹا ہے، تو حفصہ کے معاملے میں میرا رقیب نہ بن۔ مجھے یہ شعر گوئی کی دولت ہی تو ایسی ملی ہے جس سے میں حفصہ کے دل میں جگہ بنائے ہوئے ہوں۔ تو تلوار کا دھنی ہے، اندلس میں ایسی بہت سی حفصائیں مل جائیں گی جو تیری بہادری اور شہسواری پر اپنے دل نچھاور کرنے کو تیار ہوں گی۔'' پھر نہایت افسوس سے کہا۔ ''حاتم! میں نے غرناطہ چھوڑنے سے پہلے یہی بات حفصہ سے کہی تھی اور اب تجھ سے کہتا ہوں۔ اگر تجھے اس بات پر یقین ہے کہ سورج ہمیشہ مشرق ہی سے نکلے گا تو اس پر بھی یقین رکھ کہ ایک نہ ایک دن میری جان حفصہ پر ہی قربان ہوجائے گی۔''

جبل الفتح میں پورے اندلس سے وفود پہنچ رہے تھے۔ عبدالمومن کے منتظمین نے ان وفود کے لیے ان کے پیشے اور وجہ کمال کے اعتبار سے جگہیں مقرر کی تھیں۔ شاعروں کے لیے علیحدہ جگہ رکھی گئی تھی۔ فنون حربیہ کے ماہرین کو الگ ٹھہرایا گیا تھا اور خطباء کے لیے علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ فقہ اور مذہب کے عالموں کے لیے ایک مخصوص جگہ مقرر کردی گئی تھی۔ فنکار اور بلند پایہ دستکار ایک علیحدہ حصے میں مقیم تھے۔

عبدالمومن کے شاندار دربار میں ہر روز چند وفود باریابی کی اجازت پاتے۔ شعراء اپنا کلام اور خطباء اپنے خطبات سناتے، سورما اپنی داستانِ شجاعت سناتے۔ ہنرمند، فنکار اور دستکار اپنے ہنر اور فن کے کمالات ظاہر کرتے۔ عبدالمومن کی تیز اور جوہر شناس نظریں ذرا سی دیر میں انہیں پرکھ لیتیں۔ آخر ایک دن ابوجعفر کے باپ اور عبدالملک کی باری بھی آگئی۔ یہ اپنے بیٹوں اور بھتیجے کے ساتھ عبدالمومن کے دربار میں باریاب ہوا اور عبدالملک نے اپنے جنگجو بھتیجے اور بیٹوں کا نہایت فصیح و بلیغ لب و لہجے میں عبدالمومن سے تعارف کرایا اور آخر میں ابوجعفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا یہ بیٹا اقلیم سخن کا بادشاہ ہے۔ آج پورے اندلس میں اس کا کوئی حریف نہیں۔''

عبدالمومن نے ابوجعفر کو غور سے دیکھا اور حکم دیا۔ ''کوئی تازہ کلام ہو تو سنا۔''

عبدالملک نے کہا۔ ''اس نے آپ کی شان میں

دورانِ سفر ایک قصیدہ کہا ہے، جو ظاہر ہے بڑی بے اطمینانی اور عجلت میں کہا گیا ہے۔ اس سے میرے بیٹے ابوجعفر کے ملکہ شعری اور کمال سخن گوئی کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔''

عبدالمومن نے اجازت دی۔ ''قصیدہ سنایا جائے۔''

ابوجعفر نے قصیدہ سنانا شروع کر دیا۔

''اے بادشاہ! زمانہ تیری گفتگو کی طرف ہمہ تن گوش ہے۔ تُو ارشاد فرما۔

آج امر و نہی کا اختیار تیرے سوا کسی کو بھی نہیں
تُو ارادہ کر، جو چاہے گا پورا ہوگا
تُو قصد کر، بحر و بر تیرے مفتوح ہو جائیں گے
دریا کی لہریں تیری کثیر فوج کی پامال کی ہوئی مٹی کو بوسہ دیتی ہیں
دریا کا شور گویا تیرے سلام کا جواب ہے
اے بادشاہ! اندلس پر سعادت بلند ہے
کیونکہ تیری حکومت کی خبر یہاں برابر تازہ ہوتی رہتی ہے
طارق ابن زیاد بھی تیرے آگے سرنگوں ہے
اور موسیٰ بن نصیر کو بھی تیری جیسی نصرت حاصل نہ تھی
بلکہ وہ دونوں اندلس میں اس لیے آئے تھے کہ یہاں تیرا داخلہ اس طرح ہو جس طرح بدر کامل ہالے میں داخل ہوتا ہے''

عبدالمومن اس قصیدے سے بہت متاثر ہوا۔ عبدالملک سے پوچھا۔ ''تیرے بیٹوں میں، تیرے اپنے خیال میں کون زیادہ لائق اور بہتر ہے؟ یعنی تو کسے کس پر ترجیح دیتا ہے؟''

عبدالملک نے جواب دیا۔ ''سیدی، محمد اور عبدالرحمٰن آپ کی بارگاہ میں اندلس کے بہادروں اور سپہ سالاروں کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں اور ابوجعفر شعراء کے ساتھ آیا ہے، اب یہ فیصلہ آپ خود فرمائیں گے کہ میرے بیٹوں میں کس کا بہتر ہونا آپ کو محبوب ہے۔''

عبدالمومن نے کہا۔ ''جو شخص جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کے لیے وہی کام آسان ہوتا ہے۔ تیرا بیٹا ابوجعفر اگر جنگجو اور مرد میدان نہیں ہے تو تجھے اس پر افسوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ابوجعفر واقعی میدانِ شعر گوئی کا فرد ہے۔ افسوس تو اس پر کرنا چاہیے جو بے رتبہ، حرماں نصیب اور اپنی فطری صلاحیتوں سے لاعلم اور نابلد ہے۔''

عبدالمومن جب جبل الفتح سے افریقا واپس جانے لگا تو اس نے سید ابوسعید کو غرناطہ کا حکمراں بنا دیا اور بیٹے کو ہدایت کی کہ وہ عبدالملک کے بیٹوں اور بھتیجے کا خاص خیال رکھے۔ ابوسعید نے ابوجعفر کے بھائیوں کو فوجی عہدے عطا کیے اور اس کے چچازاد بھائی کو بھی ملازمت مل گئی۔

جب یہ عہدے تقسیم ہو رہے تھے تو حفصہ اس کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ وہ سب کے سامنے ابوجعفر سے یہ نہیں پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے ابوسعید نے کوئی منصب کیوں نہیں دیا؟ وہ ابوجعفر کی تلاش میں اس کے گھر پہنچی اور مایوس واپس آئی۔ راستے میں ایک جگہ کچھ .... صدائیں سنائی دیں۔ گھڑسوار فوجی راہ گیروں کو ڈنڈوں اور چھڑیوں سے مار مار کر راستے سے ہٹا رہے تھے۔ حفصہ خود ہی کنارے ہٹ گئی۔

کچھ دیر بعد ایک فوجی دستے کے ساتھ ایک نوجوان حفصہ کے پاس سے گزرا۔ حفصہ نے اسے غور سے دیکھا۔ سیاہی مائل گندمی رنگت والے نوجوان نے اپنا گھوڑا روک لیا۔ اس نے بھی حفصہ کو بڑے اشتیاق سے دیکھا۔ اس نے اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ''اس عورت کو ذرا میرے قریب تو لانا۔''

کسی دوسرے سپاہی نے عرض کیا۔ ''سیدی! یہ حفصہ ہے، اندلس کی سب سے بڑی شاعرہ، ابوجعفر کی محبوبہ۔''

اس نے ذرا تند لہجے میں دوبارہ حکم دیا۔ ''میں اس کا تعارف نہیں چاہ رہا ہوں، میں کہتا ہوں اسے میرے قریب لایا جائے۔ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

حفصہ آگے بڑھ چکی تھی، سپاہی نے اپنا گھوڑا اس کے آگے لے جا کر روک دیا اور بولا۔ ''غرناطہ کی بے بدل شاعرہ! تجھے سیدی ابوسعید یاد فرما رہے ہیں۔''

سیدی ابوسعید کا نام سن کر حفصہ نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر بے رخی سے پوچھا۔ ''وہ مجھے کیوں بلا رہا ہے؟''

سپاہی نے جواب دیا۔ ''شاید تجھ سے تیرا کلام سنیں۔''

حفصہ نے سپاہی کو جھڑک دیا، بولی۔ ''جا اپنے سیدی سے کہہ دے کہ حفصہ ابھی اتنی ارزاں نہیں ہوئی ہے کہ تجھے سرِراہ گزرتے ہوئے اپنے اشعار سنانے لگ جائے۔''

ابوسعید اپنا گھوڑا بھگاتا ہوا بالکل حفصہ کے قریب لے آیا، مسکراتا ہوا بولا۔ ''اے گلستانِ غرناطہ کی قمری! میں نے تیرا بڑا شہرہ سنا ہے۔ میں تیرے آتشیں کلام سے اپنے دل میں آگ لگانا چاہتا ہوں۔''

حفصہ نے منہ بنا کر طنز کیا۔ ''تو میرے کلام سے اپنے دل میں آگ لگانا چاہتا ہے لیکن تو نے ابوجعفر کو اپنی مصاحبت بھی نہ بخشی حالانکہ وہ اپنے عہد اور اپنے ملک کا سب سے بڑا شاعر ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تیرے باپ نے اس کے قصیدے کو بطورِ خاص سراہا تھا۔''

ابوسعید نے بڑے احترام سے جواب دیا۔ ''لیکن

سنتا ہوں تیری بات ہی کچھ اور ہے۔"

حفصہ نے کہا۔ "ہاں میری تو بات ہی کچھ اور ہے کیونکہ میں عورت ہوں اور وہ بھی ملیح اور تیکھے خدوخال والی۔"

ابوسعید نے کھسیا کر جواب دیا۔ "تو کچھ بھی کہہ لے، میں تیری بات کا برا نہیں مانوں گا کیونکہ تو اس ملک کی مایہ ناز شاعرہ ہے اور ایک حکمران ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں تیری ناز برداری کروں۔"

حفصہ نے بڑی بے مروتی سے کہا۔ "میں کسی کی ناز برداری کے لالچ میں شاعری نہیں کرتی اور بادشاہوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ عامیوں کی طرح سرِراہ گزر باتیں کریں۔"

حفصہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی اور ابوسعید اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

حفصہ درختوں کی آڑ میں غائب ہوگئی۔ ابوسعید نے خود سے کہا۔ "حفصہ! میں دیکھوں گا تو مجھ سے کب تک دور رہے گی۔ تجھے ایک نہ ایک دن میرے پاس آنا ہی پڑے گا۔"

ابوسعید اور حفصہ کی سرِراہ نوک جھوک کا بڑا چرچا ہوا، غرناطہ کے مبالغہ گو حضرات نے اس واقعے کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ لوگوں نے یہاں تک کہنا شروع کردیا کہ حفصہ اور ابوسعید میں کچھ عہد و پیمان ہوگئے ہیں۔ حفصہ اپنے محبوب اور عاشق ابوجعفر کو کوئی اعلیٰ منصب دلانے والی ہے اور ابوسعید نے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ اگر حفصہ ابوسعید پر مہربان ہوجائے تو وہ اس کے عاشق ابوجعفر کو کوئی بڑا منصب دے دے گا۔

جب یہ باتیں جعفر تک پہنچیں تو وہ بہت بے چین ہوگیا۔ وہ غصے میں حفصہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت حفصہ اپنے مکان کے پیچھے انگوروں کی بیلوں کے سائے میں بیٹھی، ابوسعید سے اپنی ملاقات اور گفتگو کو اشعار میں موزوں کرکے بڑی سریلی دھن میں گا رہی تھی۔

"آج مجھے سرِراہ عبدالمومن کا بیٹا ابوسعید مل گیا
وہ ابوسعید جو غرناطہ کا حکمراں ہے اور جس کا چہرہ
سیاہی مائل گندم گوں ہے
ابوسعید نے اپنے سپاہیوں کی مدد سے مجھے روک لیا
اور میری شعر گوئی کی تعریفیں کرنے لگا
لیکن مجھے اس کی مدح سرائی بہت بری لگی۔ میں نے
کہا اے ابوسعید!
تو وہی ہے جس نے ابوجعفر جیسے باکمال شاعر کو کوئی
منصب نہیں دیا
ابوسعید! تو میری شعر گوئی کا مداح اور قصیدہ خواں ہے
حالانکہ دنیا ابوجعفر کی مداح ہے
میں حفصہ ہوں اور مجھے خدا نے اتنی قدرت دی ہے
کہ اپنے مخاطب کے دل میں اتر کر اس کے بھید جانوں
اے ابوسعید! تو میری تعریفیں اس لیے کرتا ہے کہ
میں عورت ہوں، ایک ایسی عورت جو ملیح اور تیکھے خدوخال
رکھتی ہے
اور جو اپنے عہد اور ملک کی بہت بڑی شاعرہ بھی ہے
ابوسعید! اگر تو ابوجعفر کے ساتھ انصاف کرے تو میں
تیری دل سے عزت کروں گی
کیونکہ تیری عادات کے برعکس تیرا سیاہی مائل گندم
گوں چہرہ مجھے بھی بھلا لگتا ہے"

ابوجعفر نے غصے میں کہا۔ "تو تیرے اور ابوسعید کے بارے میں جو افواہ گشت کررہی ہے، وہ درست ہے؟"

حفصہ نے گھبرا کر ابوجعفر کو دیکھا اور کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ "جو مرتبہ تو اپنے قصیدے سے نہیں حاصل کرسکا تھا، وہ اب تو میرے طنز و طعن کے نشتروں سے حاصل کرلے گا۔"

ابوجعفر نے ترش لہجے میں پوچھا۔ "حفصہ! تُو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

حفصہ ابوجعفر کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی، ادھر ادھر دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگور کی بیلوں کے گھنے سائے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ "ابوجعفر! تو اگر اب بھی میرا شکریہ نہ ادا کرے تو یہ تیری ناسپاسی ہوگی، تو میرے لب و رخسار کے بوسے لے، کیونکہ میرے ہونٹوں نے وہ کام انجام دیا ہے کہ تیرا سارا علم و فضل بھی اسے انجام دینے سے قاصر تھا۔"

ابوجعفر مطمئن نہیں ہو رہا تھا، پوچھا۔ "ابوسعید سے تیرا کوئی عہد و پیمان ہوا ہے؟"

حفصہ نے پوچھا۔ "کیسا عہد و پیمان؟ سرِراہ کس سے عہد و پیمان ہوتے ہیں؟"

ابوجعفر نے ضدی بچے کی طرح کہا۔ "تجھے ابوسعید سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

حفصہ نے حیرت سے پوچھا۔ "آخر کیوں؟ وہ بادشاہ ہے اور اس نے مجھے روک کر زبردستی بات کرنے کی کوشش کی تھی۔"

ابوجعفر نے ضدی انداز میں کہا۔ "وہ سب کچھ درست ہے لیکن میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تو اس سے باتیں کرے۔"

حفصہ نے بڑے جذباتی انداز میں اس کا چہرہ اپنے

منہ کی طرف کرلیا۔ بولی۔ ''ابوجعفر! یہ تو کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ مجھے میرے علم و فضل اور اعلیٰ درجے کی شعر گوئی نے عام عورتوں کی سطح سے اونچا کر دیا ہے اور تو مجھ سے ایک ایسی عورت بننے کی توقع کر رہا ہے جو نہ تیرے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے اور نہ میرے لیے وجہِ افتخار۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''تو ایک بات تو میری بھی سن لے، میں ابوسعید کی طرف سے پیش کیا جانے والا کوئی بھی ایسا منصب کبھی نہ قبول کروں گا، جس کی سفارش تو نے کی ہو یا وہ مجھے تیرے طفیل مل رہا ہو۔''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''تیری مرضی۔ تو میرا دوست ہے اور دوست، دوست کے کام آتا ہے۔ میں بھی تیرے کام آتی رہوں گی۔ یہ الگ بات ہے کہ تو میری اعانت گوارا نہ کرے۔''

''حفصہ!'' ابوجعفر نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ جس طرح تو اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اسی طرح میری اس بات پر بھی یقین رکھ کہ ایک نہ ایک دن تو میری جان لے کر رہے گی۔''

حفصہ شوخی سے مسکرانے لگی، بولی۔ ''ابوجعفر..... میری جان! فضول واہموں کو دل سے نکال دے اور آ ہم دونوں پورے خلوص اور جذبوں سے ایک دوسرے سے پیوست وہم آغوش ہو جائیں..... بالکل اسی طرح، جس طرح انگور کی بیلیں آپس میں دست بہ گریباں ہیں۔''

ابوجعفر نے حفصہ کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور حفصہ بھی اس کے سینے سے یوں چمٹ گئی گویا وہ اس کے وجود میں حلول کر جانے کی کوشش کر رہی ہو۔ بوسوں کی آوازوں میں دلوں کے گلے اور واہمے بھاپ کی طرح اڑ رہے تھے۔ ابوجعفر کے دل کو سکون آ گیا کہ حفصہ صرف اسی کی ہے اور اسی کی رہے گی۔

☆☆☆

ابوجعفر کے بھائی محمد اور چچازاد بھائی حاتم نے اسے مطلع کیا کہ ابوسعید اسے یاد کر رہا ہے۔ ابوجعفر نے کئی بار تو ان دونوں کو ٹال دیا لیکن جب اسے یہ پیغام دیا گیا کہ اگر وہ بدستور ابوسعید کے حکم کو ٹالتا رہا تو اس عدول حکمی کا کوئی خطرناک نتیجہ نکل سکتا ہے۔ حاتم نے کہا۔ ''ابوجعفر! تو بادشاہ کے پاس نہ جا کے ہم سب کو سخت نقصان پہنچائے گا، تجھے بادشاہ سے مل لینا چاہیے۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''میں اس سے کیوں نہیں ملنا چاہتا تو جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جب ہم دونوں آمنے سامنے ہوں تو آپس میں سخت کلامی ہو جائے اور میں ابوسعید کو جی بھر کے مغلظات سنا دوں۔''

حاتم نے کہا۔ ''میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تو حفصہ کی خاطر بادشاہ کی دشمنی مول لے لے۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''میں حفصہ کی خاطر بادشاہ تو کیا دنیا بھر کی دشمنی مول لے سکتا ہوں اور میری غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ حفصہ کو کوئی اور بھی میری ہی نظر سے دیکھے اور میری ہی طرح چاہے۔''

حاتم ہنس دیا، بولا۔ ''سادہ لوح ابوجعفر! تیری اس احمقانہ بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ میں تیرے عشق کی قدر کرتا ہوں لیکن کیا تو سمجھتا ہے کہ یہی عشق کی آگ حفصہ کے دل میں بھی روشن ہو گی؟''

''ہاں اور میرا اس طرح سوچنا غلط بھی نہیں ہے۔''

ابوجعفر نے حاتم کو ڈانٹ دیا، بولا۔ ''حاتم! تو میرے چچا کا بیٹا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ تیرے ساتھ بھی معاندانہ سلوک کروں۔''

حاتم نے پوچھا۔ ''یہ معاندانہ سلوک کیا معنی رکھتا ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''آج اگر مجھے یہ باور کرا دیا جائے کہ تو بھی حفصہ میں دلچسپی لینے لگا ہے تو میں تیرے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ تو زندگی سے عاجز آ جائے۔''

حاتم نے کہا۔ ''کوئی اور کیا یقین دلائے گا، میں خود تجھے یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں حفصہ کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں مجھے حفصہ سے اس کے کلام اور اس کی حسین شکل وصورت کی وجہ سے عشق سا ہو گیا ہے۔''

ابوجعفر نے خونخوار نظروں سے حاتم کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آج سے میرے تیرے تعلقات ختم۔ اب تو میری شکل تک نہ دیکھے گا۔ تو نے حفصہ سے عشق کا اظہار کر کے میرے دل میں نشتر اتار دیے ہیں۔ اب میں تجھے ہمیشہ اپنا دشمن سمجھوں گا۔''

ابوجعفر یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

باہر دو سپاہی اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان دونوں نے اپنی تلواریں نیام سے نکال لیں۔ اس کے بعد بادشاہ کا حکم سنایا۔

''ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ابوجعفر کو زندہ یا مردہ بادشاہ کے روبرو حاضر کر دیں اگر تو سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوا تو ہم طاقت سے لے جائیں گے۔''

ابوجعفر نے اپنے عزیزوں کو پکارا لیکن کسی نے کوئی

جواب تک نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اس کے بھائی محمد نے اسے سمجھایا۔ ''ابوجعفر! ضد نہ کر۔ بادشاہ طاقتور ہے اور اس نے جو حکم دیا ہے اس کی اسی طرح تعمیل بھی کرا سکتا ہے۔''

ابوجعفر بے بس ہو گیا، سپاہیوں سے کہا۔ ''دوستو! اپنی تلواریں نیام میں ڈال لو۔ ابوجعفر تمہارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔''

دونوں سپاہیوں نے ابوجعفر کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اسے ابوسعید کے پاس لیے چلے گئے۔

اس وقت ابوسعید اپنے محل کے اس حصے میں بیٹھا تھا، جہاں سے دریائے شنیل کو لہراتے بل کھاتے دیکھا جا سکتا تھا اور قصر کے نیچے سبزہ زاروں کے مناظر سے خوب اچھی طرح لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔ ابوسعید نے ابوجعفر کو اس حصے میں بلوالیا اور جب ابوجعفر اس کے سامنے پہنچا تو ابوسعید احتراماً کھڑا ہو گیا، پوچھا ''ابوجعفر! میں تیری دل سے عزت کرتا ہوں اور مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تو میری عزت نہیں کرتا۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''سعیدی! جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرے قصیدے میں ایک شعر بھی ایسا نہ تھا، جو بادشاہ کے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہو تو مجھے اپنی ذات اور شاعری سے سخت نفرت ہو گئی اور یہی بیزاری مجھے بادشاہ سے دور بھگا رہی تھی۔''

ابوسعید نے کہا۔ ''ابوجعفر! ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ تیرے کام کا بھی ایک وقت مقرر تھا۔ کچھ جانتا ہے کہ اس وقت میں نے تجھے کیوں بلایا تھا؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''سیدی خوب جانتے ہیں کہ یہ عاجز علم غیب نہیں جانتا اگر جانتا ہوتا تو بادشاہ اس قسم کے سوالات ہی نہ کرتا۔''

''پھر بھی اپنے ذہن پر زور دے کہ میں تجھے کیوں بلا سکتا ہوں۔''

ابوجعفر نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''حضور والا! میں نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی، بس یہ سوچ کر میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے ہوں کہ دنیا آج تک نہ تو کسی کے کام آئی ہے اور نہ ہی میرے کام آ سکتی ہے۔''

ابوسعید نے کہا۔ ''ابوجعفر! تو اپنے عبرو وعظ کو تو بند کر۔ اگر مجھے یہ باتیں سننی ہوتیں تو آج میں بادشاہ نہ ہوتا کچھ اور ہوتا۔ تو شاید میری باتیں دلچسپی سے نہیں سن رہا۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''میں بادشاہ کی باتیں پوری دلچسپی سے سن رہا ہوں۔''

ابوسعید نے پوچھا۔ ''بول تو کیا بننا پسند کرے گا؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں کیونکہ شعر گوئی کے کیف نے مجھے بے نیاز کر دیا ہے۔''

ابوسعید کو غصہ آ گیا، بولا۔ ''تو جھوٹا ہے۔ تو نے میرے باپ کو قصیدہ کسی منصب کی وصولیابی کے لالچ ہی میں سنایا تھا اور آج تو خود کو بے نیاز ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

ابوجعفر تو جھوٹا ہے جیسے فقرے پر غصے سے کانپنے لگا، بولا۔ ''میں کوئی منصب بھی قبول نہ کروں گا کیونکہ میں حضورِ والا کی نظر میں جھوٹا ہوں اور جھوٹوں کو شاہی دربار میں نہیں رکھنا چاہیے۔''

ابوسعید نے کہا۔ ''اب زیادہ باتوں کا وقت نہیں رہا۔ میں نے تجھے یہاں اس لیے بلایا ہے کہ میں تجھے اپنا وزیر بنانا چاہتا ہوں۔''

ابوجعفر چونک کر بادشاہ کا منہ دیکھنے لگا، گھبراہٹ میں کہا۔ ''وزیر، وزیر اعظم یعنی کیا واقعی؟''

ابوسعید نے کہا۔ ''تجھے کل سے اپنا منصب سنبھال لینا ہے، سمجھا یا نہیں سمجھا؟''

ابوجعفر نے بل کھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اتنی جلدی میں اپنے منصب کو کس طرح سنبھال سکتا ہوں؟''

ابوسعید نے جواب دیا۔ ''میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔ تو میری حکومت کا وزیر ہے، یہ بات میں جانتا ہوں اور یہی بات تجھے بھی یاد رکھنی ہے۔'' پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ابوجعفر! میرے لیے یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ حفصہ جیسی شاعرہ اور ملیح اور تیکھے خدوخال کی دوشیزہ یہ طعنہ دے کہ میں نے تیرے علم و فضل اور شعر گوئی کے کمال کی کوئی قدر نہ کی۔ بخدا میں تجھے اپنا وزیر نہ بناؤں تو اس لائق ہی نہ رہوں گا کہ حفصہ سے دوبارہ آنکھ تک ملا سکوں۔ ابوجعفر! تو خود ہی بتا کیا کسی شخص کو اتنی ہمت عطا کی گئی ہے کہ حفصہ اس سے کوئی بات کہے اور وہ شخص اسے ٹال جائے۔ واللہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے۔''

ابوجعفر نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''میں وزیر بننے کے لائق نہیں ہوں۔''

ابوسعید نے جواب دیا۔ ''اور میں بھی مجبور ہوں کہ تجھے جبراً وزیر بنا دوں۔ ابوجعفر! تو عقل سے کام لے اور اس منصب کو بخوشی قبول کر لے ورنہ تجھے خردمندوں کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے حکمران کے عناد سے بچو کیونکہ اس کے عناد میں ذلت، رسوائی اور جان کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے اور اس کا

عناد اس تلوار جیسا ہوتا ہے جو ہر وقت سر پر معلق رہتی ہو۔"

ابوجعفر بے بس ہو گیا اور مجبوراً وزارت کے منصب کو قبول کر لیا۔

☆☆☆

جب یہ خبر عام ہوگئی کہ ابوجعفر کو اس کی لیاقت اور شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر ابوسعید نے اپنا وزیر بنالیا ہے تو ہر طرف سے ابوجعفر اور اس کے گھر والوں کو مبارکبادیں ملنے لگیں۔ ابوجعفر کے باپ عبدالملک نے اس خوشی میں اپنے جاننے والوں اور دوستوں کی دعوت کردی۔ ابوجعفر کے خاندانی لیموؤں کے باغ میں شاندار اجتماع ہوا۔ افریقی چادروں اور تیونسی کرتوں کی رنگارنگی نے موسم بہار کا سماں پیدا کردیا تھا۔ ہنستے مسکراتے چہرے عبدالملک اور اس کے بیٹوں کو شاندار لفظوں میں مبارکباد دیتے اور پھر آپس میں باتیں کرنے لگتے۔

باغ کے ایک حصے میں عورتوں کا اجتماع تھا۔ اس میں ہر عمر کی عورتیں جمع خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ بعض ادھیڑ عمر اور بوڑھی خواتین خاندانی اور ملکی معاملات پر مباحثے کر رہی تھیں۔ حسین اور نوجوان عورتیں اس فکر میں تھیں کہ کسی طرح ابوجعفر سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرلیا جائے اور اسے اپنی طرف ملتفت کرایا جائے۔ انہیں حفصہ کا قصہ معلوم تھا اور خوب اچھی طرح جانتی تھیں کہ ابوجعفر کو حفصہ سے عشق ہے لیکن وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آرہی تھیں۔

ابوجعفر جب کسی ضرورت سے ان خواتین کے پاس سے گزرا تو چند لڑکیوں نے اپنی شوخ اداؤں سے ابوجعفر کو اپنی طرف متوجہ کرہی لیا۔ ان میں ایک لڑکی لبابہ سب سے زیادہ شوخ تھی۔ اس کا رنگ ابوسعید کی طرح سیاہی مائل گندمی تھا، اس نے ابوجعفر کو مخاطب کیے بغیر کہا۔ "لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ ملک کے ایک بڑے شاعر کو وزیر بنادیا گیا ہے لیکن میں ملول ہوں کہ اس طرح میرے پسندیدہ اور قوم کے ایک عظیم شاعر کی شاعری کو قتل کردینے کا سامان کردیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کون سچا ہے، میں یا لوگ؟"

ابوجعفر اس کے قریب پہنچا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "تیرا خیال صحیح ہے، میں نے عہدۂ وزارت بخوشی قبول نہیں کیا، بلکہ یہ مجھے مجبوراً سونپا گیا ہے۔ اگر تو کہے تو میں اس منصب سے کنارہ کشی اختیار کرلوں؟"

لبابہ نے طنزاً کہا۔ "میں نے تو یہ سنا ہے کہ تُو نے یہ منصب کسی کی خواہش کے احترام میں قبول کیا ہے اور اب اگر تو میری خواہش پر اس منصبِ جلیلہ کو چھوڑ دے گا تو میں اس پر ہمیشہ حیران اور سرگرداں رہوں گی کہ میری قوم کا اتنا بڑا شاعر اپنی ذاتی کوئی رائے نہیں رکھتا، ایک کی رائے پر تو ترقی اور اقبال کے زینوں پر چڑھنا شروع کرتا ہے اور دوسری کی خواہش پر نیچے اتر آتا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

ابوجعفر لبابہ کی دلچسپ اور مدلل باتوں سے مسحور ہوگیا، اس نے کہا۔ "اگر میں بھول نہیں رہا ہوں تو تیرا نام لبابہ ہے نا؟"

لبابہ نے جواب دیا۔ "ہاں میرا نام لبابہ ہے اور میں عنسی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں، تو خود بھی عنسی ہے۔"

ابوجعفر نے کہا۔ "تیری باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ کیا تو مجھے موقع دے گی کہ میں تجھ سے علیحدگی میں چند باتیں کرسکوں؟"

لبابہ نے جواب دیا۔ "بالکل۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں لوگوں کے شور وغل سے دور لیموؤں کے اس جھنڈ میں چلے گئے جس کے آر پار کم ہی دکھائی دیتا تھا۔ دوسری لڑکیاں رشک وحسد سے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

لیموؤں کا یہ کنج ترش خوشبو میں بسا ہوا تھا اور شاخوں کے کانٹے ان کے دامن پکڑ رہے تھے۔

لبابہ نے کہا۔ "میں تو ہمیشہ اس بات پر نازاں رہتی تھی کہ میری قوم میں اتنا بڑا شاعر پیدا ہوگیا لیکن پھر جب بھی میں نے یہ سنا کہ حفصہ نے تجھ پر سحر کردیا ہے تو میں سب سے زیادہ ملول ہوجاتی تھی۔"

ابوجعفر نے کہا۔ "یہ تُو بار بار یا تو حفصہ کا نام لیتی ہے یا پھر اشارتاً اس کا ذکر کر جاتی ہے۔ آخر کیوں؟"

لبابہ نے جواب دیا۔ "میں حفصہ سے سب سے زیادہ حسد رکھتی ہوں اور اس کے حسد میں، میں نے شاعری بھی شروع کردی ہے۔ میرا خیال ہے اگر میں مشقِ سخن جاری رکھوں گی تو ایک نہ ایک دن حفصہ کی مدمقابل ضرور ثابت ہوں گی یا پھر اس سے بڑھ بھی سکتی ہوں۔"

ابوجعفر نے کہا۔ "ذرا اپنے چند شعر سنانا تو، میں بھی تو دیکھوں کہ حفصہ کا مقابلہ کرنے والی خود کتنی بڑی شاعرہ ہے۔"

لبابہ نے جواب دیا۔ "ابھی میں اتنی بڑی شاعرہ تو نہیں ہوں کہ تجھے فخریہ اپنے اشعار سنا سکوں لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر تو ان پر اصلاح دے دے گا تو یہ اشعار اپنے معنی ومطالب اور فن کی بلندی تک پہنچ جائیں گے۔"

ابوجعفر نے کہا۔ "اچھا اب تو اپنے اشعار سنا۔"

لبابہ نے شرم سے نظریں جھکالیں اور اشعار سنانے لگی۔ "جب تو اپنے ہنر میں یکتائے زمانہ ہے تو پھر تو اتنا

سریع الحصول کیوں ہو گیا ہے؟ لوگ حفصہ کا نام تیرے نام
کے ساتھ لیتے ہیں
وہ حفصہ جس کے باپ کا نام حاجی ہے اور جو اپنے
خاندان کی نسبت سے رکوبیہ کہلاتی ہے
بے شرموں اور بے حیاؤں پر خدا کی لعنت
کہتی ہوں حفصہ بڑی آزاد خیال اور آزاد خصال ہے
وہ اپنی خواہشات کی غلام ہے
وہ اپنے دل کو وسیع مہمان خانہ کہتی ہے جس میں ہر وہ
شخص رہ سکتا ہے جو کسی نہ کسی طرح کا کمال رکھتا ہو
لیکن میں کہتی ہوں کہ اس مہمان خانے کو قحبہ خانہ
کیوں نہ کہا جائے
ایک شریف عورت کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ خود کو
اتنا ارزاں کرے

اے میری قوم کے عظیم شاعر ابو جعفر! میں نے سنا ہے
کہ درخت اپنے پھل سے اور آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا
جاتا ہے تو خدا کے لیے حفصہ کے دار سے مت واپس لوٹ
خدا مجھے توفیق دے، میں حفصہ کے پاس رسول اللہؐ
کی ایک حدیث لکھ کر تحفے میں بھیجوں گی
اور وہ حدیث ہے جس کے پاس حیا نہیں اس کے
پاس ایمان نہیں"

ابو جعفر نے کہا۔ "بڑا زوردار کلام ہے تو حفصہ کے
پاس یہ حدیث فوراً لکھ کر بھیج دے۔"

لبابہ نے شرما کر کہا۔ "کیا میرے کلام پر تو اصلاح
نہیں کرے گا؟"

ابو جعفر نے جواب دیا۔ "اس میں اصلاح کی گنجائش
ہی نہیں۔"

لبابہ نے کہا۔ "ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کر، میں فن
شعر گوئی میں بالکل نو آموز طالب علم ہوں۔"

ابو جعفر نے جواب دیا۔ "لیکن کچھ لوگ وہبی ہوتے
ہیں اور تو بھی شاعری میں وہبی ہے۔"

لبابہ بہت خوش تھی۔ اس کا خیال تھا اس نے ابو جعفر کا
دل جیت لیا ہے، بولی۔ "میں چاہتی ہوں تو بھی کبھی میرے گھر
بھی قدم رنجہ فرماتا رہ اور مجھے بھی اپنی ہم نشینی کا موقع دے۔"

ابو جعفر نے کہا۔ "تیری جودت طبع اور شیریں کلامی کا
اگر کوئی ایک بار زخم کھالے تو پھر ممکن نہیں کہ وہ تجھے زندگی بھر
بھلا سکے اور اس پر مستزاد یہ کہ تیرے چہرے کی ملاحت ایسی
ہے جیسے لذیذ کھانوں میں نمک کی مناسب ترین مقدار۔"

ابو جعفر نے لبابہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہتھیلی
کی پشت کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ "اس کے باوجود کہ مجھے
حفصہ نے بری طرح گھائل کر رکھا ہے، تیری ہم نشینی اور کرم
فرمائی میرے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ اگر تو اجازت
دے تو میں کبھی کبھی تیری معطر اور پیار بھرے ہونٹوں کے گھنے سائے
میں سکون کی سانسیں لے لیا کروں۔"

لبابہ نے جواب دیا۔ "تو اگر پسند کرے تو یہ ہونٹ ہمیشہ
تجھے مستقل مل سکتے ہیں۔"

ابو جعفر نے لبابہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھا،
پھر کہا۔ "میری فطرت میں سیماب جیسی بے قراری ہے اور
میں کسی بھی چیز سے بہت جلد اکتا جاتا ہوں۔ اگر تو یہ چاہتی
ہے کہ میں زندگی بھر تجھ سے سیر نہ ہو سکوں تو ضروری ہے کہ تو
مجھ سے گاہ بگاہ ملتی رہ۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ ملاقات سے ہم
دونوں ہمیشہ تشنگی محسوس کرتے رہیں گے اور ہماری محبتیں
ہمیشہ جوان اور تر و تازہ رہیں گی لیکن جس دن بھی ہم دونوں
نے ایک دوسرے کو مستقلاً مسلط کر لیا، ہماری محبت، ہمارے
جذبے اور ہمارے جذبوں کی شدتیں اسی دن مر جائیں گی۔"

لبابہ نے کہا۔ "لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟ کیا ہمارا
معاشرہ اور ہماری قومی زندگی اس نوع کے تعلق کو برداشت
کر سکیں گے؟"

"نہ برداشت کریں لیکن لبابہ مشکل تو یہی ہے کہ میں
اس معاشرے کا آدمی نہیں ہوں۔ کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ حفصہ
میرے لیے ناممکن ہے اور میں اسے حاصل نہیں کر سکتا؟ یہ
غلط ہے۔ وہ میرے لیے کبھی بھی ناممکن نہیں رہی لیکن افسوس
کہ میں اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ حفصہ کی طبیعت بھی میرے
ہی جیسی ہے، وہ خود بھی مجھے نہیں حاصل کرنا چاہتی۔ ہم
دونوں عشق کی دھیمی دھیمی آگ میں سلگتے رہنا چاہتے ہیں۔"

لبابہ ابھی جواب دینے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ
لیموؤں کے کنج میں ایک ادھیڑ عمر عورت داخل ہوئی اور
ابو جعفر کو ایک پرچہ دیتے ہوئے بولی۔ "حفصہ آئی تھی اور یہ
پرچہ دے کر چلی گئی۔"

ابو جعفر نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے پرچہ
لے لیا اور اسے پڑھنے لگا۔
"کہاں گیا میرا وہ قول کہ تو نے سیاہی مائل گندم گوں شخص کی
مخالفت کی تھی
اب میں نے یہ سنا ہے کہ تو لیموؤں کے جھنڈ میں جس ذات
سے ہمکلام ہے اور
دونوں نشہ آور لفظوں کے تبادلے سے وہ لذت حاصل
کرنے میں مشغول ہیں

چاروں جسموں کے اتصال ہی سے حاصل ہوا کرتی ہے
اے ابوجعفر! میں نے سنا ہے کہ اس وقت تو جس کے
عشق کا دم بھر رہا ہے
اس کا رنگ سیاہ ہے، بالکل سیاہ رات کی طرح
کیا تو نہیں جانتا کہ رات کی تاریکی میں حسن کی
ساری ادائیں
چھپ جایا کرتی ہیں
اس کی تاریکی میں نہ تو اپنے محبوب کا مسکراتا چہرہ ہی
دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی
وہ شرم و حیا اور آسودگی، جو بعد وصال محبوب کے چہرے
پر نظر آتی ہے
اب میں تجھ سے کیا شکایت کروں، تو نے جس کلام سے
مجھے رلایا تھا
آج تو خود اس میں مبتلا ہے، خدا تیرا انجام بخیر کرے۔"

ابوجعفر کی نظر میں دنیا اندھیری ہو گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ لبابہ نے اس کے ہاتھ سے پرچہ لے لیا اور اسے پڑھنے لگی۔ اسے حفصہ پر بڑا غصہ آیا۔ خط مسل کر ایک طرف پھینک دیا، بولی۔ "شیطان کی بچی! تیرے اعمال خود رات کی سیاہی کی طرح ہیں۔ اگر اس وقت تو میرے سامنے ہوتی تو میں تیرا منہ نوچ لیتی اور تیرے روشن اور گورے چہرے پر چراغ کی کالک مل دیتی۔"

ابوجعفر نے جلدی سے حفصہ کا خط اٹھا کر سینے سے لگا لیا، بولا۔ "لبابہ! تو خدا کے لیے خاموش ہو جا۔ میں حفصہ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ اگر تو اپنے دل میں حفصہ کے لیے محبت نہیں رکھ سکتی تو مجھ سے دوری اختیار کر، کیونکہ میرے دل میں حفصہ کا دوست ہی جگہ حاصل کر سکتا ہے۔"

لبابہ بگڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ "ابوجعفر! میں ایسی مزید ہتک نہیں برداشت کر سکتی۔"

وہ پیر پٹختی ہوئی چلی گئی اور ابوجعفر اس کی پروا کیے بغیر حفصہ کی تلاش میں نکل گیا۔

دریائے ڈارو نہایت وقار سے لہراتا، بل کھاتا اپنے مدغل کی طرف بہا چلا جا رہا تھا۔ ابوجعفر پریشان اور دل شکستہ، حفصہ کو ادھر ادھر تلاش کر رہا تھا۔ دور تک گیہوں کی تیار فصل کھڑی تھی۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر اکا دکا آدمی آ جا رہے تھے۔ ابوجعفر سیدھا حفصہ کے پاس پہنچا، وہ اپنے باغ میں بے فکری سے ٹہل رہی تھی۔

ابوجعفر نے دور ہی سے آواز دی۔ "حفصہ! دیکھ، میں تجھے منانے آیا ہوں۔ آخر تجھے آج یہ ہو کیا گیا تھا کہ تو مجھ سے ملے بغیر ہی چلی آئی۔"

حفصہ نے جواب دیا۔ "ابوجعفر! پہلے تو اپنے دل سے رشک و حسد کو نکال دے، اس کے بعد کوئی بات کر سکتی ہوں۔"

ابوجعفر اس کے قریب پہنچ گیا، بولا۔ "کیسا رشک و حسد؟ میرے دل میں نہ تو رشک ہے نہ حسد، آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

حفصہ نے کہا۔ "میں تجھے مبارک باد دینے گئی تھی کہ ابوسعید نے تجھے اپنا وزیر بنایا لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تو کسی کالی کلوٹی لڑکی سے کیوڑوں کے کنج میں بیٹھا پیار و محبت کی باتیں کر رہا ہے تو میں مبارک باد دیے بغیر ہی واپس چلی آئی کیونکہ میں یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ میری موجودگی میں کوئی اور لڑکی تجھ پر قبضہ جمالے۔"

ابوجعفر ہنسنے لگا، بولا۔ "حفصہ! میں تجھے کس طرح یقین دلاؤں کہ میرے دل پر کسی اور لڑکی کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔ میرے دل میں تو ہے اور بس تو۔ آخر میں یہ بات کتنی بار دہراؤں حفصہ کہ جس طرح تجھے یہ معلوم ہے کہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا مقدر ہے، اسی طرح تو اس پر بھی یقین رکھ کہ میری جان کسی نہ کسی دن تجھ پر قربان ہو جائے گی۔"

حفصہ نے منہ پھلائے رکھا، بولی۔ "تو دعوے تو بڑے کرتا ہے لیکن دوسری عورتوں اور لڑکیوں سے عشق و محبت لڑانے سے باز بھی نہیں آتا۔ ابوجعفر! میں سب کچھ برداشت کر لوں گی لیکن کسی اور لڑکی یا عورت کو تیرے پہلو میں نہیں دیکھ سکتی۔"

ابوجعفر بڑی دیر تک حفصہ کو منانے کی کوشش کرتا رہا۔ حفصہ کے گھر میں شور و غل ہو رہا تھا اور عورتوں اور مردوں کی ملی جلی تیز تیز آوازیں باغ کے اندر تک پہنچ رہی تھیں۔ ابوجعفر نے پوچھا۔ "یہ تیرے گھر میں جھگڑا کون کر رہا ہے؟"

حفصہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "جھگڑے کس گھر میں نہیں ہوتے اور مسلم گھرانے تو آپس میں لڑنے کے لیے مشہور ہیں۔"

ابوجعفر نے کہا۔ "تو ٹھیک کہتی ہے، لیکن پھر بھی کچھ پتا تو چلے؟"

حفصہ نے بڑی مایوسی اور افسردگی سے ابوجعفر کو دیکھا، بولی۔ "شاید تو یقین نہیں کرے گا، جس طرح تو نے میرے اندر کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچا دی ہے، اسی طرح تو نے میری گھریلو زندگی میں بھی ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ آج کئی دن سے میرا بڑا بھائی سلیمان اس بات پر جھگڑ رہا ہے

کہ میں نے تجھ سے قابلِ اعتراض تعلقات کیوں استوار کر رکھے ہیں۔ گھر میں میری ماں تیری حمایت کرتی ہے اور اس وقت وہ میری تائید اور تیری حمایت میں میرے بھائی سلیمان کو ڈانٹ رہی ہے۔"

ابوجعفر نے پوچھا۔ "سلیمان کیا چاہتا ہے؟"

حفصہ نے جواب دیا۔ "وہ کہتا ہے، تو مجھ سے شادی کر لے۔"

ابوجعفر کی پیشانی بھیگنے لگی، اس پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ "پھر تیری کیا منشا ہے؟"

حفصہ نے جواب دیا۔ "ابوجعفر! یہ بھی طے ہے کہ میں تجھ سے عشق تو کر سکتی ہوں لیکن شادی نہیں کر سکتی اور شاید تو خود بھی اس غیر جذباتی اور غیر عاشقانہ رشتے کے لیے تیار نہ ہوگا۔"

ابوجعفر نے کہا۔ "ہاں، لیکن..... اگر تو میرے لیے سریع الحصول نہ رہی اور تجھ پر پابندیاں عائد ہونے لگیں تو میں اس ناخوشگوار رشتے پر بھی آمادہ ہو جاؤں گا۔"

حفصہ نے ابوجعفر کو کوئی جواب نہ دیا۔ ابوجعفر مہندی کے درختوں کے سائے میں بیٹھ گیا۔ حفصہ بھی اس کے سامنے جا بیٹھی، پوچھا۔ "جس لڑکی سے تو باتیں کر رہا تھا اس کا نام کیا ہے؟"

ابوجعفر نے جواب دیا۔ "لبابہ..... وہ شاعرہ بھی ہے لیکن تیرے جتنی بلند پایہ شاعرہ نہیں۔"

حفصہ نے کہا۔ "ابوجعفر! کیا میں حسین نہیں ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ بلکہ تو اتنی حسین ہے کہ غرناطہ میں ایک بھی تیرے حسن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔"

حفصہ نے پھر سوال کیا۔ "کیا میں بلند پایہ شاعرہ نہیں ہوں؟"

"کیوں نہیں..... بلکہ تو اتنی بڑی شاعرہ ہے کہ دنیائے شاعری میں مدتوں تیرے مثل دوسری شاعرہ نہیں پیدا ہوگی۔"

"کیا میں اعلیٰ حسب نسب نہیں رکھتی؟"

"کیوں نہیں..... تیرے حسب نسب کی پاکیزگی اور درخشانی آفتاب کی طرح ظاہر اور نمایاں ہے۔"

"کیا میں اپنے ہنر کے ذریعے ابوسعید تک نہیں پہنچ سکتی؟"

اس سوال نے ابوجعفر کو پریشان اور فکرمند کر دیا، بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔ "کیوں نہیں، لیکن بادشاہ کے دربار میں کسی حسین اور اعلیٰ حسب نسب رکھنے والی شاعرہ کا پہنچنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ شاہوں کی نظروں کے سامنے پہنچنے والی حسین عورتیں اپنی عزت و آبرو بھلا کس طرح محفوظ رکھ سکتی ہیں۔"

حفصہ مسکرانے لگی، شاید ابھی کچھ اور باتیں ہوتیں لیکن حفصہ کی ماں اور اس کے بھائی سلیمان کے ایک ساتھ پہنچ جانے سے دونوں ہی چپ ہو گئے۔ ماں نے حفصہ سے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ بادشاہ ابوسعید نے تیری سفارش پر ابوجعفر کو اپنا وزیر بنایا ہے؟"

ابوجعفر کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی، حفصہ نے جواب دیا۔ "ابوجعفر کو اس کی قابلیت اور لیاقت بادشاہ کے پاس لے گئی ہے ورنہ اس نے تو منصبِ وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

سلیمان نے بڑی بے رخی سے کہا۔ "لیکن لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ تیری ایک دن سرِ راہ بادشاہ سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی اور تو نے اسے غیرت دلائی تھی کہ اس نے ابوجعفر جیسے لائق فائق نوجوان کو اپنے دربار میں کوئی منصب کیوں نہیں دیا۔ کہتے ہیں، بادشاہ نے اس کے بعد ہی ابوجعفر کو اپنا وزیر بنا لیا۔"

ابوجعفر نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا، بولا۔ "ہاں، یہ درست ہے۔ تو صحیح کہتا ہے حالانکہ میں نے بڑی کوشش کی کہ مجھے وزارتِ عظمیٰ کا منصب نہ دیا جائے لیکن بادشاہ نہیں مانا۔" پھر حفصہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ مجھے جو شے بھی مل رہی ہے وہ حفصہ کے طفیل مل رہی ہے۔ شاعری کا درد و سوز بھی حفصہ ہی کا رہینِ منت ہے اور وزارتِ عظمیٰ کا منصب بھی حفصہ ہی کا عطا کردہ ہے۔"

ماں نے پوچھا۔ "کیا تم دونوں شادی کے لیے تیار ہو؟"

ابوجعفر نے جواب دیا۔ "اس معاملے میں، میں حفصہ کا پابند ہوں۔"

حفصہ نے کہا۔ "ماں! میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔"

سلیمان نے کہا۔ "اگر تو ابھی شادی نہیں کرے گی تو اس وقت تک ابوجعفر سے کنارہ کشی اختیار کر، جب تک کہ تیرے دل میں ابوجعفر سے شادی کرنے کا خیال یا شوق نہ پیدا ہو جائے۔"

"بھائی!" حفصہ نے جوش و جذبے سے کہا۔ "میں بالغ ہوں اور خدا نے مجھے عقل و خرد اور معاملہ فہم ادراک سے بھی نواز رکھا ہے، اس لیے میں اپنے بارے میں جو فیصلہ کروں گی وہ ان فیصلوں سے بہتر ہی ہوگا، جو دوسرے میرے بارے میں کریں گے۔ اس لیے میں تجھ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرے معاملے میں اپنی زبان بند رکھ۔ اگر تو اپنے دل میں یہ حسد محسوس کر رہا ہے کہ ابوجعفر نے میرے طنز و طعن سے وزارتِ عظمیٰ کا منصب حاصل کر لیا ہے

اور تُو محروم ہے تو میں ابوجعفر سے درخواست کروں گی کہ وہ بادشاہ سے کہہ سن کر تجھے بھی کوئی اچھا سا منصب دلادے۔"

ابوجعفر نے کہا۔ "اب اگر سلیمان اپنی زبان سے کسی منصب کی درخواست نہ بھی کرے، میں تب بھی اسے کوئی نہ کوئی منصب ضرور دلوادوں گا۔"

سلیمان نے جواب دیا۔ "میں خود بھی بادشاہ سے مل کر اپنے شایانِ شان خدمت حاصل کرسکتا ہوں، لیکن میری رائے میں ہم دونوں کا ایک ہی جگہ مختلف عہدوں پر موجود ہونا بہتر نہیں ہے۔"

حفصہ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

ابوجعفر نے اپنی زبان سے کوئی سوال تو نہیں کیا لیکن اس نے سلیمان کو کچھ ایسی نظر سے دیکھا جس میں حفصہ ہی جیسا سوال پایا جاتا تھا یعنی "وہ کیوں؟"

ماں، سلیمان کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

سلیمان نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں کیوں میں اپنے دل کو ابوجعفر کی طرف سے صاف نہیں محسوس کرتا۔ میں کبھی نہ کبھی اسے نقصان ضرور پہنچا سکتا ہوں۔ چنانچہ اگر میں بادشاہ کے قریب پہنچ گیا، تو وہاں ہر وقت اسی فکر میں رہوں گا کہ کس طرح تجھے نقصان پہنچاؤں۔ ہاں، اگر تو حفصہ کا پیچھا چھوڑ دے تو میں تیرا دوست بلکہ بھائی بھی بن سکتا ہوں۔"

ابوجعفر نے کہا۔ "یہی بات اگر حفصہ اپنی زبان سے کہہ دے تو میں اس پر غور کرسکتا ہوں ورنہ تیرے کہنے سے میں حفصہ کی محبت اپنے دل سے نہیں نکال سکتا۔ رہی یہ بات کہ تو اگر بادشاہ کے قریب پہنچ گیا تو وہاں ہمیشہ میری ایذا رسانی کے درپے رہے گا تو میں اس کے لیے تیار ہوں اور تیری طرف سے پہنچنے والی ہر ایذا اور مضرت کو خوش آمدید کہوں گا۔ حفصہ کی خاطر یا اس توقع پر کہ شاید میری بھلائیاں اور عدم تشدد تیرے سخت دل کو موم کرکے مجھ پر مائل کردیں۔"

حفصہ نے نہایت ناگوار لہجے میں کہا۔ "ابوجعفر! اب تو یہاں سے چلا جا، کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہوجائے اور میں ہنگامے سے زیادہ اپنی رسوائی سے ڈرتی ہوں۔"

ابوجعفر کھڑا ہوگیا، بولا۔ "حفصہ! جیسا کہ میں نے کہا ہے، میں سلیمان کو بادشاہ کے دربار میں کوئی اچھا سا منصب ضرور دلوادوں گا۔ اس کے بعد سلیمان چاہے تو مجھے تباہ و برباد کردے، یا اپنے دل کی کدورتیں نکال کر مجھے اپنا بھائی بنالے۔"

ابوجعفر چلا گیا اور حفصہ اور اس کی ماں افسوس کے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مارچ کے موسم کی رنگینیاں
جاسوسی کے شمارے کی دلفریبیاں

وبائی دہشت
جرم کی شاندار منصوبہ بندی میں پوشیدہ ہولناک تباہی کا ایک اور منصوبہ..... سنسنی خیز ناول کے پے در پے واقعات..... **امجد رئیس** کے قلم کی جادو بھری روانی.....

انگارے
دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا **طاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت..... **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ
زندگی کی الجھنوں میں گرفتار ہوجانے والوں کا المیہ۔ سرورق کی پہلی کہانی

وقت کی طنابوں پر چلنا آسان نہیں..... وہ ہر چال کو ڈھال بنا رہا تھا..... سرورق کی دوسری کہانی

چٹی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہیں، لیکن سلیمان کے چہرے پر کوئی خاص تغیر نہیں تھا۔

ابوسعید اور ابوجعفر میں بڑی جلدی بے تکلفی ہوگئی۔ ابوسعید اس کی شاعری کا مداح تھا اور اکثر وبیشتر اس سے اس کا کلام سنتا رہتا تھا۔ ابوسعید کی ہر وقت یہی کوشش رہتی کہ وہ ابوجعفر کو خوش رکھے۔ وہ ابوجعفر سے اہم ملاقات میں مشورے بھی لیتا لیکن اسے بہت جلد ایک بات معلوم ہوگئی۔ ابوجعفر محض ایک شاعر تھا، جنگ جوئی اور خون خرابے سے اسے نفرت تھی۔ جب کبھی جنگ کی بات شروع ہوتی، ابوجعفر کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ ابوسعید کو خون خرابے سے باز رکھے لیکن ابوسعید، عبدالمومن کا بیٹا تھا جس نے اپنے قوتِ بازو سے حکومت حاصل کی تھی اور آج فنِ محاربت میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔

ابوجعفر اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح سلیمان کو بھی ابوسعید سے ملوادے۔ وہ سلیمان پر احسان کرنا چاہتا تھا کہ وہ حفصہ کے معاملے میں اپنی زبان بند رکھے۔

انگور کی فصل شروع ہوچکی تھی اور غرناطہ کے شہری اپنے خاندانوں کے ساتھ تاکستان کی طرف سفر کررہے تھے۔ ابوجعفر کا خاندان بھی انگوروں کے شہر ابدہ روانہ ہوگیا۔ ابوسعید بھی چند دنوں کے لیے ابدہ منتقل ہونا چاہتا تھا۔ اس نے ابوجعفر سے پوچھا۔ ''کیا تیرا خاندان بھی ابدہ روانہ ہوچکا ہے؟''

ابوجعفر نے سرد آہ بھری، جواب دیا۔ ''سیدی! میں خود بھی ہر سال ابدہ جاتا رہا ہوں، لیکن امسال وزارت کی بھاری بیڑیوں نے مجھے غرناطہ ہی میں روک لیا ہے۔''

ابوسعید کو غصہ آگیا، تیوریوں پر بل ڈال کر دریافت کیا۔ ''تو وزارت کو بھاری بیڑیوں سے تشبیہ دے رہا ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''سیدی! میں شاعر ہوں اس لیے جب بھی کوئی نیا مضمون ذہن میں آتا ہے، بے تکلف بیان کردیتا ہوں، جس کا میرے واقعی اور حقیقی جذبوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

ابوسعید نے کہا۔ ''تیرے ساتھ میں خود بھی ابدہ جانا چاہتا ہوں۔ تو تیاری کر اور اپنے ساتھ اربابِ نشاط وغنا کو بھی لے کر چل۔''

ابوجعفر کی خوشی کی انتہا نہ رہی، بولا۔ ''سیدی! اس موقع پر میں ایک شخص کی سفارش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میری سفارش منظور ہوگئی تو اربابِ غنا ونشاط کا انتظام اس کے سپرد کردیا جائے گا کیونکہ وہ ان کاموں میں مجھ سے زیادہ لائق ہے۔''

ابوسعید نے دریافت کیا۔ ''وہ کون ہے جس کا تو سفارشی بن رہا ہے؟''

ابوجعفر نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''مشہور شاعرہ حفصہ کا بھائی سلیمان۔''

ابوسعید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوکر فوراً ہی غائب ہوگئی۔ ابوجعفر کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا کہ اسے سلیمان کی سفارش کرتے ہوئے حفصہ کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔

ابوسعید نے فراخدلی سے کہا۔ ''تو سلیمان کو فوراً بلالے اور اربابِ غنا ونشاط کا انتظام اس کے سپرد کردے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''سیدی جو بھی حکم دیں گے، یہ ناچیز اسے بجالائے گا۔''

ابوسعید نے کہا۔ ''میں نے تیری شاعری سن لی اور اس سے مستقل لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔ میں نے حفصہ کی بڑی شہرت سنی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس سفر میں وہ بھی ہمارے ساتھ رہے اور ہم سب اس کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔''

ابوجعفر خاموش ہوگیا اور سوچنے لگا کہ بادشاہ کو کیا جواب دے۔ ابوسعید نے پوچھا۔ ''تو کیا سوچنے لگا؟ بس اسی وقت تو حفصہ کے پاس چلا جا۔ اس کے بھائی سلیمان کو یہ خوشخبری سنا کر حفصہ کو بھی شریکِ سفر ہونے پر آمادہ کرلے۔ میرا خیال ہے وہ اس پر بہ آسانی آمادہ ہوجائے گی۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ وہ آمادہ ہوجائے اور اگر اس نے انکار کردیا تو سیدی کو اس سے مطلع کردیا جائے گا کیونکہ حفصہ بڑی تلخ مزاج عورت ہے اور کسی کی کم ہی سنتی ہے۔''

بادشاہ نے طنزاً کہا۔ ''ابوجعفر! میں تم دونوں کے تعلقات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر تو حفصہ سے شریکِ سفر ہونے کو کہے گا تو اس کی مجال نہیں جو انکار کردے۔''

ابوجعفر نے آہستہ سے کہا۔ ''بہرحال میں کوشش ضرور کروں گا، آگے حفصہ کی اپنی مرضی۔''

بادشاہ کا اندازِ گفتگو ہی بدل گیا، بڑی بے مروتی سے حاکمانہ انداز میں کہا۔ ''ابوجعفر! کان کھول کر سن لو، میں بادشاہ ہوں تو زمانہ میرے اختیارات سے واقف ہے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ حفصہ ہماری ہم سفر ہوگی، تو میرا یہ فیصلہ حفصہ تک پہنچا دے۔ کوئی وجہ نہیں کہ تو یا غرناطہ کے

دوسرے لوگ تو حفصہ کی شاعری اور ذہانت و فطانت سے لطف اندوز ہوں اور میں محروم رہوں۔"

ابوجعفر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بادشاہ کو اس کے لب و لہجے میں جواب دے سکتا، بولا۔ "بہتر ہے، حفصہ ہماری ہم سفر ہوگی، میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔"

ابوسعید مسکرانے لگا، بولا۔ "اب تو جا سکتا ہے تاکہ سفر کی تیاریاں کر سکے۔"

ابوجعفر دل برداشتہ اور دل شکستہ، بادشاہ سے رخصت ہوا اور اس الجھن میں پھنس گیا کہ اس سلسلے میں حفصہ سے کس طرح بات کرے۔ وہ سیدھا حفصہ کے گھر پہنچا۔ حفصہ کی ماں نے خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا، بولی۔ "تیرا آنا مبارک ہو ابوجعفر! خدا تجھے ہمیشہ خوش اور شادماں رکھے۔ یہ تیرے چہرے پر فکر و تردد کی پرچھائیاں کیوں نظر آ رہی ہیں؟"

ابوجعفر نے جواب دیا۔ "سلیمان کو بادشاہ نے یاد کیا ہے، ہم لوگ ابدہ میں انگور کا موسم گزارنے جا رہے ہیں۔"

حفصہ اس وقت کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابوجعفر نظروں سے اسے تلاش کر رہا تھا۔ ماں نے کہا۔ "جسے تو تلاش کر رہا ہے وہ اپنے بھائی سلیمان کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہے۔" پھر خوشی سے بولی۔ "جب سلیمان یہ سنے گا کہ تو نے اسے شاہی دربار تک پہنچا دیا ہے تو وہ اپنے دل سے تیرے خلاف کدورت کو نکال دے گا۔"

ابوجعفر وہاں ٹھہرا نہیں، فوراً ہی چلا آیا۔ راستے میں اسے ایک باغ سے ملحقہ کھیت کی پگڈنڈی پر سلیمان آتا دکھائی دیا، اس کے ساتھ حفصہ بھی تھی۔ وہ دونوں ابوجعفر کو نہیں دیکھ سکے۔ ابوجعفر چاہتا تو ان دونوں کو مخاطب کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ وہ سلیمان سے متعلقہ خوشخبری خود اس لیے نہیں سنانا چاہتا تھا کہ اس طرح سلیمان اس خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا کہ شاید ابوجعفر اس کی خوشامد کر رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ جب یہ خبر حفصہ اور سلیمان اپنی ماں سے سنیں گے تو اس کا ان دونوں پر اثر ہی کچھ اور ہوگا۔

شام کو غروب آفتاب سے ذرا پہلے حفصہ ابوجعفر سے ملنے پہنچ گئی۔ غرناطہ کی پہاڑیوں کے اوپر شفق پھوٹ رہی تھی اور بادلوں کے آوارہ ٹکڑے سورج کی کمزور شعاعوں سے چمک رہے تھے۔ دن بھر کے تھکے ہارے پرندے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ حفصہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی، بڑے دکھ سے پوچھا۔ "ابوجعفر سچ بتا کیا میری آنکھوں سے وہ محبت بالکل ظاہر نہیں ہوتی جس نے میرے وجود کو پھونک کر رکھ دیا ہے اور جس کا تعلق سراسر تیری ذات سے ہے۔"

ابوجعفر حفصہ کی برہمی سے ڈر گیا، مسکراتے ہوئے بولا۔ "تو یہ سوال کیوں کر رہی ہے مجھ سے؟"

حفصہ نے تلخی سے جواب دیا۔ "تو نے مجھے نظر انداز کرنا کیوں شروع کر دیا ہے؟"

ابوجعفر نے کہا۔ "میں نے تجھے کب نظر انداز کیا ہے حفصہ.....؟ جس دن میں اپنی زندگی سے بیزار ہو جاؤں گا اس دن بھی تجھے نظر انداز کرنے کی جرأت نہ کر سکوں گا۔"

حفصہ نے کہا۔ "آج جب تو میری ماں سے مل کر آ رہا تھا، راستے میں، میں نے تجھے دیکھ لیا تھا۔ میں خود تجھے اس لیے نہیں روک سکی کہ میرا بھائی سلیمان میرے ساتھ تھا اور وہ تجھے ناپسند کرتا ہے لیکن اگر تو مجھے مخاطب کر لیتا تو میں تجھے اپنے ساتھ دوبارہ گھر لے جاتی۔"

ابوجعفر نے جواب دیا۔ "جی تو میرا بھی یہی چاہتا تھا کہ میں تجھ سے مل لوں لیکن پھر اس خیال سے باز رہا کہ سلیمان کا دماغی توازن پھر بگڑ جائے گا۔"

حفصہ نے کہا۔ "میں نے وہ خوش خبری سن لی، سلیمان تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔"

ابوجعفر نے خوشی سے جواب دیا۔ "کیا ابھی؟ اسی وقت؟"

"کیا ابھی..... اس وقت؟"

"ہاں ابھی اور اسی وقت۔ وہ سامنے والے باغ کے کنارے کھڑا تیرا انتظار کر رہا ہے۔"

"وہ یہاں میرے پاس کیوں نہیں آ جاتا؟"

"شاید اس لیے کہ اس طرح وہ اپنی انا اور غیرت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔"

ابوجعفر نے افسردگی سے کہا۔ "وہ انا اور غیرت کی بات بلاوجہ سوچتا ہے ورنہ اگر وہ یہاں تک آ سکتا تھا تو میرے گھر بھی آ سکتا تھا۔"

حفصہ نے کہا۔ "میں اسے مجبور نہیں کر سکتی۔ تو میرے ساتھ چلا چل۔"

ابوجعفر سلیمان کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ایک کھائی کے پاس اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ابوجعفر نے مسکراتے ہوئے اور سلیمان نے منہ بناتے ہوئے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔ ابوجعفر کچھ کہنے کے لیے ابھی اپنا منہ بھی نہ کھول سکا تھا کہ سلیمان نے بے رخی سے پوچھا۔ "مجھے بادشاہ کے پاس کب پہنچنا ہے؟"

ابوجعفر نے جواب دیا۔ "کل صبح کیونکہ اب ذرا سی

بھی تاخیر ہمارے لیے نقصان دہ ہوگی۔''

سلیمان نے حفصہ سے کہا۔''حفصہ! تو میرے ساتھ چل۔ میں اس نوجوان کا شکر گزار ہوں ورنہ اگر میں خود کوشش کرتا تو ایک نہ ایک دن بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل کر ہی لیتا۔''

ابوجعفر کو ایسا لگا، گویا اس نے جو کام کیا ہے وہ اتنا اہم نہیں تھا۔ کوئی بھی انجام دے سکتا تھا۔

حفصہ نے جواب دیا۔''ابوجعفر! تو کسی سوچ میں نہ پڑ، میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میرے بھائی سلیمان کی باتوں کا برا نہ مان۔ یہ میرا بھائی ہے، حفصہ کا بھائی..... میں اس سے محبت کرتی ہوں، اس لیے تو بھی اس کا خیال رکھ۔''

سلیمان نے پوچھا۔''کیا میں صبح یہاں آجاؤں؟ یا تو خود آجائے گا میرے پاس؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔''میں تیرا انتظار کروں گا۔''

بھائی کی وجہ سے حفصہ بھی نہیں رکی اور واپس چلی گئی۔

ابوجعفر اس فکر میں از سر نو گرفتار ہوگیا کہ وہ ابوسعید کا پیغام حفصہ کو کس طرح دے گا۔ کہیں حفصہ اس سے ناراض نہ ہوجائے لیکن پھر یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں ابوسعید حفصہ کو اپنی طرف نہ مائل کرلے۔

سلیمان کو شرطہ کے دوسرے شعبے صاحب اللیل کا منصب دیا گیا۔ یہ منصب بھی شرطہ (پولیس) ہی سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے اختیارات بہت زیادہ ہوتے تھے۔

حفصہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ ابوسعید اسے بھی اس سفر میں لے جانا چاہتا ہے تو بہت خوش ہوئی۔

ابوجعفر نے کہا۔''حفصہ! تو ساتھ جانے سے انکار کردے۔''

حفصہ نے پوچھا۔''وہ کیوں؟ نئی جگہ دیکھنے کی خوشی کسے نہیں ہوتی۔''

ابوجعفر نے منہ بنایا، بولا۔''حفصہ! تو میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ ابوسعید اس لائق نہیں ہے کہ تو اس کی مصاحبت نشینی کرے اور اس کی ہوس اور دست درازیوں سے محفوظ رہے۔''

حفصہ نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔''ابوجعفر! تو بڑا شکی ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ ابوسعید میرے ساتھ زبردستی بھی کرسکتا ہے۔ میں تو اسے اپنے قصیدے اور دوسرے اشعار سنانا چاہتی ہوں کیونکہ لوگ بتاتے ہیں کہ ابوسعید اچھے اشعار کا سچا قدردان ہے۔''

ابوجعفر نے نفرت سے کہا۔''ہوگا اچھے اشعار کا سچا قدردان لیکن اس نے آج تک میرے اشعار کی تو قدر نہ کی۔''

حفصہ کو یکایک لبابہ کا خیال آگیا، ابوجعفر کو چھیڑتے ہوئے بولی۔''سنتی ہوں، ابوسعید کا سیاہی مائل گندم گوں چہرہ بڑا دلکش لگتا ہے اور اسے سامنے رکھ کر بڑے اچھے اشعار کہے جاسکتے ہیں۔''

ابوجعفر ایکدم مشتعل ہوگیا، بولا۔''اگر یہ بات ہے اور تو واقعی ابوسعید کے دل میں جگہ بنالے تو اس سے میرا ایک کام ضرور کرادے گی۔''

حفصہ نے پوچھا۔''کون سا کام؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔''مجھے عہدۂ وزارت سے سبکدوش کرادے۔ میں اس بھاری بیڑی کے ساتھ آزادانہ نقل و حرکت سے محروم ہوگیا ہوں اور مجھے یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہے کہ ابوسعید نے مجھے اپنا وزیر کیوں بنایا تھا۔''

حفصہ نے پوچھا۔''کیوں بنایا تھا؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔''مجھے وزیر بنا کے وہ تجھے اپنے قریب لانا چاہتا تھا اور اپنے اس مقصد میں وہ قریب قریب کامیاب ہوچکا ہے۔''

حفصہ نے شوخی سے منہ بنایا، ہنس کر بولی۔''میری محبت نے تجھے شکی اور بدگمان کردیا ہے اور کچھ نہیں۔''

ابوجعفر نے کہا۔''کچھ بھی سہی لیکن اب میں وزیر نہیں رہنا چاہتا۔''

حفصہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اچھا، یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر میں ابوسعید کے مزاج میں واقعی دخیل ہوگئی تو وزارت سے تیرا چھٹکارا کرادوں گی۔''

ابوجعفر کے دل میں حفصہ کی باتیں نشتر کی طرح اتری جارہی تھیں۔ حفصہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس نے حفصہ کو جلانے کی ایک اچھی سی ترکیب سوچ لی۔ لبابہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ ابدہ گئی ہوئی تھی۔ ابوجعفر نے فیصلہ کرلیا کہ وہ لبابہ سے ربط وضبط بڑھا کر حفصہ کو جلانے کی کوشش کرے گا۔

☆☆☆

انگوروں کے باغات میں رنگ برنگے خیموں کی بہار آئی ہوئی تھی اور خیموں کے اندر باہر انسانوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ ان میں ہر عمر کے مرد و عورت موجود تھے۔ باغات میں انگور کی بیلوں کے ساتھ ہی رنگترے، لیمو، انجیر اور مہندی کے درختوں کی بھی بھرمار تھی۔ شاہی قافلہ بھی ابدہ کے سب سے بڑے اور سب سے دلکش باغ میں اترا۔ شاہی خدمت گاروں نے آناً فاناً اس باغ کو شاندار شہر بنادیا، شاندار خیموں کا حسین شہر۔ ابوسعید کے آس پاس اس کے

بھی تاخیر ہمارے لیے نقصان دہ ہوگی۔''

سلیمان نے حفصہ سے کہا۔''حفصہ! تو میرے ساتھ چل۔ میں اس نوجوان کا شکر گزار ہوں ورنہ اگر میں خود کوشش کرتا تو ایک نہ ایک دن بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل کر ہی لیتا۔''

ابوجعفر کو ایسا لگا، گویا اس نے جو کام کیا ہے وہ اتنا اہم نہیں تھا۔ کوئی بھی انجام دے سکتا تھا۔

حفصہ نے جواب دیا۔''ابوجعفر! تو کسی سوچ میں نہ پڑ، میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میرے بھائی سلیمان کی باتوں کا برا نہ مان۔ یہ میرا بھائی ہے، حفصہ کا بھائی..... میں اس سے محبت کرتی ہوں، اس لیے تو بھی اس کا خیال رکھ۔''

سلیمان نے پوچھا۔''کیا میں صبح یہاں آجاؤں؟ یا تو خود آجائے گا میرے پاس؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔''میں تیرا انتظار کروں گا۔''

بھائی کی وجہ سے حفصہ بھی نہیں رکی اور واپس چلی گئی۔

ابوجعفر اس فکر میں از سر نو گرفتار ہوگیا کہ وہ ابوسعید کا پیغام حفصہ کو کس طرح دے گا۔ کہیں حفصہ اس سے ناراض نہ ہوجائے لیکن پھر یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں ابوسعید حفصہ کو اپنی طرف نہ مائل کرلے۔

سلیمان کو شرطہ کے دوسرے شعبے صاحب اللیل کا منصب دیا گیا۔ یہ منصب بھی شرطہ (پولیس) ہی سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے اختیارات بہت زیادہ ہوتے تھے۔

حفصہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ ابوسعید اسے بھی اس سفر میں لے جانا چاہتا ہے تو بہت خوش ہوئی۔

ابوجعفر نے کہا۔''حفصہ! تو ساتھ جانے سے انکار کردے۔''

حفصہ نے پوچھا۔''وہ کیوں؟ نئی جگہ دیکھنے کی خوشی کسے نہیں ہوتی۔''

ابوجعفر نے منہ بنایا، بولا۔''حفصہ! تو میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ ابوسعید اس لائق نہیں ہے کہ تو اس کی مصاحبت نشینی کرے اور اس کی ہوس اور دست درازیوں سے محفوظ رہے۔''

حفصہ نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔''ابوجعفر! تو بڑا شکی ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ ابوسعید میرے ساتھ زبردستی بھی کرسکتا ہے۔ میں تو اسے اپنے قصیدے اور دوسرے اشعار سنانا چاہتی ہوں کیونکہ لوگ بتاتے ہیں کہ ابوسعید اچھے اشعار کا سچا قدردان ہے۔''

ابوجعفر نے نفرت سے کہا۔''ہوگا اچھے اشعار کا سچا قدردان لیکن اس نے آج تک میرے اشعار کی تو قدر نہ کی۔''

حفصہ کو یکایک لبابہ کا خیال آگیا، ابوجعفر کو چھیڑتے ہوئے بولی۔''سنتی ہوں، ابوسعید کا سیاہی مائل گندم گوں چہرہ بڑا دلکش لگتا ہے اور اسے سامنے رکھ کر بڑے اچھے اشعار کہے جاسکتے ہیں۔''

ابوجعفر ایکدم مشتعل ہوگیا، بولا۔''اگر یہ بات ہے اور تو واقعی ابوسعید کے دل میں جگہ بنالے تو اس سے میرا ایک کام ضرور کرادے گی۔''

حفصہ نے پوچھا۔''کون سا کام؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔''مجھے عہدۂ وزارت سے سبکدوش کرادے۔ میں اس بھاری بیڑی کے ساتھ آزادانہ نقل و حرکت سے محروم ہوگیا ہوں اور مجھے یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہے کہ ابوسعید نے مجھے اپنا وزیر کیوں بنایا تھا۔''

حفصہ نے پوچھا۔''کیوں بنایا تھا؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔''مجھے وزیر بنا کے وہ تجھے اپنے قریب لانا چاہتا تھا اور اپنے اس مقصد میں وہ قریب قریب کامیاب ہوچکا ہے۔''

حفصہ نے شوخی سے منہ بنایا، ہنس کر بولی۔''میری محبت نے تجھے شکی اور بدگمان کردیا ہے اور کچھ نہیں۔''

ابوجعفر نے کہا۔''کچھ بھی سہی لیکن اب میں وزیر نہیں رہنا چاہتا۔''

حفصہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اچھا، یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر میں ابوسعید کے مزاج میں واقعی دخیل ہوگئی تو وزارت سے تیرا چھٹکارا کرادوں گی۔''

ابوجعفر کے دل میں حفصہ کی باتیں نشتر کی طرح اتری جارہی تھیں۔ حفصہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس نے حفصہ کو جلانے کی ایک اچھی سی ترکیب سوچ لی۔ لبابہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ ابدہ گئی ہوئی تھی۔ ابوجعفر نے فیصلہ کرلیا کہ وہ لبابہ سے ربط وضبط بڑھا کر حفصہ کو جلانے کی کوشش کرے گا۔

☆☆☆

انگوروں کے باغات میں رنگ برنگے خیموں کی بہار آئی ہوئی تھی اور خیموں کے اندر باہر انسانوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ ان میں ہر عمر کے مرد و عورت موجود تھے۔ باغات میں انگور کی بیلوں کے ساتھ ہی رنگترے، لیمو، انجیر اور مہندی کے درختوں کی بھی بھرمار تھی۔ شاہی قافلہ بھی ابدہ کے سب سے بڑے اور سب سے دلکش باغ میں اترا۔ شاہی خدمت گاروں نے آناً فاناً اس باغ کو شاندار شہر بنادیا، شاندار خیموں کا حسین شہر۔ ابوسعید کے آس پاس اس کے

وزیر، ندیم اور دوسرے بڑے عہدیداروں کے خیمے تھے اور انہی میں حفصہ کے بھائی سلیمان کا خیمہ بھی تھا۔ حفصہ سلیمان ہی کے خیمے میں رہ رہی تھی۔ ابوجعفر کا خیمہ سلیمان کے خیمے سے دو خیموں کے اس پار تھا۔ اس نے کئی بار حفصہ کو بھڑکیلے لباس میں ادھر ادھر محوِ خرام دیکھا تھا۔ جب وہ محوِ خرام ہوتی تو بادشاہ کے اعلیٰ منصب دار اسے بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سے مخاطب ہوسکتا کیونکہ ادھر کئی دن سے وہ لوگ یہ دیکھ رہے تھے کہ حفصہ بادشاہ سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی اور بادشاہ بھی اس کی ہر بات پر یا تو زور سے ہنس دیتا یا پھر زیرِ لب مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ اس نے حفصہ کے اشعار کی سب سے زیادہ داد دی تھی اور اس کے مذاقِ لطیف کی بڑی تعریفیں کی تھیں۔ ان دونوں کے اس میل ملاپ اور بے تکلفی کو ابوجعفر بھی رشک و حسد سے دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ محض شاعر نہ ہوتا اور سپاہی بھی ہوتا تو وہ بادشاہ کو رقابت میں ہلاک ضرور کر دیتا۔

حفصہ نے بادشاہ کو متاثر تو پہلے ہی کر لیا تھا مگر تاکستان کی صحبتوں نے بادشاہ کو اس کی محبت میں دیوانہ کر دیا۔ حفصہ کو بھی بادشاہ کی باتوں میں بڑا مزہ آیا۔ وہ بھی بادشاہ کی گرویدہ ہوتی چلی گئی۔ ابوجعفر کو جس بات کا ڈر تھا، وہ پوری ہو چکی تھی اور اب وہ ایک نئی مصیبت، نئی گھٹن سے دوچار تھا۔ پہلے تو وہ حفصہ کو منع بھی کر سکتا تھا لیکن اب یہ بات ناممکن ہوگئی تھی کیونکہ اگر اس کا علم کسی طرح بادشاہ کو ہو جاتا تو اس پر اس کا عتاب بھی نازل ہوسکتا تھا۔

شبِ ماہتاب میں بادشاہ نے ایک خاص محفل منعقد کی اور اہتمام یہ کیا کہ خیموں کے باہر روشنی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ باغ کے سبزہ زار پر بادشاہ کی نشست مہندی کے درختوں کے سرے پر واقع تھی۔ نشست کے پیچھے مہندی کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ بادشاہ کی نشست سے ملحق داہنی طرف حفصہ کی نشست تھی اور ان دونوں کے سامنے دور تک شعراء اور سامعین کی نشستیں تھیں۔ چاند کی زردی مائل دودھیا روشنی میں ایسا لگتا تھا گویا انسانی سائے محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ وہ لوگ اپنے سے زیادہ فاصلے والوں کی شکلیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن حفصہ اور بادشاہ اتنے قریب قریب تھے کہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔

شعرا نے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا اور چاندنی میں سامعین اور شعراء کے سر وجد میں اس طرح حرکت کر رہے تھے جس طرح بے برگ و بار ٹنڈ منڈ پودے ہوا میں ہل رہے ہوں۔ بادشاہ نے ابوجعفر کا کلام اس وقت تک نہیں سنا جب تک کہ دوسرے شعرا اپنا کلام نہیں سنا چکے۔ وہ ابوجعفر کا کلام حفصہ کے ساتھ سننا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ ابوجعفر کے کلام پر خاموشی اختیار کر کے حفصہ کے کلام پر جی بھر کے داد دیتا اور اس عمل کا حفصہ اور ابوجعفر پر الگ الگ جو اثر پڑتا، اس سے وہ اچھی طرح واقف اور مطمئن تھا۔ رات کے پچھلے پہر تک شعرا اپنا کلام سنا چکے، چاند ایک گوشے سے ابھر کر دوسرے گوشے میں جا چکا تھا۔ اس کیف آور ماحول میں لوگ جمائیاں لینے لگے تھے۔ بادشاہ اس عرصے میں کئی بار شروبات کا دور چلا چکا تھا۔ اب لوگ شعرا کا کلام سنتے سنتے نیند میں اپنی گردنیں ڈھلکا رہے تھے۔ اتنے میں بادشاہ کے حاجب نے ابوجعفر کا نام لیا اور اس سے کلام سنانے کی درخواست کی لیکن ابوجعفر کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

بادشاہ نے مسکرا کر حفصہ کی طرف دیکھا اور شوخی سے کہا۔ ''کیا ابوجعفر سو گیا؟''

حفصہ بڑی فکرمند تھی۔ اس نے بادشاہ کی مسکراہٹ کا زہرخند سے جواب دیا، بولی۔ ''بادشاہ نے کچھ انتظام ہی ایسا کیا ہے کہ غریب ابوجعفر کسی گوشے میں سر جھکائے آنسو بہا رہا ہوگا۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''حفصہ سچ سچ بتا، ابوجعفر کی کون سی ادا تجھے بھا گئی ہے اور تو اسے اس قدر کیوں پسند کرتی ہے؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''پسند اور ناپسند کا انحصار اگر حسن، مردانہ وجاہت اور کسی خاص وصف پر ہوتا تو میرا خیال ہے اس دنیا میں تخمِ محبت ایک نایاب شے ہوتا۔ محبت کی آگ انسانی دلوں میں کب اور کیوں روشن ہو جاتی ہے، کوئی نہیں جانتا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''پھر بھی، کوئی تعریف تو کر، کچھ تو بتا، تو نے اس پر غور تو ضرور کیا ہوگا؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''سیدی! میں شاعرہ ہوں اس لیے اپنی قوتِ متخیلہ سے کام لے کر آپ کی بات کا جواب دے سکتی ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اچھا تو اسی طرح جواب دے۔''

حاجب بار بار ابوجعفر کو پکار رہا تھا لیکن ابوجعفر کا کوئی پتا نہ تھا۔ حفصہ ہر بار ابوجعفر کے نام پر چونک چونک جاتی۔ بادشاہ نے اس کی یہ کیفیت محسوس کر لی، بولا۔ ''تو فکر نہ کر، ابوجعفر سو گیا ہوگا۔ دیکھنا جیسے ہی جاگے گا، دیوانوں کی طرح

اپنا کلام سنانے لگے گا۔ ہاں تو، تُو اپنی بات پوری کر۔''

حفصہ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، جب روحیں پیدا کی گئیں تو انہیں جوڑوں میں پیدا کیا گیا ہوگا اور یہ عالم بالا میں ایک دوسرے سے آشنا اور واقف رہ چکی ہوتی ہیں۔ پھر جب یہ عالم ظاہر میں آتی ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوجاتا ہے تو یہ روحیں قدیم آشنائی کی وجہ سے ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگتی ہیں اور چونکہ اس شناسائی یا اس آشنائی کا ہمارے جسموں کو کوئی علم نہیں ہوتا اس لیے ہمارا دماغ زندگی بھر اس کا جواز یا جواب تلاش کرتا رہتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔''

''سبحان اللہ، سبحان اللہ..... تو نے کتنی خوبصورت توجیہہ بیان کی ہے، روح خوش ہوگئی۔ خدا نے تجھے جو جوہر لاثانی عطا فرمایا ہے، اس پر اپنے رب کا شکر ادا کر۔ حفصہ! تُو، تو مردوں پر بھی سبقت لے گئی۔''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''خدا نے مجھے جو صلاحیتیں دی ہیں، میں انہیں پوری طرح کام میں لا رہی ہوں اور یہی میری وہ شکر گزاری ہے جو میں اپنے رب کے حضور ہمیشہ ادا کرتی رہتی ہوں۔''

بادشاہ اس کی ہر بات پر سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اچھا اب ایک بات اور بتا؟''

حفصہ نے کہا۔ ''ارشاد؟''

بادشاہ نے کہا۔ ''ادھر میں شدت سے یہ بات محسوس کر رہا ہوں کہ میں خود بھی تیری محبت میں گرفتار ہوگیا ہوں اور شاید یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ میری محبت کا جواب تو بھی محبت ہی سے دے رہی ہے۔ پھر اس کا کیا مطلب ہوا کہ تجھے ابوجعفر بھی چاہتا ہے اور تو بھی ابوجعفر سے محبت کرتی ہے۔ اب یہ بتا کہ عالم بالا میں تیری روح کے قریب ہم دونوں میں سے کس کی روح رہی ہوگی؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''شاید دونوں ہی کی، کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کئی کئی روحیں آپس میں شناسا یا آشنا رہ چکی ہوں کیونکہ اس دنیا میں بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انسانی محبت کے مرکز اور محور بدلتے رہتے ہیں، یا بیک وقت کئی کئی ہوتے ہیں۔''

بادشاہ اس جواب سے سناٹے میں آگیا۔ ''مرحبا مرحبا، سبحان اللہ۔''

حاجب نے بادشاہ کو مطلع کیا۔ ''ابھی ابھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس محفلِ ماہتاب میں ابوجعفر موجود نہیں ہے۔ اس کی نشست خالی ہے۔''

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ''یہ کیونکر ممکن ہے کہ ابوجعفر مجھے مطلع کیے بغیر میرے سامنے سے چلا جائے۔''

حاجب نے عرض کیا۔ ''لیکن سیدی! اس وقت یہ بات ممکن ہوچکی ہے۔''

بادشاہ نے حکم دیا۔ ''اسے اس کے خیمے میں دیکھا جائے اور وہاں سے پکڑ کے بلایا جائے۔''

حاجب نے ''بجاارشاد'' کہہ کر اپنا سر جھکالیا۔ بادشاہ کے آدمی ابوجعفر کی تلاش میں اس کے خیمے کی طرف چلے گئے۔

بادشاہ نے حفصہ سے دوبارہ باتیں شروع کردیں۔ ''میں نے محض تیری خاطر ابوجعفر کو اپنا وزیر بنالیا، ورنہ یہاں اس سے بھی لائق لوگ موجود ہیں۔''

حفصہ نے کہا۔ ''ابوجعفر جو کچھ بھی ہے اور جیسا کچھ بھی ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کی اہانت یا دل آزاری سے میری روح کو دکھ پہنچتا ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں اس کا خیال رکھوں گا۔''

بادشاہ نے حفصہ کو اور زیادہ قریب کرلیا۔ دونوں ایک دوسرے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ رات کا سناٹا، سوئی سوئی چاندنی، خوابیدہ سبزہ واشجار، دلوں میں جذبات وہوس کا مدوجزر جاری تھا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ ابوجعفر اپنے خیمے میں بھی نہیں ہے۔ بادشاہ نے اس خبر کے ساتھ ہی محفل برخاست کردی۔ لوگ اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ بادشاہ نے حفصہ کو پُرمعنی اجازت طلب نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''میں نے تیرا کلام تو سنا ہی نہیں، کیا تو اب اس تنہائی میں اپنا کلام سنانا پسند کرے گی؟''

حفصہ نے بادشاہ کے خدمت گاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سیدی! یہاں تنہائی کہاں؟ لوگ تو اب بھی موجود ہیں۔''

بادشاہ نے مہندی کے جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آ..... ہم دونوں اس جھنڈ میں چلے چلیں، تاکہ وہ تنہائی جس کے ہم دونوں متلاشی ہیں ہمیں واقعی میسر آجائے۔''

حفصہ نے آمادگی ظاہر کی، بادشاہ نے اپنے خدمت گاروں کو وہیں چھوڑا اور خود حفصہ کے ساتھ مہندی کے جھنڈ میں چلا گیا۔ اندر بھی چاندنی شاخوں سے چھن چھن کر داخل ہو رہی تھی۔ بادشاہ نے وارفتگی میں حفصہ کا ہاتھ پکڑ کر لیا، بولا۔ ''حفصہ! اب ادھر آ، میرے پہلو میں بیٹھ جا۔ دو آشتا

روحیں ایک دوسرے کو تلاش کرتی ہوئی مہندی کی جھاڑیوں کے جھنڈ میں داخل ہو چکی ہیں۔ کیا یہاں بھی یہ دونوں ایک دوسرے سے دور دور رہیں گی؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، کیونکہ روحوں کی مقناطیسیت انہیں دور رہنے ہی نہ دے گی۔''

بادشاہ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ حفصہ نے بھی کوئی مزاحمت نہ کی۔ بادشاہ نے اسے بھینچ لیا اور ایک طویل بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ''حفصہ! میرے ہونٹ ایک عرصے سے تیرے لبوں کی تشنگی محسوس کر رہے ہیں۔ تیرے یہی وہ ہونٹ ہیں، جن سے فصاحت و بلاغت شعروں کی شکل میں بہتی رہتی ہے اور یہی وہ منبعِ خوش گوئی و خوش کلامی ہے جس نے ایک زمانے کو رشک و حسد میں مبتلا کر دیا ہے۔ ابوجعفر کتنا خوش قسمت ہے کہ اس نے بڑی آسانی سے کسی محنت اور کوشش کے بغیر یہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ اے کاش! میں ابوجعفر ہوتا۔''

حفصہ نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، بولی۔ ''سیدی! ایسا نہ کہیے۔ آپ بادشاہ ہیں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''ایسی بادشاہی کس کام کی، جو تیری نظر میں ابوجعفر سے کمتر ہو۔''

حفصہ نے ناگواری سے کہا۔ ''سیدی! کیا اس وقت یہ متنازعہ اور بے لطف باتیں بے محل نہیں ہیں؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''تو ٹھیک کہتی ہے، ہمیں واقعی ان باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔''

بادشاہ نے حفصہ کو اپنے پہلو میں دیکھ کر اتنی خوشی محسوس کی، جتنی کسی علاقے کی تسخیر میں بھی حاصل نہ ہوئی ہوگی۔ حفصہ بھی بادشاہ سے یوں بے تکلفی سے پیش آ رہی تھی جیسے پہلے کبھی اجنبی تھی ہی نہیں۔

صبح بادشاہ کے چند اشعار لوگوں کی زبان پر تھے۔ اس میں بادشاہ نے رات کے واقعے کی طرف لطیف اشارے کیے تھے۔

''خدا مہندی کے درختوں کو تا ابد قائم و سلامت رکھے
رات کے پچھلے پہر وہ ہم دونوں کی پردہ پوشی کر رہے تھے
خدا گواہ ہے کہ جب ہم دونوں چسپاں و پیوستہ تھے
ہوا میں لونگ کی خوشبو رچی بسی محسوس ہو رہی تھی
اور ساتھ ہی ایک ایسی خوشبو بھی اڑ رہی تھی جس کا تعلق
ہم دونوں کے جسموں سے تھا
کسی درخت پر قمری نے نغمہ سنجی شروع کر دی تھی اور باغ
کے خوشبودار پودے جھومنے لگے تھے
اس وقت پورا باغ خوش تھا، شاید اس لیے کہ اس کی
آغوش میں دو تشنہ روحیں
بوس و کنار میں مشغول تھیں، اس وقت زمانہ میرے
موافق تھا''

بادشاہ نے ابوجعفر کو طلب کیا۔ ابوجعفر کے چہرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ رات بھر سویا نہیں ہے۔ پپوٹے بھاری تھے اور چہرے پر شب بیداری کی تھکن نمایاں تھی۔ بادشاہ ابوسعید اس سے ناراض تھا، اس نے پوچھا۔ ''رات تو کہاں تھا؟''

ابوجعفر نے بادشاہ کی نظم کا آخری شعر سنا کر جواب دیا۔ ''آپ نے شعر میں کہا ہے کہ اس وقت پورا باغ بہت خوش تھا، شاید اس لیے کہ اس کی آغوش میں دو تشنہ روحیں بوس و کنار میں مشغول تھیں، اس وقت زمانہ میرے موافق تھا۔''

معلومات کا خزانہ

☆ اگر ان کو کاٹا نہ جائے تو بڑ، پیپل، صنوبر اور دیودار کے درخت سالہا سال زندہ رہتے ہیں۔

☆ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ فلاں شخص چڑھتے سورج کا پجاری ہے۔ دنیا میں ایک ایسا ملک بھی ہے جسے چڑھتے سورج کی سرزمین کہتے ہیں۔ اس کا نام جاپان ہے۔

☆ ایشیا کا دل ملائیشیا کو کہا جاتا ہے۔

☆ دنیا کی سب سے خوش قسمت اور سب سے بدنصیب ماں، نپولین بونا پارٹ کی تھی۔ خوش نصیب اس لیے کہ اس کے تمام بیٹے بادشاہ بنے اور تمام بیٹیاں ملکہ بنیں اور بدنصیب اس لیے کہ اس کی تمام اولاد کو اس کی زندگی میں ہی مار دیا گیا تھا۔

☆ عجوہ کھجور گٹھلی سمیت کوٹ کر دینے سے، دل کا دورہ پڑنے والے مریض کو افاقہ ہوتا ہے۔

☆ کہتے ہیں گلِ داؤدی تقریباً اڑھائی ہزار سال سے انسان کا ساتھی ہے۔

عالمی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا (از محمد فیصل بٹ) سے انتخاب

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

بادشاہ نے پوچھا۔ ''کیا تُو نے میرے اشعار سن لیے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''ہاں سن لیے۔ اب آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں اس لیے مجھے سبکدوش کر دیجیے۔''

بادشاہ ایکدم برہم ہو گیا۔ ''ابوجعفر او اللہ، اگر حفصہ تیری طرفدار نہ ہوتی تو میں تجھے قتل کرا دیتا۔ میں عدولِ حکمی تو برداشت کر ہی نہیں سکتا۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''موت میرے لیے زندگی ہے، میں ان حالات میں موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہوں۔''

''اگر یہ بات ہے تو میں تجھے زندہ رکھوں گا اور تُو عہدۂ وزارت پر بھی فائز رہے گا۔''

ابوجعفر خاموش ہو گیا، اس کا دل بجھ گیا تھا۔ زیادہ باتیں بھی گراں گزرنے لگی تھیں۔ بادشاہ نے بڑی چھیڑ چھاڑ کی کہ ابوجعفر بات کرے مگر وہ خاموش رہا۔ بادشاہ نے کہا۔ ''ابوجعفر! تو خاموش کیوں ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''سیدی! میں کیا بات کروں، دو باتیں کرنے والوں میں ایک زبردست ہو اور دوسرا زیردست..... وہاں اگر باتیں کی بھی جائیں تو وہ بے مزہ رہتی ہیں کیونکہ آزادی کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے۔''

شاید بادشاہ کو ابوجعفر کی حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب تو جا سکتا ہے۔''

ابوجعفر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ وہ بہت اداس تھا اور رنج و ملال اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ وہ رونا چاہتا تھا لیکن رو نہ سکتا تھا۔ اس کے دل پر ایک گھٹا سی چھا گئی تھی جو برستی بھی نہ تھی اور کھلتی بھی نہ تھی۔ اسے رہ رہ کر حفصہ یاد آ رہی تھی، اب حفصہ سے ملاقاتیں بھی کم ہوتی تھیں کیونکہ حفصہ کو بادشاہ سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔

ظہر کے بعد ابوجعفر کے خیمے میں لبابہ آ گئی۔ لبابہ کے ساتھ اس کی ایک خادمہ بھی تھی۔ لبابہ نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''افسوس کہ کل رات میں تجھ سے نہیں مل سکی، کیونکہ میں اپنے ماموں کے پاس گئی ہوئی تھی۔''

ابوجعفر نے پژمردہ انداز میں جواب دیا۔ ''ہاں لبابہ! میں کل سے بہت اداس ہوں۔ میں تیرے پاس سکون کی تلاش میں گیا تھا لیکن وہاں بھی نہیں مل سکا کیونکہ تو موجود ہی نہ تھی۔''

لبابہ نے اسے چھیڑا۔ ''سنتی ہوں، حفصہ بھی تیرے ساتھ آئی ہے؟''

''ہاں لبابہ! حفصہ بھی آئی ہوئی ہے لیکن وہ میرے ساتھ نہیں آئی، بادشاہ کے ساتھ آئی ہے۔''

''کیوں، کیا تجھ سے اُن بن ہو گئی؟''

''نہیں، اُن بن تو نہیں ہوئی لیکن وہ اس میں عار نہیں محسوس کرتی کہ اس کے عاشقوں میں ابوجعفر بھی ہو اور بادشاہ بھی۔''

لبابہ افسوس کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن شرفاء میں تو یہ نہیں ہوتا؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''شرفاء میں یہ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو لیکن شاید شعرا میں یہ سب ہوتا ہے۔''

لبابہ نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔ ''پھر اب کیا ارادہ ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''صاحبِ ارادہ تو کوئی اور لوگ ہی ہوتے ہیں، میرا تو اپنی ذات پر بھی اختیار نہیں ہے لبابہ!''

اسی وقت حفصہ بھی اس کے خیمے میں آ گئی، وہ کہتی ہوئی خیمے میں داخل ہوئی۔ ''ابوجعفر! کل کی محفل میں تیری عدم موجودگی نے مجھے بہت مایوس کیا۔ آخر تو کہاں چلا گیا تھا؟''

اچانک لبابہ کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک گئی، پھر ابوجعفر کی طرف دیکھا، بولی۔ ''تو یہ بات ہے، وہی تو میں کہوں تو محفل سے اچانک بن بتائے کہاں چلا گیا؟''

ابوجعفر نے حفصہ کو جلانے کا فیصلہ کر لیا، حفصہ کو نظر انداز کر دیا، لبابہ سے کہنے لگا۔ ''تیری عدم موجودگی میں مجھے تیری باتیں بہت یاد آتی رہیں بلکہ جب میں نے یہ سنا کہ تاکستان کا رخ کرنے والوں میں تیرا خاندان بھی شامل ہے تو میں نے بادشاہ کو جبراً اس پر آمادہ کیا کہ وہ بھی ابدہ چلا چلے۔ چنانچہ آج میں تجھے اپنے روبرو دیکھ کر بہت خوش ہوں۔''

لبابہ پھولی نہ سمائی، بولی۔ ''ابوجعفر! اگر تو میرا ہو جائے تو میں کسی کی پروا بھی نہ کروں اور میں ان میں سے نہیں ہوں جو اپنے پیچھے عاشقوں کی فوج لیے پھرتی ہیں۔ جس طرح میرا خدا ایک ہے اسی طرح میرا محبوب بھی ایک ہے۔''

حفصہ کو غصہ آ گیا، بولی۔ ''او رو سیاہ! یہ تو کس طرف اشارہ کر رہی ہے؟''

لبابہ نے جواب دیا۔ ''جس پر میری یہ بات صادق آتی ہو۔''

حفصہ نے کہا۔ ''جس طرح تیرا خدا ایک ہے اسی طرح تیرا محبوب بھی ایک ہے۔ پھر اپنے اس محبوب کو بھی اپنے خدا کی طرح نادیدہ اور ناقابلِ حصول بنا دے۔ نادان لڑکی! بھاری بھاری دور از کار تشبیہیں اور مثالیں کس کام کی، اگر ان کے پیچھے اتنے ہی بھاری اور بڑے معانی و مطالب بھی موجود نہ ہوں۔ تو زمین پر رہتی ہے زمین ہی کی بات کر اور اپنے محبوب کو آسمانی شے نہ بنا۔'' پھر ابوجعفر سے کہا۔

''اور تجھے کیا ہو گیا ہے کہ اس نا سمجھ اور شیخی باز سے اتنا بے تکلف ہوا جا رہا ہے۔''

ابوجعفر حفصہ سے الجھنا نہیں چاہتا تھا، اس نے حفصہ کو دیکھا تک نہیں، لبابہ نے جواب دیا۔ ''میں نادان اور ناسمجھ ہوں لیکن مجھے اپنی نادانی اور ناسمجھی پر فخر ہے کیونکہ اس نادانی اور ناسمجھی نے مجھے ارزاں نہیں کر دیا۔''

حفصہ نے ابوجعفر سے کہا۔ ''ابوجعفر! میں تجھ سے ملنے آئی ہوں، اس روسیاہ سے لڑنے نہیں آئی۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''لبابہ میری رشتے دار ہے اور میرے خیمے میں ہر شخص کو آزادیٔ تقریر حاصل ہے۔ یہ بادشاہ کا خیمہ نہیں ہے، ابوجعفر کا خیمہ ہے۔''

حفصہ نے پوچھا۔ ''کیا میں چلی جاؤں؟''

لبابہ نے کہا۔ ''کیا ابوجعفر نے تجھے بلایا تھا جو اس سے جانے کی اجازت مانگ رہی ہے۔''

حفصہ نے بگڑ کر کہا۔ ''تو خود کو سمجھتی کیا ہے؟ میں چاہوں تو تجھے چند ثانیوں میں درست کر دوں۔''

لبابہ بگڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ''ذرا آگے بڑھ کر تو دیکھ، میں خالی خولی شاعرہ تو ہوں نہیں اور بہت کچھ بھی ہوں۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''لبابہ! تو کس کے منہ لگتی ہے۔ ادھر آ، میرے پاس بیٹھ جا۔ میں بڑی بے قراری میں ہوں، میرے پاس بیٹھ کر سکون پہنچا اور قسم کھا کہ تو مجھے دھوکا نہیں دے گی، میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔''

لبابہ ہنسنے لگی، مسکراتی ہوئی اس طرح ابوجعفر کے پاس جا بیٹھی، گویا ابوجعفر سے مل کر بیٹھنے کا لبابہ کے سوا کسی اور کو اختیار ہی نہ تھا۔ حفصہ واقعی جلنے کڑھنے لگی، بولی۔ ''ابوجعفر! یہ میری شرافت ہے کہ میں برابر برداشت کیے جا رہی ہوں، ورنہ یہ سمجھ لے کہ اگر میں نے تجھے جلایا تو اس زمین پر تجھے کہیں سکون نہ ملے گا۔''

لبابہ نے کہا۔ ''تو اور کس طرح ستائے گی حفصہ! ابوجعفر کے دل پر جو بیت رہی ہے اسے کوئی دوسرا شخص سمجھ بھی نہیں سکتا۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''لبابہ! بس تو اپنی ہی باتیں کیے جا، تیری باتیں بڑی پُرلطف ہیں۔''

حفصہ نے طیش سے کہا۔ ''ابوجعفر! اگر یہ بات ہے تو میری باتیں بھی سن لے، ان میں بھی بڑا لطف ہے۔''

ابوجعفر حفصہ کی شکل دیکھنے لگا، لبابہ بھی چپ ہو گئی۔

حفصہ نے کہا۔ ''ابوجعفر! تو نے بادشاہ کا وہ کلام تو سن ہی لیا ہو گا جو اس نے شب کی کنج نشینی اور خلوت گزینی کی کیفیات میں موزوں کیا تھا۔''

ابوجعفر نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں، میں نے بادشاہ کا وہ کلام سن لیا۔''

حفصہ نے پوچھا۔ ''وہ کیسا ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''بادشاہ کا کلام بھی، کلاموں کا بادشاہ ہے۔ میں اس کی تعریف کے سوا اور کچھ بھی کیا سکتا ہوں۔''

حفصہ نے کہا۔ ''رات کے پچھلے پہر کی ان کیفیات کو میں نے بھی نظم کیا ہے، میرے اشعار بھی سن لے۔''

ابوجعفر ششدر رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ حفصہ اتنی بڑی جرأت کر سکتی ہے۔

حفصہ نے ابوجعفر کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا، اپنے اشعار سنانے لگی۔

''او سیاہی مائل گندم گوں محبوب! تو مہندی کے درختوں
کو کیوں دعا دے رہا ہے؟
کیونکہ انہیں ہم دونوں کے وصل اور ملاپ سے کوئی
خوشی نہیں ہوئی
قمری بھی رنج و حسد سے فغاں سنج تھی
خوشبودار پودے خوشی سے نہیں جھومے تھے بلکہ وہ حسد
سے ہمیں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے
ہوا نے لونگ کی خوشبو کو ہماری خلوت کی پُرکیف خوشیوں
کا نظارہ کرایا
باغ اس پر آزردہ اور غمگین تھا کہ اسے یہ لذتیں کیوں
حاصل نہ ہوئیں
اے وہ شخص! جس کی شہروں پر حکومت ہے، تُو نے
اب دلوں پر بھی حکمرانی شروع کر دی ہے
اپنے دل سے خوش فہمی نکال دے اور وہ ستارے جو
مہندی کے جھنڈ میں ہمیں دیکھ رہے تھے
اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ہم دونوں کی نگرانی کر رہے تھے
اور جب حسد، رنج اور غم اتنا عام ہو، تو یہ کس طرح
کہہ سکتا ہے کہ زمانہ ہمارے موافق تھا''

ابوجعفر نے اپنے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس کیا، پوچھا۔ ''حفصہ! کیا یہ تیری حقیقی کیفیات ہیں؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''تیرے اس سوال کا جواب میں اس وقت دوں گی جب تو پہلے میرے سوال کا جواب دے گا۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''سوال کر، میں جواب دوں گا۔''

حفصہ نے لبابہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تو لبابہ کو اتنا ہی پسند کرتا ہے جتنا ظاہر کر رہا ہے؟''

ابوجعفر کو چکر سا آ گیا، بولا۔ ''تیرے اس سوال کا میرے سوال سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے اور بہت بڑا تعلق ہے۔'' حفصہ کہنے لگی۔ ''جس طرح تو لبابہ سے مل کر خوش ہوتا ہے اور اس کی ہم نشینی میں لطف و لذت محسوس کرتا ہے، اسی طرح میں بھی ابوسعید کی صحبت سے لطف اندوز ہو لیتی ہوں۔''

ابوجعفر لاجواب ہو گیا۔ اس نے لبابہ سے میٹھی میٹھی لگاوٹ کی باتیں کر کے، حفصہ کو جلانے کا جو کھیل کھیلا تھا، حفصہ نے اسے ابوجعفر ہی پر الٹ دیا۔

حفصہ نے جاتے جاتے لبابہ سے کہا۔ ''کومل! ابوجعفر کو اچھی طرح قابو میں رکھ، ورنہ کوئی اور لے اڑے گی۔''

حفصہ چلی گئی اور ماحول کو ویران اور اداس کر گئی۔ بعد میں لبابہ نے بڑی کوشش کی کہ ابوجعفر پہلے کی طرح بولنے چہکنے لگے لیکن ناکام رہی۔ آخر وہ بھی چلی گئی اور ابوجعفر منہ لپیٹ کر رونے لگا۔

تاکستان میں رنگین محفلیں جمتی رہیں۔ حفصہ، ابوسعید کی خلوت و جلوت میں اپنی شیریں گفتاری اور سحر کلامی کا سماں باندھتی رہی۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ''شاید ابوجعفر اور حفصہ میں ان بن ہو گئی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ اس طرح حفصہ ابوجعفر کی وزارت کو تقویت پہنچا رہی ہے۔''

کسی اور نے کہا۔ ''تم دونوں غلطی پر ہو، حفصہ جتنی بڑی شاعرہ ہے، اتنی ہی آزاد خیال بھی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے ایک دن بادشاہ سے کہا کہ عالم بالا میں جو روحیں قریب قریب رہی ہیں، ان میں وہیں سے شناسائی اور آشنائی قائم ہے۔ اس لیے اس عالم ظاہر میں بیک وقت کئی کئی سے عشق ممکن ہے۔''

چوتھے نے اپنے گال تھپتھپائے۔ ''توبہ توبہ، یارسول اللہ صلعم! آپ نے صحیح فرمایا تھا کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب کسی مومن کے لیے دنیا کے اوپر سے زیادہ اندر رہنا بہتر ہوگا، شاید یہی وہ زمانہ ہے۔''

لوگ ابوجعفر کو دیکھ کر اور زیادہ سرگوشیاں شروع کر دیتے۔ جب وہ بادشاہ کے سامنے جاتا تو ایسا لگتا گویا دونوں ایک دوسرے کو زبردستی گوارا کر رہے ہیں۔ حفصہ کا بھائی سلیمان صاحب اللیل تھا، اس نے جو دربار میں ابوجعفر کا یہ رنگ دیکھا تو اور زیادہ مخالف ہو گیا۔ وہ اپنی بہن کو سمجھاتا رہتا۔ وہ حفصہ سے کہتا۔ ''تیرے لیے ابوجعفر کے مقابلے میں ابوسعید بہت مناسب ہے۔ میرے خیال میں اب تجھے ابوجعفر سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے۔''

حفصہ نے ناخوشگوار لہجے میں جواب دیا۔ ''بھائی! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے دونوں کو اپنی عقل کے میزان پر رکھا تو ابوجعفر کا پلڑا جھک گیا۔ بادشاہ ہونا الگ بات ہے اور بہت بڑا شاعر ہونا الگ بات۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ ابوجعفر کو اپنے دل سے نکال دوں لیکن ناکام رہی۔''

سلیمان نے کہا۔ ''کیا تجھے اس مناقشے کا علم ہے جو ابوجعفر اور بادشاہ میں پیدا ہو چکا ہے؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''مجھ سے زیادہ اس مناقشے کا کس کو علم ہو سکتا ہے۔''

''پھر تیرا کیا خیال ہے، اس میں جیت کس کی ہوگی اور اس کا کیا انجام ہوگا؟''

''میں نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں ہمیشہ یہ کوشش کروں گی کہ ابوجعفر کو بادشاہ سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

سلیمان نے نفرت سے کہا۔ ''تجھے ان دونوں کے مناقشے میں غیر جانبدار رہنا چاہیے۔''

''ناممکن، میں مجبور ہوں۔''

حفصہ اور ابوجعفر کی کشیدگی کی بات ابوجعفر کے چچازاد بھائی حاتم تک پہنچی تو وہ ذرا حیران تو ضرور ہوا لیکن اس نے ابوجعفر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ابوجعفر! غلطی تیری ہی ہے۔ تجھے حفصہ کو بادشاہ سے نہیں ملانا چاہیے تھا۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''بھائی حاتم! میرا ملانا تو بہانہ بن گیا ورنہ کسی اور ذریعے سے بھی بادشاہ حفصہ سے مل سکتا تھا۔''

حاتم نے کہا۔ ''حفصہ چیز ہی ایسی ہے کہ ہر کوئی اس کی محبت اور ملاقات کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''بھائی حاتم! میں وزارت سے سبکدوشی حاصل کرنا چاہتا ہوں اور ابوسعید مجھے حفصہ کے سامنے ذلیل کرنے کے لیے وزارت پر فائز رکھنا چاہتا ہے۔ مجھے مشورہ دے کہ میں اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کروں۔''

حاتم نے سرگوشی میں کہا۔ ''زبان کو قابو میں رکھ، ہوائیں غمازی کرتی ہیں۔''

ابوجعفر نے بڑی حسرت سے کہا۔ ''اے کاش میں شاعر نہ ہوتا۔ میری شائستگی، میرا ادب، میری شاعری، یہ ساری چیزیں میرے لیے وبال جان ہیں۔''

یہ لوگ غرناطہ واپس گئے۔ ابوجعفر نے غرناطہ میں

رسما وزارت کی خدمات انجام دیں ورنہ اس میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت تنہائی میں گزارتا۔ لبابہ نے کئی بار کوشش کی کہ ابوجعفر کا دل خوش کرے لیکن ناکام رہی اور مایوس واپس گئی۔ ابوجعفر کو اس کے باپ اور بھائیوں نے بھی سمجھایا کہ وہ جن حالات میں پھنسا ہوا ہے، اس سے نکلنے کا بہترین راستہ یہی ہے کہ صبر اور خاموشی اختیار کی جائے اور حفصہ اور بادشاہ کو ان کے حالوں پر چھوڑ دیا جائے لیکن ابوجعفر کو یہ سارے مشورے فضول اور بیکار محسوس ہوتے رہے۔

ابوجعفر کے دوستوں نے محفلِ طرب منعقد کی۔ بظاہر یہ ابوجعفر کے دوست تھے لیکن اندر سے یہ سب بادشاہ کے جاسوس تھے جنہیں ابوسعید نے ابوجعفر کی نگرانی پر لگا دیا تھا کیونکہ بادشاہ خوب جانتا تھا کہ جب ابوجعفر کے دل میں حفصہ کے معاملے میں کینہ وحسد کی آگ سلگ رہی ہے تو کسی نہ کسی دن دھواں بھی اٹھے گا اور اس دھوئیں کو اٹھنے سے پہلے ہی دبا دینا ضروری تھا۔ اس محفلِ طرب میں رقص کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ پینے پلانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ پہلے تو ساغر کا دور چلا۔ ابوجعفر اور اس کے دوست مل جل کر، ہنس ہنس کر شراب پیتے رہے اور یہاں تک بے تکلفی اختیار کی گئی کہ مطربوں اور رقاصاؤں کو بھی اس میں شریک کرلیا گیا۔

نصف شب کو رقص وموسیقی کا ہنگامہ شروع ہوا۔ اس میں مطرب نے ابوجعفر ہی کا کلام سنانا شروع کردیا اور ایک اشبیلی رقاصہ نے اس پر رقص کیا۔ کلام حزنیہ تھا، رقص بھی سست اور المیہ تھا۔ اس میں ابوجعفر نے اپنی بدبختی کا رونا رویا تھا۔

''بخدا یہ روزِ مسرت یا شبِ شادمانی ہے
لیکن اے سیہ بختی تو بھی تو یہیں کہیں چھپی کھڑی ہے
محفل کو بڑی بڑی تیز شمعوں والی روشنی سے روشن کیا گیا ہے
اور دورِ ساغر سے دلوں کی مسرتیں شدید کی جارہی ہیں
لیکن ابوجعفر خوب جانتا ہے کہ خوشیاں اور شادمانیاں
اس کے لیے نہیں ہیں
اس کی بدبختی اور محرومی کا اگر چند لفظوں میں احاطہ کیا جائے تو کہا جائے گا کہ
جب ابوجعفر کسی دن تمناؤں کا جال بچھاتا ہے تو وہ
دن وحشی ہرن کی طرح خوفزدہ
راہِ فرار اختیار کرتا ہے''

اشبیلی رقاصہ نے بڑی کوشش کی کہ وزیر ابوجعفر اس کے فن کی داد دے لیکن مایوس رہی۔ وہ گیت اس طرح سناتا رہا، جس طرح کوئی مصیبت کا مارا، غمزدہ ہجوم یاس میں طربیہ گیت سنتا ہے اور رقص اس طرح دیکھتا رہا جس طرح کوئی خیالوں میں مخفل جمالیتا ہے اور اس کے مدھم اور بے ربط مناظر سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

کسی دوست نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''ابوجعفر! تیری حفصہ سے کب سے ملاقات نہیں ہوئی؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کا کوئی حساب نہیں رکھا لیکن یہ جانتا ہوں کہ حفصہ ایک نہ ایک دن میری جان ضرور لے لے گی۔''

دوست نے کہا۔ ''میں سنتا ہوں آج کل حفصہ بادشاہ پر نثار ہورہی ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''بادشاہ پر نہیں، بادشاہت پر۔ میں حفصہ کو بے نیاز سمجھتا تھا لیکن وہ بھی منصب پرست بلکہ شاہ پرست نکلی۔ میرے دل سے دنیا کا اعتبار جاتا رہا۔''

دوست نے کہا۔ ''بادشاہ کو بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر تو کہے تو بادشاہ کے خلاف کوئی سازش تیار کی جائے۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں ابوسعید کے خلاف کوئی سازش نہیں کروں گا۔''

دوست نے کہا۔ ''کیا ابوسعید کی زیادتیوں کے خلاف تیرے دل میں انتقام کی آگ نہیں بھڑکتی؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس لیے کہ ابوسعید کی حکومت میں میرے باپ اور بھائی اس کے معاون اور مددگار ہیں۔ کیا میں اپنے باپ اور بھائی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتا ہوں؟''

اس رات ابوجعفر کے دوست اسے بڑی دیر تک گھیرتے رہے، لیکن وہ ان کی باتوں میں نہیں آیا۔

کئی دن بعد بادشاہ نے ابوجعفر سے شکایتاً کہا۔ ''میں نے سنا ہے تو اپنے دوستوں میں میری شکایتیں کرتا پھرتا ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''میں بادشاہ کی شکایتیں اپنے دوستوں سے کیوں کروں گا جبکہ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ کے مقابلے میں ان کی حیثیت ہی کیا ہے۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''کیا تو اسے اپنی حق تلفی سمجھتا ہے کہ حفصہ میری طرف راغب ہوگئی ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''یہ بات بھی نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ سے پہلے حفصہ خود راغب ہوگئی تھی۔''

بادشاہ اسے گھیر رہا تھا، بولا۔ ''کیا یہ بھی غلط ہے کہ تو اپنے فرائضِ منصبی بے دلی سے انجام دیتا ہے؟''

ابوجعفر نے کہا۔ ''میں اس کی بھی تردید نہیں کروں گا کیونکہ میں نے کئی بار بادشاہ سے درخواست کی ہے کہ میں منصب وزارت کا اہل نہیں ہوں اور مجھے سبکدوش کردیا جائے لیکن سیدی اس پر رضامند ہی نہیں ہوتے۔''

بادشاہ نے خفگی سے کہا۔ ''اور اس رات تو بغیر بتائے کہاں چلا گیا تھا؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''سیدی! جس کوتاہی کو آپ پہلے ہی نظرانداز کرچکے ہیں، اس کا دوبارہ ذکر کرنا مروتِ شاہی کے خلاف ہے۔''

بادشاہ اور برہم ہوگیا، بولا۔ ''تیری مزید کوتاہیاں میرے لیے ناقابل برداشت ہوں گی، اب تو جاسکتا ہے۔''

ان دونوں کی گفتگو حفصہ بھی سن رہی تھی لیکن اس وقت بادشاہ نے اسے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ ابوجعفر کے جاتے ہی بادشاہ نے حفصہ کو اپنے پاس بلالیا، ہنستے ہوئے کہا۔ ''تو نے دیکھ لی اپنے شاعر کی جرأت اور حوصلہ؟''

حفصہ بہت آزردہ تھی، آہستہ سے جواب دیا۔ ''دیکھ لی، اور اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوں کہ بادشاہ جب کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو وہ اپنی بلندی سے بالکل نچلی سطح پر آجاتے ہیں اور اس وقت ان میں اور کسی عام آدمی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''تو نے اس کا اندازہ کس طرح لگایا؟''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''اس طرح کہ بادشاہ اس کی خطائیں اور غلطیاں تلاش کررہے تھے حالانکہ اس کی ہر کوتاہی قابلِ معافی تھی اور اس کا ہر جواب لائقِ تحسین۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''حفصہ! تو میرا مطلب نہیں سمجھی، اس طرح میں تجھ پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ ابوجعفر تیرے لائق نہیں ہے، تو اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔''

حفصہ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''سیدی! ابوجعفر کا نقش میرے دل پر بہت گہرا ہے، جسے میں، آپ یا کوئی بھی مٹا نہیں سکتا۔ میں اپنی صاف گوئی پر معذرت خواہ ہوں۔''

بادشاہ اکدم سنجیدہ ہوگیا، بے نیازی سے بولا۔ ''مجھے معلوم نہیں ابوجعفر کی کون سی ادا بھا گئی ہے۔ ورنہ میں اس میں کوئی خوبی نہیں دیکھتا۔ اگر تو کہے تو میں ابوجعفر جیسے بیس تیرے لیے خرید سکتا ہوں جو ہر وقت تیری ناز برداریاں بھی کریں اور خدمت بھی۔''

حفصہ نے نہایت کرب سے اپنی آنکھیں بند کرلیں، بولی۔ ''بس سیدی بس! اب مزید تحقیر نہ کیجیے ابوجعفر کی۔ اسے اتنا ارزاں نہ کردیجیے۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ ابوجعفر اکثر و بیشتر یہ کہتا رہتا ہے کہ حفصہ ایک نہ ایک دن میری جان لے لے گی۔ میرا خیال ہے اس میں مشیتِ ایزدی کارفرما ہے اور یہ فقرے الہامی ہیں، جو کسی دن بھی سچ ثابت ہوسکتے ہیں۔''

حفصہ نے سہم کر بادشاہ کی طرف دیکھا، بولی۔ ''نہیں سیدی! ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''بس ایک شرط پر..... وہ یہ کہ تو ابوجعفر سے ملنا چھوڑ دے۔''

حفصہ نے جواب دیا۔ ''میں اس سے ایک عرصے سے نہیں ملی ہوں لیکن میں نہ ملنے کی پابند نہیں رہ سکتی۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''تو سوچ لے، میں سوچنے کا موقع دیتا ہوں ورنہ ابوجعفر کا برا حشر دیکھنے کے لیے تیار رہ۔''

حفصہ نے آہستہ سے کہا۔ ''میں منافقت نہیں اختیار کروں گی، سوچنے کے بعد بھی وہی کہوں گی جو ابھی کہہ چکی ہوں۔''

بادشاہ کا مزاج بدمزہ ہوگیا اور حفصہ کو سامنے سے ہٹا دیا۔ ابوجعفر کے لیے اس کی نیت بدل چکی تھی۔ وہ اس کانٹے کو نکالنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

☆☆☆

ابوجعفر غرناطہ کے سرسبز و شاداب علاقے میں تنہا تھا۔ یوں تو وہ ایک شاندار روایات کا حامل خاندان رکھتا تھا اور اس کے بھائی اور دوسرے احباب اعلیٰ مراتب پر فائز تھے لیکن حفصہ کی محبت نے اسے ان سب سے جدا کردیا تھا۔ وہ ابوجعفر کو سمجھاتے رہتے کہ حفصہ کے معاملے میں بادشاہ کی رقابت سے بچے لیکن ابوجعفر بے بس تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں غرناطہ کی متوازی پہاڑیوں میں نکل جاتا۔ کبھی دریائے شنیل کے کنارے کنارے وہاں تک چلا جاتا جہاں دریائے ڈارو اس میں گرتا تھا۔ سرو کے بلند و بالا درختوں کے سائے میں وہ کسی مسافر کی طرح گھنٹوں پڑا رہتا اور سورج کی شعاعیں ادھر سے ادھر ہوجاتیں لیکن وہ بے حس و حرکت آنکھیں بند کیے حفصہ اور اپنے حشر کی بابت سوچتا رہتا۔ سیر و تفریح کی غرض سے گھومنے پھرنے والے لوگ اس کے پاس سے سرسری گزر جاتے لیکن جو اسے پہچان لیتا یہی کہتا۔ ''ابوسعید کا وزیر کتنا سادہ طبع ہے، ورنہ کہیں کوئی وزیر اس طرح تنہا سبزہ زاروں میں پھرتا ہے۔''

اس دن وہ بڑی دیر تک سبزے پر پڑا رہا، رات ہوگئی۔ قمری مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ آسمان پر چاند کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ پھولوں کی مہک اور ٹھنڈی ہواؤں نے اسے تھپکیاں دیں اور ابوجعفر کی آنکھ لگ گئی۔ معلوم نہیں کب

تک سوتا رہا اور اس وقت جاگا جب صاحب الخیل سلیمان نے اسے بیدار کیا۔ حفصہ کے بھائی سلیمان کا کام ہی یہی تھا کہ راتوں میں شہر کی نگرانی کرے۔ اس نے رات کی تاریکی میں کسی شخص کو سبزہ زار میں سوتے جو دیکھا تو اسے جگا دیا اور بتایا۔ ''رات ہو چکی ہے اپنے گھر کی راہ لے۔''

ابوجعفر نے بیدار ہوتے ہی انگڑائی لی اور صاحب الخیل کو پہچاننے کی کوشش کی، پوچھا۔ ''تو کون ہے؟''

سلیمان نے آواز سے اسے پہچان لیا، بولا۔ ''لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے کہیں کوئی وزیروں سبزہ زاروں میں سوتا پھرتا ہے۔''

ابوجعفر نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ''سلیمان! ان دنوں میں بہت پریشان ہوں۔ خدا تیرا بھلا کرے اور حج کی سعادت سے بہرہ مند کرے۔ ذرا دیکھنا تو میرا گھوڑا کدھر ہے؟''

سلیمان نے جواب دیا۔ ''تیرے گھوڑے کو تو میں نے دیکھا نہیں، اسے چور لے گئے ہوں گے۔ اگر تو پسند کرے تو میرے گھوڑے پر میرے پیچھے بیٹھ جا، تو جہاں کہے گا پہنچا دوں گا۔''

ابوجعفر کے جی میں آئی کہ کہہ دے، مجھے اپنی بہن حفصہ کے پاس پہنچا دے لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ معلوم نہیں، حفصہ کہاں ہو؟ اپنے گھر میں یا ابوسعید کے محل میں اور پھر یہ خوف بھی تھا کہ اس کی اس بات کا سلیمان برا نہ مان جائے۔ سلیمان نے کہا۔ ''میرے پیچھے بیٹھ جا۔''

ابوجعفر سلیمان کے پیچھے بیٹھ گیا اور سلیمان ایک طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ابوجعفر سے پوچھا۔ ''تو نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''میرا حلیہ بالکل صحیح ہے، لیکن بات کیا ہے؟''

سلیمان نے کہا۔ ''کیا بادشاہ تجھ سے ناراض ہے؟''

''شاید، کیونکہ اس کی باتوں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔''

سلیمان نے کہا۔ ''حفصہ کہتی تھی کہ تیرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔''

ابوجعفر چونک گیا، پوچھا۔ ''کیا حفصہ کو مجھ سے ہمدردی ہے؟''

سلیمان نے جواب دیا۔ ''بہت زیادہ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی ہمدردی تجھے مہنگی پڑے گی۔''

ابوجعفر چپ ہو گیا کیونکہ وہ سلیمان کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا تھا۔

سلیمان نے کہا۔ ''میں نے حفصہ کو کئی بار سمجھایا کہ اب وہ تیرا پیچھا چھوڑ دے لیکن وہ اس پر کسی طرح تیار ہی نہیں ہوئی۔''

ابوجعفر کے دل میں ایک بار پھر حفصہ کی محبت کا چراغ پوری آب و تاب سے روشن ہو گیا۔

سلیمان معلوم نہیں کیا کچھ کہتا رہا اور ابوجعفر بھی اپنے خیالوں میں گم رہا لیکن جب سلیمان نے اس سے گھوڑے پر سے نیچے اترنے کے لیے کہا تو اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سلیمان نے کہا۔ ''میں تجھے اپنے گھر لے آیا ہوں، حفصہ گھر میں موجود ہے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے تجھ پر رحم سا آ گیا ہے اور پھر تو نے مجھ پر احسان بھی تو کیا تھا۔''

ابوجعفر کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ پھولا نہ سمایا۔

حفصہ نے کافی دنوں بعد ابوجعفر کو اپنے سامنے جو دیکھا تو اسے سکتہ سا ہو گیا۔ دونوں طرف تکلف اور اجنبیت پیدا ہو گئی تھی۔ زیتون کے چراغ کی روشنی میں دونوں ایک دوسرے کو گم صم کھڑے دیکھ رہے تھے۔ سلیمان نے اپنی بہن سے کہا۔ ''آج میں نے ابوجعفر کو گھاس پر مسافر کی طرح سوتے دیکھا تو اپنے گھر لیے چلا آیا۔ حفصہ! اس کی حالت تو قابلِ رحم نظر آتی ہے۔''

حفصہ نے اجنبیوں کی طرح کہا۔ ''بیٹھ جا۔'' اور اس کے سامنے ہی خود بھی بیٹھ گئی۔ ابوجعفر بھی ذرا سے تامل کے بعد بیٹھ گیا۔ سلیمان چلا گیا۔

کچھ دیر دونوں ہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ آخر ابوجعفر نے پہل کی، بولا۔ ''سلیمان کہتا تھا، تجھے اب بھی مجھ سے ہمدردی ہے۔''

حفصہ نے دل جلے لہجے میں کہا۔ ''بھائی جھوٹا ہے، مجھے تجھ سے کوئی ہمدردی نہیں کیونکہ لبابہ کی موجودگی میں میری ہمدردی کیا معنی رکھتی ہے۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''حفصہ! تو نے مجھے سمجھنے میں ہمیشہ غلطی کی ہے۔ آج تک میں نے تیرے سوا کسی اور کو نہیں چاہا۔''

حفصہ نے جل کر کہا۔ ''پھر وہ تیری خلوتوں میں کیا لینے آتی ہے؟''

ابوجعفر نے جنوب مشرق کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یا اللہ! حفصہ کے دل سے شکوک نکال دے۔ تو گواہ ہے کہ میں نے حفصہ کے علاوہ کسی سے بھی محبت نہیں کی اور لبابہ کے لیے میرے دل میں شرہ بھر بھی محبت نہیں ہے۔''

حفصہ بھی اس کے انداز سے بڑی متاثر ہوئی، رقت

زدہ آواز میں بولی۔ ”میں اپنی اس غلطی پر آج تک نادم ہوں کہ میں نے بلاوجہ کیوں ابوسعید سے ملاقات کی اور اسے اتنا موقع کیوں دیا جو آج تجھے یہ بُرے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔“

ابوجعفر نے کہا۔ ”میں تجھے خطاکار کیوں قرار دوں، میری قسمت ہی خراب ہے۔“

حفصہ نے اسے کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں دیر تک گلے شکوے کرتے رہے۔

حفصہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”ابوسعید مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے تجھ میں کیا بات دیکھ لی ہے جو یوں محبت کر رہی ہوں، اس نے کہا کہ اگر میں پسند کروں تو وہ تیرے جیسے بیس غلام خرید دے۔ میں نے بادشاہ کو منع کر دیا کہ وہ تیری تحقیر نہ کرے، میں نہیں برداشت کر سکوں گی۔“

ابوجعفر کو بھی غصہ آگیا، طیش میں بولا۔ ”او کالے کلوٹے بادشاہ! آخر تو خود کو سمجھتا کیا ہے ——— اور حفصہ! میں ابوسعید جتنی حیثیت تو نہیں رکھتا لیکن اگر تو کہے تو میں بیس دینار میں ابوسعید جیسا سیاہی مائل گندم گوں غلام خرید کر تیرے حوالے کر سکتا ہوں۔“

حفصہ کو ہنسی آگئی، بولی۔ ”اچھا اب بس بھی کر۔ کہیں تیری یہ بات کوئی بادشاہ کے کان تک نہ پہنچا دے۔“

بہت دنوں بعد دونوں کو تنہائی اور یکجائی میسر آئی تھی، حفصہ نے درخواست کی کہ وہ اسے اپنا تازہ کلام سنائے۔ ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”حفصہ! میں اپنا تازہ کلام سنا تو سکتا ہوں لیکن اس میں بھی بادشاہ کے خلاف گلہ موجود ہے۔“

حفصہ نے کہا۔ ”تو پروا نہ کر کیونکہ یہاں ہم دونوں کے سوا تیسرا کوئی بھی نہیں اور میں بادشاہ سے تیری چغلی کھانے سے رہی۔“

ابوجعفر حفصہ کو ساتھ لے کر عقبی باغ میں چلا گیا۔ وہاں دونوں سرو کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ہوا سے ابوجعفر کے بال لہرا رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال درست کیے اور کہا۔ ”لے، اگر تو میرا کلام سننا ہی چاہتی ہے تو سن!“ اس کے بعد ابوجعفر نے اپنا کلام سنایا۔

”میرے مخاطب وہ سارے ہی لوگ ہیں، جنہیں میں جانتا ہوں
یا وہ مجھے جانتے ہیں
اے لوگو! میری بات سنو۔ آؤ دیکھو، کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟
تم میں کوئی ایسا ہے جو مجھ سے میرا ادب، میری تہذیب، میری
وزارت مجھ سے خرید لے اور
اس کے عوض مجھے اس پروا ہے کی حیثیت دے
دے جو غرناطہ
سے دور دنیا کی سب سے اونچی چوٹی پر رہتا ہو
اور جو بالکل آزاد ہو، نہ کسی کو حکم دیتا ہو نہ کسی...
کا حکم مانتا ہو
خدا کے برگزیدہ بندو! جاؤ، بادشاہ سے کہہ دو کہ اس دنیا میں اسی کا حکم قابل قبول ہے
جو خطاکاروں کو بخش دیا کرتا ہے
آہ، میں ایک شخص کی وجہ سے اپنی زندگی سے تنگ...
آچکا ہوں
یہ شخص غضب ناک بھی ہے، ترش رو سست بھی اور ڈرنے والا بھی
میں نے جب بھی اس کے چہرے پر نظر ڈالی، موت گھورتی دکھائی دی
میں نے گریز اختیار کیا لیکن اس کے ہاتھ لمبے ہیں
اور یہ ہمیشہ میری فکر میں رہتے ہیں
زمانہ گواہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اس کی خیرخواہی اور بھلائی میں شب و روز گزارے ہیں
لیکن وہ اس سے بھی خوش نہیں
میں تھک چکا ہوں کیونکہ اب اس کو خوش کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی
اور نہ ہی میں راہِ فرار اختیار کر سکتا ہوں؟“

ابوجعفر نے یہ اشعار اتنے جوش و خروش سے سنائے کہ اسے احتیاط کا خیال ہی نہ رہا۔ رات کے سناٹے نے اس آواز کو معلوم نہیں کس کس کے کانوں تک پہنچا دیا۔ حفصہ نے کہا۔ ”ابوجعفر! تو نے یہ کلام بآوازِ بلند سنا کر اچھا نہیں کیا۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”حفصہ! میں شکوہ کرنے پر مجبور ہوں۔“

حفصہ نے کہا۔ ”اب تو ہمت کر اور غرناطہ سے فرار ہونے کی کوشش کر۔“

ابوجعفر نے کہا۔ ”میں ایسا کر تو سکتا ہوں لیکن میں ابوسعید کی عملداری سے نکل کر کہاں جا سکتا ہوں؟“

حفصہ نے مشورہ دیا۔ ”ملک میں ابوسعید کی رقیب ایک اور طاقت بھی ہے...... ابن مردنیش کی۔ تو اس کے پاس پناہ لینے کی کوشش کر، میرا خیال ہے وہ تجھے مایوس نہیں کرے گا۔“

ابوجعفر نے پوچھا۔ ”کیا میں تنہا جاؤں یا چند آدمیوں کو اپنے ساتھ لے لوں؟“

”تو جیسا مناسب سمجھ، کر گزر لیکن اب تیرا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ بعد میں، میں بھی تیرے پاس آجاؤں گی۔“

وہ رات ابوجعفر اور حفصہ نے اس طرح گزاری گویا وہ ان کی زندگی کی آخری رات ہے۔ صبح الوداع کہنے سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی گرم جوشی سے بوسہ دیا اور جدا ہو گئے۔

اپنے بھائی سلیمان کے بارے میں حفصہ کی رائے ذرا تبدیل ہو گئی تھی کیونکہ رات اس نے ابوجعفر سے جو ہمدردی برتی تھی اس نے ان دونوں ہی کو متاثر کر دیا تھا۔ حفصہ نے رات کی دلچسپ باتوں کا اپنے بھائی سلیمان سے ذکر کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”بھائی! رات ابوجعفر نے اپنی بے بسی اور بدقسمتی کا جو سماں اپنے اشعار میں باندھا ہے، اگر تو سنتا تو بہت متاثر ہوتا۔“

سلیمان نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”وہ بہت پریشان ہے اور مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی ہے۔“

بہن نے کہا۔ ”ابوسعید نے کہا تھا کہ وہ میرے لیے بیس ابوجعفر خرید سکتا ہے، اس کا ابوجعفر نے بھی بڑا دلچسپ جواب دیا۔“

سلیمان نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”کیا جواب دیا؟“

حفصہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ابوجعفر کہتا تھا کہ میں بادشاہ جتنی حیثیت تو نہیں رکھتا لیکن ابوسعید جیسا گندم گوں غلام بیس دینار میں خرید کر تیری خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔“

سلیمان نے حفصہ کی یہ بات بڑی دلچسپی سے سنی، بولا۔ ”ابوجعفر کو یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی، یہ بڑا عاقبت نااندیش معلوم ہوتا ہے۔“

ابوسعید اپنے وزیر سے بہت ناراض تھا۔ اس کا دربار خاص و عام سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے اس بھرے دربار میں ہی ابوجعفر سے بازپرس شروع کر دی، پوچھا۔ ”تو نے حفصہ کے سامنے جو کلام سنایا تھا، ذرا مجھے اور درباریوں کو بھی سنا دے۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ وہ کلام میں دربار میں نہیں سنا سکتا۔“

ابوسعید نے سخت برہمی سے کہا۔ ”تیری یہ جرأت کہ میرے حکم سے سرتابی کرے۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ تیرے اس کلام میں میرے خلاف بھڑاس نکالی گئی ہے، تیرا سینہ میرے خلاف نفرتوں سے پُر ہے۔“

ابوجعفر سہم گیا۔ ابوسعید نے مزید کہا۔ ”اور تو بیس دینار میں میرے جیسا غلام خرید کر حفصہ کو پیش کر سکتا ہے۔ واللہ! اب تو تیری باتیں بالکل ناقابلِ برداشت ہو گئی ہیں۔ میں تجھے تین دن کا موقع دیتا ہوں۔ ان تین دنوں میں تو اپنی اصلاح بھی کر لے گا اور حفصہ سے دستبرداری کا اس کی موجودگی اور بھرے دربار میں اعلان بھی کر لے گا۔ اگر نہیں تو اب تو میرے عتاب سے بچ نہیں سکے گا۔“

درباری ابوجعفر کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

ابوجعفر ڈرا سہما گھر پہنچا اور اپنے باپ اور بھائیوں کے سامنے اپنے حالات پیش کیے اور پوچھا۔ ”اب آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

باپ نے سوچے سمجھے بغیر ہی مشورہ دے دیا۔ ”بادشاہ نے جو کچھ کہا ہے اس کی تعمیل کر۔“

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ”لیکن میں حفصہ سے دستبردار ہونے کو ہرگز تیار نہیں۔“

اس کے بھائی محمد نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ تو اپنے نفس کا غلام ہے۔ ہم تیری بھلائی کے خواہاں ہیں۔ اگر اس معاملے میں ہم سب تیرا ساتھ دیں تو ہمارے سامنے اتنا طاقتور دوسرا کون بادشاہ ہے۔ رہا ابن مردنیش، تو شاید ابھی وہ اتنا طاقتور نہیں ہے کہ اس کی طاقت کا سہارا لیا جا سکے۔“

ابوجعفر نے کہا۔ ”مجھے صرف تین دن ملے ہیں اور میں ان تین دنوں کو برباد نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے یہ تین دن بھی ضائع کر دیے تو میں چوہے کی طرح مار دیا جاؤں گا۔“

باپ نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”لیکن میں تیرا ساتھ نہیں دوں گا کیونکہ تو ہمیشہ اپنے نفس کا کہا کرتا ہے۔“

ابوجعفر کے بھائی عبدالرحمٰن نے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لی۔ ابوجعفر مایوس اور دل برداشتہ تنہا فرار ہونے کے منصوبے بنانے لگا۔

جب ابوجعفر کا باپ عبدالملک اور بھائی محمد کہیں چلے گئے تو عبدالرحمٰن نے ابوجعفر کو مطلع کیا۔ ”ابوجعفر! میں تیرا ساتھ دوں گا کیونکہ میں نے بھی ابوسعید سے کوئی فیض نہیں حاصل کیا اور بھائی حاتم بھی تیرا ساتھ دیں گے۔“

ابوجعفر کے چہرے پر مایوسی کی جگہ امید نے لے لی، بے اختیار بولا۔ ”بھائی عبدالرحمٰن! اس ظلمت کدے میں تم

آفتاب کی طرح ابھرے ہو۔ کیا بھائی حاتم سے مجھے بات کرنی پڑے گی؟''

''نہیں، میں خود کرلوں گا۔ تو فرار ہونے کا منصوبہ بنا، ہم دونوں تیرے ساتھ چلیں گے۔''

ابوجعفر نے حفصہ کو مطلع کردیا کہ وہ غرناطہ سے رخصت ہورہا ہے۔

حفصہ نے پوچھا۔ ''کبھی واپس تو آؤ گے؟''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''شاید نہیں، ہاں اگر ابنِ مردنیش غرناطہ پر قابض ہوگیا تو میں یہاں فاتحانہ داخل ہوں گا ورنہ تجھے مریہ بلوالوں گا۔''

حفصہ نے افسوس سے کہا۔ ''تو مرد ہے، مردوں کی طرح فرار ہوکر غرناطہ سے مریہ پہنچ سکتا ہے لیکن میں کس طرح نکلوں گی؟ ابوسعید مجھ پر توسخت پہرے بٹھادے گا۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''میں اس کی بھی کوئی ترکیب کروں گا لیکن پہلے تو ایک وعدہ کر۔''

حفصہ نے پوچھا۔ ''کس بات کا وعدہ؟''

ابوجعفر نے ہنس کر کہا۔ ''تو ابوسعید کی طرح ابنِ مردنیش کو اپنا کلام سنانے کی کوشش نہیں کرے گی۔''

حفصہ نے شرما کر جواب دیا۔ ''میں اس کا وعدہ کرتی ہوں۔''

اس دن ابوجعفر اور حفصہ نے ایک ساتھ کافی وقت گزارا۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر و بے نیاز تھے۔ ابوجعفر سوچتا، وہ حفصہ کی جدائی برداشت کس طرح کرے گا۔ بار بار جی میں آتی وہ غرناطہ نہ چھوڑے، مریہ نہ جائے اور حفصہ کی خاطر وہ ساری ذلتیں گوارا کرلے جو ابوسعید دے رہا ہے۔

حفصہ کا دل بار بار اسے مجبور کررہا تھا کہ ابوجعفر کو روک لے، نہ جانے دے لیکن وہ اس کی جدائی اس لیے گوارا کرنے پر مجبور تھی کہ اس طرح ابوجعفر کی جان بچ جائے گی اور یہ امید تو ہے کہ کسی دن ابوجعفر ابنِ مردنیش کے ساتھ زیادہ بااختیار ہوکر غرناطہ واپس آئے گا۔

ابوجعفر کا بھائی عبدالرحمٰن فرار کے لیے تیار تھا۔ حاتم اور اس کے چند ساتھی بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار تھے۔ ابوجعفر نے جو یہ دیکھا کہ اس میں چند قابلِ اعتبار آدمیوں کو بھی شریک کیا جاسکتا ہے تو اس نے بھی اپنے چند لائقِ اعتبار دوستوں کو سبز باغ دکھایا اور ابوسعید کے خلاف بغاوت اور فرار پر آمادہ کرنا چاہا۔ ان میں سے کسی ایک نے اس سازش کو ابوسعید کے سامنے بیان کردیا۔ ابوسعید نے ابوجعفر، عبدالرحمٰن، حاتم اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے احکام جاری کردیے لیکن عبدالرحمٰن اور حاتم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہلے ہی فرار ہوچکے تھے۔ ابوجعفر، حفصہ سے الوداعی ملاقات کرکے جانا چاہتا تھا اس لیے عبدالرحمٰن اور حاتم کا ساتھ نہیں دے سکا لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ گرفتار کرلیا جائے گا تو اس نے ملاغہ کی راہ اختیار کی، کیونکہ اس کے خیال میں یہ محفوظ راستہ تھا پھر ملاغہ سے وہ بحری سفر کرکے مریہ چلا جاتا۔ ابوسعید نے تمام راستے بند کررکھے تھے۔ تمام سرحدی علاقوں میں اس کے آدمی اپنے شکار کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ابوجعفر جیسے ہی ملاغہ میں داخل ہوا، اسے ابوسعید کے آدمیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور ان میں اس کا وہ دوست سب سے آگے تھا جسے ابوجعفر نے اپنا ہمراز بنالیا تھا اور سبز باغ دکھا کر فرار پر آمادہ کرلیا تھا۔ اس نے ابوجعفر کو بڑی بے مروتی سے پکڑ کر اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھنے کی کوشش کی۔ ابوجعفر نے مزاحمت کی اور کہا۔ ''تو دوستی کا یہ صلہ دے رہا ہے حالانکہ اگر تو میرا ساتھ دیتا تو فائدے میں رہتا۔''

دوست نے جواب دیا۔ ''میرے سامنے دو فائدے تھے، ایک تو یہ کہ میں بادشاہ کی وفاداری میں تیری سازش کا بھانڈا پھوڑ دوں اور اس سے اس کا فوری اور یقینی صلہ حاصل کرلوں اور دوسرا یہ کہ تیرا ساتھ دوں اور تیرے طفیل ابنِ مردنیش سے کسی اچھے صلے کی توقع رکھوں۔ چنانچہ میں نے متوقع صلے پر یقینی اور فوری صلے کو ترجیح دی۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''جب تو نے مجھے گرفتار ہی کرلیا ہے تو۔۔ پشت پر میرے ہاتھ کیوں باندھ رہا ہے؟''

دوست نے بڑی بے دردی سے اسے زمین پر گرادیا اور اس کا منہ زمین کی طرف کرکے دونوں ہاتھ اپنے قابو میں لے لیے اور اس کی کمر پر بیٹھ کر ہاتھوں کو باندھنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کہتا جارہا تھا۔ ''تو بادشاہ کا مطلوب ہے اس لیے میں تیرے ساتھ جتنی سختی کروں گا بادشاہ اتنا ہی مجھ سے خوش ہوگا۔''

ابوجعفر کو ملاغہ کے قلعے کے ایک حصے میں قید کردیا گیا اور اس خوشخبری کو ابوسعید کے پاس روانہ کردیا گیا۔

ابوجعفر قید خانے میں بند اپنے انجام کا انتظار کررہا تھا اور جب بھی قید خانے کا در کھلتا، وہ سمجھتا، شاید جلاد ننگی تلوار لیے اس کے قتل کو آرہا ہے۔ ظہر کے وقت قید خانے کا در کھلا، تو وہ اپنی زندگی سے اتنا مایوس ہوچکا تھا کہ خود ہی اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ ''آج کون سا دن ہے؟ شاید جمعہ ہے۔ اگر تم اس وقت قتل کردو گے تو میں شکر گزار ہوں گا کیونکہ میں سجدے میں گر کر اپنے معبود کے روبرو پہنچنا چاہتا ہوں۔''

لیکن آنے والے کے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی اور اس کا

چہرہ جانا پہچانا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی چوروں کی طرح دروازہ اندر سے بند کرلیا، سرگوشی میں بولا۔ ''ابوجعفر! میں نے تجھ سے ملاقات کی خاطر اپنی نماز بھی قضا کردی۔ خدا مجھے معاف کرے لیکن اس کے علاوہ تجھ سے ملاقات کی کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔''

ابوجعفر نے پہچان لیا، اس کا نام حجاج تھا اور یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا، جنہیں ابوجعفر نے اپنا ہمراز بنالیا تھا مگر اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ابوجعفر نے کہا۔ ''تو نے جمعے کی نماز کیوں چھوڑ دی؟''

حجاج نے کہا۔ ''کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت ہر شخص نماز میں مشغول ہوگا اور میری ملاقات کے لیے یہ بہترین وقت تھا۔''

ابوجعفر اس کی شکل دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچے جارہا تھا۔

حجاج نے کہا۔ ''ابوجعفر! تو ابوسعید سے رحم کی درخواست تو کرسکتا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ معاف بھی کردے گا۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ابوسعید مجھے معاف نہیں کرے گا اور کیوں نہیں معاف کرے گا اس سے شاید سبھی واقف ہیں۔''

حجاج نے نہایت افسوس سے کہا۔ ''حفصہ نے تیری جان لے لی۔ واللہ وہ بڑی شاعرہ ہے لیکن بخدا وہ اس عہد کا بڑا فتنہ بھی ہے اور ابوجعفر! تجھے اسی دن حفصہ سے کنارہ کش ہوجانا تھا جب تجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس نے ابوسعید سے بھی اپنے تعلقات استوار کرلیے ہیں۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ حفصہ میری زندگی تھی اور میں نے اس زندگی کو یہ جانتے ہوئے بھی پوری شدت سے چاہا کہ یہ ایک نہ ایک دن موت میں تبدیل ہوجائے گی۔''

حجاج رونے لگا، بولا۔ ''میں تیرے انجام پر رو رہا ہوں، آہ زمانہ ہم سے ایک ایسا انسان چھین رہا ہے جس کی مرصع و مسجع گفتگو میں بے پناہ حلاوت و لذت ہے۔''

ابوجعفر نے جواب دیا۔ ''مت رو میرے دوست حالانکہ مجھے کوئی غم نہیں کیونکہ میں دنیا کی لذیذ نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوچکا ہوں۔ شاید تجھے خبر نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنے دورِ وزارت میں مرغیوں کے دل و جگر کھائے ہیں، جام بلوریں میں پانی پیا ہے، اسپ صبا رفتار پر سوار ہوا ہوں، فرشِ دیبا پر سویا ہوں، حسین عورتوں سے لطف اندوز ہوا ہوں، شمعِ تاباں سے اپنے گھر کو روشن رکھا ہے۔ آج ابنِ منصور حلاج کی طرح اپنے عہد کے ظالم ترین انسان کی قید میں اپنے انجام کا منتظر ہوں۔ اب میں اپنے خدا کے پاس جانے والا ہوں اور جو خدائے غفار کے پاس جاتا ہے وہ کسی عذر اور حجت کا محتاج نہیں ہوتا۔''

حجاج نے گلوگرفتہ آواز میں کہا۔ ''آہ، کیا میں ایسے شخص پر نہ روؤں جو اتنی اچھی باتیں کرتا ہے اور جس کے کلام میں دریاؤں جیسی روانی ہے۔''

قید خانے کے نگراں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور آہستہ سے کہا۔ ''اے شخص! تیری ملاقات کا وقت ختم ہوا، اب باہر آجا، کیونکہ سامنے سے کچھ ایسے لوگ آتے دکھائی دیتے ہیں جو زندانی کے لیے شاید کوئی حکم لائے ہیں۔''

حجاج چپ چاپ قید خانے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد قید خانے میں حفصہ کا بھائی سلیمان چند آدمیوں کے ساتھ داخل ہوا۔ ابوجعفر نے حیرت سے پوچھا۔ ''سلیمان تم! تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ کیا مجھ سے ملنے آئے ہو؟ حفصہ کا کوئی پیغام؟''

سلیمان نے جواب دیا۔ ''پیغام حفصہ کا نہیں، بادشاہ کا لایا ہوں کیونکہ میں بادشاہ کے خدمت گاروں میں شامل ہوں۔'' اس کے بعد اس نے بادشاہ کا حکم پڑھ کر سنایا۔ ''میں سید ابوسعید ابن عبدالمومن حاکم غرناطہ و بلاد اندلس سلیمان صاحب اللیل کو حکم دیتا ہوں کہ وہ غدار ابوجعفر کو اس شہر میں سولی پر چڑھادے، جہاں وہ گرفتار کیا گیا ہے۔''

ابوجعفر نے یہ حکم نہایت سکون اور اطمینان سے سنا اور اس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی یا ندامت نہیں ظاہر ہونے دی، پوچھا۔ ''اس حکم کی تعمیل کب ہوگی؟ ابھی یا کچھ دیر بعد..... یا کل؟''

سلیمان نے جواب دیا۔ ''بادشاہ نے وقت یا دن کا تعین نہیں کیا ہے اس لیے میں اسے فوراً ہی پورا کردینا چاہتا ہوں کیونکہ ایک فرماں بردار خدمت گزار اپنے آقا کا حکم فوراً ہی بجالاتا ہے۔''

ابوجعفر اٹھ کر کھڑا ہوگیا، بولا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں، آج جمعہ ہے۔ میں اس مبارک دن کی موت کو اپنے حق میں شہادت سمجھوں گا۔''

سلیمان نے جواب دیا۔ ''سارے دن اللہ کے ہیں اور اس موت کو شہادت میں کیوں شمار کیا جائے، جو ایک عورت کی محبت اور دو عاشقوں کی رقابت میں آرہی ہو۔''

ابوجعفر نے کہا۔ ''سلیمان! شاید میں نے تجھ پر کوئی احسان کیا تھا؟''

سلیمان نے برا سا منہ کر جواب دیا۔ ''احسان تو خدا کرتا ہے جو اپنے بندے کے دل میں کسی بندے کی خیر کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور انسان اتنا ناشکرا اور نادان ہے کہ اسے اپنی طرف منسوب کر کے احسان کا طعنہ دیتا ہے۔''

ابوجعفر نے مسکرا کر کہا۔ ''سلیمان! تو شاہی حکم بجا لا۔ میں تیار ہوں۔''

سلیمان اسے ملاغہ کے چوک میں لے گیا اور بڑھئیوں کو بلا کر سولی کھڑی کرائی اور سیکڑوں آدمیوں کی موجودگی میں اسے سولی پر چڑھا دیا۔ ابوجعفر کا دم گھٹنے لگا، اس کی سانس رکنے لگی، آنکھوں کی بینائی دھندلی ہونے لگی اور اس دھندلی بینائی سے اس نے تماشائیوں میں اپنے دوستوں اور احسان تلے دبے ہوئے لوگوں کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر انہیں پہچان لیا۔ وہ سب ابوجعفر کے پھڑکتے جسم کا تماشا بڑی خوشی اور لطف سے دیکھ رہے تھے۔

جب حفصہ کو ابوجعفر کے انجام کا علم ہوا تو وہ بہت روئی۔ ابوسعید نے اس پر سختی کی اور حکم دیا کہ وہ ابوجعفر کے سوگ میں آنسو بہا کر بادشاہ کو جلائے نہیں۔

کچھ دنوں بعد ایک شخص حفصہ سے ملا۔ وہ ابوجعفر کے چچازاد بھائی حاتم کے پاس سے آیا تھا اور حاتم کی طرف سے حفصہ کے لیے اشعار کا تحفہ لایا تھا۔ ان اشعار میں حاتم نے حفصہ کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''اے میری زندگی! اس دیارِ غیر میں تیرے دیدار کا مشتاق ہوں
تاکہ میں عمدہ صفات کی حامل حفصہ کو دیکھوں
حفصہ! میں تیری طرف واپس ہونے کا مشتاق ہوں
لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک شخص (ابوجعفر) کا علم اور دوسرے (بادشاہ) کی رقابت حائل ہے
حفصہ! میں تیری بارگاہ تک کس طرح رسائی حاصل کروں کیونکہ وہاں تو میرے دشمنوں کے سوا کوئی نہیں جاتا''

حفصہ نے ان اشعار کو آنکھوں سے لگا لیا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی، بولی۔ ''حاتم! شاید تجھے نہیں معلوم کہ علم کا وہ پہاڑ جو میرا محبوب اور تیرے چچا کا بیٹا تھا، ملاغہ کے اجنبیوں میں ڈھایا جا چکا ہے۔ وہ ملاغہ کے چوک میں ابنِ منصور حلاج کی طرح سولی پر لٹک رہا ہے۔''

جب بادشاہ کو اس کی سن گن ملی کہ ابوجعفر کے باغی بھائی حفصہ سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں تو اس نے پہرا اور سخت کر دیا۔ کچھ عرصے بعد غرناطہ پر ابن مردنیش کے حامیوں نے قبضہ کر لیا اور ابوسعید، حفصہ کو لے کر مراکش چلا گیا اور غرناطہ کی دوبارہ تسخیر کا کام اپنے بھائیوں کے سپرد کر دیا۔

مراکش میں حفصہ نے ابوجعفر کے سوگ میں ماتمی کپڑے پہن لیے۔ اس پر ابوسعید نے اسے دھمکی دی۔

''حفصہ! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تو میرے دشمن اور باغی کے سوگ میں ماتمی لباس پہنے۔ میں بادشاہ ہوں اور چاہوں تو تجھے بھی ابوجعفر کی طرح سولی پر لٹکا دوں۔''

حفصہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ''ہاں، اس حقیقت کا مجھ پر بہت دنوں بعد انکشاف ہوا کہ تو صرف بادشاہ ہے، عاشق نہیں اور بادشاہ سولیوں پر لٹکاتے اور عاشق سولیوں پر لٹکتے ہیں۔''

بادشاہ شرمندہ ہو کر حفصہ کے پاس سے ہٹ گیا۔

اسی شب کو بادشاہ نے حفصہ کو پُردرد اشعار گاتے ہوئے سنا۔ یہ حفصہ کے اپنے اشعار تھے، جو بادشاہ کی تلخ گفتگو کے بعد موزوں کیے گئے تھے۔

''میں نے ابوجعفر مظلوم کے سوگ میں ماتمی لباس پہن لیا ہے
آخر لوگ اس سے جلتے کیوں ہیں؟ وہ مجھے قتل کی دھمکیاں کیوں دیتے ہیں؟
میں یہ سوگ اس عاشق کے غم میں منا رہی ہوں جس کو لوگوں نے حسد و رقابت میں ہلاک کر دیا ہے
خدا اس پر رحم فرمائے جو ان دشمنوں کے مقتول پر آنسو بہائے یا نوحہ کرے
اور اس مقتول کو ابرِ صباحی سیراب کرے
جس کا دستِ سخا اپنے دشمنوں کو بھی سیراب کیا کرتا تھا''

ابوسعید نے حفصہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ کچھ عرصے بعد حفصہ بھی چل بسی اور مراکش ہی میں دفن کی گئی۔ ابوجعفر کو بعد میں لوگوں نے رحم کھا کر ملاغہ کے غریبوں کے قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ مراکش اور ملاغہ کے درمیان بحیرۂ روم حائل تھا، گویا مرنے کے بعد بھی ان کی مہجوری اور مفارقت کا سلسلہ قائم رہا اور دونوں کے درمیان دو ملکوں اور ایک سمندر کا فاصلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حائل ہو گیا۔

☆☆☆

ماخذات: نفح الطیب، علامہ مقری۔ الاحاصل غرناطہ، الوزیر لسان الدین بن الخطیب۔ تاریخ اندلس، عبدالقوی ضیا۔ خلافتِ اندلس، نواب ذوالقدر جنگ بہادر۔ جغرافیہ اندلس، مولوی عنایت اللہ۔ مسلمانانِ اندلس، لین پول۔ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان صاحب

''دنیا میں قتل سے زیادہ بھیانک اور ہولناک جرائم بھی موجود ہیں۔'' بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس پستہ قد شخص نے کہا۔ ''اور بجلی کی کرسی یا گلوٹین سے بھی زیادہ دہشت ناک سزائیں ہوسکتی ہیں۔''

نہ معلوم لوگ کیوں مجھے اتنے ذوق وشوق اور دلچسپی سے ایسی عجیب وغریب کہانیاں سناتے ہیں۔ پب میں، ریل گاڑیوں میں اور تفریح گاہوں میں ہر جگہ مجھے کوئی نہ کوئی ایسا باتونی شخص مل ہی جاتا ہے اور یہ پستہ قد شخص تو فوراً ہی

گرفتارِ بلا

ابوالفرح ہمایوں

محبت جتنا کمزور جذبہ سمجھا جاتا ہے بعض اوقات اتنا ہی طاقتور بن کر خود کو ثابت کرتا ہے... جیسے کہ اس کے ساتھ ہوا۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا حزن وملال کا شکار تھا کہ اچانک اس محبت کے خون ہونے پر خون کے آنسو رو دیا اور پھر اسے اس قاتل سے انتقام لینے سے کوئی نہ روک سکا کیونکہ وہ عشق کی بلا میں گرفتار تھا۔

حسرت ویاس کی تصویر بنے ایک عاشق کی انتقامی کارروائی

بے تکلف ہو گیا تھا۔ میں نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے جام کا آرڈر دیا اور دیوار پر نصب ایل سی ڈی پر چل رہے پروگرام پر نظریں جما دیں۔ جرم و سزا پر بحث چل رہی تھی۔ ایک رحم دل نقاد نے فرمایا کہ موت کی سزا ایک وحشیانہ ظلم ہے۔ اسے فی الفور بند کر دینا چاہیے۔

"وحشیانہ ظلم؟" پستہ قد شخص کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "ہماری حیثیت آدم خور شیر کے کچھار میں پڑے ہوئے ایک بے بس شکار جیسی ہے۔ پہلے ہر شخص کو مکمل تحفظ فراہم کرو، ملک سے سزائے موت خود بخود ختم ہو جائے گی۔"

اس نے مشروب کی ایک چسکی لی۔ "اب مارٹن ہی کی مثال لے لو۔ یاد رکھو کہ یہ ایک فرضی نام ہے۔ اسے موسیقی اور مصوری سے اچھی خاصی رغبت ہے۔ وہ فلاحی اداروں کو بڑی فراخ دلی سے چندہ دیتا ہے اور قانون کا احترام بھی کرتا ہے۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی شخص کو جان بوجھ کر کبھی معمولی سا دکھ بھی نہیں پہنچایا۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی لوسی سے شدید محبت کرتا تھا لیکن ایک دن لوسی نے دریا میں کود کر جان دے دی۔ مارٹن چند روز تک بے حد افسردہ اور سوگوار رہا اور پھر اتفاق سے اسے ایک دن یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک اوباش شخص نے لوسی کو دھوکا دیا تھا اور اسی غم میں لوسی نے خودکشی کر لی۔

"یہ بات معلوم ہوتے ہی مارٹن کا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ نفرت کے احساس نے اس کے اندر کھولتا ہوا لاوا بھر دیا۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ اس شخص کو عبرتناک سزا دے گا۔ اس شخص کا نام ڈیوس تھا۔ وہ ایک اچھا فٹ بال کا کھلاڑی اور تیراک تھا۔ چھ فٹ کا طویل قد مگر آنکھوں سے مکاری ٹپکتی تھی۔ نہ جانے لوسی کو اس میں کیا خاص بات نظر آئی کہ اس کی الفت میں گرفتار ہو گئی۔

"مارٹن نے اپنی نفرت کے جذبات پر قابو پانے کی بے حد کوشش کی۔ اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے اس نے یہ جواز بھی تلاش کر لیا کہ ایک قانون پسند معزز شہری کو خاموش رہنا چاہیے۔ قدرت خود ہی سزا کا کوئی راستہ نکال لے گی۔ مکافاتِ عمل شاید اسی کا نام ہے لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ لوسی ہی وہ پہلی اور آخری لڑکی نہیں تھی جو اس کے فریب کا شکار ہوئی۔ تب اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس کو ضرور سزا دے گا۔ خواہ قانون شکنی ہی کرنی پڑے۔

"اگر مارٹن معتدل دماغ کا عام سا شخص ہوتا تو وہ منصوبہ بندی کرتا اور ڈیوس کو گولی مار دیتا پھر موقع سے... بہ آسانی فرار ہو جاتا۔ لیکن وہ ایک اذیت پسند شخص تھا۔ شاید بیٹی کی موت کی وجہ سے وہ تشدد پسند بن گیا تھا۔ انتقام کا جذبہ اس کی رگ رگ میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ مارٹن نے کچھ عرصہ اسی سوچ بچار میں صرف کیا کہ وہ ڈیوس کو ایسی کون سی سزا دے جو اس جیسے کمینے شخص کے لیے مناسب ترین ہو۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ اسے موقع میسر آ گیا۔ ایک عمارت میں اپنی مرضی کے مطابق اسے پینٹ ہاؤس اپارٹمنٹ بھی مل گیا۔ یہ پینٹ ہاؤس ایک اسکائی اسکریپر عمارت کی چھت پر تھا۔ مارٹن نے فوراً اسے ایک فرضی نام سے کرائے پر حاصل کیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک تاجر ظاہر کیا تھا جس کا بیشتر کاروبار بیرون ملک سے وابستہ تھا۔ وہ کبھی کبھار ہی اپارٹمنٹ کو دیکھنے آتا ورنہ وہ مہینوں کے لیے غائب ہو جاتا تھا۔ اس نے عمارت کے مالک کو سمجھا دیا تھا کہ یہاں اس کی بے انتہا ضروری چیزیں اور کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی حالت میں کوئی بھی اس کمرے میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ سب بندوبست کر کے وہ طویل عرصے کے لیے غائب ہو گیا۔

"پہلے سال مارٹن نے ایک خاص اور عجیب طریقہ حفظِ ماتقدم کے طور پر استعمال کیا۔ وہ جب بھی باہر جاتا دروازے پر کوئی ایسا خاص نشان لگا دیتا کہ دروازہ کھولے جانے کی صورت میں اسے فوراً پتا لگ جاتا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ مارٹن اس صورتِ حال سے کافی مطمئن نظر آیا۔ اب اس نے دوسرے قدم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے فرضی کمپنی کا جعلی لیٹر ہیڈ چھپوایا اور ڈیوس کو اس کمپنی کی طرف سے ایک نہایت اعلیٰ ملازمت کا پروانہ روانہ کر دیا۔ جیسا کہ مارٹن کو امید تھی، ڈیوس نے اس پیشکش کو بلا پس و پیش منظور کر لیا اور مارٹن کو آگاہ کر دیا۔ ڈیوس کی رضامندی کے بعد مارٹن نے اسے فون کیا اور دوسرے دن شام کو ایک اچھے ریستوران میں ملاقات کے لیے دعوت دی۔ یہ جگہ عمارت کے بالکل قریب تھی۔ اس نے ڈیوس کو یہ بات بھی سمجھا دی تھی کہ اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرے اور نہ ہی ملازمت کے بارے میں کسی کو بتائے اور ملازمت کا اصل پروانہ اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اس نے ڈیوس کو ایک فرضی کہانی سنائی کہ اس ملازمت کے مسئلے پر اس کا فرم کے دیگر عہدے داران سے اختلاف ہو گیا ہے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس بات کو خفیہ رکھا جائے۔

"اگر ڈیوس اس کی باتوں کو ماننے سے انکار کر دیتا تو پھر وہ کوئی اور طریقہ سوچتا لیکن اعلیٰ ملازمت اور حسین

مستقبل کے خواب نے ڈیوس کی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس نے کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور صحیح وقت پر ریستوران چلا آیا۔ مارٹن اسے اچھی طرح جانتا تھا لیکن ڈیوس، لوسی کے باپ کے چہرے سے بالکل ناآشنا تھا۔ مارٹن نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور دونوں گپ شپ کے ساتھ ساتھ شغلِ مے نوشی میں مصروف ہو گئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر دونوں اٹھ گئے۔ مارٹن، ڈیوس کے ہمراہ اسی کی کار میں بیٹھ گیا اور اسے لے کر اِدھر اُدھر فضول چکر لگاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوس کو اس عمارت کے قریب لے آیا جہاں اس کا پینٹ ہاؤس واقع تھا۔ اس نے کار کو کچھ فاصلے پر روک دینے کا اشارہ دیا اور ڈیوس کو اپنے کاندھے سے لگا کر عمارت میں داخل ہو گیا۔ رات کافی گزر چکی تھی اور عمارت کے مکین محوِ خواب تھے۔

”لفٹ کے ذریعے دونوں اوپر پہنچے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مارٹن بے حد خوش نظر آنے لگا۔ وہ بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے الماری سے بوتل نکالی اور دونوں پینے بیٹھ گئے۔ شروع کے دو پیگ تو دونوں نے جلدی جلدی ختم کر لیے لیکن تیسرے پیگ میں مارٹن نے ڈیوس کے گلاس میں دو خواب آور گولیاں ڈال دیں۔ خواب آور دوا کے دو مزید پیگ پینے کے بعد اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی لیکن قبل اس کے کہ وہ خطرے کا احساس کر سکتا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ مارٹن چند لمحے بے ہوش ڈیوس کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل مارے خوشی کے شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ کچھ گھبراہٹ بھی اسے محسوس ہو رہی تھی کہ اس دیوقامت جسم کو وہ کیسے قابو میں لائے گا لیکن جب اس نے لوسی کی موت کو یاد کیا تو اس کے جسم میں ایک نئی توانائی بھر آئی اور وہ پُرسکون ہو گیا۔

”ڈیوس کا وزن بہت زیادہ تھا لیکن مارٹن اسے کھینچ کھانچ کر اس چھوٹے سے کمرے میں لے جانے میں کامیاب ہو گیا جو وہ بطور اسٹوڈیو استعمال کیا کرتا تھا۔ چھت پر بنا گول مختصر سا کمرا پہلے پانی کا ٹینک تھا۔ بعد میں متروک ہو گیا پھر بطور کمرا استعمال ہونے لگا، سیلن زدہ اور نیم تاریک ہونے کے ساتھ ساتھ ساؤنڈ پروف بھی تھا۔ مارٹن نے پینٹ ہاؤس کرائے پر لیتے وقت اس خوبی کو بھی مدِنظر رکھا تھا۔ اسٹوڈیو میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ مارٹن نے ڈیوس کے بوٹ کو اتار کر اس کی جیبیں خالی کر دیں۔ ملازمت کا اصل پروانہ [illegible] کر راکھ کر دیا۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے چلا آیا۔ نیچے جاتے ہوئے وہ دروازہ مقفل کر آیا تھا جو کہ اسٹوڈیو میں داخلے کا واحد راستہ تھا۔

”اب صرف ڈیوس کی کار کا مسئلہ تھا۔ اگر اس عمارت کے قریب وہ دیکھ لی گئی تو ممکن ہے کہ کوئی سراغ مل جائے۔ اتنی بڑی کار کو وہ کہیں چھپا بھی نہیں سکتا تھا لیکن اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔ کار کی چابی اس کے پاس تھی۔ وہ کار کو ڈرائیو کر کے ایک مشہور جوئے خانے تک لے گیا اور پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی جہاں سیکڑوں کاریں پہلے سے موجود تھیں۔ شہر میں کار چوری کی وارداتیں عام بات تھی۔ کوئی بھی ڈیوس کی کار کو یہاں سے اٹھا کر کہیں اور لے جا سکتا تھا۔

”دوسرے دن صبح ڈیوس کی آنکھ کھلی۔ اس کے کپڑے گرد سے اَٹے ہوئے تھے۔ اس کا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس کی بائیں پنڈلی اکڑ کر رہ گئی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ اور کراہتے ہوئے وہ اٹھا اور اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ ایک مختصر سے کمرے میں قید تھا۔ کمرے میں ایئر کنڈیشنرز کا شور پھیلا ہوا تھا اس کے بالکل سامنے ایک ٹی وی سیٹ تھا جو کہ آن تھا۔ ڈیوس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور پہلی بار اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس کا بایاں پیر آہنی زنجیر سے جکڑا ہوا تھا اور زنجیر کا دوسرا سرا دیوار میں نصب تھا۔

وہ دیر تک سوچتا رہا کہ آخر یہ سب کیا ہے، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی اور جب اس کے دماغ سے دھند چھٹی تو اس نے دیکھا کہ تقریباً چھ فٹ دور ایک میز پر پلاسٹک کا ایک پیالا رکھا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے پیالے کی طرف بڑھا لیکن زنجیر میں قید ہونے کے باعث لڑکھڑا کر نیچے گر پڑا۔ وہ پھر اٹھا اور اس مرتبہ پیالے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے تھوڑا سا پانی پیا اور برتن کو زمین کی طرف اچھال دیا۔ اس نے دیکھا کہ میز پر کئی ڈبل روٹیاں بھی رکھی ہوئی ہیں لیکن اس وقت اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ ایک کاؤچ پر بیٹھ گیا اور حالات پر غور کرنے لگا۔

”اسے گزشتہ رات کی ہر بات یاد تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مارٹن کے فلیٹ سے کہیں باہر نہیں گیا تھا۔ اب یہ بات واضح تھی کہ مارٹن نے نشہ پلا کر اسے بے ہوش کیا اور پھر اسے قید کر دیا لیکن کیوں؟ ڈیوس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے فرض کر لیا کہ یہ ایک سنگین مذاق ہے اور اگر یہ مذاق ہے تو زنجیر یقینی طور پر کہیں معمولی سی اٹکی ہوئی ہوگی۔ اس نے چند بار زنجیر کو جھٹکا دیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

"ڈیوس کی انگلیاں شراب اور خواب آور دوا کی وجہ سے ابھی تک بے جان تھیں۔ اس نے لرزتی انگلیوں کو دھیرے دھیرے جیب میں ڈالا، سگریٹ کی تلاش میں۔ اس نے اپنی تمام جیبیں کھنگال ڈالیں لیکن کہیں بھی کچھ نہ تھا۔ اس نے گھبرا کر مارٹن کو آوازیں دینا شروع کردیں۔ کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا اور تیز تیز سانسیں لینے لگا۔ ڈیوس کو اب تک جو خوش فہمی تھی، وہ رفتہ رفتہ دم توڑ گئی۔ اس کی رگوں میں دہشت دوڑنے لگی۔ کیا مارٹن پاگل ہوگیا ہے؟ اس نے اب تک کے گزرے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یاد آیا کہ کس طرح ملازمت کی پیشکش موصول ہوئی اور مارٹن نے فون کیا اور ہدایت کی کہ ملازمت کے بارے میں کسی کو نہ بتائے اور ایک خاص ریستوران میں ملاقات کے لیے بلالیا۔ اس نے مارٹن کی تمام ہدایتوں پر سختی سے عمل کیا، لہٰذا اب کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ اس نے مارٹن کے بارے میں کوئی چھان بین نہ کرکے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ ان سب باتوں کو سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مارٹن نے بڑی چال بازی سے اسے اپنے جال میں پھانس لیا ہے۔ غصے کی شدت سے وہ پاگل ہوگیا اور زنجیر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ لیکن اس مشقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے پورے جسم میں شدت کا درد جاگ اٹھا۔ اپنی ناکامی پر اس کے غصے کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ ذرا دیر بعد وہ بے دم ہوکر نیچے گر پڑا۔

"اس کا ذہن ابھی تک حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا مگر ان حوصلہ شکن حالات نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کردیا تھا۔ اس کے دل سے یہ احساس بھی مٹ چکا تھا کہ وہ مسلسل نہ جانے کب سے جاگ رہا ہے۔ ایک بار پھر پیاس کی طلب ستانے لگی، وہ اٹھا اور پلاسٹک کے برتن کے پاس پہنچا لیکن پیالہ خالی تھا۔ اس نے پیالے کی طرف ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور غصے میں اسے دور پھینک دیا اور پھر اس کی نگاہ میز پر پڑی ہوئی.... ایک ربر ٹیوب پر پڑی جو اوپر پانی کے ٹینک سے منسلک تھی۔ نہ جانے کون سا طریقہ استعمال کیا گیا تھا۔ بہرحال اس ٹیوب میں سے وقفے وقفے سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شاید یہ انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ پانی کا پیالہ خالی نہ رہے۔ لیکن ڈیوس کی بدقسمتی کہ پیالے کو اس نے ٹیوب کے نیچے رکھنے کے بجائے دور پھینک دیا تھا۔

"پیالہ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ اب اس کی پیاس شدت کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسے ہر حال میں پیالے کو حاصل کرنا تھا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا اور اپنے ہاتھ پیالے کی طرف بڑھا دیے لیکن اس کا فائدہ صرف یہ ہوا کہ اس کے لمس سے برتن کچھ اور آگے سرک گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اب کیا ہوگا؟ کیا وہ پیاسا ہی مرجائے گا؟ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کافی دیر رو چکنے کے بعد جب اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اس نے ..... سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل سوچنا شروع کیا اور اچانک ہی اسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس نے اپنی جیکٹ اتاری اور چاروں شانے چت زمین پر لیٹ گیا۔ جیکٹ کی ایک آستین پکڑ کر بقیہ حصے کو اس نے برتن کے اوپر پھینکا اور جھٹکا دے کر جیکٹ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ پیالہ بھی ساتھ ساتھ گھسٹتا چلا آیا۔ اب اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے پیالے کو بے اختیار چوم لیا لیکن ابھی اسے پانی کے لیے کئی منٹ اور صبر کرنا تھا۔ اس نے پیالے کو پائپ کے نیچے رکھ دیا اور ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

"اچانک اس کی نظر سامنے میز پر پڑے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر کاغذ اٹھایا۔ یہ ایک ٹائپ شدہ تحریر تھی۔ لکھا تھا۔ "مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں تمہیں اس حال میں یہاں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ تم اس وقت تک کے لیے میرے مہمان ہو جب تک میں واپس نہ آجاؤں۔ میں نے تمہارے لیے بہترین کمرا منتخب کیا ہے۔ تمہارے کھانے پینے کا بندوبست بھی موجود ہے۔ چند دنوں کے لیے میں شہر سے باہر جارہا ہوں اور ہوسکتا ہے کہ واپسی میں کچھ زیادہ دیر ہوجائے۔ بہرحال میرا مشورہ ہے کہ پُرسکون رہو اور میرا انتظار کرو۔ مارٹن۔"

"ڈیوس کافی دیر تک اس تحریر کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مارٹن کئی دنوں کے لیے اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مارٹن واپس نہیں آتا، اسے اسی طرح قید میں رہنا پڑے گا۔ اس تلخ حقیقت نے اسے ایک بار پھر چیخنے چلانے پر مجبور کردیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تھک ہار کر اس نے سوچا۔ ابھی دن کا وقت ہے۔ سب لوگ کام پر گئے ہوئے ہوں گے۔ شام کو جب عمارت کے مکین واپس آئیں گے تو وہ ایک بار پھر کوشش کرے گا۔ ممکن ہے کہ کوئی اس کی آواز سن لے۔ ان خیالات نے اسے کسی حد تک پُرسکون کردیا اور وہ اپنے مستقبل کے

متوجہ ہو جائیں لیکن افسوس! کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے وہ اس مقصد کے لیے استعمال کر سکتا۔

''اس کے ہاتھ پاؤں خوف سے کانپنے لگے۔ وہ سخت دہشت زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا' آخر مارٹن چاہتا کیا ہے؟ مارٹن کب واپس آئے گا؟ یہ سوالات مسلسل اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ ٹی وی پر مختلف پروگرام آتے رہے اور ڈیوس کی زندگی کا سیاہ ترین دن خاموشی سے گزر گیا۔ دوسرے دن وہ دیر تک سوتا رہا۔ جب سو کر اٹھا تو سخت بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پیالے میں کچھ پانی جمع ہو چکا تھا اور ٹی وی پر ایک ناول نگار کا انٹرویو پیش کیا جا رہا تھا۔ یکا یک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں' کیوں نہ وہ ٹی وی کو کسی طرح توڑ دے اور اس کے تار کے ذریعے دیوار میں کرنٹ دوڑا دے۔ اگر آگ لگ جائے تو یقیناً لوگ دوڑے چلے آئیں گے لیکن ٹی وی اس کی پہنچ سے دور تھا اور نہ ہی وہ اس کی تاروں تک پہنچ سکتا تھا۔ وہ ایک لمحے کو کانپ کر رہ گیا۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو سب سے پہلے وہی بجلی کے جھٹکے اور آگ کا شکار بنے گا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ اپنی بے بسی پر رو دیا۔

''وہ ایک بار پھر بے تابانہ انداز میں پانی کی طرف بڑھا اور پھر رک گیا۔ ڈبل روٹی کے چند سلائس زہر مار کیے اور پھر تھوڑا سا پانی پی لیا۔ اس نے پائپ سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کو غور سے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ پانی کی آمد پہلے کی نسبت کچھ اور کم ہو گئی ہے۔ کیا یہ پانی ایک ماہ تک اس کی ضروریات کو پورا کر سکے گا؟ تیس ڈبل روٹیاں اور تیس دن؟ اف خدایا! کیا واقعی مارٹن تیس دن سے قبل نہیں آئے گا؟ اس کی ہمت جواب دے گئی۔

''ڈیوس نے ایک بار پھر چیخنا چلانا شروع کر دیا لیکن اس آہ و بکا کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ شام کے وقت اس نے پھر لوگوں کو امداد کے لیے پکارا اور اگلے روز بھی اور اس کے بعد بھی۔ یہاں تک کہ جب ایئر کنڈیشنر چلتے چلتے رک گیا، تب بھی اسے ٹھیک کرنے کوئی نہیں آیا۔ شروع کے چند دن تو مارٹن دن میں ایک بار چھپ کر ڈیوس کو دیکھ لیتا تھا اور جب اسے مکمل اطمینان ہو گیا کہ وہ بالکل ''خیریت'' سے ہے تو اس نے وہاں آنا چھوڑ دیا۔''

یہ داستان سنانے کے بعد بھورے سوٹ والا پستہ قد آدمی ایک استہزائیہ ہنسی ہنسا۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب میرا ائرپورٹ پہنچنے کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری باتوں سے اداس نہیں ہوئے ہوں گے۔''

''ٹھہرو!'' میں بولا۔ ''یہ تو بتا دو، اس کے بعد کیا ہوا؟''

اس نے اپنی گردن نفی میں ہلائی۔ ''میں کیا بتا سکتا ہوں۔ بس اندازہ ہے کہ چند دنوں بعد پانی بند ہو گیا ہو گا اور ڈبل روٹیاں بھی سوکھ کر بیکار ہو گئی ہوں گی۔'' اس نے اپنے شانے اچکائے۔

''مگر.....'' میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میری آواز حلق میں اٹک گئی۔

''اس کمرے میں دو سال سے کوئی داخل نہیں ہوا ہے۔'' پستہ قد شخص نے میرا مطلب سمجھ کر آہستہ سے کہا۔ ''ایک وکیل کے ذریعے اس پینٹ ہاؤس کا کرایہ اور دیگر واجبات باقاعدگی سے ادا کیے جا رہے ہیں۔ عمارت کا مالک اور دوسرے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مارٹن بزنس کے سلسلے میں یورپ گیا ہوا ہے اور شاید ابھی مزید وہاں قیام کرے گا۔ انہیں اس وقت تک کوئی پروا نہیں ہو گی جب تک کہ کرایہ ملتا رہے گا۔'' اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ ''اور جب کبھی کوئی وہاں داخل ہو گا تو اسی وقت تک ڈیوس کی ہڈیاں گل سڑ کر خاک ہو چکی ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ کسی کو اس بات کا شبہ بھی نہیں ہو گا کہ یہاں کبھی کوئی قید تھا اور اب یہ جگہ اس کا مدفن ہے۔ وہ کمرا پوری طرح ائرٹائٹ ہے اور باہر ایک بڑے برتن میں کافور رکھا ہوا ہے اس لیے جسم گلنے سڑنے کے عمل میں... بدبو پھیلے گی تو اس پر کافور کی بو حاوی ہو جائے گی۔''

اتنی تفصیل سنانے کے بعد وہ مسکرایا اور باہر نکل گیا۔ میں بے وقوفوں کی طرح بس اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اچانک مجھے ہوش آیا اور میں اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن اتنی دیر میں وہ نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ میرے چاروں طرف بڑی بڑی اور سر بفلک عمارتیں کھڑی ہوئی تھیں اور تقریباً ہر عمارت کی چھت پر ایک پینٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔ اس بارے میں اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ عمارت کون سی ہے، جس میں ڈیوس قید تھا اور کیا وہ عمارت اسی شہر میں ہے یا کسی دوسرے شہر میں؟

میں واپس مڑا اور دوبارہ بار میں داخل ہو گیا۔ میں نے بارٹینڈر سے دریافت کیا کہ کیا وہ اس آدمی کو جانتا ہے جو ابھی مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ بارٹینڈر نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''شاید وہ اس شہر میں اجنبی ہے۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

خود اپنے دام میں

آصفہ ضیا احمد

تقدیر نے بارہا ثابت کردیا ہے کہ دوسروں کے لیے گڑھے کھودنے والے اکثر خود ہی ان کا شکار ہوجاتے ہیں مگر... اس سے کبھی کوئی سبق نہیں لیتا بلکہ اسے تقدیر کے کھاتے میں ڈال کر اپنی من مانیوں میں مصروف رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک منظر نامہ یہاں بھی موجود ہے جسے خدا پر بھروسا نہیں رہا اور اپنی سازشوں کو مکمل اور جامع سمجھتے ہوئے شیطانی کارروائیوں میں مصروف ہوکر وہ بھول گئی کہ ایک طاقت اوپر آسمانوں پر بھی موجود ہے جو انسان کے ارادوں کا جنازہ بخوبی نکال سکتی ہے۔

خود اپنے دام میں آنے والے دلدار کا فسادنامہ

شادی کے بعد اولاد کی پیدائش میں تاخیر ہوجائے تو شادی شدہ جوڑے کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ اپنے پرائے سب کے منہ کھل جاتے ہیں اور میاں بیوی چوروں کی طرح منہ چھپانے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے سے بھی آنکھ ملا کر بات نہیں کر پاتے۔ دونوں ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کا مسئلہ تنویر اور رانیہ کے درمیان بھی آن کھڑا ہوا۔ ان دونوں کی شادی کو کم و بیش سات سال کا عرصہ بیت چکا تھا لیکن ابھی تک

دونوں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے۔ اس وقت بھی رانیہ اپنی اور تنویر کی میڈیکل رپورٹ کی ریڈنگ میں مصروف تھی۔ قریب ہی تنویر بیٹھا ہوا اسے متفکر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر بعد رانیہ نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور رپورٹ فولڈ کر کے ایک طرف سرکا دی۔ تنویر نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے رپورٹ اٹھا کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی اور طمانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم فضول پریشان ہوتی ہو۔ گائنا کالوجسٹ نے کلیئر کر دیا ہے کہ ہم دونوں میں کوئی فالٹ نہیں ہے۔ دیر قدرت کی طرف سے ہے۔''

رانیہ کافی دیر سے اپنے آنسوؤں کے بیٹھی تھی۔ شوہر کی بات سن کر پھٹ پڑی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''سال دو سال کی دیر سویر ہو جاتی تو صبر آجاتا لیکن یہاں تو سال پر سال بیتے جا رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے علاج معالجہ اور دوا، دعا میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ باہر والوں کی تو خیر میں پروا نہیں کرتی ہوں لیکن آپ کی اماں نے تو میرا جینا حرام کر دیا ہے۔''

''ہوں.....'' تنویر نے ہنکارا بھرا۔ پھر قدرے توقف کے بعد ٹھوس اور حتمی لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس سارے مسئلے کا ایک حل نظر آرہا ہے۔''

رانیہ نے اپنے آنسو اپنے آنچل میں سمیٹے اور استفسارانہ نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ ہونٹ تو خاموش تھے لیکن آنکھیں سوال کر رہی تھیں کہ کیا حل ہے۔ تنویر نے اس کی بھیگی بھیگی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا۔

''ہم اپنے عزیز و اقارب میں سے کسی کے بچے کو گود لے لیتے ہیں۔ اماں کو وارث مل جائے گا۔ ان کی دلی مراد بر آئے گی۔ اور تمہارا بھی دل لگا رہے گا۔''

رانیہ نے دل گرفتہ لہجے میں جواباً کہا۔ ''اماں قیامت برپا کر دیں گی۔ آپ اپنی تجویز اپنے پاس ہی رکھیے۔''

''تو پھر بتاؤ کیا کریں؟'' تنویر نے گہری سنجیدگی کے ساتھ پُرفکر انداز میں کہا۔ لمحاتی توقف کے بعد پھر اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''کہتے ہیں ہر مسئلے کا حل مسئلے میں ہی چھپا ہوتا ہے۔ صرف اسے تلاش کر کے سلجھانا پڑتا ہے لیکن ہمارا مسئلہ تو ریشم کی گرہ بن گیا ہے جو دن بدن الجھتا ہی جا رہا ہے۔ کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آرہا ہے۔'' دونوں میاں بیوی کے چہروں پر غور و فکر کے تاثرات تھے۔

☆☆☆

تنویر ایک مستحکم اور وسیع بزنس کا مالک تھا۔ ٹمبر مارٹ اور فرنیچر کی کئی دکانیں اس کی ملکیت تھیں۔ والد کے چھوڑے ہوئے کاروبار کو اس نے اپنی محنت اور دیانت داری سے بامِ عروج پر پہنچایا تھا۔ اسی دوران اس کی والدہ مسرت جہاں نے اس کی شادی اپنی سہیلی کی بیٹی رانیہ سے کر دی۔ رانیہ کا تعلق بھی ایک متمول اور معزز گھرانے سے تھا۔ وہ بذاتِ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، اسمارٹ اور دیدہ زیب شخصیت کی مالک تھی۔ تنویر ماں کے انتخاب پر بے حد خوش اور شاداں تھا۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی کو یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے خوشیوں کا ساون برس رہا ہے اور ان کا آنگن مہک رہا ہے لیکن گزرتے ہوئے وقت نے انہیں فوراً خبردار کر دیا کہ وہ خود بھی پیاسے ہیں اور ان کا آنگن بھی سونا اور بنجر ہے۔ پہلے پہل تو دونوں نے اس بات کو اتنی شدت سے نہیں لیا لیکن جوں جوں دن بیت رہے تھے، دونوں کی فکر و پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا اور مسئلہ سنگین ہوتا جا رہا تھا۔ شروع میں تو مسرت جہاں نے دبی دبی زبان میں کہا لیکن اب وہ برملا بیٹے اور بہو سے یہ کہنے لگی تھیں کہ اب وہ مزید انتظار نہیں کر سکتیں۔ اس لیے تنویر کو فوراً ہی دوسری شادی کر لینا چاہیے۔ ماں کی طرف سے تنویر پر شدید دباؤ تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ٹال مٹول سے کام لے کر اس موضوع کو ہوا میں اڑا دیتا لیکن آخر کب تک؟ جس دن مسرت جہاں نے بیٹے بہو کو اپنے روبرو بٹھا کر یہ دھماکا خیز اعلان کر دیا کہ مہینا بیس دن میں وہ تنویر کی دوسری شادی کرنے والی ہیں۔ دلہن وہ تلاش کر چکی ہیں اور انہیں یقین ہے کہ آنے والی بہو اس خاندان کو وارث ضرور دے گی۔ ''اگر تم دونوں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہو تو میں وقتِ ملاقات طے کر لوں۔'' رانیہ یک ٹک ساس کو تکتی رہی۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھی اور اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے بیڈ روم میں جا کر اپنے بیڈ پر گر گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

تنویر نے تیز نگاہوں سے ماں کو گھورا اور غرایا۔ ''آپ کو رانی کے سامنے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔'' مسرت جہاں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دے کر بیٹے کو قائل کر لیا کہ دوسری شادی اس کے لیے کتنی ضروری ہے۔ کافی بحث و تکرار کے بعد تنویر نے شدید تذبذب اور کشمکش کے مرحلے سے گزر کر ماں کے سامنے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ مسرت جہاں کے دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ فرطِ جذبات سے ان کا تھل تھل کرتا فربہ جسم لہلہاتے ہوئے درخت کی طرح ہلکورے لے رہا تھا۔ انہوں نے محبت سے بیٹے کی پیشانی

چوی اور بہو کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں جبکہ تنویر نے گھر سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی کار تک پہنچا اور سرعت کے ساتھ گاڑی اسٹارٹ کی اور باہر کی راہ لی۔ مسرت جہاں نے پیار سے بہو کے گال تھپتھپائے اور اپنی انگلیوں سے رانیہ کے بالوں میں کنگھا کرنے لگیں۔ رانیہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے انہیں دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مسرت جہاں مکمل طور پر مستعد اور پُرعزم تھیں۔ بہو کو کس طرح رام کرنا ہے اور کونسا پینترا اختیار کرنا ہے، وہ بخوبی جانتی تھیں۔ رانیہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر ہمدردانہ لہجے میں اسے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ صرف نام کی رانی نہیں ہے۔ تنویر اگر اسے رانی کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو حقیقت میں بھی صرف اور صرف وہی تنویر کے دل کی اور گھر کی رانی ہے۔ آنے والی بہو تو صرف ان کی ضرورت ہے۔ وہ بہو سے تیقن آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں ”اس گھر میں قدم رکھنے والی یہ لڑکی ہمیشہ تمہارے انڈر پریشر رہے گی۔ گھر کے تمام مالکانہ حقوق صرف تمہیں حاصل ہوں گے۔ وہ لڑکی ہر کام تمہاری اجازت سے انجام دے گی۔“ بولتے بولتے کھنکارنے کے لیے وقفہ کیا اور پھر لہجے کو مزید میٹھا بناتے ہوئے بولیں۔

”ارے میری بچی میں بھی عورت ہوں۔ تیرا دکھ سمجھتی ہوں۔ مگر میں بھی مجبور ہوں کیونکہ تنویر بھی میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اگر یہ بے اولاد رہا تو تم ہی بتاؤ اس خاندان کی بیل کیسے پھولے پھلے گی۔ تمہارا یہ احسان اور یہ بے مثال ایثار ہمارا خاندان ہمیشہ یاد رکھے گا۔ ارے بیٹا دلہن وہی جو پیا من بھائے اور تو تو تنویر کے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہے۔ بھلا تیرا راج اور تاج کون چھین سکتا ہے۔“ اپنے مطلب کے حصول کے لیے مسرت جہاں نے زمانے بھر کی چکنی چپڑی باتیں کر کے رانیہ کو رجھانے کی کوشش کی۔ رانیہ پہلے تو انتہائی صبر و سکون سے سب کچھ سنتی رہی پھر ان کے انداز پر ناگواری محسوس کرتے ہوئے ذرا تیکھے اور ترش لہجے میں بولی۔

”اماں! میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں اس لیے آپ مجھے تنہا.....“ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے مسرت جہاں تنتنا کر اپنی نشست سے اٹھ گئیں اور سپاٹ لہجے میں بولیں۔

”اے بی بی! میں کب تمہارے کمرے میں عمر گزارنے کے لیے آئی ہوں۔ بس جا ہی رہی ہوں لیکن کان کھول کر میری ایک بات سن لو۔ پرسوں میں تنویر کو صنم سے ملوانے لے جا رہی ہوں۔ اگر تم بھی اس سے ملنا چاہتی ہو تو تیار ہو جانا۔ اللہ اللہ کر کے تنویر نے ہامی بھری ہے اور میں اس موقعے کو گنوانا نہیں چاہتی۔“ رانیہ ساس کے آخری جملے پر تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے مسرت جہاں نے جاتے جاتے ایک زہر میں بجھا ہوا تیر چھوڑا تھا جو اس کے دل کو لہولہان کرتا ہوا آر پار نکل گیا۔ آنسوؤں کی برسات یوں امڈ امڈ کر برسی کہ اس میں اس کا سارا وجود ہی بہہ گیا۔

مسرت جہاں اپنے مقررہ کردہ وقت پر پورے طمطراق کے ساتھ تیار ہوئیں۔ ان کی سج دھج دیکھ کر کوئی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک بیوہ خاتون ہیں۔ تنویر کے لیے بھی اہتمام سے تیار ہونے کا حکم جاری کیا تھا۔ دل چاہا ماں سے اسی وقت انکار کر کے رانیہ کو اس کی ہنسی اور مسکراہٹیں واپس کر دے لیکن اپنی ہٹ دھرم ماں کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے اپنے ہونٹ سی لیے۔ تنویر تینتیس سالہ خوبرو اور صحت مند جوان تھا۔ سہل پسند شروع سے نہ تھا۔ اس لیے جسم چربیلا نہ تھا۔ کسرتی بدن تھا۔ دیکھنے میں اٹھائیس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ بچپن سے خوش لباس اور جامہ زیب تھا۔ اس وقت بھی رانیہ نے اسے سادہ لیکن قیمتی کپڑے کا لباس نکال کر دیا تھا جو اس پر خوب پھب رہا تھا۔

☆☆☆

ڈرائیور کو... سمجھانے کا پتا اچھی طرح سمجھانے کے بعد روئے سخن بیٹے کی جانب موڑتے ہوئے مسرت جہاں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بیگم اقتدار علی نے ایک تقریب میں مجھے ان لڑکیوں سے ملوایا تھا۔ مجھے تو دونوں ہی بہنیں پسند آئیں۔ تمہیں آج اس لیے لے کر جا رہی ہوں کہ تم اپنی چوائس بتا دو۔“ جس گھر کے سامنے ڈرائیور نے گاڑی روکی وہ یقیناً کسی زمانے میں عالیشان ہوگا لیکن اب تو وہ شکستہ اور سالخوردہ نظر آ رہا تھا۔ علاقے کی آبادی بھی اس قدر گنجان تھی کہ ڈرائیور کو یکدم گاڑی کی اسپیڈ ہلکی کرنا پڑی۔ مسرت جہاں کے حکم پر ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کر اس دو منزلہ مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز پر ایک لڑکا باہر آیا، ڈرائیور سے بات کی اور پھر اندر چلا گیا۔ ڈرائیور واپس پلٹا اور مسرت جہاں سے مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

”بیگم صاحبہ! آپ جن محترمہ سے ملنے آئی ہیں، وہ اوپر کی منزل میں رہتی ہیں۔ نیچے مالک مکان کی فیملی ہے۔“

”اچھا“ کہتے ہوئے مسرت جہاں نے اپنے بھاری بھرکم وجود کو گاڑی سے کھینچ کر نکالا اور بیٹے کو بھی اترنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ماں بیٹا زینہ عبور کر کے اوپر پہنچے تو خاتونِ

خانہ نے ان کا استقبال کیا، انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر وہ اور مسرت جہاں رسمی گفتگو کے بعد اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہوگئیں۔ تنویر ہونقوں کی طرح بیٹھا ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتا رہا۔ کمرے کا فرنیچر اور گھسا پٹا قالین دیکھ کر یہ بات تو اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ گھر کے معاشی حالات انتہائی غیر مستحکم اور ناگفتہ بہ ہیں۔ ابھی وہ یہیں تک سوچ پایا تھا کہ اچانک کمرے کے دروازے کا پردہ ہٹا اور یکے بعد دیگرے دو چاند چمکے۔ تنویر پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ وہ سوچ رہا تھا امی نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرے لیے تو یہ انتخاب ہی مشکل ہے کہ دونوں میں سے کون زبر ہے اور کون زیر۔ وہ اپنی سوچوں سے اس وقت باہر آیا جب مسرت جہاں نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

''یہ تمہاری گل بانو آنٹی کی صاحبزادیاں ہیں۔ بڑی صنم ہے اور چھوٹی شبنم ہے۔ دونوں بچیاں بڑی با اخلاق، خوش مزاج اور سگھڑ ہیں۔'' تنویر نے ہلکے سے اپنے سر کو جنبش دی اور متانت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔'' وہ ان دونوں کے حسین جلوؤں میں ایسا گم ہوا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ آج اس کی ایک اہم بزنس میٹنگ بھی ہے۔ اس کے منیجر نے جب اسے کال کی تب وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوا اور ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''امی! میں چلتا ہوں۔ میں ٹیکسی لے لوں گا۔ گاڑی آپ کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے گل بانو کے قریب جا کر تعظیماً جھکا، سلام کیا اور دونوں لڑکیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ دونوں بہنیں تنویر کی پُروقار شخصیت اور مردانہ وجاہت سے مرعوب نظر آرہی تھیں۔ تنویر کے جانے کے بعد مسرت جہاں نے بھی اجازت طلب کی اور بغیر کسی تمہید کے تنویر کے لیے صنم کو مانگ لیا۔ گل بانو نے معذرت خواہانہ انداز میں فوراً کہا۔

''بہن! یہ رشتہ سر آنکھوں پر لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ صنم انگیج ہے۔ ہاں اگر آپ شبنم کے لیے کہتی ہیں تو ہم لوگ غور کر کے جواب دیں گے۔'' مسرت جہاں نے بغیر کسی حیل وحجت کے فوراً گل بانو کی بات مان لی اور بڑے تپاک سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے بولیں۔

''بس بہن تاخیر سے کام مت لیجیے گا۔ مجھے فوری جواب چاہیے۔''

گل بانو نے پُرخیال نظروں سے مسرت جہاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بیٹے کی مرضی بھی معلوم نہیں کی اور آناً فاناً رشتہ دے ڈالا۔''

مسرت جہاں نے گردن اکڑا کر فخریہ لہجے میں کہا۔

''ارے گل بانو بہن! اسے اس وقت سے جانتی ہوں جب یہ میرے پیٹ میں سمایا تھا۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اسے آپ کی دونوں بیٹیاں پسند آئیں۔ اس لیے بغیر کسی تردد کے میں نے صنم نہ سہی شبنم کو مانگ لیا۔ بس بہن مجھے جواب اقرار میں چاہیے، انکار میں نہ سنوں گی۔'' گل بانو نے پیشانی پر سلوٹیں ڈالتے ہوئے ایک تھکی ہوئی گہری سانس لی اور اداس لہجے میں بولیں۔

''مسرت بہن سوتن پر بیٹی دینا کوئی آسان کام نہیں۔ صلاح مشورہ اور غور وخوض کے بعد ہی فیصلہ کروں گی۔'' چند لمحوں کے لیے مسرت جہاں کا چہرہ لٹک گیا لیکن وہ وقت کی نبض کو پہچانتی تھیں۔ اس لیے فوراً پینترا بدلا اور اپنا بیش قیمت پرس کھولتے ہوئے بولیں۔

''ارے بہن! میں بھی ایسی بھلکو ہوں کہ دماغ میں آئی بات بھول جاتی ہوں۔'' گل بانو استفہامیہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ مسرت جہاں نے ایک صحت مند نوٹوں کی گڈی گل بانو کی آنکھوں کے سامنے لہرائی اور متکبرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دونوں لڑکیوں کے لیے یہ پیسے لے کر آئی تھی۔ دونوں جتنی حسین ہیں اتنی ہی نازک اور کمزور ہیں۔'' گل بانو کی آنکھوں میں نوٹ دیکھ کر لالچ اور طمع کی جو چمک ابھری، وہ مسرت جہاں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی۔ گل بانو نے نوٹوں کی گڈی مسرت جہاں کے ہاتھوں سے یوں اچکی جیسے شکاری اپنے شکار کو اچکتا ہے۔ نوٹوں کو لگاوٹ سے سہلاتے ہوئے بولی۔

''ارے بہن! اس کی کیا ضرورت تھی۔ میری بیٹیوں کو صرف آپ کی دعائیں چاہئیں۔'' مسرت جہاں گل بانو کی قلبی کیفیت کو اچھی طرح جان چکی تھیں۔ انہوں نے صحیح وقت پر صحیح نشانہ لگایا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولیں۔

''مجھے آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔''

گل بانو نے اپنے لہجے سے شہد ٹپکاتے ہوئے کہا۔

''ارے اطمینان رکھیے۔ بس ذرا بچی کی مرضی معلوم کرلوں۔ انشاء اللہ میری شبو آپ ہی کی بہو بنے گی۔''

اب مسرت جہاں یوں زینے اتر رہی تھیں جیسے کوئی قلعہ فتح کر کے جا رہی ہو، جب ڈرائیور نے ان کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ اپنی گاڑی میں بیٹھیں، تب انہیں محسوس ہوا کہ بالائی منزل کی کھڑکی سے کچھ آنکھیں ان کی گاڑی کو

حسرت بھری نظروں سے تک رہی ہیں۔ غرور اور گھمنڈ ان کے انگ انگ سے پھوٹنے لگا۔

☆☆☆

رانیہ کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ گردوپیش کو بھلا کر وہ بے ترتیب سی اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ بدقت تمام اپنے آتشیں آنسو روکے ہوئے تھی۔ آج تک اسے اپنی محبت اور تنویر کی وفا پر بڑا ناز تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی عین وقت پر تنویر دوسری شادی کے لیے انکار کر دے گا اور اس کی ساس کو منہ کی کھانی پڑے گی لیکن جیسے ہی وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے، اس کا کرب اور دکھ جاگ اٹھا۔ آنکھوں کے سوتے ابل پڑے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ان حالات میں اگلا قدم کیا اٹھانا چاہیے کیونکہ ماں باپ عرصہ دراز پہلے اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے چونکہ وہ بذات خود ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے کسی بہن یا بھائی کے گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں البتہ عزیز واقارب کافی تھے لیکن اسے اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ جب تک اس کے پاس گڑ رہے گا، یہ مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہیں گے اور پھر سارے پھُر کر کے اڑ جائیں گے۔ یہ ایک بے رحم اور اٹل حقیقت تھی کہ عنقریب اس گھر میں اس کی سوتن آنے والی ہے اور اگر قدرت نے اسے اولاد سے بھی نواز دیا تو یقیناً اس کا اس گھر میں وہ مقام نہیں رہے گا، جو ابھی ہے۔ وہ اپنے دماغ پر بہت زور ڈال رہی تھی لیکن کوئی حل نہیں نکال پا رہی تھی۔ انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں اسے غفلت کی نیند آ گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب تنویر نے دفتر سے آ کر اس کے بکھرے بکھرے وجود کو اپنے ہاتھوں سے سمیٹ کر اسے ڈھنگ سے لٹایا۔ اس کے سرہانے نرم و گداز تکیہ دیا اور اس کے لمبے سیاہ بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ شوہر کی اس محبت کو دیکھ کر اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ تنویر ایک نہیں، دس شادیاں کرے لیکن وہ اپنے شوہر کے گھر کی چار دیواری سے کبھی باہر نہیں نکلے گی کیونکہ اسی گھر میں اس کی عزت، عفت، عصمت اور وقار محفوظ ہے۔ فیصلہ کرتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے تنویر کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ دیا اور تنویر نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ رانیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے آگ برساتی گرمی میں اسے گھنا سایہ نصیب ہو گیا ہو اور یہی سایہ اس کی اصل پناہ گاہ ہے۔

☆☆☆

مسرت جہاں کا زیب تن کیا ہوا قیمتی لباس، قیمتی جیولری، پرس اور چمچماتی کار اور اس کے علاوہ بھاری بھر کم نوٹوں کی گڈی اور پھر سونے پر سہاگا ڈپٹے کا شاہانہ انداز ان کی امارت کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ تنویر کا بروکھوا ابھی چند لمحوں کا تھا لیکن دونوں بیٹیاں دل و جان سے اس پر فدا ہو گئی تھیں بلکہ گل بانو بھی اس کے قصیدے پڑھ رہی تھی۔ مسرت جہاں کے جاتے ہی صنم ماں پر برس پڑی۔ اس کا غیظ و غضب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اشتعال انگیز لہجے میں اس نے اپنے دل کا زہر اگلا۔

''اماں، یہ ہر رشتے والوں کو تم یہ کیوں کہہ دیتی ہو کہ میں انگیج ہوں۔ میں نے کس کے نام کی انگوٹھی رنگ پہن رکھی ہے۔ بھلا مجھے بھی تو اس کا نام پتا بتایئے۔'' گل بانو نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

''اری نگوڑ ماری...... حلق پھاڑ کر کیوں چلا رہی ہے۔ گھر کی بات گھر ہی میں رہنے دیا کر۔ سو بار میرا لاڈلا کہہ چکا ہے کہ اماں میں صنم سے شادی کروں گا پھر بھلا میں تیرے لیے کوئی اور رشتہ کیسے قبول کر لوں۔'' صنم کرخت آواز میں چلائی۔

''آپ کا وہ بیٹا فرہاد...... ایک نمبر کا نکھٹو، کام چور اور آوارہ۔ اس سے شادی کرنے سے پہلے میں خودکشی نہیں کر لوں گی۔'' گل بانو نے دوبارہ سرزنش کرتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا اور بولی۔

''ذرا اپنی آواز کا والیوم کم کر۔ اڑوس پڑوس والے سمجھتے ہیں تم تینوں میرے پیٹ کے جنے ہو۔ تیرے شور واویلے سے سب سمجھ جائیں گے کہ صرف فرہاد میرا بیٹا ہے اور تم دونوں میری بھتیجیاں ہو۔'' صنم نے ہاتھ نچاتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواباً کہا۔

''ارے سمجھ جائیں، مجھے کسی کی پروا نہیں۔ لیکن یہ خام خیالی دل سے نکال دیں کہ میں فرہاد سے شادی کروں گی۔ ایک نمبر کا جیب کترا اور اٹھائی گیرا۔ اپنا پیٹ پال نہیں سکتا مجھے کہاں سے روٹی کھلائے گا۔''

صنم نے بخیے ادھیڑنے شروع کیے تو گل بانو کا بھی پارہ چڑھ گیا اور جوابی حملہ کرتے ہوئے طیش آمیز لہجے میں بولی۔

''صنم! میرا منہ مت کھلوا۔ اسے چور، اٹھائی گیرا بنایا کس نے۔ تیری انگلی پکڑ کر ہی اس نے چلنا سیکھا ہے۔ تیری محبت میں وہ ایسا اندھا ہوا کہ اسے اچھے برے کی تمیز ہی ختم ہو گئی۔''

اب صنم کی باری تھی۔ اس کی زبان آگ اگلنے لگی۔

''اماں! ہماری ماں تو ہمیں پیدا کر کے ملک عدم

سدھار گئیں۔ ہم دونوں تو آپ ہی کی گود کے پلے بڑھے ہیں۔ ہم تو آج بھی آپ کے شاگرد ہیں۔ دراصل استاد تو آپ ہی ہیں۔ ہم تینوں جو کچھ بھی کرتے ہیں ماسٹر مائنڈ تو آپ ہی ہیں نا۔'' گل بانو انگارے چباتے ہوئے بولی۔

''اے..... وہ امداد علی والے واقعے کی بھی ماسٹر مائنڈ میں تھی یا تم دونوں کی ملی بھگت تھی۔ ذرا مجھے یہ تو بتا۔'' امداد علی کے حوالے پر صنم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے اور ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کوئی جواب نہیں بن پڑا اور اس نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ دور بیٹھی شبنم نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بہن کو جاتے دیکھا اور اپنی نشست سے اٹھ کر گل بانو کے قریب آئی اور مدھم آواز میں استفسار کیا۔

''اماں! یہ امداد علی کا کیا قصہ ہے، آپ نے تو اس کی ساری شعلہ بیانی ایک پل میں ختم کردی۔'' گل بانو نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اری میری بنو! ایسے تیر ہمیشہ میں اپنے ترکش میں سنبھال کر رکھتی ہوں۔ ضرورت کے وقت ہی انہیں نکالتی ہوں۔'' شبنم نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

''سارے تیروں کی نمائش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ امداد علی کا کیا ماجرا ہے، یہ بتایئے۔'' اس کے لہجے میں تجسس نمایاں تھا۔ گل بانو نے منہ میں پان کی گلوری ٹھونستے ہوئے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور بولی۔

''پچھلے دنوں میرے بیٹے فرہاد اور تیری بہن صنم نے بڑا اچھا ڈراما رچایا تھا۔ یہاں قریب کے ایک گاؤں کا بوڑھا اور مالدار زمیندار صنم سے ٹکرا گیا۔ صنم اس کی جائداد، زمینیں اور روپے پیسے دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوگئی۔ فوراً اس سے نکاح پر آمادہ ہوگئی۔ اس نے انتہائی بھاری جوڑے اور زیورات بری میں چڑھائے اور بڑے ارمانوں سے اسے اپنی حویلی لے کر گیا۔ جب اس نے سب اپنے ہاتھ میں کرلیا تب فرہاد کو فون کیا کہ پوری تیاری کے ساتھ آجاؤ۔ فرہاد بھی پرانا کھلاڑی ہے۔ اپنے چند دوستوں کو پولیس کی وردیاں پہنا کر اور جعلی نکاح نامہ تیار کر کے امداد علی کے سر پر پہنچ گیا کہ صنم میری بیوی ہے۔ زیادہ تین پانچ کروگے تو پولیس ابھی تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر تمہیں گھسیٹتی ہوئی لے جائے گی۔ وہ سادہ لوح آدمی چکرا کر رہ گیا۔ اس نے اسی لمحے طلاق نامہ لکھ کر صنم کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ دونوں نے بوڑھے کو مزید احمق بنایا کہ پولیس کو بھی کچھ دینا پڑے گا اور اس طرح اس سے ایک خطیر رقم اینٹھ لی۔'' شبنم نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کافی طویل ہنکارا بھرا اور گردن مٹکاتے ہوئے بولی۔

''تب ہی ایک عرصے سے دونوں شیر و شکر بنے ہوئے تھے۔ ہر جگہ ساتھ ساتھ اڑے اڑے پھرتے تھے۔ وہ تو اچانک پیسوں کے لین دین پر دونوں میں تو، تو..... میں، میں ہوگئی۔ تب ہی سے بھائی فرہاد غائب ہے اور آپا کا بھی موڈ آف ہے۔ آج تنویر کے رشتے کے بہانے سارا نزلہ آپ پر گرا۔'' گل بانو نے تائیدی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی اور پھر منہ پر سلوٹیں ڈالتے ہوئے بیزار کن لہجے میں بولی۔

''چھوڑ خاک ڈال دونوں پر۔ تُو اپنے بارے میں بتا۔ تجھے پسند ہے نا یہ رشتہ۔ میں مسرت جہاں کو کیا جواب دوں؟'' شبنم کی آنکھیں اس ذکر پر چمکنے لگیں۔ کھلکھلا کر اس نے اپنی بتیسی چمکائی اور مخمور لہجے میں بولی۔

''ارے میری اماں! وہ شہزادہ تو سیدھا آنکھوں کے رستے دل میں اتر گیا ہے۔ بس جلدی سے شادی کی تاریخ طے کردو تاکہ میں پیا مکن کا لطف اٹھا سکوں۔''

گل بانو نے اس کی بے حیائی کی باتوں پر مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔ ''تیرے اس گلفام کے ساتھ دو خار بھی لگے ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ بڑھیا جو تیری ساس بننے والی ہے اور دوسری تیری سوتن رانیہ۔ اسے تو میں نے نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ بہت بڑے گھرانے کی لڑکی ہے۔ ماں باپ کروڑوں کی جائداد اس کے نام چھوڑ کر مرے ہیں۔'' شبنم نے ایک طویل انگڑائی لے کر ایک جماہی لی اور قدرے خم ہو کر گل بانو کے کان میں سرگوشی کی۔

''میری ماں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنی راہ میں آنے والی ساری مزاحمتوں کو دور کرنا میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کے سکھائے ہوئے سارے گر مجھے ازبر ہیں۔ بقول آپا اور بھائی فرہاد کے آپ ہی ہماری ہیڈ مسٹریس ہیں۔ ہم تو ابھی طفلِ مکتب ہیں۔'' گل بانو اپنی اس تعریف پر مارے خوشی کے جھوم اٹھی۔ بڑی گرم جوشی اور پیار سے شبنم کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ خوشی اور مسرت دونوں کے چہروں سے عیاں تھی۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن پر مسافروں، قلیوں، بھک منگوں کا ایک جم غفیر تھا اور وہیں فرہاد ایک سنگی بینچ پر بیٹھا اپنی عقابی نظروں سے یہ مشاہدہ کر رہا تھا کہ کس مسافر کی جیب میں کتنی ہریالی ہے کیونکہ جب سے صنم سے لڑ بھڑ کر وہ گھر سے نکلا

تھا۔ اسے پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سگریٹ کا ٹوٹا ایک طرف پھینکا اور اپنی مہم سر کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ قریب کھڑے ہوئے ایک شخص کی پھولی ہوئی جیب پر اس کا ہاتھ مہارت سے رینگتا ہوا پہنچا ہی تھا کہ ایک قلی کی تیز نگاہوں نے سارا معاملہ ہی چوپٹ کر دیا۔ قلی کے شور مچانے پر وہاں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایسی افراتفری مچی کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بدقت تمام سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جب تعاقب کرتا ہوا ہجوم کافی پیچھے رہ گیا۔ تب ایک جگہ رک کر اس نے دم لیا اور اپنی پھولی سانسیں درست کرنے لگا۔ اسی وقت اس کا موبائل گنگنایا۔ شدید غصے میں مرتعش موبائل کو ایک جھٹکے سے نکالا تو اسکرین پر صنم کا نام چمک رہا تھا۔ خوشی سے آنکھیں چمکنے لگیں۔ خود کلامی کے انداز میں بدبدایا۔ ''مل گیا کوئی نیا کیس تب ہی تو رجنیش بھلا کر مابدولت کو یاد کیا ہے۔ میرے بغیر تو صنم کا کام ہی نہیں چلتا لیکن اس بار جھے بخرے پہلے طے کروں گا، بعد میں کام پکڑوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سیل فون آف کیا اور ٹیکسی والے کو ہاتھ کا اشارہ دیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ماں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ لجاجت سے بولا۔ ''اماں! بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔'' ماں کا دل فوراً پسیج گیا۔ حالانکہ غصے میں بھری بیٹھی تھی لیکن سب کچھ بھول بھال کر کچن میں جا کر کھانا گرم کرنے لگی۔

اس دوران میں صنم داخل ہوئی اور ماتھے پر تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ تم اپنی اماں کے ہاتھ کا کھانا کب سے کھانے لگے۔ تم میرے ساتھ چلو بہترین کھانا بھی کھلاؤں گی اور جو پلاننگ میں نے کی ہے، اسے حتمی شکل دینے کے لیے ہمیں کیا اٹھاپٹخ کرنی ہے، اسی سلسلے میں تم سے ڈسکس بھی کرنا ہے۔''

فرہاد نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے اپنے پیر پھیلائے اور خالص کاروباری انداز میں بولا۔ ''معاملہ کیا ہے؟ اور منصوبہ بندی کیسی ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا..... مجھے سب سے پہلے یہ بتا کہ تیرے ہاتھ مال آتے ہی مجھے کیا ملے گا؟'' صنم اس کے لہجے پر بھونچکا رہ گئی کیونکہ ابھی تک وہ کتے کی طرح اس کے آگے پیچھے دم ہلاتا پھرتا تھا۔ ہڈی ڈالو تب بھی خوش..... روٹی کا ٹکڑا پھینک دو تب بھی خوش۔ لیکن آج اسے محسوس ہوا کہ فرہاد کا عقل والا خانہ بالکل خالی نہیں ہے اور اگر اس کی ماں کو سن گن مل گئی تو پھر تو وہ سارا مال ہڑپ کر جائے گی۔ اس نے فوری فرہاد کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتی ہوئی اسے باہر لے کر

جواب

کلاس میں امتحان ہو رہا تھا۔ ماسٹر صاحب غصے کی حالت میں کلاس روم میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی مستقل چہل قدمی کی وجہ سے خالد کو نقل کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا اس لیے اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''سر! آپ بیٹھ جائیں نا۔''

''خاموش۔'' ماسٹر صاحب غصے سے چلائے۔ ''چپ چاپ پرچہ کرتے رہو۔'' خالد تھوڑی دیر تو چپ رہا اور پھر ایک پرچے پر کچھ لکھ کر ماسٹر صاحب کو دے دیا۔ ماسٹر صاحب پرچہ پڑھتے ہی اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ خالد کے پیچھے بیٹھے ہوئے محمود نے پوچھا۔

''تم نے پرچے میں آخر کیا لکھ دیا تھا جو ماسٹر صاحب فوراً بیٹھ گئے؟''

''میں نے لکھا تھا کہ سر آپ کی پینٹ پھٹی ہوئی ہے۔'' خالد نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ۔ محمد ماجد اسلم، حیدر آباد

''قصاب نے آج میری بڑی توہین کی۔''

''وہ کس طرح؟''

''میں نے اس سے کہا کہ کتے کے لیے آٹھ آنے کے چھیچھڑے دے دے۔ وہ کہنے لگا، کاغذ میں لپیٹ دوں یا تم یہیں کھاؤ گے؟''

مرسلہ: غلام فرید جتوئی، رحیم یار خان

☆☆☆

ڈاکٹر ہیلر کہتا ہے، جو لوگ اوسطاً کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں وہ بڑی پریشان کن ہے۔ بالخصوص جب ماہرین اعداد و شمار اس اصطلاح کو استعمال کریں۔ اب یہی دیکھیے کہ ایک شخص اپنا بایاں پاؤں دہکتی ہوئی انگیٹھی پر اور دایاں پاؤں برف کی سل پر رکھے کھڑا ہو تو ہمارے ماہرین اعداد و شمار میں بے تکلف کہہ اٹھیں گے کہ یہ شخص اوسطاً آرام سے کھڑا ہے۔

مرسلہ: خرم اختر

نکل گئی۔ جب گل بانو کھانے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو اسے پتنگے لگ گئے۔ گل بانو کی چیخ و پکار پر شبنم دوڑی دوڑی آئی اور آتے ہی سارا معاملہ سمجھ گئی۔ گل بانو کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر میز پر رکھی۔ گل بانو نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے شدید غصے کے عالم میں کہا۔

”ارے ایسی ہی میرے بیٹے کی دیوانی ہے تو اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ اسے بے وقوف بنا کر اس سے کام لیتی ہے اور چند ٹکے دے کر اسے دھتکار دیتی ہے۔“ شبنم نے منہ میں سالم کوفتہ ٹھونستے ہوئے چپڑ چپڑ کی آواز نکالی اور پھر پانی کا بڑا سا گھونٹ لے کر بولی۔

”ارے اماں! شادی تو وہ بھائی فرہاد سے کبھی نہیں کرے گی کیونکہ اسے چاہیے تنویر جیسا بانکا، سجیلا، اسمارٹ اور خوبرو نوجوان۔“

☆☆☆

دلہن بن کر شبنم نے جب تنویر کے گھر میں قدم رکھا تو پہلی ہی نظر میں ناقدانہ جائزہ لے لیا۔ سب کچھ اس کی توقع کے مطابق تھا۔ پُرتعیش اور جدید فرنیچر سے آراستہ بنگلا، قیمتی اور نادر تصاویر اور مہنگی اشیا۔ اس کے علاوہ سبزہ اور وسیع لان دیکھ کر تو اس کے دل کی کلی کھل گئی۔ ایسے ہی گھر اور بر کے سپنے اس نے بُن رکھے تھے۔ گل بانو نے اچھی طرح رگڑائی منجھائی کر کے اسے رخصت کیا تھا۔ اس لیے فی الحال تو شائستگی اور تہذیب کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ مسرت جہاں بھی نئی بہو کے چاؤ چونچلوں میں مصروف تھیں۔ رانیہ نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی۔ اس کے وہی شام و سحر اور وہی معمولات تھے۔ ساس کی مزاج پرسی کرنا، ان کا پرہیزی کھانا وقت پر میز پر لگانا اور ان کی دوا اور انجکشن کا خیال رکھنا۔ یہ سب اس کی روٹین میں شامل تھا اور رہا تنویر — اس کے لیے تو اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ جب وہ شبنم کے کمرے میں ہوتا تب وہ اپنے دل پر سل رکھ لیتی۔ ورنہ تنویر کا ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھوں سے کر کے خوش ہوتی۔ اس کے علاوہ بھی گھر کی دیگر تمام ذمے داریاں کلی طور پر اپنے سر لے کر اس نے اپنے آپ کو مصروف کر لیا تھا تاکہ اُلٹی سیدھی باتیں سوچنے کا وقت ہی نہ ملے۔ گھر کے تمام ملازمین بھی رانی بی بی، رانی بی بی کا کلمہ پڑھتے تھے اور یہی بات شبنم کو کھلنے لگی کہ اس گھر پر حکمرانی مکمل طور پر رانیہ کی ہے۔ مسرت جہاں بھی ہر کام اسی سے پوچھ کر کرتی ہیں۔ عزیز و اقارب آئے گئے سب اس کا ہی دم بھرتے ہیں۔ تنویر بھی بہت جلد شبنم کی خمار پرور آنکھوں اور لبوں کے ساغر سے باہر نکل کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ اس کی کاروباری مصروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ صبح کا گیا، رات ہی میں گھر لوٹتا۔ ہوٹل بازی پسند نہیں تھی۔ اس لیے آتے ہی رانیہ کو آواز دیتا۔ رانیہ خود بھی ہمہ وقت تیار رہتی۔ دونوں مل کر رات کا کھانا ہمیشہ ساتھ کھاتے۔ تنویر نے شبنم کو بھی شامل کرنا چاہا لیکن اس نے تلخ لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”مجھے جب بھوک لگتی ہے میں کھا لیتی ہوں۔ مجھ سے کسی کا انتظار نہیں ہوتا۔“ ایسا کرارا جواب سن کر تنویر نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔ چونکہ کھانے کا کمرا اس کے کمرے سے متصل تھا اس لیے پلیٹوں، چمچوں کی کھنکناہٹ، باتوں کی آواز، ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اس کی سماعتوں میں زہر گھولتے۔ کچھ دن تک تو وہ برداشت کرتی رہی لیکن ایک دن پھٹ پڑی۔ تنویر کی موجودگی میں ہی اپنی زبان درازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رانیہ کے کمرے کا مطالبہ کر دیا۔ تنویر چراغ پا ہو گیا اور اس کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ بات شاید اور آگے بڑھتی لیکن رانیہ نے فوراً ہامی بھر لی اور اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

”میں کل ہی اپنی نگرانی میں ملازمین سے اپنا سامان ہٹوا کر بالائی منزل کے کسی کمرے میں شفٹ ہو جاؤں گی۔“ اس کی اس ادا پر شبنم دل ہی دل میں مزید جل بھن کر کباب ہو گئی کیونکہ تنویر اس کی جانب سے رخ پھیر کر نہایت محبت اور احترام کی نظروں سے رانیہ کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ پوری سج دھج کے ساتھ بنی سنوری اس کے سامنے کھڑی تھی لیکن تنویر صرف اور صرف رانیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ شبنم کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی۔ دوسرے دن فوراً ہی گل بانو کو فون کھڑکھڑایا۔ سارا دردِ دل ایک ہی سانس میں کہہ سنایا۔ گل بانو نے صبر کی تلقین کرتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

”جیسے ہی تیرا پیر بھاری ہوا، یہ سب تیرے قدموں میں لوٹیں گے اور یہ تنویر...... یہ تو تیری انگلیوں پر ناچے گا۔“

”سچ کہہ رہی ہو اماں۔“ شبنم چہک کر بولی۔ گل بانو...... لہجے میں سارے جہاں کی شیرینی ٹپکاتے ہوئے بولی۔

”ارے میری بنو! یہ میں نہیں بول رہی ہوں بلکہ میرا تجربہ بول رہا ہے۔ تو اس خاندان کا وارث تو پیدا کر پھر دیکھ تیری کیا آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ویسے میری بچی تو اپنے رنگ روپ و بناؤ سنگھار پر بھرپور توجہ دیا کر۔ مرجھائی ہوئی اور پژمردہ عورت کبھی مرد کا دل نہیں جیت سکتی۔“

شبنم نے جھلائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''ارے روزانہ ایک نیا ڈریس زیب تن کر کے ایک نئی لک کے ساتھ سامنے آتی ہوں۔ مگر مجال ہے جو میری طرف دیکھ لے۔ ہمیشہ رانی رانی کا ورد کرتا رہتا ہے وہ شخص۔ وہ رانی میں نوکرانی۔'' یہ کہہ کر شبنم نے رونا اسٹارٹ ہی کیا تھا کہ گل بانو نے گھبرا کر کہا۔

''شبو! تو ایک کام کر..... کچھ دنوں کے لیے میرے پاس آجا۔ تیری آؤٹنگ بھی ہوجائے گی اور دل بھی بہل جائے گا۔ جب تک تنویر اور مسرت جہاں تیرے ہاتھ پیر نہ جوڑیں، یہاں سے واپس جانے کی ضرورت نہیں۔''

''کیا کہا؟'' شبنم خفگی بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ کے قبرنما گھر میں، میں نے اتنے دن کیسے گزارے، سوچتی ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ نہ بابا نہ۔ آپ کے گھر کا آب ودانہ بھی اب میرے حلق سے نہیں اترتا۔ چند دن تو کیا میں چند گھنٹے بھی وہاں نہیں رہ سکتی۔''

گل بانو کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تو بری طرح تلملا گئی۔ ساری ممتا اور محبت ہوا ہوگئی۔ اشتعال آمیز لہجے میں بولی۔ ''احسان فراموش..... میرا گھر تجھے قبر نظر آرہا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تیری رخصتی کو۔ اب مجھ سے کوئی امید مت رکھنا۔ وہ تو مرتے ہوئے بھائی کو زبان دی تھی اس لیے نبھا رہی ہوں۔ ورنہ بچپن میں ہی تم دونوں بہنوں کو چلتا کردیتی۔''

شبنم نے گھبرا کر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''ارے اماں! آپ تو ناراض ہوگئیں۔'' گل بانو نے کوئی جواب نہیں دیا اور رابطہ منقطع کردیا۔ شبنم نے موبائل بیڈ پر پھینکتے ہوئے کندھے اچکائے اور بولی۔

''ابھی چند کرارے نوٹ اور کھنکتے ہوئے سکے سامنے پھینکوں گی تو سارا غصہ، ساری ناراضگی ہوا میں اڑ جائے گی۔''

☆☆☆

مسرت جہاں کی ناپتی تولتی نگاہیں روزانہ شبنم کو تاڑتی رہتی تھیں۔ جیسے ہی انہیں احساس ہوا۔ انہوں نے فوراً گائنا کالوجسٹ سے رابطہ کیا اور پریگنینسی کنفرم ہوتے ہی گھر میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ تنویر کی نظروں میں بیوی کی ہر خامی خوبی بن گئی۔ ماں بیٹے کی دلی مراد بر آئی تھی۔ شبنم اب زمین پر نہیں بلکہ ان کے سروں پر چل رہی تھی۔ دونوں اس کی ناز برداریوں میں غرق تھے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کی ڈائٹ، میڈیسن اور آرام کا پورا پورا خیال رکھا جاتا۔ بقول مسرت جہاں کے پہلوٹھی کی اولاد ہے کہیں الٹا سیدھا پیر نہ پڑ جائے۔ قدم قدم پر داری صدقے ہوتیں۔ ذیابیطس کی مریضہ تھیں لیکن اس پُرمسرت موقعے پر مٹھائی کھانا بھولیں اور نہ ہی ڈھیروں مٹھائی تقسیم کرنا بھولیں۔ اب وہ ایک ایک دن گن رہی تھیں کہ کب ان کے گھر میں ننھی منی کلکاریوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔ رانیہ نے بھی شبنم کو گلے لگا کر نہ صرف مبارکباد دی بلکہ اپنی نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا لیکن شبنم کی فکر سوچ نے خاموشی سے سرگوشی کی۔ ''بظاہر خوش ہو رہی ہے، اندر سے کوئلہ بن گئی ہوگی۔'' میکے کا ایک چکر لگا کر اس نے روپے پیسے کی چمک دکھا کر گل بانو کو بھی رام کرلیا تھا۔ ویسے بھی آج گل گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی تھی کیونکہ صنم کو بھی فی الحال کوئی شکار ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ پچھلے کئی مہینوں کا کرایہ بھی چڑھ چکا تھا۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی اس وقت صرف شبنم ہی تھی۔ اس لیے تینوں نے مل کر اسے گھیر لیا۔ اس گھر کی اَن داتا فی الحال شبنم ہی بنی ہوئی تھی۔ تینوں مختلف اوقات میں اس سے رابطہ کرتے اور وہ کسی نہ کسی بہانے آکر تینوں کی مٹھی گرم کر کے تنویر کے واپس آنے سے پہلے گھر پہنچ جاتی لیکن مسرت جہاں نے اب اس کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی تھی۔ یہ خبر گل بانو کے خاندان پر بجلی بن کر گری۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر مسرت جہاں سے..... چلت پھرت کے کاموں کے لیے اکساتی۔ مستقل آرام کے لیے سختی سے منع کرتیں، ساس کی ہدایات پر اس لیے عمل کرنا پڑتا تھا کہ تنویر بھی ماں کا ہم نوا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر بھی سو بار کہہ چکی تھی کہ آپ کا بی پی بہت ہائی ہے۔ کنٹرول نہیں کیا تو آپ کے لیے اور بچے کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ بادل ناخواستہ شبنم نے ہاتھ پیر ہلانا شروع کیے تو سب سے پہلے نوکروں کی شامت آئی۔ وہ غریب سہمے سہمے رہ کر اپنا کام انجام دیتے اور فوراً بھاگتے۔ ان ہی دنوں رانیہ کے کزن کی شادی اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ تنویر بذات خود بھی اس شادی میں شرکت کرنا چاہتا تھا لیکن کاروباری مسائل نے اس کے قدم روک لیے۔ مسرت جہاں نے بخوشی رانیہ کو اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت عرصے سے کہیں باہر گئی بھی نہیں ہو۔ اچھا ہے چند دن اپنے رشتے داروں میں ہو آؤ۔ یہاں کی فکر نہ کرنا۔ یہاں کے سارے معاملات اب شبنم دیکھ لے گی۔'' قریب کھڑی شبنم کے کانوں سے یہ جملہ ٹکرایا تو اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے لیکن ظاہر کچھ نہیں ہونے دیا کیونکہ اداکاری میں بھی اسے

ملکہ حاصل تھا۔ کچن میں پہلا قدم رکھتے ہی کھلا گئی۔ ملازمہ کی مدد سے جو ناشتا تیار کیا، وہ اتنا بدذائقہ تھا کہ مسرت جہاں اور تنویر کوشش کے باوجود نہ نگل سکے۔ دونوں ماں بیٹے نے اس وقت تو صبر کرلیا لیکن لنچ اور ڈنر میں تو ان کا صبر جواب دے گیا۔ مسرت جہاں نے نہ صرف اس کو بلکہ گل بانو کی سات نسلوں کو نہیں بخشا۔ تنویر نے بھی کاٹ دار لہجے میں ماں کی تائید کی۔ دونوں رانیہ کو یاد کر کے اس کی انگنت خوبیوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ شبنم نے دانت کچکچاتے ہوئے زیرلب خودکلامی کی۔

''مسرت جہاں اور رانیہ ... بہت جلد تم دونوں کو اوپر کا ٹکٹ نہیں کٹوایا تو میرا نام بھی شبنم نہیں۔'' نوکر چاکر بھی جس کے جدھر سینگ سمائے ادھر بھاگ نکلے۔ شبنم نے گھبرا کر گل بانو کو کال کی اور مدد کے لیے بلوایا۔ حالات سے گھبرا کر تنویر نے بھی اس روز رانیہ کو فون کر کے فوراً آنے کے لیے کہا۔ لمحہ بھر توقف کے بعد اپنی بات مزید بڑھائی اور دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

''رانی! تمہارے جاتے ہی اس گھر کا شیرازہ ہی بکھر گیا۔ امی کو نہ ان کے حساب سے وقت پر کھانا مل رہا ہے اور نہ دوا۔ ان کی شوگر ڈسٹرب ہوگئی ہے۔ آج مجھے ڈاکٹر کے پاس ہر صورت میں انہیں لے کر جانا ہے۔ اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر میں بھی آج کل گھرداری کر رہا ہوں۔'' تنویر کے لہجے میں فکرمندی اور التجا کا عنصر نمایاں تھا۔ چاہتے ہوئے بھی وہ انکار نہ کرسکی اور فوراً واپسی کے لیے رضامند ہوگئی۔

☆☆☆

جب شبنم نے ایک گورے چٹے تندرست و توانا بچے کو جنم دیا تو سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مسرت جہاں نے بچے کا نام ''ارمان'' رکھا۔ تنویر اور رانیہ کو بھی یہ نام پسند آیا۔ بچہ سب کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ بچہ تھا بھی اتنا پیارا گل گوتھنا سا کہ جو دیکھتا بانہیں پسار دیتا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد شبنم کا غرور سر چڑھ کر بول رہا تھا لیکن تنہائی میں گل بانو نے پھر اس کی جھاڑ پھٹکن کی اور کہا کہ نہ صرف تنویر کی بلکہ رانیہ کی بھی تمام جائداد کا مالک یہ بچہ ہی ہوگا۔ جتنا یہ لوگ بچے سے محبت اور انسیت رکھیں گے تو تم دونوں ماں بیٹا اتنے ہی فائدے میں رہو گے۔ یہ وقت صبر اور ضبط کا ہے۔ بیٹے کو رانیہ کی گود میں ڈال دے تاکہ وہ مرنے سے پہلے اسے ہی اپنا وارث نامزد کرے۔ شبنم نے وہی کیا جو مشورہ گل بانو نے دیا تھا۔ شبنم نے وقتی طور پر سب کو خوش کر کے سبھوں کے دلوں میں اپنی جگہ بھی بنالی اور بچے کی تمام ذمے داریاں بھی مسرت جہاں اور رانیہ کے سر منڈھ دیں۔ رانیہ خود بھی اولاد کے لیے ترسی ہوئی تھی۔ ارمان کو پاکر تو وہ اپنی سدھ بدھ ہی بھلا بیٹھی۔ اپنے تمام کام بہ طریق احسن نمٹانے کے بعد وہ فوراً ارمان کو اپنے کمرے میں لے کر چلی جاتی۔ اپنے سارے کمرے کو اس نے قیمتی اور رنگ برنگے کھلونوں سے سجا رکھا تھا۔ ارمان خود بھی رانیہ سے اتنا زیادہ مانوس ہوگیا تھا کہ فقط دودھ پینے کے لیے شبنم کی گود میں جاتا۔ مسرت جہاں چونکہ بیماریوں میں گھری ہوئی تھیں۔ اس لیے ارمان کو ان کی گود میں دیتے ہوئے اسے خوف آتا اور رانیہ اور بچے کا حد سے زیادہ لاڈ دلار اب اس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ یہ شیطانی وسوسہ اس کے دل میں سرسرانے لگا کہ مبادا ایک دن وہ سگی ماں کو بھی پہچاننے سے انکار کردے۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں اپنی گردن ہلائی اور آہستگی سے اپنے آپ سے مخاطب ہوکر بولی۔

''اب تو ... فرہاد بھائی سے ہی کہنا پڑے گا۔ وہ ہی مجھے ان ساس بہو سے نجات دلا سکتے ہیں۔''

جانے کے لیے وہ آہستہ آہستہ پر تولنے لگی اور ایک دن تنویر کو شیشے میں اتار کر پھر سے اڑ گئی۔ جب دوسری بار بھی اس نے یہی کیا تب مسرت جہاں نے فوراً ایکشن لیا اور اسے اچھی طرح لتاڑا۔ شبنم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور علی الاعلان کہا۔

''تمام پابندیاں صرف میرے لیے ہیں۔ رانیہ تو کھلی آزاد فضاؤں میں تتلی کی طرح اڑی اڑی پھرتی ہے۔'' مسرت کافی صبر و ضبط سے کام لے رہی تھیں۔

''شبنم! تم میں اور رانیہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' شبنم نے ان کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا اور پورے اشتعال اور جلال کے ساتھ غرائی۔

''سب سمجھ رہی ہوں۔ وہ دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے ساتھ لاکھوں کروڑوں کی دولت لائی ہے۔ میں خالی ہاتھ آئی ہوں۔ ہے نا یہی بات..... اسی لیے اسے آپ بھی اور تنویر بھی مجھ پر فوقیت دیتے ہیں۔'' مسرت جہاں کچھ دیر تو ٹکٹکی لگائے اسے گھورتی رہیں پھر مستحکم لہجے میں بولیں۔

''جو فرق تم نے محسوس کیا، اس کی ہماری نظروں میں کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ میرا بیٹا بھی اللہ نہ کرے کنگال یا محتاج نہیں۔ ہاں البتہ جو خاندانی وضع داری و شائستگی، تعلیم

وتربیت، سلیقہ و گھڑپن رانیہ کے پاس ہے، تمہارے پاس اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ میں اور میرا بیٹا بس تمہارے حسن پر شیدا و فریفتہ ہو گئے تھے۔ ورنہ...... ورنہ...... بس اب تم زیادہ میرا منہ نہ کھلواؤ۔'' مسرت جہاں بولتے بولتے رک گئیں۔ شبنم نے ارمان کو اپنی گود میں لیا اور جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ مسرت جہاں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''تم اپنے میکے جارہی ہو۔ ہماری بلا سے لیکن ارمان میرے اور رانیہ کے پاس رہے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ ننھیال کی پرچھائیں بھی اس پر پڑے۔'' شدتِ غیظ سے شبنم کا برا حال تھا۔ نہ الفاظ سمجھ میں آرہے تھے اور نہ زبان ساتھ دے رہی تھی۔ تلملاتی ہوئی آگے قدم بڑھائے تھے کہ رانیہ نے دوڑ کر پکڑا۔ وہ کافی دیر سے اپنے کمرے میں بیٹھی دونوں ساس بہو کی تکرار سن رہی تھی۔ دونوں کی مکالمہ بازی نے اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑا دی تھی۔ روز بروز گھر کی بگڑتی ہوئی فضا، مسرت جہاں کا غصہ اور شبنم کی تنتناہٹ اس کے علاوہ تنویر کی بےبسی اس سے نہیں دیکھی جارہی تھی۔ رانیہ نے منت سماجت کر کے اسے باہر جانے سے روکا۔ اشتعال کی وہ تند لہر جس نے شبنم کو مکمل طور پر جکڑ رکھا تھا، رانیہ نے اس کی گرہ اس طرح کھولی کہ اسی وقت گل بانو کو فون کر کے اس کے پورے خاندان کو اپنے گھر بلا کر نہ صرف ان کی بھرپور خاطر تواضع کی بلکہ اپنی طرف سے انہیں اس بات کی بھی اجازت دے دی کہ وہ لوگ وقتاً فوقتاً خود آکر شبنم اور ارمان سے ملاقات کر لیں تو یہ زیادہ بہتر رہے گا۔ رانیہ کے اس معاہدے پر وہ سارے راضی ہو گئے بلکہ اس وقت شبنم نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ رانیہ نے ساس کے متعلق صرف اتنا کہا کہ بیماریوں نے انہیں مغلوب کر دیا ہے۔ اس لیے وہ عارضی طور پر چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ رانیہ نے اس واقعے کی بن گن تنویر کو نہیں لگنے دی۔ البتہ شبنم نے نمک مرچ لگا کر شوہر کے کان ضرور بھرے۔ سب کچھ سننے کے بعد بھی تنویر کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ غصے میں شبنم جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی بگڑی ہوئی صورتِ حال میں وہ ہمیشہ رانیہ کی جانب دیکھتا اور رانیہ انتہائی صبر، تحمل سے کام لیتے ہوئے سارے معاملے کو بخیر و خوبی نمٹا لیتی۔ اس واقعے کے بعد شبنم کے میکے والوں کو جیسے ویزا ایشو کر دیا گیا تھا۔ گل بانو اور صنم تو شاذ و نادر ہی نظر آتیں لیکن فرہاد اکثر و بیشتر اب بہن اور بھانجے سے ملنے کے بہانے آنے جانے لگا تھا۔ گھنٹوں شبنم کے کمرے میں بیٹھ کر ہنسی قہقہوں کے درمیان کبھی شام کی چائے پی جارہی ہے تو کبھی لنچ اور ڈنر کے مزے لوٹے جارہے ہیں، دبی دبی زبان سے مسرت جہاں نے پھر احتجاج کیا لیکن تنویر اور رانیہ نے شبنم کی سائیڈ لیتے ہوئے فوری کہا۔

''امی اب ایسا بھی ظلم نہ کریں۔ نہ آپ اسے میکے جانے کی اجازت دے رہی ہیں اور اس کے میکے والوں کے لیے یہاں آنے پر بھی پابندیاں عائد کر رہی ہیں۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔'' مسرت جہاں نے وقت اور رشتے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے چپ سادھ لی۔ اس تازہ ترین پیش رفت کے تحت فرہاد دندناتا ہوا آتا اور خواب و خور کے مزے لوٹتا۔ ارمان کو گھمانے پھرانے کے بہانے گھر سے باہر بھی گاہے بگاہے لے جاتا۔ مسرت جہاں کے کہنے پر رانیہ نے شبنم کی توجہ اس جانب مبذول کی تو شبنم نے یوں اپنے کان جھٹکے جیسے مکھی اڑا رہی ہو اور پھر کھرے اور حاکمانہ لہجے میں بولی۔

''میرا بچہ ہے اور میرا بھائی ہے۔ کسی غیر کے حوالے اپنا بچہ نہیں کر رہی ہوں۔ ہاں اگر آپ کا بچہ ہوتا تو میں بھائی فرہاد سے کہتی ہاتھ لگانے کی بھی ضرورت نہیں۔''

اس کا طرزِ تخاطب اور حقارت آمیز لہجے میں یہ گفتگو سن کر رانیہ اپنی جگہ پانی پانی ہو گئی۔ خجالت اور شرمندگی سے اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اپنی محرومی کا احساس اتنی شدت سے ہوا کہ اشکبار آنکھوں سے کچھ دیر تو شبنم کو تکتی رہی۔ پھر سسکیاں لیتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ شبنم نے اس کے دل پر کیا نشتر چلائے اس نے اس کا تذکرہ بھی کسی سے نہیں کیا۔ ہاں البتہ بارگاہِ الٰہی میں خوب روئی اور گڑگڑائی اور شاید یہی وقتِ قبولیت تھا۔ جب اس خالق کائنات کی رحمت ٹوٹ کر رانیہ پر ایسی برسی کہ اسی مہینے گائنا کالوجسٹ نے اسے خوشخبری سنائی کہ اس کی رپورٹ پوزیٹو ہے۔ پہلے پہل تو رانیہ اسے اپنے تخیل کا کرشمہ سمجھی لیکن تنویر نے خوشی سے مسکراتے ہوئے سرشار لہجے میں اس سے کہا۔

''میں تم سے کہتا تھا نا کہ رب کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ وہ تمہیں ضرور بار آور کرے گا۔'' مسرت جہاں کی سماعت سے جب یہ خوشخبری ٹکرائی تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ گھر کا ہر فرد خوشی سے سرشار تھا ماسوائے شبنم کے اور اس کے میکے والوں کے۔ یہ قیامت خیز خبر پاتے ہی گل بانو کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ان سب پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی۔ اب رانیہ کے میکے کی جائداد سے ارمان کو ٹکا بھی نہیں ملنے والا تھا اور رہا تنویر کا اثاثہ تو اب وہ بھی دو

برابر برابر حصوں میں تقسیم ہوجاتا۔ شبنم کے پیروں تلے سے تو زمین ہی کھسک گئی تھی۔ وہ دن رات اسی مسئلے پر سوچ سوچ کر الجھ رہی تھی کہ ایسا کیا کیا جائے کہ نہ بانس رہے نہ بانسری بجے۔ فرہاد اور صنم کے ساتھ خفیہ مذاکرات اور مشاورت جاری تھی۔ دونوں شبنم کو دھیرج اور صبر کا مشورہ دے رہے تھے کیونکہ عجلت اور جلد بازی سے کام بگڑ بھی سکتا تھا جبکہ شبنم سخت تشویش میں مبتلا تھی۔ گل بانو نے بھی اسے سمجھایا کہ روٹی ٹھنڈی کر کے کھانی چاہیے۔

☆☆☆

رانیہ کے ہاں جس روز بیٹے کی پیدائش ہوئی اس روز شبنم کی سراسیمگی اور اضطراب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ابھی تک اسے فرہاد اور صنم سے بہت توقع تھی کہ وہ ضرور اسے کوئی امید افزا خبر سنائیں گے اور اس کے راستے کے یہ خار ہٹا دیں گے لیکن آج تو اسے ارمان کا سنگھاسن ڈولتا نظر آرہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کاش مردہ بچہ پیدا ہو لیکن اس کی یہ خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ تنویر نے اسے فون پر فوراً یہ اطلاع دے دی تھی کہ ارمان کا چھوٹا بھائی تشریف لے آیا ہے۔ سنتے ہی وہ جل بھن کر کباب ہوگئی تھی۔ حسنِ اتفاق کہ تنویر کے دونوں بچوں کی تاریخ پیدائش بھی ایک ہی تھی۔ آج ہی ارمان کی پہلی سالگرہ تھی اور آج ہی رانیہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ مسرت جہاں اور تنویر رب کے حضور فوراً سجدۂ شکر بجالائے۔ دونوں ماں بیٹے کے چہرے سے خوشیاں چھلکی پڑ رہی تھیں جبکہ شبنم اس اذیت ناک پچھتاوے سے گزر رہی تھی کہ کاش فرہاد اور صنم کا آسرا نہ لیتی اور خود ہی کوئی داؤ کھیل جاتی تو کم از کم یہ بچہ تو دنیا میں نہیں آتا مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

وقت اپنی پوری رفتاری سے محو پرواز تھا۔ مسرت جہاں نے اپنے اس پوتے کا نام ''ایمان'' رکھا تھا۔ آج ارمان کی چوتھی سالگرہ تھی اور ایمان کی تیسری۔ پورا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ مہمانوں کی آمد ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہر سال تنویر نہ صرف اپنے دونوں بیٹوں کو ڈھیر سارے تحائف سے لاد دیتا بلکہ دونوں بیویوں کو بھی بیش قیمت تحفے دے کر ان کی خوشیوں میں اضافہ کرتا۔ آج بھی اس نے شوروم سے ایک ہی ماڈل اور ایک ہی رنگ کی دو ٹویوٹا کرولا خریدی تھیں۔ وہ دونوں بیویوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اس کے حکم پر ڈرائیور نے مقررہ وقت پر کاریں لا کر اسے اطلاع دی۔ تنویر، رانیہ اور شبنم کا ہاتھ پکڑ کر باہر لایا اور مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''امید ہے خاکسار کا یہ تحفہ آپ دونوں کو پسند آئے گا۔'' رانیہ خوشی سے کھل گئی اور چہکتی ہوئی آواز میں بولی۔

''سبحان اللہ، کتنی زبردست گاڑی ہے لیکن اتنا قیمتی تحفہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔'' تنویر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں جواباً کہا۔

''قیمت فی الحال تو کچھ نہیں ہے لیکن جب تم اور ایمان اس میں بیٹھو گے تب اس کی قیمت کئی گنا بڑھ جائے گی۔'' رانیہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ حقیقتاً اسے گاڑی بہت پسند آئی تھی۔ وہ بار بار شوہر کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہی تھی جبکہ شبنم کا موڈ بری طرح آف تھا۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ ایک نگاہِ غلط انداز کاروں پر ڈالی اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔ تنویر نے فوراً ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور شوخی سے بولا۔

''مانا کہ گاڑی آپ کی طرح حسین و جمیل نہیں لیکن ایسی بری بھی نہیں کہ آپ یوں نظر پھیر کر جارہی ہیں۔ کیوں؟ کیا میرا تحفہ پسند نہیں آیا؟'' شبنم ناگن کی طرح پھنکاری اور زہریلے لہجے میں بولی۔

''مجھے بی ایم ڈبلیو ڈرائیو کرتے ہوئے جو لطف آتا ہے وہ کسی دوسری گاڑی میں نہیں آتا۔ اگر مجھے گفٹ ہی کرنا تھا تو میری پسند کی گاڑی دی ہوتی۔'' آج کے خوشیوں بھرے دن تنویر اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ شبنم پہل کر چکی تھی اس لیے جواب دینا ضروری تھا۔ نہایت تحمل کے ساتھ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملائمت کے ساتھ کہا۔

''شبنم! تحفے کو قیمت میں نہیں محبت کے پیمانے پر قبول کرنا چاہیے۔'' شبنم نے تنک کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور ضدی لہجے میں بولی۔

''رانیہ کی دولت تو ویسے ہی بینک کی زینت بنی ہوئی ہے۔ آپ کم از کم ایک بی ایم ڈبلیو خرید کر میری خواہش تو پوری کر سکتے تھے۔''

ہنسنے بولنے والا تنویر پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ سخت طیش کے عالم میں اس نے صرف اتنا کہا۔ ''آئندہ سال دونوں بچوں کی سالگرہ پر میں کوئی گفٹ نہیں دوں گا۔ رانیہ اگر اپنے میکے کے پیسے سے خریدے گی تو تم بھی اپنے نکھٹو اور نکمے بھائی سے کہہ دینا۔ وہ ضرور تمہیں بی ایم ڈبلیو خرید کر تمہاری دلی آرزو پوری کردے گا۔'' یہ معمولی سی جھڑپ شاید جنگِ عظیم میں تبدیل ہوجاتی لیکن عین اس وقت

مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔

ارمان اور ایمان کو تمام تحائف میں سب سے زیادہ جو تحفہ پسند آیا تھا، وہ تھا اپنی دادی کا دیا ہوا ایک کھلونا۔ یہ نوزائدہ بچے کے سائز کا بڑا سا ریچھ کا گڈا تھا جو سیل سے چلتا تھا۔ جیسے ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو حرکت دو اس کے ہونٹ متحرک ہوکر سیٹی کی شکل میں سکڑ جاتے اور مشہورِ زمانہ پوئم کی دھن آن ہوجاتی۔ دونوں بھائی مسرت جہاں کے اس گفٹ کے ایسے عاشق زار تھے کہ اس گڈے کو سوتے ہوئے بھی اپنے سے جدا نہ کرتے۔ مسرت جہاں کا گفٹ تھا اور بیٹا اسے لیے لیے پھرتا تھا۔ اس لیے شبنم کو اس کھلونے سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ کھل کر تو کچھ کہہ نہیں سکتی تھی لیکن ایک دن خاموشی سے بیٹے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کا پسندیدہ کھلونا ایسی خفیہ جگہ چھپایا کہ بچہ رو رو کر ہلکان ہوگیا لیکن اس کا پتھر دل موم نہیں ہوا۔

☆☆☆

آج پھر شبنم فرہاد کے سر پر سوار تھی۔ فرہاد اس کی کھوپڑی میں یہ بات اتارنے کی کوشش کررہا تھا کہ جلد بازی کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ صبر سے کام لو لیکن شبنم نے اس کی نصیحت کو رد کرتے ہوئے زبردست احتجاج کا مظاہرہ کیا اور درشت لہجے میں بولی۔

''آپ اور صنم مجھ سے ٹھیک ٹھاک رقم اینٹھ چکے ہیں اور جب میں اس مسئلے پر بات کرتی ہوں تو مجھے صبر، تحمل اور دھیرج کا درس دیتے ہیں۔ میں آخری وارننگ دے رہی ہوں۔ اسی ہفتے میری ساس، رانیہ اور اس کے بیٹے کا قصہ تمام کرنا ہے۔ ورنہ میں آپ لوگوں کے حلق میں انگلی ڈال کر ایک ایک پیسا اگلوالوں گی۔ آپ لوگ سیدھی طرح سے ہوش میں آجایئے۔'' فرہاد سگریٹ سلگائے کسی سوچ میں گم تھا۔ سگریٹ مسل کر ایک طرف پھینکا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''شبو، میری بات غور سے سنو۔ ہر کیس میں میرا اور صنم کا باہمی اشتراک ہوتا ہے۔ اب تک تم نے جتنی بھی رقم دی ہے، وہ سب میں خرچ کرچکا ہوں۔ صنم کو پتا چلا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ کہتی ہے اگر میرا حصہ نہ دیا تو میں سارا کچا چٹھا کھول کر تنویر کے سامنے رکھ دوں گی۔ اب میرے پاس تو کچھ ہے نہیں۔ میں تو پیدائشی قلاش ہوں۔ اس لیے تمہارا معاملہ بالکل ساکت وجامد ہے..... اگر صنم کا منہ بند نہیں کیا تو وہ سر پھری حقیقتاً جاکر تنویر کو سب کچھ بتادے گی اور پھر ہم دونوں لمبی جیل یاترا پر چلے جائیں گے۔'' فرہاد کی بات سنتے ہی شبنم کا چہرہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد پڑ گیا اور وہ مرتعش آواز میں بولی۔

''بھائی فرہاد! اب تو میرے پاس کچھ نہیں ہے، سب کچھ آپ کے حوالے کرچکی ہوں۔'' فرہاد نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا اور بلا کسی توقف کے جواباً کہا۔

''عورت کی آخری جمع پونجی اس کا زیور ہوتی ہے جو وہ برے وقت کے لیے رکھ دیتی ہے۔ سخت وقت میں وہی کام آتا ہے۔'' فرہاد کے اس مشورے پر شبنم دانت پیس کر رہ گئی لیکن وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اپنے مشتعل جذبات پر قابو پالیا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پہلے تو خالی خالی نظروں سے فرہاد کو دیکھتی رہی پھر طویل وقفے کے بعد بے بسی کے ساتھ بولی۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے کچھ مہلت دو، اپنا زیور بھی داؤ پر لگادوں گی لیکن کام جلدی اور صاف شفاف ہونا چاہیے۔'' فرہاد کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے لیکن اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ بے نیازی کے ساتھ مثبت انداز میں اپنی گردن ہلائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شبنم گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ خود کلامی کے انداز میں آہستگی سے بڑبڑائی۔

''خودغرض، مطلبی شخص..... میں تجھے دیکھ لوں گی۔''

اس وقت اس کی آنکھیں سانپ سے مشابہ تھیں۔

☆☆☆

مسرت جہاں دونوں بہوؤں اور پوتوں کے ساتھ خاندان کی ایک تقریب میں جانے کی تیاری کررہی تھیں لیکن جب انہوں نے شبنم کو ارمان کے ساتھ باہر جاتے ہوئے دیکھا تو سخت اور ٹھوس لہجے میں مستفسر ہوئیں۔

''یہ تمہارے دماغ میں کہاں کا سودا سمایا ہے۔ میں نے چار دن قبل ہی تمہیں بتادیا تھا کہ اس تقریب میں ہم سب کی شرکت ضروری ہے۔ پھر اب باہر جانے کی کیا تک ہے۔'' شبنم نے خلافِ عادت نہایت شیریں لہجہ اختیار کیا اور اپنی دانست میں نہایت معقول وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا۔

''امی! دراصل بات یہ ہے کہ آج آپی کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ اس لیے اماں نے چند لمحوں کے لیے مجھے بلوایا ہے۔ میں یوں گئی اور یوں آئی۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ مسرت جہاں نے بادلِ ناخواستہ اجازت تو دے دی لیکن پیشانی کے بل بتارہے تھے کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے کو کنٹرول کررہی ہیں۔ شبنم نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ارمان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اس طرح دوڑ لگائی کہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ آج صبح ہی

قصوروار

تنویر ریاض

ایک منیجر کی کوتاہی اور شرمندگی پر دلچسپ تحریر

معاشرہ مغربی ہو یا مشرقی... بعض اوقات حالات کی تنگ دستی اور بے روزگاری کا غم انسان کو زندگی سے بہت دور لے جاتا ہے... وہ بھی بہت امید سے انٹرویو دے کر آیا تھا اور اپنے یقین پر بہت پُراعتماد بھی تھا مگر جذبات نے اس کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیا... کیونکہ لامتناہی انتظار اور اہلِ خانہ کے طعنوں نے اسے سانس لینا دوبھر کر دیا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ کئی مرتبہ بجنے کے بعد کسی نے فون اٹھالیا۔

"ہاں!" دوسری طرف سے کوئی زور سے چلایا۔ "کیا ہے؟ کون بول رہا ہے؟"

اسٹیوارٹ کے ہاتھ سے فون گرتے ہی والا تھا۔ اسے اس شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ "مسٹر فلیمنگ! میں اسٹیوارٹ کارلسن بول رہا ہوں۔ کریسنٹ مارکیٹنگ کا ہیومن ریسورز ڈائریکٹر۔ کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی تاہم اسٹیوارٹ کو یوں لگا جیسے اس کے مخاطب کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔ اس کے نتھنوں سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے بھاپ کا انجن چل رہا ہو۔ کافی دیر بعد اس نے تیز آواز میں جواب دیا۔

"ہاں...... ہاں، مجھے یاد ہے۔ میں بھولا نہیں

ہوں۔'' یوں لگا جیسے وہ شدید تکلیف میں ہو۔

''کیا یہ وقت بات کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے؟'' اسٹیوارٹ نے پوچھا۔ وہ پہلے ہی اسے ملازمت دینے کے حق میں نہیں تھا۔

ایک بار پھر طویل خاموشی چھا گئی۔ ''مناسب وقت.....؟'' فلیمنگ نے بالآخر جواب دیا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں کچھ نہیں چاہتا۔'' اسٹیوارٹ نے کہا۔ اس نے باس کے کہنے پر فون کیا تھا جس کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''فلیمنگ ہمارے مطلب کا آدمی ہے۔ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ ہمیں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔ تم اسے فون کرو۔''

''کیا تم اب بھی ہمارے ساتھ کام کرنے میں دلچسپی رکھتے ہو بریڈ؟ مجھے آج ہی تمہارا جواب چاہیے ورنہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

یہ سچ نہیں تھا لیکن یہ بات اس نے اس لیے کہی کہ شاید اس طرح فلیمنگ اس پیشکش کو قبول کرنے سے باز رہے۔

''اس بات کو کتنا عرصہ ہوگیا؟'' بریڈ نے پوچھا۔

''چھ ہفتے یا اس سے بھی زیادہ اور تمہیں اب خیال آیا ہے۔''

''ہمیں اس پوزیشن کے لیے کئی امیدواروں کے انٹرویو کرنا تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔'' یہ بھی سچ نہیں تھا کیونکہ انٹرویوز چار ہفتے پہلے ہی ہو چکے تھے۔

جب اسٹیوارٹ نے دیکھا کہ اس نے انٹرویو میں سب سے زیادہ نمبر لینے والے جن تین امیدواروں کی سفارش کی تھی، انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے تو اس کے لیے بھی باس کی خواہش پر عمل کرنا مشکل ہوگیا اور وہ فلیمنگ کو فون کیے بغیر چھٹیوں پر چلا گیا لیکن، یہ چھٹیاں بھی ڈراؤنا خواب ثابت ہوئیں۔ دو دن بارش کی نذر ہوگئے۔ اس کی بیوی بور ہوتی رہی اور اس نے کسی سرگرمی میں دلچسپی نہیں لی۔ بچے بھی کچھ اداس اور شرمندہ تھے۔ شاید انہیں یہ جگہ پسند نہیں آئی تھی۔

جب وہ چھٹیوں سے واپس آیا تو باس بہت ناراض ہوئی اور اسی لیے فلیمنگ کو فون کرنا پڑا۔ ''تمہیں یہ ملازمت چاہیے یا نہیں۔'' اسٹیوارٹ نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو، میں بیوی سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''بنی!'' وہ چلایا۔ اس کی آواز خالی ہال میں گونج رہی تھی۔ ''کریسنٹ والوں کی طرف سے جاب کی آفر آئی ہے۔ تم کیا کہتی ہو..... کیا؟ میں سن نہیں پا رہا۔ تم زور سے بولو۔ مجھے تمہاری آواز نہیں آ رہی۔''

اسٹیوارٹ کو یوں لگا جیسے وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ اپنی بیوی کی آواز نہ سن رہا ہو پھر فلیمنگ نے اچانک کتے کی طرح دردناک آواز میں چلانا شروع کر دیا۔ اسٹیوارٹ نے فون کان سے ہٹا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کیا تمہاری اس سے بات ہوئی؟'' کمپنی کی نائب صدر اور کرتا دھرتا سونیا کلف نے پوچھا۔

اسٹیوارٹ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دروازے میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے کھڑی تھی۔

''ہاں، ہوگئی۔'' اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''اچھا..... پھر اس نے کیا جواب دیا؟''

اسٹیوارٹ کا منہ خشک ہوگیا اور اس کے ہونٹ چپکنے لگے۔

''ہاں..... وہ..... وہ۔''

سونیا سیدھی کھڑی ہوگئی اور اس نے اپنے بلاؤز کو دونوں ہاتھوں سے نیچے کرتے ہوئے کہا۔

''اسٹیوارٹ! کیا تم نے اسے ہماری پیشکش بتا دی یا نہیں؟''

''میں نے کوشش کی تھی۔'' اس نے بولنا شروع کیا۔ ''لیکن اس نے..... میرا مطلب ہے کہ.....'' اس نے باس کی طرف ترچھی نظر ڈالی جو اسے گھور رہی تھی۔ اگر وہ باس کو اس کے بھونکنے کے بارے میں بتا دے تو کیا وہ یقین کرے گی یا یہ سمجھے گی کہ وہ ایک بار پھر ٹال مٹول کر رہا ہے۔

''دراصل سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔'' وہ زور سے بولا۔ ''شاید اس کے فون میں کوئی خرابی تھی۔''

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اندر چلی آئی۔ ''کیا تم نے اسے دوبارہ فون کیا؟''

''ہاں۔'' اسٹیوارٹ نے جواب دیا۔ ''میں نے کئی بار کوشش کی لیکن بات نہیں ہو سکی۔''

وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی... کہیں زیادہ خراب نہ ہو جائے۔ بہتر ہے کہ تم گھر جا کر آرام کرو۔''

اسٹیوارٹ بمشکل اپنی کرسی سے اٹھا۔ وہ واقعی اپنے آپ کو بہتر محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''اور ہاں گھر جاتے ہوئے فلیمنگ سے مل لینا۔'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کا مکان تمہارے راستے میں آتا ہے۔ میں نے اس کی فائل میں یہی پتا دیکھا ہے۔''

اسٹیوارٹ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ تحکمانہ انداز میں بولی۔ ''تمہیں یہ کام کرنا ہے۔ اب مزید بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو ورنہ نتائج کے تم خود ذمے دار ہوگے۔''

اس واضح دھمکی کے بعد اسٹیوارٹ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ اٹھائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

راستے میں اس نے سوچا کہ وہ فلیمنگ کے گھر کے بغیر سونیا کو بتادے کہ اس نے جس ہیرے کا انتخاب کیا تھا، اس نے ہماری پیشکش ٹھکرا دی ہے کیونکہ اسے کسی دوسری جگہ ملازمت مل گئی ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ سونیا اس کی بات پر یقین کرنے کے بجائے اپنے طور پر تصدیق کرے گی کہ وہ فلیمنگ سے ملا تھا یا نہیں اور کیا واقعی کہیں اور ملازم ہو گیا ہے؟

اس نے اپنی کار فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی کی اور باہر آکر مکان کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ مکانات پچاس ساٹھ سال قبل تعمیر ہوئے تھے اور مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر مکانات کی حالت کافی خستہ تھی۔ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد اس نے بھی اس علاقے میں مکان خریدنے کے بارے میں سوچا تھا لیکن اس کی بیوی نے مخالفت کی تھی۔ وہ بڑے اور کشادہ مکان میں رہنا چاہتی تھی چنانچہ انہوں نے نسبتاً ایک نئی آبادی کو ترجیح دی جہاں جدید طرز کے مکانات بنے ہوئے تھے۔

فلیمنگ کا مکان بھی درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی چھت پر لگے ہوئے سبز ٹائلوں کا رنگ بھی اس پر جھکے ہوئے درخت کے پتوں جیسا ہو گیا تھا۔ اسٹیوارٹ نے محسوس کیا کہ لان کی بڑھی ہوئی گھاس کو کاٹنے کی ضرورت ہے۔ اسے لان میں پڑی ہوئی ایک بائیسکل نظر آئی جو تقریباً گھاس میں چھپی ہوئی تھی۔ ڈرائیوے میں گرد اور مٹی سے اٹی ہوئی نیلے رنگ کی ٹورس کار کھڑی ہوئی تھی جس کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کافی دنوں سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

ایک بار پھر اس نے پسینے میں تر اپنی ہتھیلیاں پتلون پر رگڑ کر صاف کیں اور تین سیڑھیاں چڑھ کر چھوٹے سے پورچ میں آ گیا۔ اس کی ٹانگیں بھاری اور سخت ہو رہی تھیں۔ ایک بار پھر اس نے سوچا کہ واپس چلا جائے۔ کوئی غیبی قوت اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی لیکن مجبوری غالب آ گئی۔

اس نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی نظر بیرونی دروازے پر گئی جو آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس نے پہلے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کی انگلی ہوا میں معلق رہ گئی جیسے کسی نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

''ہیلو؟'' اس نے پکارا، لیکن اسے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔ یہ بالکل ایسی ہی تھی جو اس نے ایک گھنٹا پہلے سنی تھی جب بریڈ فلیمنگ اس سے مخاطب تھا۔ تیز اور بناوٹی۔

''مسٹر فلیمنگ! میں کریسنٹ کارپوریشن سے آیا ہوں۔ اسٹیوارٹ کارلسن۔ کیا تم گھر پر ہو؟''

اس نے کندھے سے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا تو وہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ اب وہ بہ آسانی چھوٹی سی ڈیوڑھی اور اس سے متصل لیونگ روم کو دیکھ سکتا تھا۔

''بریڈ! ہمیں بہت خوشی ہوگی اگر تم ہماری پیشکش پر غور کرو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔''

جب اس کی آنکھیں مدھم روشنی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ مزید چند قدم آگے بڑھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے یوں لگا کہ اس کی جلد سرد اور سکڑتی جا رہی ہو۔ بریڈ فلیمنگ کمرے کے آخری سرے پر بیرونی دروازے کی طرف منہ کیے گھٹنوں کے بل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں فرش پر ٹکی ہوئی تھیں۔

اسٹیوارٹ اسے اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گیا اور سمجھا کہ شاید وہ عبادت میں مشغول ہے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم.....'' پھر وہ رک گیا۔

فلیمنگ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی کوئی جواب دیا بلکہ وہ اسی طرح خاموشی سے گھٹنوں کے بل جھکا رہا۔ پھر اسٹیوارٹ کی نظر بجلی کے تار پر گئی جو اس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا اور اس کا دوسرا سرا فلیمنگ کے عقب میں الماری کے دروازے کی ناب سے بندھا ہوا تھا۔

''اوہ میرے خدا!'' اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب لپکا اور ناب سے بندھے ہوئے تار کو کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مضبوط گرہ تھی اور اسے کاٹ کر ہی دروازے سے الگ کیا جا سکتا تھا پھر اس نے تار کے دوسرے سرے کو دیکھا جو فلیمنگ کی گردن سے لپٹا ہوا تھا لیکن اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ وہ اپنے آپ کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بجائے اس نے فلیمنگ کا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔

گو کہ اس کا جسم ابھی تک گرم تھا لیکن دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ آگے کی طرف جھکتا چلا گیا اور اس کی سانس کی نالی سکڑ گئی اور اس کے اپنے وزن کی وجہ

سے اس کا دم گھٹ گیا۔ واضح طور پر اس نے خودکشی کی تھی۔

"یہ ناممکن ہے۔" اسٹیوارٹ نے سرگوشی کی۔

"میری ابھی اس سے بات ہوئی تھی۔"

اس نے فلیمنگ کا بازو چھوڑ کر اس کے چہرے کو دیکھا جسے وہ ملازمت نہیں دینا چاہ رہا تھا۔ "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔"

لاش کے پاس سے سستی شراب کی بو آ رہی تھی۔ اسٹیوارٹ نے دیکھا کہ اس کے برابر میں ایک شراب کی بوتل پڑی ہوئی تھی۔ وہ تقریباً خالی ہو چکی تھی لیکن اب بھی اس میں ایک گھونٹ جتنی شراب تھی۔ اس نے اسے اٹھانا چاہا لیکن فوراً ہی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"مجھے فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ میرا اس کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ پولیس آ گئی تو وہ مجھ سے بھی پوچھ گچھ کرے گی حالانکہ میں نے تو اسے ملازمت کی پیشکش کی تھی۔"

اسٹیوارٹ نے اندھیرے میں کمرے کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ تمام پردے گرے ہوئے تھے حالانکہ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کمرے کا ٹیلی ویژن بھی غائب تھا اور اس کی یادگار کے طور پر دیوار میں ایک مستطیل تختہ لگا ہوا تھا۔

جب اس نے ڈائننگ روم میں جھانکا تو وہاں بھی فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور لکڑی کے فرش پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی قالین نہیں تھا اور خالی کمرے میں آواز گونج رہی تھی جو اس نے ٹیلی فون پر سنی۔ اسی طرح کمرے کی فضا بھی بوجھل اور سیلن زدہ تھی جس سے لگتا تھا کہ کافی عرصے سے یہاں آگ نہیں جلائی گئی۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ لان کی صفائی کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ اور کار کس وجہ سے کھڑی کر دی گئی تھی۔ فلیمنگ کی زندگی سمٹتی جا رہی تھی جب اس کی جمع پونجی ختم ہو گئی تو پہلے اس نے آسائشوں سے منہ موڑا پھر ایک ایک کر کے ضروری اشیا سے بھی محروم ہوتا گیا۔

اسے یاد آ گیا کہ فلیمنگ گزشتہ ایک سال سے بے روزگار تھا جب اس نے کریسنٹ کارپوریشن میں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس تنگی ترشی میں اس کے بیوی بچوں نے کیا ردعمل ظاہر کیا ہوگا اور ان کی نظروں میں فلیمنگ کی کیا وقعت رہ گئی ہوگی۔ وہ خود اس صورت حال سے گزر چکا تھا جب وہ کسی وجہ سے مارٹیج کی قسط ادا نہیں کر سکا تو اس کی بیوی رینا بچوں کو لے کر اپنے والدین کے پاس چلی گئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی اسٹیوارٹ کو صحن میں پڑی ہوئی ناکارہ سائیکل اور فلیمنگ کا اپنی بیوی پر چلانا یاد آ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ اگر اس کی بیوی اور بچے اوپر ہیں اور انہیں ابھی تک معلوم نہیں تو وہ اسٹیوارٹ کو جاتا ہوا دیکھ کر کیا سمجھیں گے؟ بہتر ہے کہ انہیں اس کی آمد کا علم ہو جائے۔

"ہیلو۔" اس نے دوبارہ آواز لگائی۔ "مسز فلیمنگ! کیا تم گھر پر ہو؟"

اس کی آواز فضا میں گونج کر رہ گئی۔ اس نے سیڑھیوں کی لائٹ جلانے کے لیے دیوار میں لگا ہوا سوئچ آن کیا لیکن لائٹ نہیں جلی۔ اس نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور اس کی ٹارچ کی روشنی میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوپر پہنچ کر اس نے راہداری کے دونوں جانب ٹارچ گھمائی تو معلوم ہوا کہ تمام دروازے بند ہیں۔ اس نے ایک بار پھر آواز لگائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ پہلے دروازے پر پہنچا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازے کا ہینڈل گھما دیا اس نے اندر جھانکا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

وہاں ایک سنگل بیڈ کے سوا کچھ نہیں تھا جس پر ایک گلابی چادر بچھی ہوئی تھی اور جا بجا مٹی نظر آ رہی تھی۔ دیوار پر چند پوسٹرز لگے ہوئے تھے جن پر نوجوان لڑکوں کی تصویریں تھیں۔ اسٹیوارٹ نے انہیں پہچان لیا۔ وہ سب پوپ اسٹارز تھے۔ اس نے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

اب اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہاں بھی ایک سنگل بیڈ تھا اور دیکھنے میں ہی کسی نوعمر لڑکے کا کمرا لگ رہا تھا لیکن وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ تیسرے کمرے میں گیا۔ وہاں اس نے ایک کنگ سائز بیڈ دیکھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی وہاں ڈالی اور دیکھا کہ اسے بھی دوسرے بستروں کی طرح احتیاط سے تیار کیا گیا تھا لیکن دوسرے کمروں کے برعکس وہ خالی نہیں تھا۔

وہاں ایک چادر کے نیچے تین مختلف جسم برابر برابر لیٹے ہوئے تھے اور ایک سیاہ دھبا ان کے گرد پھیل رہا تھا۔ ایک چیخ مار کر وہ پیچھے ہٹا اور تیزی سے باہر آ گیا۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ نیچے اتر کر اس نے کوشش کی کہ فلیمنگ کی لاش سے بچ کر نکلے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اندھیرے میں اس سے ٹکرا جائے۔ وہ دوڑتا ہوا بیرونی دروازے سے باہر آیا اور اسے زور سے بند کر دیا۔

فٹ پاتھ پر آ کر اس نے اپنی رفتار آہستہ کی اور پھر رک گیا۔ اس نے زور زور سے سانس لینا شروع کی تاکہ تازہ اور صاف ہوا اس کے جسم میں جائے۔ باہر کی دنیا ویسی

ای تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ خاموش اور پُرسکون... البتہ دور سے گاڑیوں کے گزرنے کی آواز آرہی تھی۔ اس وقت سڑک پر پیدل چلنے والے نظر نہیں آرہے تھے اور بیشتر گھروں میں گاڑیاں موجود نہیں تھیں۔ یہ دوپہر کا وقت تھا جب والدین دفتروں اور بچے اسکولوں میں ہوتے تھے۔

وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی تک اپنا سیل فون پکڑا ہوا ہے اور اس کی فلیش لائٹ بھی جل رہی تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے اسے بند کیا اور کافی دیر تک کی بورڈ کو دیکھتا رہا۔

اس نے سوچا کہ اگر وہ پولیس کو فون کرتا ہے تو اسے ان کے سوالوں کے جواب بھی دینا پڑیں گے جیسا کہ عموماً وقوعہ کی اطلاع دینے والے سے کیے جاتے ہیں اور یہ ایک بڑی خبر بن جائے گی۔ ہر کوئی اس کا تعلق اس واردات سے جوڑے گا اور وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی صفائی پیش کرتا رہے گا۔

اور سب سے بڑھ کر سونیا کیا سوچے گی۔ وہ جانتا تھا کہ جب اسے اس واقعے کی خبر ملے گی تو اس کے چہرے کے تاثرات کیا ہوں گے وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر سر ہلاتے ہوئے کہے گی۔ ”میں نے کئی ہفتے پہلے تمہیں فلیمنگ کو فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ اگر تم وہ کر لیتے جو تم سے کہا گیا تھا تو یہ واقعہ پیش نہیں آتا۔ تم اپنے آپ کو بہت اہم اور دوسروں کو بہت حقیر سمجھتے ہو۔“ وہ سونیا کو یہ سوچنے اور کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے فون جیب میں رکھ لیا اور ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک عورت کے سوا جو اس کی طرف پیٹھ کیے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ وہ جلدی سے کار میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

”کیا دفتر میں کوئی مسئلہ ہے؟“ ریٹا نے پوچھا۔

اسٹیوارٹ نے کھانے پر سے نظریں اوپر اٹھائیں اور اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ ”نہیں بالکل نہیں۔ یہ تم نے کیوں پوچھا؟“

”تم آج جلدی گھر واپس آگئے، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتا دو۔“

”نہیں، کچھ نہیں۔ تمہیں وہم ہوگیا ہے۔“ اس نے پہلے سے زیادہ مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ کسی صورت میں بھی ریٹا کو آج کے واقعے کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے فلیمنگ کے مکان میں کیا دیکھا۔ سب سے پہلے تو ریٹا یہی پوچھتی کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا اور یہ کہ اس نے ابھی تک پولیس کو اطلاع کیوں نہیں کی۔

اس نے ریٹا کو ٹالنے کے لیے کہا۔ ”سونیا مجھے تنگ کر رہی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

”ملازمت میں تو ایسا ہوتا ہے۔ باس کی ہر بات برداشت کرنا پڑتی ہے۔“ ریٹا نے کہا۔ ”اس صورت حال کو قبول کرلو یا کسی دوسری جگہ نوکری کی درخواست دے دو۔“

”ڈیڈی اگر تم اس کے ساتھ جوڑی بنالو۔“ اس کے بیٹے نے چہکتے ہوئے کہا۔

”اپنا منہ بند رکھو ٹومی۔“ اسٹیوارٹ نے اپنے سولہ سالہ بیٹے کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ”اور کھانا کھاتے وقت یہ ہیٹ اتار دیا کرو۔“

اسٹیوارٹ کو بہت برا لگتا جب ٹومی گھر سے باہر نکلتے وقت سر پر ہیٹ چڑھا لیتا۔ دیکھنے والے اسے کوئی بدمعاش ہی سمجھتے ہوں گے جبکہ وہ ایک باعزت اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔

”میں کھانا کھا چکا۔“ ٹومی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے سے لاتعلقی جھلک رہی تھی۔ ”اب تم پُرسکون ہو جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

”تم نے اس کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔“ اسٹیوارٹ نے ریٹا سے کہا۔

”یہ سب تمہاری بے پروائی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم بچوں پر بالکل بھی توجہ نہیں دیتے۔“ ریٹا نے جوابی وار کیا۔

”اگر تم لوگوں نے جھگڑا شروع کیا تو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی میرے دوست مجھے یاد کر رہے ہیں۔“ اس کی بیٹی شیلا نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ اس نے سیاہ لباس کے ساتھ گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہوئی ہے۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور وہ اپنا بیشتر وقت ان کے ساتھ گھومنے اور پارٹیاں اٹینڈ کرنے میں گزارتی تھی۔ اسٹیوارٹ اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر شیلا چلی گئی تو صبح سے پہلے اس کی واپسی نہیں ہوگی۔

”ٹھیک ہے، ہم بات کو یہیں ختم کر دیتے ہیں۔“ وہ بات کو ختم کرتے ہوئے بولا۔

”اب کوئی بحث نہیں ہوگی۔“ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور مشروب کی بوتل لینے چلا گیا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر تم کسی دوسری جگہ ملازمت کرلو۔“ ریٹا نے کہا۔ ”لیکن، ہم یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ تمہیں موجودہ ملازمت سے جواب

مل جائے۔ تم جانتے ہو کہ ہم پر کتنا قرض ہے اور میں تنہا یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔"

"تم فکر مت کرو۔ مجھے کوئی نہیں نکال رہا۔" اسٹیوارٹ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن وہ دفتر پہنچا تو سونیا نے اسے فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا اور بولی۔

"اس نے کیا جواب دیا؟"

اسٹیوارٹ کا منہ خشک ہونے لگا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ رات اس نے ٹی وی پر خبریں سنی تھیں لیکن اس میں فلیمنگ فیملی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی یہ خبر عام نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"اس نے حال ہی میں کوئی دوسری ملازمت کر لی ہے۔ بہرحال اس نے ہماری پیشکش کا خیر مقدم کیا۔ وہ کافی خوش نظر آ رہا تھا۔"

سونیا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کہاں؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"میں پوچھ رہی ہوں کہ اس نے کہاں ملازمت کی ہے؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ اس نے اس بارے میں کچھ بتایا تھا۔" اسٹیوارٹ کے لیے اس سے نظریں ملانا مشکل ہو رہا تھا۔

"تم اس کے گھر گئے اور تم نے یہ جاننے کی زحمت بھی نہیں کی۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں اس بارے میں جاننا چاہوں گی؟ وہ کون ہے جس نے ہمارے آدمی کو اچک لیا جسے ہم نے دو درجن امیدواروں میں سے منتخب کیا تھا۔"

"میں ـــ میں دراصل اس کے گھر نہیں جا سکا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ اس سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی اور اس مرتبہ کامیاب ہو گیا۔ اس لیے اس کے گھر جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔" اس نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ شاید اس نے بروٹن وائٹ، کا نام لیا تھا۔"

سونیا اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم اس کے گھر نہیں گئے؟"

اسٹیوارٹ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سونیا اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے کیریئر کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ وہ کس سمت میں جا رہا ہے۔ تمہاری بے پروائی ہمارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ وہ جا سکتا ہے۔ جب اسٹیوارٹ اس کے پاس سے گزر کر جانے لگا تو وہ بولی۔ "میرا ایک دوست بروٹن وائٹ کے پرسنل ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہے۔ میں اسے فون کر کے معلوم کرتی ہوں۔"

سونیا سے ملنے کے بعد اس نے دن کا بقیہ حصہ اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرنے میں گزارا۔ جب کوئی اس کے پاس آنے لگتا تو فون اٹھا کر اس کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیتا تاکہ آنے والے کو اندازہ ہو جائے کہ وہ فون پر کوئی اہم بات کر رہا ہے اور اسے کسی کی مداخلت گوارا نہیں اور یوں وہ شخص دروازے سے ہی واپس چلا جاتا۔

سونیا سہ پہر کے بعد اس کے پاس آئی اور اس نے وقت ضائع کیے بغیر کہا۔

"میری وہاں پال ٹریسی سے بات ہوئی ہے۔ وہ بریڈ فلیمنگ کو نہیں جانتے اور نہ ہی انہوں نے حالیہ مہینوں میں کسی کو ملازمت دی ہے۔"

"میں نے کہا تھا کہ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" اسٹیوارٹ نے جواب دیا۔ "وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ اس لیے اس کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا واقعی تمہاری اس سے بات ہوئی تھی؟" سونیا نے بے یقینی سے کہا۔

"تم خود اسے فون کر کے کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟" اس نے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔

"میں نے فون کیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا جو کہ بڑی عجیب بات ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ کل تم نے اسے فون کیا تھا اور اس سے بات بھی ہوئی تھی؟"

"ہاں۔"

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہارے فون سے کوشش کروں۔ ممکن ہے کہ میں نے غلط نمبر ڈائل کر دیا ہو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔

اسٹیوارٹ اسے فون دینے ہی والا تھا لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ اس طرح اسے پتا چل جائے گا کہ گزشتہ روز اس نے صرف ایک مرتبہ فلیمنگ کو فون کیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ گرم ہو رہا ہے۔

"تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا۔"

سونیا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "نہیں اسٹیوارٹ! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم نے شروع سے ہی مجھے اس معاملے میں دھوکے میں رکھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے

سے قاصر ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے۔" وہ چلاتے ہوئے بولا۔ "تمہارا جو دل چاہے کرو۔ اس وقت مجھے تنہائی چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلا اور لابی میں سے گزرتا ہوا عمارت سے باہر چلا گیا۔

جب وہ دو گھنٹے بعد واپس آیا تو نشے میں دھت تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سونیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا میز کا سامان ایک کارڈ بورڈ کے ڈبے میں پیک کر دیا گیا تھا۔ سیکیورٹی والوں نے اس سے شناختی کارڈ مانگا اور اسے عمارت سے باہر لے گئے۔

گھر واپس جاتے ہوئے اس نے اپنی کار فلیمنگ کے مکان کے سامنے روک دی۔ دفتر سے نکلتے وقت اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہ وہاں کھڑا اس مکان کو دیکھ رہا تھا۔ اسٹیوارٹ نے مشروب کا گھونٹ لیا۔ اس وقت اسے سونیا سے زیادہ فلیمنگ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جس کی ناکام زندگی کا ملبا اس پر آن گرا تھا۔ اسے یوں لگا کہ وہ کسی متعدی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔

اس سے نجات پانے کے لیے اس کے ذہن میں ایک ممکنہ حل آیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس خاندان کی اموات کو مزید خفیہ رکھے کیوں نہ پولیس کو گمنام فون کر کے مطلع کر دیا جائے۔ ایک بار اس معاملے کی تحقیقات مکمل ہو گئی اور موت کے وقت کا تعین ہو گیا تو وہ اس گرداب سے باہر نکل آئے گا۔ وہ لوگوں کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے گا کہ وہ بہت خوش قسمت تھا جو سونیا کے کہنے کے باوجود فلیمنگ کے گھر نہیں گیا ورنہ دوسرے لوگوں کی طرح اس کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔

سونیا نے کمپنی کے لیے جس شخص کا انتخاب کیا، وہ ایک نفسیاتی قاتل تھا جس نے اپنی فیملی کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔ جب یہ بات کمپنی کے صدر کے علم میں آئی اور وہ اسے سونیا کے غلط انتخاب اور اپنی لاپرواہی سے آگاہ کرتا تو اس کے نتیجے میں سونیا کی ساکھ کو نقصان پہنچتا اور اس کی ملازمت بحال ہو جاتی۔

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد وہ اپنے آپ کو زیادہ پُراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مشروب کا ایک اور گھونٹ لیا اور بوتل بند کر کے گلوو کمپارٹمنٹ میں رکھ دی۔

"اب گھر چلنا چاہیے۔" وہ بڑبڑایا اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ آج جو کچھ دفتر میں ہوا، اس کے بارے میں رینا اور بچوں کو کچھ نہیں بتائے

کلاسیفکیشن

میرا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے ہے۔ وہ اس طرح کہ ہم سب بہن بھائی مڈل کر چکے ہیں اور آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ والدین کی تعلیم بھی مڈل ہے اس لیے ہمارا گھرانا مڈل کلاس کہلاتا ہے۔ میرے چچا کا تعلق تھرڈ کلاس سے ہے وہ اس لیے کہ چچا نے صرف تین کلاسیں پڑھی ہیں اور اب ان کا اکلوتا بیٹا بھی تھری کلاس میں ہے۔ ہمارے سارے خاندان کا تعلق کسی نہ کسی طبقے سے ہے۔ مثلاً کوئی تھرڈ کلاس ہے کوئی مڈل کلاس ہے۔ صرف ایک ماموں کا گھرانا ہائی کلاس ہے کیونکہ وہ سب ہائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ جب میری عمر 5 برس ہوئی تو میں نے اسکول جانا شروع کیا لیکن اسکول میں کوئی قابل استانی نہ ہونے کی وجہ سے میں ابتدائی تعلیم صحیح طریقے سے حاصل نہ کر سکی۔ قابل استانی اس لیے نہ تھی کہ جب میں چھٹی کرتی تو وہ مجھے پیار سے سمجھاتی کہ بیٹا چھٹی نہ کیا کرو، پڑھائی متاثر ہوتی ہے۔ اب بھلا کوئی بچہ نرمی سے بھی سمجھتا ہے۔ چنانچہ میں ایک دن کے سمجھانے کے بعد اکٹھا ہفتہ بھر چھٹی کر لیتی۔ اب کیا تھا زیادہ سے زیادہ 5,4 ڈنڈے پڑ جاتے۔ بچہ ڈنڈوں سے کب سمجھتا ہے۔ چنانچہ میں ایک دو دن اسکول آ کر پھر ہفتہ بھر چھٹی کر لیتی۔ تھک ہار کر استانی نے میرے اوپر توجہ دینا چھوڑ دی اور میری ابتدائی تعلیم متاثر ہو کر رہ گئی۔

تیسری کلاس کے بعد گھر والوں نے مجھے باہر جا کر کھیلنے کی اجازت دے دی لیکن باہر کوئی تمیز دار دوست نہ ہونے کی وجہ سے میرا اخلاق تباہ ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اگر میں کسی لڑکی کو گالی دے دیتی تو وہ میری شکایت کر کے مجھے گھر سے پٹواتی بدلہ اتارنے کے لیے اگلے دن میں اسے 3,4 گالیاں دے دیتی وہ پھر شکایت کرتی اور مجھے پھر پٹواتی اب بھلا کوئی مار سے بھی سمجھتا ہے۔ ساتویں کلاس سے میں نے ٹیوشن پڑھنا شروع کر دی لیکن استانی کے بدزبان ہونے کی وجہ سے میں نے ٹیوشن چھوڑ دی وہ اس طرح کہ استانی کچھ سمجھاتی اور میری سمجھ میں نہ آتا تو میں کہہ دیتی کہ تمہیں سمجھانا ہی نہیں آتا، میں تم سے ٹیوشن نہیں پڑھوں گی چنانچہ استانی مجھے برا بھلا کہتیں۔ اب بھلا بدزبان کون تھا میں یا استانی؟ ان حالات کے پیش نظر یعنی معاشرے کے صحیح نہ ہونے کی وجہ سے میں نے ٹیوشن چھوڑنے اور آگے نہ پڑھنے کا اعلان کر دیا اور اب میں مڈل کلاس کہلاتی ہوں۔

(تحریر: اخت مولانا محمد عثمان غنی)

مرسلہ: رضوان احمد ..... کورنگی کراچی

گا۔ وہ بلاوجہ پریشان ہوں گے۔ اسے پورا یقین تھا کہ اگلی تنخواہ ملنے سے پہلے وہ اپنی ملازمت پر بحال ہو چکا ہوگا۔

گھر پہنچ کر اس نے کار ڈرائیوے میں کھڑی کی اور وہ باکس ڈکی میں ہی چھوڑ دیا جس میں اس کے دفتر کا سامان تھا۔ ریٹا ڈیوڑھی میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

''تمہارے دفتر سے فون آیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تم سے سیل فون لینا بھول گئے کیونکہ اب تم ان کے ملازم نہیں رہے اس لیے وہ اپنی چیز واپس لینا چاہ رہے ہیں۔''

''وہ کتیا.....'' وہ غرایا۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی جا کر سونیا کا گلا گھونٹ دے تاہم اس نے ریٹا کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی اور کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں واپس ملازمت پر چلا جاؤں گا، تم میری بات کا یقین کرو۔ یہ سب محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے جسے میں دور کر دوں گا۔''

''اور تم نشے میں بھی ہو۔'' ریٹا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نشے میں نہیں، البتہ پریشان ضرور ہوں اور ایسی صورتِ حال میں کون پریشان نہیں ہوگا۔''

وہ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر جانے لگی۔ ''تم نے اتنا کچھ کر لیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے۔''

''مجھ سے دور مت جاؤ۔'' وہ چلایا۔

ریٹا نے گھوم کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

''تم کبھی مجھ سے دور مت جانا۔'' اس نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے دوبارہ کہا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

ٹومی کمرے سے نکل کر آیا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''ڈیڈ.....''

اسٹیوارٹ نے تحمید کے انداز میں انگلی اٹھائی اور کہا۔ ''ایک لفظ بھی منہ سے مت نکالنا ورنہ میں قسم کھاتا ہوں کہ.....''

ٹومی کا منہ کھلا رہ گیا لیکن اس نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ شیلا کچن میں کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ یہ سوچ کر خوفزدہ تھی کہ کون ان کے گھر کو توڑنے کے درپے ہے۔

اسٹیوارٹ سوچ رہا تھا کہ کیا آخری دنوں میں بریڈ فلیمنگ بھی اپنے آپ کو اسی طرح ناپسندیدہ اور ٹھکرایا ہوا سمجھ رہا ہوگا، کیا اسے بھی اس احساس نے زندہ درگور کر دیا ہوگا کہ وہ اپنی فیملی کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا؟ واقعی اگر مرد کمانے کے قابل نہ رہے تو اس کی دو کوڑی کی وقعت نہیں ہوتی۔ یہ سوچتے ہی اسے جھرجھری آ گئی۔

اس نے ریٹا کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس کے آنسو دیکھ کر وہ بے چین ہو گیا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''معاف کرنا۔ آج کا دن بہت دباؤ والا تھا۔ جیسا کہ تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا تاہم مجھے شراب نہیں پینی چاہیے تھی۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

یہ کہہ کر وہ مڑا اور بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ جب واپس آؤں تو تمہیں اور بچوں کو یہیں دیکھوں۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے تم لوگوں کا انتظار کرنا پڑے۔ سمجھ گئیں؟''

''ہاں.....'' ریٹا نے جواب دیا۔

وہ نصف شب کے بعد فلیمنگ کے مکان پر پہنچا۔ پولیس کو گمنام فون کرنے سے پہلے وہ یہاں سے اپنی موجودگی کے نشانات مٹانا چاہ رہا تھا۔ اس نے کئی ٹی وی ڈراموں میں دیکھا تھا کہ واقعے کی اطلاع ملتے ہی فارنسک ٹیم جائے وقوعہ پر پہنچ جاتی ہے۔ اگر یہاں اس کی موجودگی کے نشانات پائے گئے تو پولیس اس سے غلط نتیجہ اخذ کر سکتی ہے، چنانچہ اس نے ایک فارمیسی پر رک کر ضروری سامان خرید لیا۔

اس نے اپنی کار کا دروازہ آہستہ سے بند کیا اور پڑوس کے گھروں پر نظر ڈالی۔ وہ سب تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چند گھروں میں ہی روشنی نظر آ رہی تھی۔ سڑک پر اتنی خاموشی تھی کہ وہ اپنے قدموں کی چاپ بھی سن سکتا تھا۔ اس نے سڑک پار کی اور فلیمنگ کے اندھیرے لان میں داخل ہو گیا۔

اس نے پلاسٹک کی بالٹی زمین پر رکھی اور ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے۔ جب اس نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا تو اس کے پورے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ دروازے کے پیچھے اسے کیا دیکھنے کو ملے گا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ پھر اسے بند کر کے اس نے وہ چھوٹی سی ایل ای ڈی لائٹ جلانے کا خطرہ مول لیا جو اس نے دوسرے سامان کے ساتھ بازار سے خریدی تھی۔ اس کی روشنی بریڈ فلیمنگ پر پڑی جو پہلے والی پوزیشن میں ہی تھا، البتہ اس کا چہرہ سیاہ اور بُری طرح سوج چکا تھا۔

اسٹیوارٹ نے گہری سانس لی اور اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے یاد کرنے لگا کہ اس نے گزشتہ روز کس کس جگہ کو چھوا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بالٹی زمین پر رکھی۔ اس میں سے ایک صفائی کرنے والا پیڈ اور پلاسٹک اسپرے ڈسپنسر نکالا جس میں الکوحل بھرا ہوا تھا پھر وہ بریڈ کی طرف بڑھا۔

اس نے دل میں کہا کہ میں پہلے اس ناب سے شروع کروں گا جس میں تار بندھا ہوا ہے۔ میں پہلے وہیں گیا تھا پھر زینے کی ریلنگ، اوپر کے کمرے اور آخر میں بیرونی دروازے کی دونوں اطراف..... اور ہاں فلیمنگ کی کلائی بھی۔ اس نے اپنے آپ کو یاد دلایا۔

وہ بڑی احتیاط سے لاش سے بچتا ہوا الماری کے دروازے تک پہنچا اور اس نے ناب کے علاوہ تار کے تھوڑے سے حصے پر بھی اسپرے کر دیا پھر اس نے اس گیلی سطح کو بڑی احتیاط سے صاف کیا۔ وہ کافی دیر تک کھڑا اپنے کام کے بارے میں سوچتا رہا پھر واپس جانے کے لیے مڑا تو اسے یوں لگا کہ اس نے کچھ آوازیں سنی ہیں۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں فلیمنگ کی فیملی اس کی مدد کے لیے تو کھڑی نہیں ہو گئی۔

اسی افراتفری میں اس کے ہاتھ سے ٹارچ گر گئی۔ اس نے بہ مشکل اسے تلاش کیا اور ابھی وہ سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ اسے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

''کوئی حرکت کرنے کے بارے میں نہیں سوچنا۔'' کسی نے اس پر تیز روشنی پھینکتے ہوئے کہا۔

کافی دیر تک اسٹیوارٹ کچھ نہیں بولا اور نہ ہی اس نے کوئی حرکت کی، بس احمقوں کی طرح آنے والوں کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔

''یہ..... یہ مر چکا ہے۔''

کئی لوگ دروازے میں سے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ہاں، یہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔''

وہ اتنے قریب آ چکے تھے کہ وہ انہیں بہ آسانی پہچان سکتا تھا۔ وہ سب پولیس والے تھے۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ جب میں یہاں آیا تو یہ مر چکا تھا۔'' اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' ان میں سے چھوٹے قد والے نے کہا جبکہ لمبے قد والے نے اس کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیے تھے۔

''تم یہاں پہلے کب آئے تھے یا آج ہی آئے ہو؟ ایک عینی شاہد نے تمہیں دیکھا اور گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ تم کچھ عجیب حرکتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ جب اس نے آج رات تمہیں دوبارہ یہاں آتے دیکھا تو ہمیں فون کر دیا۔''

اس نے فلیمنگ کے سیاہ چہرے پر روشنی ڈالتے ہوئے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی دے دیا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ تم پہلے بھی یہاں آئے تھے۔'' پھر اس کی نگاہ بالٹی اور صفائی کرنے والے سامان پر گئی۔

''اوہ..... اب سمجھا۔'' وہ بڑبڑایا پھر سیڑھیوں پر لائٹ ڈالتے ہوئے اس نے دو پولیس والوں سے کہا۔ ''تم لوگ اوپر جا کر بیڈ روم دیکھو۔ ان میں گھر کے افراد رہتے ہوں گے۔''

''وہ بھی مر چکے ہیں۔'' اسٹیوارٹ نے مایوسی سے کہا اور یہ سوچ کر اس کا دل بھر آیا کہ اگر وہ اس وقت ہی بریڈ فلیمنگ کو فون کر دیتا جب اس سے کہا گیا تھا تو حالات بالکل مختلف ہوتے۔

''سارجنٹ، اوپر بھی تین لاشیں ہیں۔'' ایک پولیس والے نے اطلاع دی۔

اسٹیوارٹ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

آفیسر نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل..... تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم تو صرف گھر کی صفائی کرنے آئے تھے۔'' اس نے ہنسنا شروع کر دیا پھر بولا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ تم اس معاملے میں کس حد تک ملوث ہو بہرحال تم سے ایک غلطی ضرور ہوئی کہ تم نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔ تمہیں اس کی وضاحت بھی کرنا ہوگی اور شاید اس کا جرمانہ بھی ادا کرنا پڑے۔ ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو۔ بیان ریکارڈ کروانے کے بعد تم گھر جا سکتے ہو۔''

وہ سارجنٹ کو کیا بتاتا کہ اس نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی ورنہ اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا کیونکہ اس نے سونیا سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ فلیمنگ سے ملنے نہیں گیا۔ اس سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے سونیا سے جھوٹ کیوں بولا۔ اگر وہ اسے سب کچھ سچ بتا دیتا تو بھی وہ اسٹیوارٹ کو ہی الزام دیتی کہ اس کی بے پروائی کی وجہ سے فلیمنگ اس انجام کو پہنچا۔ کاش اس سے یہ کوتاہی سرزد نہ ہوئی ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو فلیمنگ اور اس کی فیملی کی موت کا ذمے دار سمجھ رہا تھا لیکن قانون میں اس جرم کی کوئی سزا نہیں تھی۔

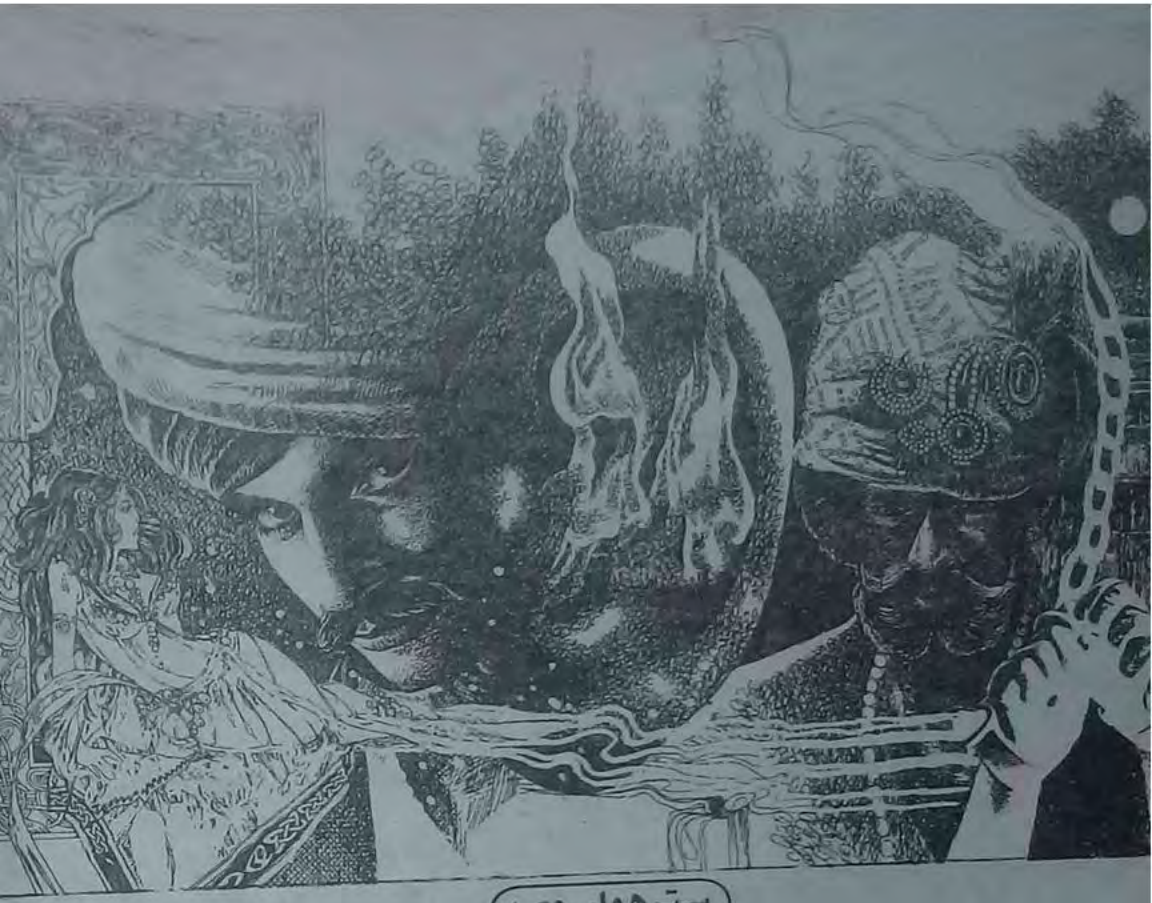

سترھواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

یہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں ایک مختصر قافلہ محو سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ و وضع دار اور وسیع خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور تجسس اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک کرنیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہ شالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوج آزادی کے سپہ سالار جنرل مجیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جاسو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ ''کاروانِ مجاہد'' کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کرسکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ''سلسلۂ تسلط'' کوہ شالیہ کی ان تینوں قابل ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں تریپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی نجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی نجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سوجتا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہاپجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کرا دیتا ہے۔ مہارانی نجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک نجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب نجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر علی تریپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لٹیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر اریبہ کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے خیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، نندو بابا اور شانتا جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار بستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کر لیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا خنجر ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ خنجر ان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پرتاب کمار اریبہ کو بری کر دیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ ادھر بچھو رام ماریا کے باپ کرنل اینڈرسن کو خبر دیتا ہے کہ اس کی بیٹی کے غیاب میں مندر کے پجاریوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ پھر بچھو رام کرنل کو حتمی خبر دیتا ہے کہ ماریا کے غیاب میں مندر والوں کا ہاتھ ہے۔ انگریز کوہ شالیہ پر چڑھائی کی منظوری دے دیتے ہیں۔ ادھر بدری ناتھ اپنے چیلوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس گوری حسینہ رینا کو اغوا کرلیں۔ دو پجاری رینا کو اغوا کر کے مندر لے آتے ہیں۔ اریبہ اور شاہ زمان سی ہاک نامی جہاز کو تباہ کرنے کے مشن پر روانہ ہوتے ہیں تاہم وہ دھر لیے جاتے ہیں۔ ادھر شوکی رینا کی تلاش میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پجاری گھیر لیتے ہیں۔ انگریز وہاں حملہ کر دیتے ہیں۔ شوکی کا مقابلہ بدری ناتھ

سے ہوتا ہے۔ شوکی کی مدد ایک نادیدہ قوت کرتی ہے جس کے نتیجے میں کالی کا مندر تباہ ہو جاتا ہے اور شوکی ملبے تلے دب جاتا ہے۔ ادھر شاہ زمان آزاد ہو کر اریہ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ شاہ زمان فرنگیوں کے کیمپ تک پہنچ جاتا ہے اور اریہ کو وہاں سے رہا کروا لیتا ہے۔ ادھر رابرٹ اپنی بہن گارشیا کا گلا دبا کر سوجنا کو راج محل سے بھگا لے جاتا ہے۔ تاہم گارشیا بچ جاتی ہے۔ اس پر قاتلانہ حملے کی وجہ سے راج محل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ شوکی کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک غار میں ہوتا ہے۔ شوکی کے سامنے ایک حسین وجمیل عورت ہوتی ہے جسے دیکھ کر وہ مبہوت ہو جاتا ہے۔ اس کا نام سدھا ہوتا ہے، وہ اس سے مدد کی درخواست کرتی ہے اور اپنی داستان سناتی ہے۔ ادھر شاہ زمان اور اریہ سی ہاک پر پہنچ جاتے ہیں، رینالڈ بھی وہاں پہنچتا ہے اور کیپٹن جیمس اور شاہ زمان کو زخمی کر دیتا ہے۔ رابرٹ سوجنا کو لے کر بذریعہ جہاز انگلستان کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ ادھر زمان زخمی حالت میں رینالڈ سے مقابلہ کرتا ہے تاہم رینالڈ اریہ کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ سی ہاک وہاں سے روانہ ہو جاتا ہے۔ راج محل میں مجو بائی بھجو رام اور گارشیا کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے کیونکہ راجا کی موت کے بعد وہاں اس کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ ادھر راجا کی طرف سے بھیجے جانے والے چیتن شرما کو جہاز میں سوجنا نظر آ جاتی ہے، وہ راجکماری کو پہچان لیتا ہے۔ سوجنا گھبرا جاتی ہے۔ رینا راکاشی بستی سے نکل شکشیر گھاٹی پر آ جاتی ہے۔ وہاں ایک انجانی قوت اسے اپنے زیر اثر کر کے بینا ٹائز کر لیتی ہے۔ ادھر علی اور شاہ زمان وغیرہ ہاؤس بوٹ میں سی ہاک کے تعاقب میں چل پڑتے ہیں، راستے میں ان کا سامنا بحری قزاقوں سے ہو جاتا ہے جو سب کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ علی اور شاہ زمان دو ڈاکوؤں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں اسی دوران طوفان کے باعث ان کی بوٹ پر ہلچل مچ جاتی ہے۔ ادھر وائٹ فالکن بھی طوفان کی زد میں آیا اور اس کو کافی نقصان ہوا کیرتن اور شوبھا اس طوفان میں موت کا شکار بن گئے۔ شوکی رینا کو کھوجتا ہوا شکشیر گھاٹی پہنچتا ہے۔ بدری ناتھ رینا کو اپنے شیطانی عمل سے قابو کرنا چاہتا ہے تاہم شوکی اسے بچا لیتا ہے۔ وہ دونوں کوہ شمالیہ سے روانہ ہو جاتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ دونوں بہت دور نکل آئے تھے۔

کوہ شمالیہ اور ہردوار کے جنگل کی حدود بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ وہ مسلسل حالت سفر میں رہے تھے اور اتنے عرصے تک بچھڑے ہوئے دو پیاسے ابھی تک بات کرنا تو درکنار ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھ بھی نہیں سکے تھے۔ ان کے لیے یہ کیا کم تھا کہ اب ان دونوں کے بیچ کوئی رکاوٹ، کوئی دیوار نہیں رہی تھی۔ وہ دونوں اس وقت بھی جیسے بہ زبان لمس ایک دوسرے سے محو کلام تھے اور یہ ان کے لیے پُرلطف اور سرور آگیں لمحات ہی تو تھے۔

ایک سبک رفتار گھوڑے کی پشت پر شوکی اور رینا جیسے یک جان دو قالب میں ڈھل گئے تھے۔ ایسے میں پیاسی دید اور ہجر زدہ اجسام کو اور کیا چاہیے کہ یہ حسین ساعتیں جیسے تھم کیوں نہ جائیں......

شوکی کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھی۔ رینا اس کے آگے بیٹھی تھی۔ گھوڑا منزل کی جانب دوڑ رہا تھا۔ شوکی کا حال یہ تھا کہ رینا کو اس نے خود سے یوں لگا رکھا تھا جیسے بدری ناتھ جیسا کوئی دشمن...... کوئی بیری، اس کے محبوب کو پھر نہ اس سے جدا کر ڈالے۔

یہی حال رینا کا بھی تھا، اسے بھی اپنے محبوب کے ساتھ لگے بیٹھے رہنے میں سکون مل رہا تھا اور وہ اب محبوب کی قربتوں سے ایک لمحے کے لیے بھی محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔

بالآخر جب شوکی نے محسوس کیا کہ وہ اب خطرے کی حدود عبور کر چکا ہے، تاہم منزل ابھی دور تھی...... اس نے ایک مقام پر گھوڑا روک لیا۔ دونوں ابھی گھوڑے پر ہی تھے، اتنی سی جدائی بھی انہیں گراں گزرتی تھی کہ ذرا اتر کر ستالیں۔ سانسیں دونوں کی چڑھی ہوئی تھیں، کچھ مسافتوں کے باعث اور کچھ...... قربت کی ان پرسرور گھڑیوں کے سبب...... جو ایک عرصے بعد میسر آئی تھی۔

اب وہ ایک دلکش وادی کے سرے پر تھے، جس کے اطراف سرسبز گھاس پھیلی ہوئی تھی اور ایک جانب چھدرا سا جنگل تھا جس پر کسی پر بہار گلشن کا احساس ہوتا تھا۔ وہ دونوں کسی ہیولوں کی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر سوار نظر آتے تھے۔

ان کی نظروں کے سامنے وادی اور جنگل کے پار...... دور غربی افق پر پہاڑیوں کی سربفلک چوٹیاں تھیں، جہاں سے غروب آفتاب کا سرخی مائل نصف مکھڑا بادل کی چند ٹکڑیوں سے جھانکتا عجیب منظر پیش کرتا تھا۔ ماحول میں ہلکی سی گونج کا تاثر محسوس ہوتا تھا۔ ایک اسرار بھری سی بازگشت تھی، جو کبھی دور اور کبھی نزدیک سے سنائی دیتی تھی۔

شوکی گھوڑے سے اتر آیا اور پھر رینا کو بھی سہارا دے کر نیچے اتارا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو یوں تھام رکھا تھا جیسے وہ اب ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہ ہونا چاہتے ہوں۔

اس کے بعد شوکی، رینا کا نرم و نازک ہاتھ تھامے ایک گھنے پیڑ کے نیچے لے آیا۔

شوکی گھوڑے کی پشت سے اوڑھنے بچھونے کا سامان جس میں کچھ زادراہ بھی تھا، اتار لایا تھا۔ وہ اس نے پیڑ کے نیچے ڈال دیا۔

بچھونا تیار کرنے کے بعد وہ دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ جنگلی ..... پھل وغیرہ تھے، شہد تھا، وہی انہوں نے کھایا۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے انہیں یقین ہی نہیں آرہا ہو کہ وہ دونوں اتنے عرصے بعد ایک بار پھر یکجا ہو کر ساتھ بیٹھے تھے۔ جنگل تھا، تنہائی تھی اور محبوب..... ''شوکی! یہ سب خواب تو نہیں ہے نا.....؟'' اچانک رینا نے اس کی طرف اپنی جھیل جیسی گہری نیلی آنکھوں سے تکتے ہوئے کہا تو وہ اس کے سنہرے بالوں کی لٹ کو جو رینا کے حسین چہرے پر جھالر کی طرح بکھر آئی تھی، چھو کر مسکرایا پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا دل مچل اٹھا اور اس نے بے اختیار رینا کو چوم کر اپنے سینے سے لگا لیا پھر جذباتی لہجے میں بولا۔

''لو..... یقین کرلو، تم میری بانہوں میں ہو، میری محبت بھری آغوش میں..... کیا اس سے بڑھ کر بھی تمہیں کچھ حقیقت درکار ہے؟''

''آہ..... شوکی! مجھے اسی طرح خود سے لگائے رکھو۔ ایک لمحے کے لیے بھی خود سے الگ مت کرنا، جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے۔'' رینا کے جذبات بھی مچل رہے تھے۔

دونوں کو ایک دوسرے کے وجود کی گرمی میں سکون مل رہا تھا۔ ایک طویل جدائی کی آبلہ پائی نے ان دونوں کو زخمی کر دیا تھا اور اب جیسے ایک دوسرے کا وجود ان کے لیے مرہم کا کام کر رہا تھا۔

''شوکی! مجھ میں اب سکت نہیں رہی کہ تم سے دوبارہ بچھڑوں اور..... اور پھر جی نہ پاؤں.....'' رینا یہ کہتے ہوئے آخر میں بے اختیار سسک پڑی۔

''پاگل..... ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔'' شوکی اس کے نرم و نازک گال کو اپنے ہونٹوں سے چھو کر بولا۔ اس کی آواز میں ملائمت اور لہجے میں محبت بھری حلاوت تھی۔

''میں اب تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کروں گا۔ میں نے بھی تو تمہیں حاصل کرنے کے لیے ایک طویل مسافت جھیلی ہے۔ اب بھلا میں اپنی منزل کو کیسے کھونے دوں گا۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوتے یک جان دو قالب ہو گئے۔ معاً ایک آواز پر چونک پڑے۔ ان سے ذرا فاصلے پر دو بھورے رنگ کے سانبھر آپس میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نمودار ہوئے، ان کے سینگ پتلے اور شاخ دار تھے۔

شوکی اور رینا انہیں دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔

شوکی نے شرارت بھرے انداز میں رینا سے کہا۔

''لگتا ہے انہیں بھی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی۔'' اس کی شرارت کا مطلب جان کر رینا شرما سی گئی۔ رینا کے خوب صورت چہرے پر شرم کی لالی دیکھ کر شوکی کو بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ اس نے دوبارہ اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''شوکی! ہماری منزل اب کتنی دور ہے؟'' اچانک رینا نے قدرے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ''مجھے ڈر ہے کہیں راج محل کے سپاہی یہاں نہ آ پہنچیں۔''

''ہماری منزل تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، رینا!'' شوکی مسکرا کر بولا۔ ''کیا تمہیں کسی اور منزل کی بھی تلاش ہے؟'' اس کی بات پر رینا تڑپ اٹھی اور اس نے اپنا سر اس کے کشادہ سینے پر رکھ دیا۔ تب شوکی نے اس کے مرمریں گال کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اب کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ان کی پہنچ سے بہت دور نکل آئے ہیں اور اب دلی تک پہنچنے والے ہیں۔ صبح ہوتے ہی پھر نکل پڑیں گے۔''

وہ دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ گارشیا کے بھیانک انجام سے متعلق بھی گفتگو ہوتی رہی۔ رابرٹ اور سونجا کا موضوع بھی چھڑا اور بہت سی باتیں۔ حتیٰ کہ رات ہو گئی۔ شوکی نے گھوڑے کی رسی کو اسی درخت کی جڑ سے باندھ دیا، جو کہیں کہیں سے باہر کو نکلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ بہت پرانا درخت معلوم ہوتا تھا جس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

رات کا ابتدائی پہر آن پڑا تو شوکی نے کچھ سوکھی جھاڑیاں اور شاخیں اکٹھی کر کے بچھونے کے قریب الاؤ روشن کر دیا۔ اس سے ایک تو بھولے بھٹکے کسی جنگلی جانور کے قریب آنے کا خطرہ نہیں رہتا، دوسرے انہیں بھی حرارت ملتی رہتی، کیونکہ سردی بڑھنے لگی تھی۔

راکاشی بستی والوں نے انہیں نہ صرف زادِ راہ اور گھوڑا دیا تھا بلکہ گرم کھالوں کے لحاف اور بچھونے بھی دے رکھے تھے، وہ اب انہیں ہی استعمال میں لا رہے تھے۔

شوکی اور رینا کے چہرے سامنے قریب سلگتے ہوئے الاؤ سے ہی نہیں بلکہ اپنے پیاسے دلوں کے جذبات سے بھی سرخ ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ ان دونوں دیوانوں فرزانوں کی وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ ذرا ذرا دیر بعد وہ ایک دوجے کی طرف نگاہیں بھر کر تکنے لگتے تھے اور مسکرا دیتے تھے۔

ایک موقعے پر جب شوکی گرم بچھونے پر نیم دراز تھا اور رینا اس کے پاس ہی اپنا سر شوکی کے سینے پر رکھے ہوئے تھی

اور اس کی سنہری گھنی ریشمی زلفیں شوکی کے فراخ سینے پر پھیلی ہوئی تھیں تو رینا نے دیکھا کہ شوکی یک ٹک بھڑکتے ہوئے الاؤ کی طرف تکے جا رہا تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''شوکی.....!'' رینا نے دھیرے سے اسے پکارا۔

''آں.....ہاں.....!'' وہ بھی جیسے چونکنے والے انداز میں بولا۔

''تم کسی سوچ میں گم ہو؟''

''ہاں.....!''

''کیا سوچ رہے ہو؟''

جواب میں شوکی نے پہلے ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری خارج کی، اس کے بعد رینا کا نرم و گداز ہاتھ تھام کر بولا۔

''رینا! تم مجھ سے شادی کرو گی نا.....؟'' شوکی کی بات پر رینا کسی مشرقی عورت کی طرح شرما سی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حنائی سے لبوں پر دل موہ لینے والی مسکراہٹ بھی کسی ضوفشاں کہکشاں کے مانند چمکی تھی۔ تاہم اسے شوکی کا لہجہ بچوں کی طرح معصومانہ اور ملتجیانہ محسوس ہوا، جس میں والہانہ محبت بھی تھی اور اشتیاق بھی۔

اگرچہ شوکی کو اپنے سوال کا جواب رینا کی شرم کی لالی اور موہنی سی مسکراہٹ دیکھ کر مل چکا تھا، پھر بھی جواب میں رینا نے جس کا نرم و گداز ہاتھ ہنوز شوکی کے ہاتھ میں تھا، وہ اس نے ہولے سے دبایا تھا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے رینا نے دیکھا وہ ایک دم سنجیدہ سا نظر آنے لگا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

''رینا! میں سوچ رہا تھا ہمیں اب آگے کون سا قدم اٹھانا چاہیے جو ہمارے لیے سودمند ثابت ہو.....؟ میرا مطلب ہے کیا اب ہمارا دلی جانا بہتر ہوگا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جنرل مائیکل شا.....'' اتنا کہہ کر اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر رینا اس کی ادھوری بات کا مطلب جان چکی تھی، اسی لہجے میں بولی۔

''یہی کچھ میں بھی تم سے کہنے والی تھی شوکی.....!'' اس کی بات پر شوکی نے بھی قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

جذباتیت کی فضا کے بعد جب گفتگو سنجیدہ رخ پر آنے لگی تو شوکی نے دھیرے سے اٹھ کر بیٹھنا چاہا اور رینا بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''یعنی.....تم.....بھی ایسا ہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں؟''

''ہرگز نہیں۔'' رینا نے انکار میں سر ہلا دیا اور شوکی اس کی جانب الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا، وہ وضاحت کرنے کے انداز میں آگے بولی۔

''لیکن جیسا تم سوچ رہے ہو، وہ میں سمجھ رہی ہوں۔''

''کیا سمجھ رہی ہو تم؟''

''یہی کہ تمہیں ڈر ہے کہیں میرے انکل جنرل مائیکل شا میری اور تمہاری شادی سے متعلق کوئی انکار یا سخت فیصلہ نہ صادر کر دیں اور تم چونکہ ان کے ملازم ہو اسی لیے تمہارے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو جائے، یہی مطلب تھا نا تمہارا.....؟'' رینا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا تو شوکی کو کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ تڑنت بولا۔

''ہاں، رینا! میرا یہی مطلب تھا۔ تم بالکل ٹھیک سمجھی ہو کیونکہ صرف میں ہی جنرل مائیکل شا کا ملازم نہیں ہوں بلکہ میرا بوڑھا باپ بھی ان کے ملازمین میں شامل ہے۔''

''انکل مائیکل ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ ہماری شادی پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ وہ خود ہماری شادی بڑی دھوم دھام سے کریں گے اور کوئی بعید نہیں کہ اس کے بعد تمہیں وہ اپنے پاس کسی خاص ملازمت پر رکھ لیں۔''

رینا نے امید افزا لہجے میں شوکی سے کہا تو وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ بھی یاد آ رہے تھے۔ وہ بے چارے نہ جانے کب سے اپنی بوڑھی آنکھوں میں انتظار سموئے اس کی راہ تک رہے ہوں گے۔

اگلے دن صبح وہ جاگے تو بالکل تازہ دم تھے۔ گھوڑے پر سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

دلی پہنچ کر جب وہ جنرل مائیکل شا کی قلعہ بند رہائش گاہ پر پہنچے تو سب ان دونوں کو دیکھ کر حیران اور خوش ہوئے۔ کریم بخش اور اس کی بیوی، بے چارے دونوں ہی اپنے جوان بیٹے کی طرف سے کب کے مایوس ہو چکے تھے اور اس کی جدائی کے غم میں مزید ضعیف نظر آنے لگے تھے، لیکن اب اپنے لختِ جگر کو دوبارہ اپنے درمیان پا کر جیسے دوبارہ جی اٹھے تھے۔

جنرل مائیکل شا بھی انہیں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ خاصی دیر بعد ایک تفصیلی نشست کے دوران شوکی اور رینا نے مائیکل شا کو شروع سے آخر تک ساری روداد دھیرے دھیرے سنا ڈالی۔ جنرل مائیکل شا یہ سن کر بے حد حیران ہوا اور شوکی کی بہادری کی تعریف کی۔ یوں اسے ناگرہ سے متعلق بھی تازہ اطلاعات اور وہاں کے اندرونی معاملات سے بھی آگاہی حاصل ہوئی۔

ابھی سرِدست شوکی اور رینا نے اپنا اصل مطمحِ نظر اس

سے گوش گزار نہیں کیا تھا کیونکہ رینا کے مشورے کے مطابق وہ خود ہی کسی خاص موقع پر لیکن عنقریب اپنے انکل سے اپنے اور شوکی کے درمیان پروان چڑھنے والے ''معاملۂ دل'' کے متعلق بات کرنے والی تھی۔ شوکی مطمئن بھی تھا اور کچھ الجھا ہوا بھی تاہم اسے رینا کی تسلی پر پورا بھروسا بھی تھا۔

اس کے ماں باپ اور دیگر ساتھی ملازمین بھی اس کی حیرت انگیز داستان سن کر خاصے حیران ہوئے تھے۔ قصۂ مختصر شوکت حسین عرف شوکی نے دوبارہ اصطبل کی ملازمت سنبھال لی تھی اور اپنے باپ کو مکمل آرام کرنے کی تاکید کر ڈالی تھی، تاہم کریم بخش وقت گزاری اور دل بہلانے کی خاطر چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتا تھا۔

شوکی نے البتہ ابھی اپنی ماں یا باپ سے اپنے دل کی بات نہیں کہی تھی۔ وہ ابھی رینا کا منتظر تھا کہ پہلے وہ اپنے انکل مائیکل شا سے اس بابت ذکر کرلے، کیونکہ جس طرح رینا کو یقین تھا کہ اس کے انکل کو ان کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اسی طرح شوکی کو اپنے ماں باپ پر تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی کو ہی اپنی خوشی سمجھ کر رینا کو قبول کرلیں گے۔

یوں شوکی رینا کی طرف سے اس بات کا بڑی بے چینی سے منتظر تھا کہ کب وہ مائیکل شا سے ذکر کرتی ہے اور اسے کب خوش خبری سناتی ہے۔

وہ گویا اب ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا تھا۔ بالآخر ..... دو تین روز بعد ہی رینا نے شوکی کو یہ خوش خبری سنادی کہ انکل مائیکل شا کو ان کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں مزید یہ کہ جیسا رینا نے شوکی سے کہا تھا کہ انہیں خوشی ہی ہوگی تو وہی ہوا تھا، جنرل مائیکل شا اس رشتے پر خوش تھا۔

اس اطلاع پر شوکی کی خوشی دیدنی ہوگئی، اس نے مسرت اور جذبۂ بے اختیاری تلے رینا کو اپنے سینے سے لگا کر چوم لیا۔

تاہم آخر میں رینا نے شوکی سے یہ بھی کہا کہ آج رات انکل نے اسے اپنے کمرۂ خاص میں بلایا تھا اور شوکی نے کچھ گومگو سے انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

☆☆☆

چری اپا کی چیختی ہوئی اطلاعیہ آواز سب کے کانوں میں پڑی تھی۔

علی اور شاہ زمان دونوں ڈاکوؤں کو جہنم واصل کرنے اور ان کی لاشوں کو سمندر برد کرنے کے بعد فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا ملے تھے۔ وہ بھی یہ اعلان سن کر فکرمند سے ہوگئے تھے۔ تاہم فوری طور پر بحری قزاقوں سے جنگ کا خطرہ ٹل چکا تھا۔

''لیکن پھر بھی ہمیں ان سے محتاط رہنا ہوگا۔'' اریبہ بولی۔ ''کیونکہ وہ اپنے دو ساتھیوں کی کمی سے سمجھ لیں گے کہ ان کا انجام ہمارے ہاتھوں سے ہی ہوا ہے۔''

''ہاں! اس خدشے کو ہم نظر انداز نہیں کریں گے۔'' علی ریحان نے کہا۔

''لیکن ہم انہیں ان کے دو ساتھیوں کے بارے میں کیا جواب دے کر مطمئن کریں گے؟'' ازابیلا بولی۔ وہ سب سے زیادہ متوحش اور پریشان نظر آرہی تھی۔

''ہم ان سے صاف کہہ دیں گے۔'' اس کا شوہر کیپٹن جیمس بولا۔ ''انہوں نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور ہم نے اپنے دفاع میں ایسا کیا تھا بس!''

''صحیح بات ہے، قصور تو ان کا اپنا ہی تھا۔ یہ بات خود بھی یہ لوگ جانتے ہی ہیں کہ انہوں نے دھوکے سے ہمیں ہلاک کرنا چاہا تھا۔'' شاہ زمان بولا۔ ''ہمیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''بات ڈر کی نہیں ہے زمان!'' علی ریحان نے مصلح کہا۔ ''یہ مجرم ہیں۔ یہ اپنا جرم کسی صورت میں تسلیم نہیں کریں گے۔ لہٰذا ہمیں ان سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اسی طرح لاعلم رہو کہ ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں۔''

''مگر وہ ہمارے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں گے۔'' جیمس بولا۔

''نہ ہوں، ہمیں کوئی پروا نہیں، سرد جنگ انہوں نے ہی ہم پر مسلط کی ہے۔ ہم بھی خم ٹھونک کر اس کا جواب دیں گے، انہی کے انداز میں.....'' علی نے کہا۔

اچانک وہ چونکے۔ ولکونی دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ بابیلا بھی تھی۔ دونوں نے تلواریں سونت رکھی تھیں۔ ان کے چہروں پر جارحانہ سرخی تھی۔ یہ لوگ بھی محتاط ہوگئے۔

''ہمارے دو ساتھی غائب ہیں۔'' ولکونی نے شعلہ بار نظروں سے ان کی جانب گھورتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں پورا یقین ہے کہ انہیں تم لوگوں نے ہلاک کر کے سمندر میں پھینک دیا ہے۔''

''یہ تم لوگوں کی غلط فہمی ہے۔'' کیپٹن جیمس، ولکونی سے بولا۔ ''ہم تو خود طوفان کے اس اعلان پر پریشان ہو کر یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔''

اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ تیز اور شرانے دار طوفانی ہواؤں کا زور چل پڑا۔ لانچ بری طرح ڈولنے لگی۔ سب لوگ لڑکھڑانے لگے۔ اسی وقت سردار آٹوما کی گرجتی ہوئی

آواز سنائی دی۔

''مستول گرادو۔۔۔ ہمیں طوفان کا مقابلہ کرنا ہے۔ سب وہیل کیبن کا رخ کرو۔''

اپنے سردار کا اعلان سن کر ولکوئی خونخوار نظروں سے انہیں گھورتے ہوئے بولا۔ ''ہم تم سے نمٹ لیں گے۔۔۔ اور خبردار۔۔۔ کیبن کا رخ مت کرنا کہیں کھڑے رہو۔''

یہ تہدید کرنے کے بعد وہ اپنی ساتھی بابیلا کے ساتھ پلٹ گیا۔ اس کی دھمکی اور جارحانہ انداز پر شاہ زمان نے ان کی جانب جارحانہ انداز میں پیش قدمی کرنا چاہی تھی کہ علی نے اسے روک دیا۔

''اس کے باپ کی لانچ ہے، ہونہہ۔۔۔'' زمان نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک زوردار موج نے لانچ کو کسی کاغذی ناؤ کی طرح اوپر اچھالا۔۔۔ خود ان لوگوں کے قدم بھی عرشے سے اکھڑ گئے۔ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ کوئی کہیں گرا اور کوئی کہیں۔۔۔

ایک لمحے کو ایسا لگا تھا جیسے لانچ الٹ گئی ہو۔ یہ لوگ فوراً سنبھلے، شکر تھا کہ کسی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔

وہ دوڑتے سنبھلتے اور گرتے پڑتے ہوئے ایک کیبن میں جا گھسے۔

تیز طوفانی بارش شروع ہو چکی تھی اور بادل پُرشور آواز سے گرج رہے تھے۔ رہ رہ کر بجلیاں چمک رہی تھیں اور بپھرے ہوئے سمندر میں ان کی ہاؤس بوٹ کسی حقیر تنکے کی طرح ڈول رہی تھی۔

اس وقت سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی، شاید اسی لیے کسی ڈاکو نے ان کے کیبن کا رخ نہیں کیا تھا۔

بحری قزاقوں کا یہ ٹولا یقیناً ایسے طوفانوں سے ٹکرانے کا تجربہ رکھتا تھا اسی لیے وہ اسی میں مشغول رہے۔

کافی دیر تک یہ لوگ زندگی اور موت کی کشمکش میں بقا کے لیے برسرپیکار رہے اور پھر رفتہ رفتہ طوفان کا زور ٹوٹنے لگا۔ کچھ ہلچل کم ہوئی مگر لانچ اب بھی قابو سے باہر تھی۔ منزل کھو گئی تھی۔ راستہ بھٹک گیا تھا اور وہ سب اپنی لڑائی بھول کر اسی تگ ودو میں مصروفِ کار تھے۔

طوفان میں کچھ ٹھہراؤ آ گیا تھا مگر طغیانی جیسی صورتِ حال جوں کی توں تھی۔ فطرتی مصائب وآلام سے جنگ ابھی جاری تھی۔ ذرا سنبھالا لیتے ہی اریبہ نے اپنے ''کام'' کی ذمے داری سنبھال لی اور اکیلی کیبن سے نکل گئی۔

ادھر چری اپا کو جب ولکوئی اور بابیلا نے اپنے دو ساتھیوں کے ''غیاب'' کے بارے میں بتایا تو وہ بھی سمجھا کہ وہ اس طوفانی کشاکشی میں گر کر بپھرے ہوئے سمندر کی نذر ہو گئے ہوں گے۔

''نہیں سردار! شوبرا اور ساکوس اتنے بھی بچے یا ناتجربہ کار نہیں تھے کہ وہ سمندری طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کی زد میں یوں آسانی سے آ جائیں۔'' ولکوئی نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ چری اپا نائب سہی مگر سب اسے بھی سردار ہی کہا کرتے تھے۔ وہ اس وقت ایک مستول کو سیدھا کرنے کی جستجو کر رہا تھا۔ تب ہی اسے ایک جزیرے کا ساحل دکھائی دے گیا تھا اور وہ اسی پر غور کرنے میں محو تھا کہ وہاں لانچ روکی جائے یا اس طوفان سے مقابلہ کرتے ہوئے منزل کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے کہ ولکوئی اور بابیلا یہ خبر لے کر آن پہنچے۔

''اور سردار! یہ تو طوفان آنے سے پہلے ہی ان کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہوگا۔'' بابیلا نے بھی اپنے ساتھی ولکوئی کی تائید میں کہا۔ ''کیونکہ جس وقت تم نے طوفان کی آمد کا اعلان کیا تو ہم شوبرا اور ساکوس کو ہی آوازیں دے رہے تھے۔ ان کی طرف سے جب کوئی جواب نہیں ملا تو ولکوئی اور میں انہیں تلاشنے نکلے۔ وہ نہیں ملے، پھر طوفان سر پر آ گیا۔''

چری اپا کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ساتھی غلط نہیں کہہ سکتے تھے۔ دانت پیس کر طیش سے بولا۔

''موقع ملتے ہی ان تینوں کو ایک ایک کر کے ختم کر ڈالو مگر سنو! ان کی دونوں عورتوں کو کچھ نہ ہونے پائے، وہ ہمارے کام آئیں گی۔۔۔۔''

''اتنا بے وقوف تو میں بھی نہیں ہوں سردار! لیکن وہ تینوں مرد کوئی عام مسافر نہیں ہیں، ان سے جم کر مقابلہ کرنا پڑے گا۔ یہ صرف میرے اور بابیلا کے بس کی بات نہیں۔۔۔۔'' ولکوئی نے صاف گوئی سے کہا۔

''یہ تم لوگ ادھر کیا باتیں کر رہے ہو؟'' ایک بھاری اور گونجیلی آواز پر وہ تینوں چونکے۔ یہ سردار آٹوما تھا، اس کے ہمراہ اس کی جوان بیٹی اسپارا بھی تھی۔

''اور۔۔۔۔ یہ شوبرا اور ساکوس کدھر گئے، دکھائی نہیں دے رہے؟'' اسپارا نے پوچھا۔

چری اپا نے ولکوئی اور بابیلا سے سنی ہوئی گفتگو ان دونوں باپ بیٹی کے بھی گوش گزار کر دی۔ یہ سنتے ہی سردار آٹوما کا بھاری چہرہ مارے غیظ وغضب کے سرخ ہو گیا۔ اس نے فوراً تلوار نکال لی اور بولا۔

''اسی وقت میرے ساتھ چلو، ابھی ان کے سر قلم کیے

دیتے ہیں۔"

"میں نے بھی ان سے یہی کہا تھا۔" چری اپاسفا کی سے بولا۔ "ان کے مردوں کو ہلاک کر ڈالیں اور ان کی عورتوں پر قابض ہو جائیں۔"

امپارا ان کے جارحانہ خیالات جان کر کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اسے وہ خوبرو سا اور بڑی بڑی سی روشن آنکھوں والا نوجوان علی ریحان پسند آ گیا تھا۔ اس نے اچانک درمیان میں کہا۔

"ان پر حملہ کرنے کا یہ موقع صحیح نہیں ہے۔ ہم اس طوفان کی وجہ سے اپنی منزل سے بھٹک چکے ہیں اور وہ خزانے والا جہاز بھی کھو چکے۔ ایک جزیرے کا ساحل نظر آ رہا ہے اور اس وقت لانچ کی بھی مرمت کرنا ہو گی ہمیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم پہلے اس جزیرے پر اتر جائیں اور اس کے بعد ہی ان کے بارے میں سوچیں۔"

"میرا خیال ہے امپارا ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ولکونی نے اس کی تائید میں کہا۔

جزیرے کے آثار سے متعلق انہیں علم ہو چکا تھا۔ جو سردار آتوما اور ولکونی کو بھی دکھائی دے گیا تھا۔

"کیونکہ ان سے مقابلہ کرنا آسان نہ ہو گا، وہ کوئی عام مسافر نہیں ہیں۔ تینوں ایک تربیت یافتہ جنگجو معلوم ہوتے ہیں، ورنہ شوبرا اور ساکوس ان کے ہاتھوں مارے نہیں جاتے۔"

"مجھے تو ان کی دوسری ساتھی عورت (اریبہ) بھی تیز اور چلتا پرزہ لگتی ہے۔" بابیلا نے ولکونی کی تائید کی۔

ادھر اریبہ، جس نے لانچ میں ان ڈاکوؤں کی جاسوسی کا کام سنبھالا ہوا تھا، ولکونی اور بابیلا کے جانے کے بعد جب طوفان میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو وہ ان کے پیچھے چلی گئی تھی۔

اس وقت وہ ان کی ساری باتیں سن رہی تھی۔ وہ فوراً پلٹی اور واپس کیبن میں پہنچی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو ساری بات بتا ڈالی کہ طوفان کی وجہ سے اور راستہ بھٹکنے کے سبب یہ لانچ ایک جزیرے کے ساحل کے قریب پہنچ چکی ہے اور ان بحری قزاقوں کا وہاں ایک نیا کھیل کھیلنے کا ارادہ ہے۔ لہٰذا ازحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

یہ خبر ان سب کے لیے پریشان کن تھی۔ اب علی اور شاہ زمان وغیرہ اپنے اس عظیم مشن سے مایوس ہونے لگے تھے جس کے لیے انہوں نے اپنی جانیں تک جوکھم میں ڈال رکھی تھیں۔ بلکہ اب بحری قزاقوں کی صورت میں ایک نئی مصیبت گلے پڑ چکی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ لانچ کو اس گمنام جزیرے کے ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں ان ڈاکوؤں پر ہلا بول دینا چاہیے۔"

انہیں خاموش اور سوچتا پا کر اریبہ نے کہا۔

"نہیں، ایسا کرنا اور بھی خطرناک ہو گا۔" علی نے کہا۔ "یہ ہمارے لیے ایک موقع ہے، جزیرے میں ہم زیادہ آسانی اور کسی مشکل کے بغیر ان کا مقابلہ کر پائیں گے۔"

"لیکن علی بھائی! یہ لوگ ساحل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم پر ہلا بول سکتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم ان سے پہلے ہی ان پر....."

"نہیں....." کیپٹن جیمس نے کہا۔ "مسٹر علی کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ ہم محتاط رہیں گے، اور جیسے ہی لانچ ساحل سے لگے گی، ہم اتر جائیں گے۔ اس طرح خطرے اور جنگ کو خود پر مسلط کرنا ٹھیک نہ ہو گا، اس لیے کہ میری بیوی ازابیلا کی طبیعت ٹھیک نہیں، وہ ماں بننے والی ہے۔"

ازابیلا قریب کھڑی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ علی، زمان اور اریبہ اس خبر پر کچھ ششدر ہوئے تھے۔ تاہم اریبہ نے کہا۔

"کیپٹن جیمس! تم فکر مت کرو، اللہ ہماری مدد فرمائے گا اور ازابیلا میری بہن ہے۔ ہم آپ کی بات سمجھ چکے ہیں، ہمیں واقعی جان بوجھ کر کسی خطرے کو گلے نہیں لگانا چاہیے، تاآنکہ وہ..... ظاہر نہ ہو۔"

"اوہ ..... اچھا ہوا مسٹر جیمس! آپ نے بتا دیا۔" زمان نے کہا۔ "موقع ایسا ہے کہ آپ کو مبارک باد بھی نہیں دے سکتے، لیکن جیسا کہ اریبہ نے ابھی کہا کہ اللہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔ ہم ایک نیک مشن پر نکلے تھے، مگر افسوس کہ ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔"

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے شاہ زمان!" علی نے جوش سے کہا۔ "نیک مقاصد پر نکلنے والوں کو اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ منزل ملتی ہے، اگرچہ راستے دشوار ہوتے ہیں اور رکاوٹیں آتی ہی رہتی ہیں۔"

"بے شک۔" اریبہ اور زمان نے بہ یک زبان کہا۔

اپنے ساتھی علی ریحان کی بات نے انہیں ایک نیا کوہ شکن حوصلہ عطا کیا تھا۔

اسی وقت لانچ کو ایک جھٹکا لگا۔ یہ لوگ کیبن سے باہر نکل آئے۔ طوفان کافی حد تک تھم چکا تھا۔ لیکن آسمان تاریک تھا، کوئی تارا تک ٹمٹماتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ خنکی اب اچھی خاصی ٹھنڈ میں بدلنے لگی تھی۔

اسی وقت دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھریں۔ یہ

لوگ بری طرح ٹھٹک گئے، ازابیلا کا حسین چہرہ ایکا ایکی سراسیمہ ہو گیا مگر باقیوں کے چہروں پر جوش کی سرخی نمایاں تھی۔ ڈاکوؤں سے چھینی ہوئی دو تلواریں ان کے پاس تھیں۔

"ہوشیار! لانچ ساحل سے آن لگی ہے، دشمن آرہے ہیں، لیکن کوشش کرنا کہ ان سے بھڑے بغیر ہی جزیرے کی طرف بڑھا جائے۔" زمان نے سب کو خبردار کرتے ہوئے تاکید بھی کر ڈالی۔

"نہیں، ہمیں ان کا ادھر ہی مقابلہ کرنا ہوگا، ممکن ہے ہم سے پیچھا چھڑانے کی یہ ان کی کوئی نئی چال ہو۔" علی بولا۔ "کیا پتا ہمارے لانچ سے اترنے کے بعد یہ لوگ آگے نکل جائیں۔"

علی کی بات میں وزن تھا، ماسوائے زمان کے، سب نے اس کی بات پر صاد کیا تھا۔

"لانچ بے کار ہو چکی ہے، ایندھن تو اس کا کب کا ختم ہو چکا، محض بادبانوں کے سہارے ایک بھٹکی ہوئی منزل پر اب پہنچنا ناممکن حد تک مشکل ہو چکا ہے۔ یہ لوگ بھی جزیرے پر ہی پناہ لیں گے۔" زمان نے کہا۔

"ہاں......! کیونکہ اب لانچ میں زادِ راہ بھی نہیں بچا......" اریبہ نے بھی شاہ زمان کی بات پر گرہ لگائی۔

شاہ زمان اور علی تلواریں سونتے آگے بڑھے۔ وہ اس زینے کی طرف لپکے تھے جو عرشے تک جاتا تھا، اسی زینے سے تین بحری قزاق تلواریں لیے آسیبی ہیولوں کی طرح نیچے اترتے دکھائی دیے۔

مارے خوف و دہشت کے ازابیلا کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے شوہر کیپٹن جیمس سے جا لگی۔ اریبہ ان کے ساتھ تھی، تاہم اس کے ہاتھ میں کوئی لکڑ نما شے نظر آرہی تھی جس کا سرا خاصا کند تھا۔ یہ اس نے ہتھیار کے طور پر اٹھا رکھا تھا۔ زمان نے ہی اسے ٹوٹے ہوئے کسی مستول سے تلاش کر کے دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اریبہ اس سے بھی بہ خوبی ہتھیار کا کام لینا جانتی ہے۔

علی اور زمان رک گئے، ان کے عقب میں جیمس اور دیگر بھی یکدم محتاط انداز میں ٹھہر گئے۔

اریبہ سے کیپٹن نے وہ لکڑ نما شے جھپٹ لی اور ازابیلا کو اس کے حوالے کرتے ہوئے ایک جانب کھسکنے کا اشارہ دیا۔ اریبہ اسے لیے مذکورہ سمت کو لپک گئی۔

ادھر ڈاکوؤں نے وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے ان پر ہلا بول دیا۔ یہ چری اپا سمیت تین ڈاکو تھے۔ چری اپا کے ساتھی بابیلا اور ولکونی بھی اس وقت بہت ہی خونخوار نظر آرہے تھے۔ ان کی چمکتی ہوئی سفاک آنکھوں سے جارحانہ عزائم صاف نظر آتے تھے جیسے وہ آج کٹ مرنے کو بالکل تیار ہوں۔

☆☆☆

سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ آسمان پر شفافیت ابھر رہی تھی۔ حدِ نگاہ پھیلے پُرسکون بحرِ بیکراں کو دیکھ کر لگتا ہی نہ تھا کہ شب گزشتہ میں وہ کس قدر غضب ناک ہو رہا تھا۔ اب اس کی ہلکورے لیتی سطح پر ٹنوں وزنی وائٹ فالکن مناسب رفتار سے ایک بار پھر اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔

عرشے پر تمام مسافر جمع تھے۔ کچھ زخمی تھے، انہیں جہاز کا طبی عملہ سنبھالے ہوئے تھا۔ کچھ ضرر رساں چوٹ کھا کر ہلاک ہو چکے تھے، جن میں کیرتن اور شوبھا بھی تھے۔

ان میں چند مسافر گمشدہ بھی تھے، یقیناً وہ اس بلاخیز طوفان کی لپیٹ میں آ کر سمندر برد ہو گئے تھے۔ جو چوٹوں کی زد میں آ کر ہلاک ہوئے تھے، ان کی لاشوں کو مروجہ بحری قوانین اور رسوم کے مطابق سمندر برد کیا جا رہا تھا۔ ایسے میں جذباتی مناظر دل و جگر پاش پاش کیے دیتے تھے، ان بدنصیب مسافروں کی لاشوں سے ان کے عزیز و اقارب لپٹ لپٹ کر اور دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔ چند ایک نے تو اپنے کسی پیارے کی لاش کو سمندر برد کرنے سے ہی انکار کر ڈالا تھا۔ وہ اس کی لاش کو انگلستان اور پھر وہاں سے دوبارہ واپس ہندوستان لا کر دفن کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر کپتان اور دیگر مسافروں کے سمجھانے پر کہ لاش کا اتنا عرصہ جہاز میں پڑے رہنا سب کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، لاش کے گلنے سڑنے کی صورت میں جہاز میں بیماریاں اور وبا پھوٹنے کا اندیشہ تھا۔ یوں بھی یہ سمندری قوانین کے منافی تھا۔ بڑی مشکل سے ایسے ضدی لوگوں کو سنبھالا گیا۔ غرضیکہ قیامت جیسی اس طوفانی رات کے گزر جانے کے بعد وائٹ فالکن کا سفر دوبارہ جاری ہو چکا تھا۔

کپتان کی ہدایت کے مطابق اس کی رفتار بڑھا دی گئی تھی۔ راستوں کا اب نئے سرے سے تعین کیا جا رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے مستولوں اور جہاز کے شکستہ گوشوں کی مرمت کی جانے لگی۔

یوں تھوڑی دیر بعد بہ ظاہر سب معمول پر آ گیا تھا، لیکن اس جانگاہ حادثے نے مسافروں کے دلوں میں بہت کچھ باور کرا دیا تھا کہ ایسے کڑے وقت میں کون کس کے ساتھ تھا اور کون نہیں۔

رہائشی کیبنوں کی ٹوٹ پھوٹ کے سبب اب ایمرجنسی کی صورتِ حال تھی، لہٰذا جن مسافروں کے کیبن ٹوٹ گئے تھے ان سب کو ایک بڑے سے ہال کیبن میں رہائش دے

دی گئی تھی۔ چنانچہ اب شطرنج کی اس بساط پر وہ چاروں مہرے بھی ساتھ تھے۔

سوبھنا، شفیق سے بے حد متاثر تھی، کیونکہ اس نے اس قیامت خیز طوفان والی رات میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچائی تھی، جبکہ اپنے محبوب رابرٹ کو اس نے غائب پایا تھا۔

اب چالاک لومڑ رابرٹ اسی سلسلے میں ایک کونا سنبھالے بیٹھا سوبھنا کو مکاری سے بہکا رہا تھا۔

”میں نے تمہیں سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔“ اس نے جھوٹ کہا۔ ”لیکن طوفان کا زور، تیز ہوائیں اور بپھری ہوئی موجیں جہاز کو تنکے کی طرح اچھال رہی تھیں۔ خود میں کیبن سے باہر جا گرا تھا۔“ وہ مکارانہ معصومیت سے بولا۔

”لیکن چوٹ لگنے اور بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے یاد ہے کہ ہم دونوں کیبن میں تھے۔“ سوبھنا نے اس کی طرف شاکی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”وہ نوجوان شفیق بھی تو آخر اپنی جان کی پروا کیے بغیر میرے کیبن تک آ پہنچا تھا اور مجھے——“

”اوہو —— سوبھنا ڈارلنگ! تم کتنی بھولی اور معصوم ہو مگر مجھ سے جانے کیوں اس قدر بدگمان رہتی ہو۔“ مکار لومڑ رابرٹ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اس وقت افراتفری کا عالم تھا۔ وہ نوجوان تمہاری جان بچانے کی نیت سے نہیں بلکہ محض اتفاقاً ہی گرتا پڑتا اس طرف نکل آیا تھا۔ ہر مسافر کی یہی حالت تھی۔ ہر کوئی اپنے کیبن سے دربدر ہو چکا تھا، ایسے میں اس نے ایک حسین لڑکی کو پڑے دیکھ لیا اور اسے اگر گھسیٹ کر یہاں تک لے آیا تو اس میں کارنامے کی کون سی بات ہے؟ خود میں بھی تمہیں تلاش کر رہا تھا۔“

پھر اس نے یونہی ادھر ادھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں اس کے کان میں کہا۔

”پگلی! دیکھو، وہ صندوق بھی غائب ہے، جس میں تمہارا زیور اور راج محل کے نوادرات رکھے تھے لیکن میں نے ان پر لعنت بھیج دی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ تم بچ گئیں۔“

شاطر رابرٹ کی اس بات نے سوبھنا کو واقعی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک بار پھر اس کی باتوں میں آنے لگی۔ محبوب کی یہی تو خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ دل اور من کو بھا جائے تو اس کی خامیوں پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔ سوبھنا کو بھی رابرٹ سے محبت تھی لیکن جب کبھی... اس کے دل میں رابرٹ کے متعلق کوئی غلط فہمی جنم لینے لگتی تو وہ اسے محبت کا نام دے کر سوبھنا کو بہلا لیتا تھا۔

لہٰذا سوبھنا نے دیکھا کہ واقعی وہ صندوق رابرٹ کے پاس نظر نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ عیار رابرٹ نے وقت اور حالات کی نزاکت بھانپتے ہی اس صندوقچے کو گودام میں لے جا کر چھپا دیا تھا۔

..... سوبھنا معصوم ہرنی کی طرح ایک بار پھر رابرٹ جیسے چالاک لومڑ کی باتوں میں آ گئی اور بے اختیار اس نے محبت سے رابرٹ کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

ادھر ہال کیبن کے ایک دوسرے کونے میں اپنے باپ اور دیگر لٹے پٹے مسافروں کے ساتھ بیٹھا شفیق اسی جانب دیکھ رہا تھا اور یہ بھی کہ کس طرح وہ عیار گورا رابرٹ، سوبھنا کو بہلانے میں مصروف تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سوبھنا اس کی باتوں میں آ گئی تھی اور اب رابرٹ سے مطمئن نظر آ رہی تھی۔

شفیق ایک سمجھ دار اور سلجھا ہوا نوجوان تھا مگر اس کا قصور یہ تھا کہ وہ سوبھنا کو دل دے بیٹھا تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ سوبھنا اس گورے نوجوان رابرٹ سے محبت کرتی ہے تو اس کے اپنے ضمیر نے بھی ملامت کی تھی۔ وہ ان کی محبت پر شب خون مار رہا تھا جس کا اسے کوئی حق نہیں تھا۔ یوں شفیق کو خود پر ہی ندامت محسوس ہوئی مگر اب جبکہ اس نے گزرتے وقت کے ساتھ یہ بات محسوس کی تھی کہ رابرٹ کا معاملۂ کاروبار اور تھا اور سوبھنا کا معاملۂ دل —— کچھ اور —— تو شفیق کھٹک گیا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ رابرٹ، سوبھنا کو بہکا رہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی فریب اور دغابازی کا کھیل کھیل رہا ہے۔

جبکہ چیتن کافی دیر سے سوبھنا کو گھورے جا رہا تھا۔ اسے پتھر کی لکیر کی طرح یقین ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ یہ لڑکی ناگرو کے آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کی لاڈلی بیٹی اور راجا پرتاب کمار کی سوتیلی بہن ہے، نیز اب تک اس نے اس بات کا بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ایک بنگالی نوجوان جس کا وہ نام بھی جان چکا تھا یعنی شفیق، سوبھنا میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود چیتن نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی، کیونکہ اسے ابھی خط والی بات نے پریشان کر رکھا تھا۔ جب سے اسے شوبھا کے دھوکے کے بارے میں اندازہ ہوا تھا تب سے اسے ایک تشویش آمیز بے کلی نے آن گھیرا تھا۔

اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ ان دونوں میاں بیوی (کیرتن اور شوبھا) نے ایک ڈراما رچا کر ”گیم“ کھیلا ہے۔ یہی نہیں، وہ اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل

کر چکے تھے۔ نیز اسے بڑی خوبصورتی سے الّو بنایا گیا تھا۔

اسے پہلے ان دونوں کی تلاش تھی مگر اسے حیرت تھی کہ وہ اسے ابھی تک نظر نہیں آئے تھے۔

جب اس نے کیرتن اور شوبھا کے بارے میں کپتان کنگ برڈ سے استفسار کیا تو اس نے ایک لسٹ نکالی جو اس کے نائب کپتان نے بنائی تھی۔ یہ لسٹ ان بدنصیب مسافروں کی تھی جو گزشتہ رات آنے والے خوفناک طوفان کی نذر ہو چکے تھے۔

یوں کیرتن اور شوبھا کی موت کا سن کر چیتن نے بے اختیار سکون کی سانس لی لیکن خط سے متعلق اس کی بے چینی اور پریشانی پھر بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

بہت غور و خوض کے بعد یہ سوچ کر، اگر اس نے وہ خط ملکۂ عالیہ کی خدمت میں پہنچا دیا اور اس کی عبارت تبدیل کر دی گئی ہو تو اس کا اپنا مقصد فوت ہو جائے گا اور کیرتن اور شوبھا جو خود اب فوت ہو گئے ہیں، وہ مرنے کے بعد بھی اپنے مقصد میں کامیاب رہیں گے، لہٰذا...... اس نے خط کھولنے کا ارادہ کر لیا اور جب اس نے خط کھول کر اس کی عبارت پڑھی تو دنگ رہ گیا۔

اس کا شک سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ خط نہ صرف کھولا گیا تھا بلکہ اس کی عبارت بھی کسی خاص قلم اور کیمیکل سے تبدیل کر دی گئی تھی۔

یہ تو چیتن شرما کو اس خط کی عبارت کے بارے میں معلوم ہی تھا کہ اس میں ناگرہ کے نئے راجا پرتاب کمار نے اپنے مشیرانِ خاص سے کس قسم کی عبارت تحریر کروائی تھی اور وہ کیا ہو سکتی تھی، مگر اب یہ نئی تبدیل شدہ عبارت کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔

چیتن کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ناگرہ کا نیا راجا پرتاب کمار کبھی بھی ایسا خط ملکۂ عالیہ کو نہیں بھجوا سکتا تھا نہ ہی لکھ سکتا تھا۔ یاد رہے کہ چیتن کو ابھی ناگرہ کے نئے حالات کے بارے میں بالکل بھی علم نہ تھا کہ اب نیا راجا پرتاب کمار دنیا میں نہیں رہا تھا اور اس کی جگہ اس کا سوتیلا بھائی ایش کمار اور اس کی ماں تجوبائی تخت نشین ہو چکے تھے۔

چیتن ذہن لڑانے میں محو رہا۔ اب تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہ ''مشکوک'' خط بکنگھم پیلس لے جاتا۔ خط پھاڑ دینے کی صورت میں پھر بھلا اس کا انگلستان جانے کا سفر رائیگاں چلا جاتا اور یوں وہ ناکام کس طرح واپس ناگرہ لوٹتا؟

اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ سرخروئی کا ایک نادر و نایاب موقع قسمت نے خود ہی تو اس کے سپرد کر ڈالا تھا اور وہ تھی سوجھا......

سارے حقائق اور حالات کا بہ غور تجزیہ کرتے کے بعد اس نے فی الفور ایک نیا منصوبہ بنا لیا۔ وہ اٹھا اور سیدھا سوجھا کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''میں آپ کو پہچان چکا ہوں راج کماری صاحبہ! آپ ناگرہ کے آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کی لاڈلی بیٹی سوجھا ہیں۔''

اس نے بے اختیار اور بلند آواز میں اس سے یہ کہا تو سوجھا جو اسے قریب آتا دیکھ کر ہی ایک بار پھر ہراساں سی ہو گئی تھی، یہ سن کر مزید سہم گئی اور رابرٹ کی طرف بے چارگی سے تکنے لگی، جیسے بہ زبانِ خاموشی اس سے کہہ رہی ہو کہ اب اس موذی سے تم ہی مجھے بچا سکتے ہو اور پھر ہوا بھی یہی۔

رابرٹ جو پہلے ہی اس دبلے پتلے چیتن شرما پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ غصے سے دانت پیس کر اپنی جگہ سے اٹھا اور جارحانہ انداز میں چیتن شرما کی طرف بڑھا۔ وہ ذرا بدکا۔

رابرٹ نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان دبوچ لیا اور غصے سے بولا۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم میری بیوی سے اس لہجے میں مخاطب ہونے کی کوشش کرو؟''

چیتن شرما بُری طرح بوکھلا گیا اور یہ سن کر چونک بھی گیا کہ یہ گورا نوجوان سوجھا کو اپنی بیوی کہہ رہا تھا لیکن اسے پھر بھی یقین نہیں آیا اور اپنی حیثیت بھی اسے یاد آ گئی۔

تب اس نے اپنے حواسوں پر قابو پایا اور ایک جھٹکے سے اپنا گریبان اس کے ہاتھ سے چھڑا کر تنک کر بولا۔

''تمیز سے بات کرو مسٹر...... تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں؟ ایک معزز سفیر ہوں میں......''

''تم کچھ بھی ہو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' رابرٹ بھی اس کے رعب میں آئے بغیر بدستور غصے سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''بس! آئندہ تم اپنے کام سے کام رکھو گے اور میری بیوی کو تنگ کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔''

مگر چیتن شرما اس کی تہدید کے باوجود باز نہ آیا اور اس نے رابرٹ کے چہرے سے نظریں ہٹا کر پاس کھڑی سوجھا کو گھور کر مخاطب کیا۔

''راج کماری صاحبہ! میں آپ کو اچھی طرح پہچان چکا ہوں، کیا یہ سچ کہہ رہا ہے کہ تم اس کی بیوی ہو؟''

سوجھا کوئی جواب نہ دے پائی البتہ چیتن کی اس ڈھٹائی پر اسے غصہ آ گیا اور اس نے ایک گھونسا تان کر چیتن شرما کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے کراہ خارج ہوئی اور وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔

شفیق ذرا فاصلے پر ایک کونے میں دیگر مسافروں کے ساتھ دیوار سے پشت لگائے بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرنے کی غرض سے بڑھا۔

چند ایک اور مسافر بھی درمیان میں آئے۔ شفیق نے رابرٹ کو دبوچ لیا جو ایک اور گھونسا رسید کرنے کے لیے چیتن شرما کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

''اے مسٹر اخود کو سنبھالو..... ہم ابھی ایک جانکاہ حادثے سے گزرے ہیں اور تم نے.....'' اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ رابرٹ غصے سے دانت بھینچ کر اس پر بھی پل پڑا۔ شفیق نے اپنا چہرہ اس کے گھونسے سے بچایا اور ایک ہاتھ اسے جڑ دیا پھر تو جیسے ان دونوں میں بھی ٹھن گئی۔

دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی وقت کپتان اپنے چند خلاصیوں کے ساتھ وہاں آن پہنچا اور دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کروایا۔ ساتھ ہی انہیں خبردار کیا کہ آئندہ انہوں نے جہاز میں دنگا فساد کرنے کی کوشش کی تو انہیں جہاز کے پولیس کے عملے کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ دھمکی کام کر گئی اور ہر کوئی اپنے اپنے کونے میں جا دبکا۔

یہ چاروں مہرے ایک مجبوری کی وجہ سے اب ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہی رہنے لگے تھے۔ وہیں انہوں نے اپنا سامان رکھ دیا تھا اور اپنے سونے کے لیے بستر بھی بچھا دیے تھے۔

شفیق نے بھی رابرٹ کے منہ سے یہ سن لیا تھا کہ سونجنا اس کی بیوی ہے۔ اسے یہ سن کر سخت مایوسی ہوئی تھی اور اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ البتہ سونجنا اب شفیق کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ لیتی تھی۔

چیتن شرما اڑیل تھا۔ وہ پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا اور نہ ہی اس نے رابرٹ کی اس بات پر یقین کیا تھا۔

تاہم اسے اب یقین ہو چکا تھا کہ یہ چالاک گورا نوجوان، یقیناً سونجنا کو ورغلا اور بہلا پھسلا کر انگلستان لے جا رہا تھا۔

چیتن شرما نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کپتان سے اس سلسلے میں ضرور بات کرے گا۔ اسے کپتان کنگ برڈ کی مدد کی ضرورت تھی۔ یوں وہ مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔

ادھر رابرٹ بھی کم فکرمند نہیں تھا۔ چیتن شرما کھل کر اس کے مقابلے پر آ گیا تھا بلکہ وہ اس کے پیچھے بھی لگ گیا تھا۔ تاہم اسے تسلی بھی تھی کہ اس نے چیتن کو بھی اچھا سبق سکھایا ہے اور اب وہ اس کے سامنے آنے کی دوبارہ جرأت نہیں کرے گا، مگر یہ اس کی خام خیالی تھی کیونکہ تھوڑی دیر بعد ہی اس نے چیتن شرما کو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔

''سونجنا.....!'' اس نے آہستگی سے قریب گم صم سی بیٹھی سونجنا کو مخاطب کیا۔ ''یہ آدمی چپکا بیٹھنے والا نہیں ہے۔ یہ کم بخت ضرور پیٹھ پیچھے ہمارے خلاف کچھ کرنے والا ہے لہٰذا مجھے اس پر نظر رکھنا ہوگی۔ تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور جس طرف چیتن گیا تھا وہ بھی اسی طرف کو ہو لیا۔

شفیق نے دیکھا سونجنا اب اکیلی بیٹھی ہے۔ اس کا باپ مقبول مٹھون رات کی نیند پوری کرنے کے لیے بستر پر دراز خراٹے لے رہا تھا۔ شفیق نے موقع دیکھ کر سونجنا کی جانب رخ کیا۔ دیگر مسافر بھی اونگھنے لگے تھے۔

''سونجنا.....!'' قریب آ کر اس نے ہولے سے اسے پکارا۔ سونجنا کے حسین چہرے پر الم نصیبی کی شام اتری ہوئی تھی۔ اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا میں تم سے تھوڑی سی بات چیت کر سکتا ہوں؟'' شفیق نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کی مسکراہٹ کی تہ میں اداسی کی رمق کروٹیں لے رہی تھی۔

''کیا بات کرنی ہے؟'' سونجنا نے اداس سی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ شفیق اس کے قریب فرش پر بیٹھا تو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی اور بولی۔

''دیکھو، تمہیں جو بات کہنی ہے جلدی سے کہہ دو۔ تم نے دیکھا ہے کہ رابرٹ کس قدر غصہ ور آدمی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں یہاں دیکھ کر وہ پھر مشتعل ہو جائے۔''

''مجھے صرف اتنا بتا دو سونجنا لیکن سچ سچ کہ کیا واقعی رابرٹ تمہارا شوہر ہے اور تم کیا واقعی اس کی بیوی ہو؟'' شفیق نے فوراً سوال کیا تھا۔

سونجنا نے بے تاثر سی نگاہوں سے شفیق کو دیکھا، اس کے نرم لبوں پر ہلکا سا ارتعاش اُمڈا، یوں جیسے وہاں سے لفظ پھسلنا چاہتے ہوں مگر نکلنے کی کوئی راہ نہ پا کر اندر گھٹ جاتے تھے۔ وہ ایسے ہی گھٹے گھٹے لہجے میں ہولے سے مختصراً بولی۔

''نہیں۔''

اس کے جواب پر شفیق کے شکستہ دل میں ایک بے نام سی امید نے سر ابھارا۔ وہ بولا۔ ''کیا تم واقعی کوئی راج کماری ہو.....؟''

سونجنا کے لیے اس سوال کا جواب دینا تکلیف دہ تھا کیونکہ رابرٹ نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے

بارے میں کسی کو کچھ بھی نہ بتائے۔

''میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی، اب بھگوان کے لیے تم چلے جاؤ ـــــ رابرٹ آ گیا تو......''

''تم اس سے اتنی خوف زدہ کیوں ہو سوبجنا؟'' شفیق نے تڑپ کر کہا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ اس شخص نے تمہیں اس طوفانی رات کو تنہا چھوڑ دیا تھا؟ یہ تو میرے دل میں اچانک تمہارا خیال ابھرا کہ تم جانے کس حال میں ہوگی اور میں نے تمہارے کیبن کا رخ کیا تو تم پانی میں نیم بے ہوشی کی حالت میں مجھے نظر آئی تھیں، تمہیں چوٹ بھی لگی ہوئی تھی، مجھے حیرت تھی کہ ایسے نازک وقت میں رابرٹ تمہیں چھوڑ کر......''

''تمہارا شکریہ کہ تم نے میری جان بچائی۔ بھگوان کے لیے اب تم چلے جاؤ۔'' سوبجنا نے اس کی بات کاٹ کر التجا آمیز لہجے میں کہا تو شفیق بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

دنیا میں کوئی بھی حیات جاوداں کا پروانہ لے کر نہیں آیا سبھی کو ایک دن یہاں سے رخصت ہونا ہی ہے کہ یہ دنیا ہی ناپائیدار اور فانی ہے لیکن اس کے باوجود انسان دنیا میں برسوں کا سامان کرتا ہے اور اپنے رہن سہن کے لیے بلند و بالا محلات بناتا ہے۔ قلعے تعمیر کرتا ہے، پل کا پتا نہیں ہوتا اور سکون غارت کر بیٹھتا ہے۔

راج محل کوہ ہمالیہ کی خوب صورت ترین عمارتوں میں سے ایک تھی لیکن اب ایک عرصے سے اس کا سکون اور امن غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ محلاتی سازشوں اور بیرونی شورشوں نے اس کی داخلی خوب صورتی گہنا دی تھی۔

جہاں تک معاملہ اغیار کے ساتھ جنگ کا ہوتا ہے تو بات اور ہوتی ہے لیکن جب معاملہ داخلی اور آپس کی سرد جنگ کا ہو تو اس کے نتائج نسبتاً زیادہ بھیانک نکلتے ہیں۔

راج محل کی اندرونی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ یہاں اب سگے رشتے داؤ پر لگنے والے تھے۔

ماں بیٹے کے درمیان چپقلش کو پرانے نمک خواروں اور بہی خواہوں نے چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن کب تک...... جلد ہی ریاست میں یہ خبریں گرم ہونے لگی تھیں کہ ماں بیٹے کے بیچ اختلافات کی خلیج حائل ہو گئی تھی۔

مہارانی مجو بائی کے دل و دماغ میں ابھی تک اپنے سگے بیٹے ایش کمار کی اشاروں کنایوں میں گفتگو گونج رہی تھی، جو اس نے اپنی ''گمشدہ'' بہن سوبجنا کے متعلق ماں سے کہی تھی۔

نجو بائی کبھی بھی جیتے جی اپنی لاڈلی بیٹی کو مردہ گردانے کو تیار نہ تھی۔ جبکہ ایش کمار ماں پر یہ اعلان کروانے پر زور دے رہا تھا کہ سوبجنا کسی حادثاتی موت کا شکار ہو کر کسی دریا میں ڈوب مری ہے یا پھر خونخوار درندے کی شکم سیری کی نذر ہو چکی ہے۔

ایش کمار کے مطابق، آخر سوبجنا کی اچانک گمشدگی کے متعلق کچھ تو ظاہر کرنا ہی پڑے گا ورنہ باتیں بنتی رہیں گی جو راج محل کے وقار اور اس کی شان و شوکت کے لیے مناسب نہیں تھیں۔

ایش کمار ایک مرد تھا اور خالص حکمرانی سوچ کا مالک تھا مگر مہارانی نجو بائی اپنے سینے میں ایک ممتا بھرا دل بھی رکھتی تھی۔ اس نے بیٹی کا مردہ چہرہ نہیں دیکھا تو وہ کیسے اسے مرا ہوا کہہ سکتی تھی؟

اقتدار کے سنگھاسن پر اب وہی براجمان تھی لیکن اقتدار کی سیاسی باگ راج کمار ایش کے ہاتھوں میں تھی۔ حکم مہارانی کا چلتا تھا مگر عمل کروانے کا اختیار ایش کمار کے پاس تھا۔ اسی سبب ماں بیٹے کے درمیان سرد جنگ کو مستقبل میں ایک بھیانک نتائج سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ بیٹے نے اپنے گرد اور ماں نے اپنے قریب ایسے خیر خواہوں اور جاں نثاروں کا ایک خفیہ ''گروہ'' بنا رکھا تھا۔

ایش کمار نے آتما شکلہ کو ہاتھ میں کر رکھا تھا جبکہ مہارانی نے سیناپتی موج سنگھ اور اپنے آنجہانی شوہر چندر گپتا کے مشیر خاص سترام داس کو اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا۔

اس اعتبار سے دیکھا جاتا تو نجو بائی کا پلڑا بیٹے کے مقابلے میں بھاری تھا۔ وہ ماں تھی اور ایک ماں کا دل اپنی اولاد کے لیے برابر دھڑکتا ہے۔ وہ بیٹے کے...... خلاف کوئی بھی ایسی کارروائی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی جس سے اسے کوئی نقصان ہوتا، مگر ایش کمار کا معاملہ کچھ اور تھا۔ اسے صرف راج محل کے وقار اور شان و شوکت کی فکر تھی اور اس کی خاطر وہ کسی بھی خونی رشتے کو تیاگ سکتا تھا۔

اگرچہ موج سنگھ اور سترام داس نے ایش کمار کو اس انداز سے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی اور بہ ظاہر ایش کمار نے یہ کہہ کر چپ سادھ لی تھی کہ اگر ماتا جی کو میرا مشورہ گراں گزرا ہے تو میں اس موضوع پر مزید کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا لیکن نجو بائی جانتی تھی کہ اس کے بیٹے کی ''خاموشی'' کوئی گل کھلانے کا سبب بننے والی ہے۔

یوں ماں بیٹے نے ایک دوسرے کے اندرونی عزائم جاننے کے لیے جاسوس بھی چھوڑ رکھے تھے۔

وہ رات کا درمیانی پہر تھا۔ راج محل میں خاموشی

طاری تھی۔ آسمان پر ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے اور دور ترائیوں میں..... جنگلات پر خنک سی تاریک فضا چھائی ہوئی تھی۔

ایش کمار اپنی خاص اقامت گاہ میں موجود تھا اور اس کے سامنے آتما شکلہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری تھی اور ایش کمار ہاتھ میں جام تھامے اسے سوچتی نظروں سے گھور رہا تھا پھر بولا۔

''آتما..... تم نے ایک عرصہ بنجورام کے ساتھ بتایا ہے، کیا تم نہیں جانتے اس کے لاغر وجود میں ایک اعلیٰ درجے کا دماغ بھی تھا، جو بڑے بڑے محلات کی دیواریں ہلا دیا کرتا تھا۔''

''بالکل چھوٹے راج صاحب مجھے معلوم ہے۔'' آتما شکلہ نے مودبانہ کہا۔

''تو پھر..... ؟ تم نے اب تک اس نامراد سے کیا سیکھا ہے؟''

ایش کمار کی بات پر آتما شکلہ کچھ بوکھلایا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا، اگلے ہی لمحے سنبھل کر بولا۔

''بے شک چھوٹے راج صاحب! بنجورام عرف بچھورام بڑے اعلیٰ دماغ کا مالک تھا۔ اس کی صحبت میں رہتے ہوئے میں نے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ نے مجھ پر اسی کے برتے پر اتنا وشواس کیا ہے تو بھلا میں آپ کو نراش کیسے کر سکتا ہوں۔''

''ہم نراش ہی نہیں ہو رہے بلکہ اب اپنی ہی آگ میں جلنے بھی لگے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ایش کمار اپنی آرام دہ نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم سب جانتے ہو آتما کہ ہماری ماں اور بہن نے راج محل کی عزت اور ناموس کی دھجیاں بکھیرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ بولو..... کیا نہیں جانتے تم یا ہم تمہیں اپنی ہی زبان سے اپنی ماں مریادا اور غیرت کا جنازہ نکالنے کی کتھا سنائیں؟''

''بالکل نہیں چھوٹے راج! بالکل نہیں۔'' آتما شکلہ ایک دم بولا۔ اس نے دیکھا کہ ایش کمار کا چہرہ اس وقت الاؤ کی طرح بھڑک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی آگ کی چتا روشن تھی جو اندر ہی اندر سلگتی ہے اور پھر کھا جاتی ہے۔

''ہم نے اسی لیے اپنے دل و دماغ سے ماں اور بہن کی حیثیت اور وقعت کسی گندے اور پاپی ناسور کی طرح نوچ کر پھینک ڈالی ہے۔'' ایش کمار کا لہجہ جلتی ہوئی چتا کی طرح سلگ رہا تھا، یہی کچھ اس کے چہرے سے بھی ہویدا ہوتا تھا۔

''اوش..... چھوٹے راج! اوش.....!''

''بس! سوجھنا اور بجھائی آج کے بعد ہمارے لیے مر چکیں۔'' ایش کمار یہ کہتا ہوا دوبارہ اپنی نشست پر براجمان ہو گیا اور سامنے رکھی منقش تپائی سے جام کی صراحی سے آپ ارغواں اپنے بلوریں پیمانے میں انڈیلا۔

''اس سے پہلے کہ ماتا جی (بجھائی) سوجھنا کو تلاش کر کے اس بدبخت کو دوبارہ راج محل کی پوتر تا کو نشٹ کرنے کا کارن بنیں، انہیں ہلاک کر دیا جائے۔''

ایک گھونٹ بھرنے کے بعد ایش کمار نے غیظ آلود آواز میں آتما شکلہ کی.. طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا چھوٹے راج صاحب! آپ اس کی چنتا بالکل نہ کریں۔'' آتما شکلہ فوراً بولا۔ ''میں نے کھوج لگایا ہے، سوجھنا اب ہندوستان کی دھرتی پر نہیں ہے۔ وہ اس گورے رابرٹ کے ساتھ وائٹ فالکن نامی بحری جہاز میں انگلستان روانہ ہو چکی ہے۔''

''یہ خبر تم ہمیں سنا چکے ہو آتما شکلہ!'' ایش کمار بولا۔ ''لیکن یہ خبر اس وقت تک ہمارے لیے اہم تھی جب تک ماتا جی کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ بات یہاں تک بھی رہتی تو ہمارے دل کی اگنی پت کسی حد تک شانت رہتی، پر تو اگھور تو

رئیل اسٹیٹ ایڈوائزر
DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI
پلاٹ، مکان، دکان، بنگلوز اور فلیٹ
کی خرید و فروخت کے لیے مستند نام
ریاض حسین
ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
فون نمبر: 0300-3658964

یہ ہے کہ ماتا جی نے سوجنا کی کھوجنا کے لیے آدمی تک روانہ کر رکھے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں وہ سوجنا کو کھوج کر دوبارہ یہاں نہ لے آئیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم ریاست میں تو کیا پورے کوہ شالیہ میں سر اٹھانے لائق نہیں رہیں گے اور خود کو تیاگ دیں گے۔''

آتما شکلہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ سب کہتے ہوئے ایش کمار کا پورا جسم غیظ..... میں بھڑکتی آگ سے تپنے لگا تھا، وہ ترنت بولا۔

''چھوٹے راج! آپ اس کی بھی کوئی چنتا نہ کریں، اگر ایسا ہو بھی گیا تو سوجنا کو راج محل میں تو کیا ریاست میں بھی قدم نہیں رکھنے دیا جائے گا، ہندوستان کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی اسے اسی طرح گمنامی میں موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔ میں نے اس سلسلے میں بمبئی کے ایک بڑے بدمعاش جوگندر دھمالیہ سے بات کر رکھی ہے۔''

اس کی بات پر پہلی بار ایش کمار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ تسلی آمیز تشفی کے تاثرات ابھرے تھے۔ ''چھوٹے راج'' کو کچھ قرار میں پا کر آتما شکلہ نے ترنت دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔ بولا۔

''چھوٹے راج! اب آپ اصل بات کی چنتا کریں۔ ناگرہ پر مہارانی کا راج سراسر آپ کے مفاد میں نہیں رہا ہے۔ یہ راج تو مہارانی نجو بائی کو سمجھو تو بڑے راج کمار کی موت کے بعد تحفے میں ملا ہے۔ سینا پتی اور ستر ام داس ان کی وفاداری کا دم بھر چکے ہیں۔''

''تم ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' ایش کمار نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اس کے لیے ہمیں فرنگیوں سے میل ملاپ درکار ہو گا۔ بات بارہ آنے کی کروں گا چھوٹے راج.....! پورے ہندوستان پر فرنگیوں کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے کئی ریاستیں ان کے دم سے قائم ہیں۔ جنہوں نے بغاوت کی انہیں مٹا دیا گیا۔ گورا سرکار کی حمایت کے بنا راج واڑ نہیں چل سکتا۔ یہ فرنگی نچلے بیٹھنے والے نہیں ہوتے، ایک جنگ تو ہار گئے وہ پھر..... اب بھی اسے اپنی شکست نہیں سمجھتے، ناکامی کا نام ضرور دیتے ہیں۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ حملہ کریں ان سے اپنا تعلق قائم کر لیا جائے۔''

''آتما! کھل کر کہو، ہم تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ رہے ہیں۔'' ایش کمار نے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بارہ آنے سیدھی بات ہے چھوٹے راج! مہارانی، آنجہانی راجا پرتاب کمار کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں، یعنی گورا سرکار سے بغاوت کی ریت پر گامزن ہیں جو یقیناً غلط ہے۔ وہ پالن پور اور تریپال سے اتحاد کو اسی طرح قائم رکھنا چاہتی ہیں، جبکہ آپ کے سورگ باشی پتا مہاراجا چندر گپتا اس پالیسی کے خلاف تھے، وہ دور اندیش انسان تھے، گورا سرکار کی وفاداری کا دم بھرتے تھے مگر افسوس کہ ان کے اچانک دیہانت نے ساری بازی پلٹ دی۔ پرتاب کمار کے دور حکمرانی میں گورا سرکار ہم سے ناراض اور ناراض ہو گئے اور سورگ باش چندر گپتا جی کا پورے کوہ شالیہ میں حکومت کرنے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ ظاہر ہے وہ خود ہی نہ رہے تو خواب کیسے، پر ستو ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں چھوٹے راج! آپ اگر اسی پالیسی پر دوبارہ گامزن ہو جائیں تو نہ صرف یہ کہ ناگرہ بلکہ کوہ شالیہ کی دیگر بڑی ریاستوں پالن پور اور تریپال پر بھی آپ کا راج قائم ہو سکتا ہے۔ گورا سرکار آپ کی پوری مدد کرے گی، آپ کو مہاراجا کے سرکاری لقب سے بھی نواز دے گی۔''

اس کی بات پر ایش کمار کی آنکھیں یک دم چمکنے لگیں اور وہ اسی جوش مسرت تلے ایک بار پھر اپنی نشست سے اٹھا اور آتما شکلہ کے قریب آ کر بولا۔

''آتما! اگر تم نے اس راستے کو دوبارہ بحال اور آسان کر دیا تو تم راج محل کے ہی نہیں بلکہ ریاست اور پورے کوہ شالیہ کے اَن داتا جیسے عہدے کے لیے تیار رہو۔''

''رام..... رام..... چھوٹے راج صاحب! چھوٹا منہ بڑی بات۔ ہمری اتنی اوقات کہاں، ان داتا تو آپ ہی ہوں گے، صرف ناگرہ کے نہیں بلکہ کوہ شالیہ کے۔'' آتما شکلہ اندر سے خوش ہو کر بظاہر ہاتھ جوڑ کر مکارانہ فروتنی سے بولا۔

''ان داتا کے خیر خواہ کو ہم ایسے ہی منصب سے نوازیں گے آتما! ہمارے کہنے کا مطلب یہی تھا، لیکن یہ تو بتاؤ یہ سب ہو گا کس طرح.....؟'' ایش کمار آخر میں بولا تو آتما شکلہ نے چمکتی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''چھوٹے راج! دیکھتے جاؤ میں کرتا کیا ہوں، بچھو رام نے میری بھی رسائی شیورائے بھولکر سے کرا رکھی تھی۔ وہی ہمارے کام آئے گا، بس ایک ذرا آپ کے پیغام لکھنے کی دیری ہے، وہ لکھ دیجیے اور میں چلا دلی.....''

ایش کمار اسی وقت خط لکھنے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

مہارانی نجو بائی کو سینا پتی راج سنگھ بتا رہا تھا۔

''مہارانی جی! انگلستان میں مقیم ہمارے ایک خصوصی نمائندے اشوک کھٹپال کو گورا سرکار کی وفاداری سے متعلق

ریاست کی طرف سے خیر سگالی کے جذبات پہنچائے جا چکے ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب ملکۂ عالیہ اپنی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریب میں دیگر مہاراجوں اور مہارانیوں کو بکنگھم پیلس آنے کا دعوت نامہ بھیجنے والی ہیں۔"

اس کی بات سن کر مہارانی تجو بائی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ چہرہ جوشِ مسرت سے سرخ ہو گیا۔

اس نے اب سفید ساڑی اتار پھینکی تھی، وہ اس وقت جھلملاتی ہوئی سنہری ساڑی پہنے ہوئے تھی اور اپنے کمرائے خاص میں ایک جگہ موجود جھولا نما آرام دہ نشست پر شاہانہ تمکنت کے ساتھ کشن سے پہلو لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی کلائیوں میں چوڑیاں، سر پر چھوٹا تاج تھا، جس میں ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔ دیواروں پر گلابی رنگ کی شمعیں روشن تھیں۔

"کیا تم صحیح کہہ رہے ہو سوج سنگھ؟"

سوج سنگھ نے سر کو ہلکے سے خم کر کے مؤدبانہ کہا۔ "میری ایسی جرأت کہ مہارانی صاحبہ کو غلط اطلاع دوں۔"

"اشوک کھنپال کی حیثیت واضح کرو۔" مہارانی کے لہجے میں تحکم تھا۔ "سورگ باش چندر گپتا نے اپنی راج گدی کے کچھ عرصے بعد لارڈ ڈلہیرسن اور وائسرائے ہند کی ہدایت اور مشورے پر اپنا ایک آدمی لندن روانہ کر دیا تھا۔"

سوج سنگھ مؤدبانہ انداز میں بتانے لگا اور آگے بولا۔ "اپنے دیوان جی شیو رائے بھولکر کا بہنوئی اشوک کھنپال ایک زیرک انسان ہے۔ بہ ظاہر وہ سفیر اور ایک خصوصی نمائندے کی حیثیت سے ہی لندن بھیجا گیا تھا مگر در پردہ وہ ایک خفیہ سیاسی ایجنٹ کی بھی حیثیت رکھتا ہے اور اسٹاف آفیسر کی بھی......"

"اوہ......" مہارانی نے دلکش انداز میں اپنے بھرے بھرے گداز لبوں کو دائرے کی صورت میں سکیڑا... پھر کچھ سوچ کر اول الذکر گفتگو کے حوالے سے بولی۔

"لیکن ضروری تو نہیں کہ ہمیں بھی ملکۂ عالیہ کی جانب سے دعوت نامہ موصول ہو؟" تجو بائی کا جوش کچھ مبہم سا ہو گیا۔

"اشوک کھنپال پھر کس کھیت کی مولی ہے۔ وہ آپ کے لیے خود دعوت نامہ حاصل کرے گا۔"

"نہیں۔" مہارانی تجو بائی ایک دم بولی۔ اس کی آواز میں تھوڑی سی تمکنت عود کر آئی۔ "مانگے کی دعوت میں ہمارا جانا توہین ہے۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم ناگرہ کی مہارانی کو مانگے تانگے کے دعوت نامے پر اصرار کرو۔" مہارانی تنک کر بولی۔

سوج سنگھ گھبرا گیا، جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ "مم...... میرا یہ مطلب نہیں تھا مہارانی صاحبہ! اب ملکۂ عالیہ

"سردیاں"

ایک آدمی موٹے کپڑے پہن کر گرمیوں میں باہر کھڑا تھا۔ ایک شخص نے اس سے پوچھا...."آپ نے اتنی گرمی میں یہ موٹے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟"

پہلے آدمی نے کہا۔ "ہمیں دعوت پر جانا ہے اور جب تک میری بیوی تیار ہو کر باہر آئے گی تب تک سردیاں آجائیں گی۔"

☆☆☆

"سسٹر"

نسیم جس اسپتال میں ڈاکٹر ہے، وہیں اس کی بیوی نرس ہے اور یہ کیسا ظلم سہنا پڑ رہا ہے اسے کہ اپنی ہی بیوی کو سسٹر کہنا پڑ رہا ہے۔

☆☆☆

مرسلہ: وزیر محمد خان، جبل ہزارہ

کو تو معلوم ہونا ہی چاہیے نا کہ ہندوستان کی معتبر ریاستوں میں ناگرہ کس درجے پر ہے اور یہاں معاملات کیا ہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ آنجہانی راجا پرتاب کمار نے کسی چیتن شرما نام کے آدمی کو کوئی خط دے کر بھی انگلستان روانہ کیا ہے؟ اس کا کیا بنا؟" مہارانی تجو بائی نے مکاری سے بات پلٹ دی۔

سوج سنگھ کو اس نے یونہی اپنا غرور دکھانے کے لیے جھڑکا تھا، ورنہ تو وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ملکۂ عالیہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی شان دار تقریب کا اسے بھی دعوت نامہ ملے، خواہ مانگے کا ہی سہی۔

"وہ ابھی انگلستان نہیں پہنچا، اگرچہ اسے بمبئی سے روانہ ہوئے کئی روز بیت چلے ہیں۔" سوج سنگھ نے مؤدبانہ کہا۔

مہارانی کچھ سوچنے لگی اس کے بعد اس سے کہا۔ "تم جاؤ اور ابھی جو کچھ تم نے کہا ہے اس پر عمل کر کے کل تک مجھے بتاؤ...... کیونکہ انگلستان جانا ہمارے لیے ویسے بھی ضروری ہے۔ اور ہاں، سترام داس کو ذرا یہاں بھیج دینا۔"

"بہت بہتر مہارانی صاحبہ!" یہ کہتے ہوئے سوج سنگھ نے تعظیم پیش کی اور پلٹ گیا۔

ایش کمار کی طرح مہارانی تجو بائی کے بھی علم میں یہ بات آچکی تھی کہ مختلف خفیہ ذرائع سے حاصل ہونے والی

ریاست کی طرف سے خیرسگالی کے جذبات پہنچائے جا چکے ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب ملکۂ عالیہ اپنی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریب میں دیگر مہاراجوں اور مہارانیوں کو بکنگھم پیلس آنے کا دعوت نامہ بھیجنے والی ہیں۔''

اس کی بات سن کر مہارانی مجوبائی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ چہرہ جوشِ مسرت سے سرخ ہو گیا۔

اس نے اب سفید ساڑی اتار پھینکی تھی، وہ اس وقت جھلماتی ہوئی سنہری ساڑی پہنے ہوئے تھی اور اپنے کمرائے خاص میں ایک جگہ موجود جھولا نما آرام دہ نشست پر شاہانہ تمکنت کے ساتھ کشن سے پہلو لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی کلائیوں میں چوڑیاں، سر پر چھوٹا تاج تھا جس میں ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔ دیواروں پر گلابی رنگ کی شمعیں روشن تھیں۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو موج سنگھ؟''

موج سنگھ نے سر کو ہلکے سے خم کر کے مؤدبانہ کہا۔ ''میری ایسی جرأت کہ مہارانی صاحبہ کو غلط اطلاع دوں۔''

''اشوک کھنپال کی حیثیت واضح کرو۔'' مہارانی کے لہجے میں حکم تھا۔ ''سورگ باش چندر گپتا نے اپنی راج گدی کے کچھ عرصے بعد لارڈ ڈلہیرسن اور وائسرائے ہند کی ہدایت اور مشورے پر اپنا ایک آدمی لندن روانہ کر دیا تھا۔''

موج سنگھ مؤدبانہ انداز میں بتانے لگا اور آگے بولا۔ ''اپنے دیوان جی شیو رائے بھولکر کا بھتیجا اشوک کھنپال ایک زیرک انسان ہے۔ بظاہر وہ سفیر اور ایک خصوصی نمائندے کی حیثیت سے ہی لندن بھیجا گیا تھا مگر درپردہ وہ ایک خفیہ سیاسی ایجنٹ کی بھی حیثیت رکھتا ہے اور اسٹاف آفیسر کی بھی...''

''اوہ...'' مہارانی نے دلکش انداز میں اپنے بھرے بھرے گداز لبوں کو دائرے کی صورت میں سکیڑا... پھر کچھ سوچ کر اول الذکر گفتگو کے حوالے سے بولی۔

''لیکن ضروری تو نہیں کہ ہمیں بھی ملکۂ عالیہ کی جانب سے دعوت نامہ موصول ہو؟'' مجوبائی کا جوش کچھ مبہم سا ہو گیا۔

''اشوک کھنپال پھر کس کھیت کی مولی ہے۔ وہ آپ کے لیے خود دعوت نامہ حاصل کرے گا۔''

''نہیں۔'' مہارانی مجوبائی ایک دم بولی۔ اس کی آواز میں تھوڑی سی نخوت عود کر آئی۔ ''مانگے کی دعوت میں ہمارا جانا توہین ہے۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم ناگرہ کی مہارانی کو مانگے تانگے کے دعوت نامے پر اصرار کرو۔'' مہارانی تنک کر بولی۔

موج سنگھ گھبرا گیا، جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ ''مم... میرا یہ مطلب نہیں تھا مہارانی صاحبہ! اب ملکۂ عالیہ کو تو معلوم ہونا ہی چاہیے ناکہ ہندوستان کی معتبر ریاستوں میں ناگرہ کس درجے پر ہے اور یہاں معاملات کیا ہیں۔''

''میں نے سنا ہے کہ آنجہانی راجا پرتاب کمار نے کسی چیتن شرما نام کے آدمی کو کوئی خط دے کر بھی انگلستان روانہ کیا ہے؟ اس کا کیا بنا؟'' مہارانی مجوبائی نے مکاری سے بات پلٹ دی۔

موج سنگھ کو اس نے یونہی اپنا غرور دکھانے کے لیے جھڑکا تھا، ورنہ تو وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ملکۂ عالیہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی شان دار تقریب کا اسے بھی دعوت نامہ ملے، خواہ مانگے کا ہی سہی۔

''وہ ابھی انگلستان نہیں پہنچا، اگرچہ اسے بمبئی سے روانہ ہوئے کئی روز بیت چلے ہیں۔'' موج سنگھ نے مؤدبانہ کہا۔

مہارانی کچھ سوچنے لگی اس کے بعد اس سے کہا۔ ''تم جاؤ اور ابھی جو کچھ تم نے کہا ہے اس پر عمل کر کے کل تک مجھے بتاؤ... کیونکہ انگلستان جانا ہمارے لیے دیسے بھی ضروری ہے۔ اور ہاں، ستر ام داس کو ذرا یہاں بھیج دینا۔''

''بہت بہتر مہارانی صاحبہ!'' یہ کہتے ہوئے موج سنگھ نے تعظیم پیش کی اور پلٹ گیا۔

ایش کمار کی طرح مہارانی مجوبائی کے بھی علم میں یہ بات آچکی تھی کہ مختلف خفیہ ذرائع سے حاصل ہونے والی

''سردیاں''

ایک آدمی موٹے کپڑے پہن کر گرمیوں میں باہر کھڑا تھا۔ ایک شخص نے اس سے پوچھا... ''آپ نے اتنی گرمی میں یہ موٹے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟''

پہلے آدمی نے کہا۔ ''ہمیں دعوت پر جانا ہے اور جب تک میری بیوی تیار ہو کر باہر آئے گی تب تک سردیاں آجائیں گی۔''

☆☆☆

''سسٹر''

نسیم جس اسپتال میں ڈاکٹر ہے، وہیں اس کی بیوی نرس ہے اور یہ کیسا ظلم سہنا پڑ رہا ہے اسے کہ اپنی ہی بیوی کو سسٹر کہنا پڑ رہا ہے۔

☆☆☆

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

Urdu Novels

معلومات کے مطابق وہ گورا نوجوان رابرٹ، اس کی لاڈلی بچی سوجھنا کو اپنے ساتھ انگلستان بھگا کر لے جا چکا ہے۔ لہٰذا وہ اس لیے بھی وہاں جانے کی شدت سے خواہشمند تھی۔

تھوڑی دیر بعد مشیر خاص ستر ام داس اجازت طلب کر کے اندر داخل ہوا۔ تعظیم پیش کرنے کے بعد وہ ہاتھ باندھے مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

مہارانی مجھ بائی پہلے تو اس کی جانب گھورتی رہی۔ وہ اپنی شاہانہ نشست کے قریب ہی کھڑی تھی۔ وہ جب اپنے گوشۂ خاص میں ہوتی تو اپنے مصاحبین سے اسی طرح کھڑے ہو کر بات کرتی تھی۔

''ستر ام داس!'' چند ثانیے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اسے مخاطب کر کے بولی۔

''جی مہارانی صاحبہ! میں سن رہا ہوں......'' مشیر خاص نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''تم سورگ باش مہاراجا چندر گپتا کے مشیر خاص چلے آرہے ہو، اس کے بعد راجا پرتاب کمار کے رہے، اب تم میرے مشیر ہو۔'' مہارانی مجھ بائی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے مہارانی صاحبہ!'' ستر ام داس نے اسی طرح مؤدبانہ انداز میں کہا۔ وہ مختصر جواب دینے کا عادی تھا۔

''ستر ام داس! اسی سبب تم ہمارے نہ صرف ذاتی معاملات و حالات سے واقف ہو بلکہ تم ہی وہ واحد شخص ہو جنہیں میں نے اس بات کا بھی اختیار دے رکھا ہے کہ ہم اپنے ذاتی معاملات میں تم سے صلح و مشورہ کرتے رہیں۔''

مہارانی کی اس بات پر ستر ام داس نے تعظیماً اس بار صرف اپنے سر کو ہلکا سا خم دینے پر اکتفا کیا تھا۔ مہارانی مجھ بائی نے ایک ذرا توقف کرتے ہوئے گہری سانس لی اور آگے بولی۔

''اِنش کمار ہمارا بیٹا ہے۔ ہم اس کے لیے کبھی برا نہیں سوچ سکتے لیکن وہ ابھی نادان ہے اور سوجھنا والے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا ہے، لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ اپنی بہن سے متعلق اس کے جذبات میں کسی خونی رشتے کی محبت کا دخل نہیں رہا ہے۔ وہ روایتی مردوں کی سی سوچ رکھتا ہے اور اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں جب سے یہ کہا ہے کہ ہمیں اپنی عزت اور وقار کی خاطر سوجھنا کو حادثاتی طور پر مردہ قرار دینا ہوگا، ہمارا دل بہت دکھا ہے۔ بھلا ایک ماں اپنے لخت جگر کو جیتے جی کیسے مردہ تصور کرلے؟''

اتنا کہہ کر مہارانی کا لہجہ رندھنے لگا تھا، لیکن چونکہ بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے فوراً سنبھالا لینے کی کوشش کی یوں اس دوران میں ستر ام داس نے پھر مختصر الفاظ کا سہارا لیا اور بولا۔

''مہارانی صاحبہ! آپ بالکل درست فرما رہی ہیں۔''

''ستر ام داس! ہم بس تم سے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ تم اِنش کمار پر نگاہ رکھو گے اور ہمیں اس کے روز و شب سے آگاہ کرتے رہو گے۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں وہ جوش غیرت اور طیش و نادانی میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے جو اس کے ساتھ ساتھ ہم سب کے لیے کسی مصیبت کا سبب بن جائے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔''

''دوسری بات یہ کہ اس خبر کی مصدقہ ذرائع سے تصدیق ہو چکی ہے کہ وہ مردود ونامراد گورا نوجوان رابرٹ ...... ہماری معصوم سوجھنا کو بہلا پھسلا کر بحری جہاز کے ذریعے انگلستان روانہ ہو چکا ہے۔''

''مجھے افسوس ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ چند روز بعد ہمیں ملکۂ عالیہ کی ڈائمنڈ جوبلی تقریب میں شرکت کے لیے لندن کا رخ کرنا پڑے، تو دیگر ملازمین کے علاوہ تم ہمارے ساتھ...... ہو گے، وفد کے ملازمین کا انتخاب تم کرو گے۔ موقع نکال کر ہم وہاں ملکۂ عالیہ کے سامنے سوجھنا والا معاملہ کس طرح رکھیں۔ اس کی ترتیب و تجویز تم ہی نے تیار کرنا ہے۔''

''بہت بہتر مہارانی صاحبہ!'' کہتے ہوئے ستر ام داس تھوڑی دیر تک... خاموشی سے مہارانی کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر جانے کی اجازت چاہی اور اثبات میں جواب ملتے ہی چلا گیا۔

☆☆☆

وہ مایوس مایوس سا واپس لوٹ گیا اور اپنی جگہ پر آن بیٹھا لیکن پھر جانے کیا سوچ کر وہ اٹھا اور...... ہال کیبن کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

سوجھنا کو اس نوجوان شفیق کے دلی جذبات کا اندازہ ہونے لگا تھا، وہ اس کے اپنی جانب مائل ہونے کو سمجھنے لگی تھی لیکن اس کی حوصلہ افزائی کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی، حتیٰ کہ وہ اس کا شکریہ ادا بھی نہیں کر سکی تھی۔

''یہ مجھے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟ یہ مجھ سے دور کیوں نہیں ہو جاتا؟ کیوں میری راہ تکنے کی کوشش کرتا ہے؟'' وہ دکھی دل کے ساتھ خود سے باتیں کرنے لگی۔

اس نے بس لمحے بھر کے لیے شفیق کے بارے میں سوچا تھا اور پھر خالی الذہنی کی حالت میں بیٹھی رہی۔

چیتن شرما اس وقت کپتان کنگ برڈ کے کیبن میں موجود

تھا۔ وہ مہاراجا کے سفیر کی حیثیت سے نہ صرف اپنا تعارف کروا چکا تھا بلکہ اس نے بکنگھم پیلس تک اپنی رسائی کے بارے میں بھی کپتان کو بتادیا تھا جس سب کنگ برڈ اس سے خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔

''مسٹر کنگ برڈ! یہ آپ کی ذمے داری ہے کہ میں نے آپ کو سونجنا سے متعلق جو حقیقت بتائی ہے آپ بھی اس سلسلے میں میری مدد کریں۔''

سونجنا سے متعلق سب کچھ بتانے کے بعد چیتن شرما نے کنگ برڈ سے کہا۔

''مسٹر چیتن! آپ بالکل فکر نہ کریں، میں اور میرا عملہ آپ کی بھرپور مدد کرے گا، لیکن اس کے لیے سونجنا کا آپ سے قائل ہونا ضروری ہوگا۔''

''آپ اس کی فکر نہ کریں مسٹر کنگ برڈ!'' چیتن شرما بولا۔ ''وہ نابالغ اور ناسمجھ ہے۔ رابرٹ اسے بہلا پھسلا کر انگلستان لے جارہا ہے۔ دیکھیے، سونجنا کوئی معمولی یا عام لڑکی نہیں ہے، ایک راجکماری ہے اور جس ریاست سے اس کا تعلق ہے میں خود وہاں کا سفیر ہی نہیں بلکہ ایک سیاسی ایجنٹ بھی ہوں اور اس وقت بھی میں وہاں کے راجا پرتاب کمار کا ایک اہم خط لے کر لندن جارہا ہوں۔ بکنگھم پیلس میں میری ملکۂ عالیہ.... سے ملاقات طے شدہ ہے۔''

آخری الفاظ اس نے کپتان کو خاص طور پر مرعوب کرنے کے لیے کہے تھے، اگرچہ ابھی چیتن کو معلوم نہ تھا کہ راج محل کی سیاسی فضا بدل چکی تھی اور راجا پرتاب کمار کا ایک شکاری مہم کے دوران حادثاتی طور پر انتقال ہو چکا تھا۔

بہرکیف..... اس نے یہ کہتے ہوئے وہ سربمہر خط نکال کر کنگ برڈ کو دکھادیا جس پر ریاست ناگرہ کے ٹپاخانے کی شاہی مہر ثبت تھی۔

کپتان کنگ برڈ واقعی اس سے متاثر ہوا اور اس نے چیتن شرما کو اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کراتے ہوئے اس سے تھوڑی سی مہلت مانگی اور نہایت اخلاق سے بولا۔

''آپ اس کی فکر نہ کریں مسٹر چیتن شرما! ہمارے جہاز کو انگلستان پہنچنے میں ابھی چند دن باقی ہیں۔ پھر آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ طوفانی حادثے سے ہمارا جہاز بھی متاثر ہوا ہے اور آپ سمیت کئی مسافروں کو رہائش سے متعلق پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ میں ذرا ان معاملات سے نمٹ لوں اس کے بعد رابرٹ اور سونجنا کو میں خود اپنے کیبن میں طلب کرکے بازپرس کروں گا۔''

''شکریہ کیپٹن!'' چیتن شرما ممنونیت سے بولا۔ ''زیادہ بہتر ہوگا کہ آپ جلد یہ اہم کام نمٹا دیجیے اور مزید یہ کہ مجھے بھی اسی وقت طلب کر لیجیے گا تاکہ رابرٹ یا سونجنا آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہ لے سکیں۔''

کیپٹن کنگ برڈ کو چیتن کی یہ بات مناسب نہیں لگی لہٰذا اپنی ناراضی دباتے ہوئے مگر سنجیدگی سے بولا۔

''میں اپنا کام بہتر طور پر کرنا جانتا ہوں مسٹر چیتن شرما! پہلے میں ان دونوں سے خود بات کروں گا اس کے بعد ہی آپ کو بلواؤں گا، آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں جہاز کے دوران سفر ایسے معاملات کو حل کرنے کے قانونی طریقوں سے بہ خوبی واقف ہوں۔''

چیتن شرما اس کا شکریہ ادا کرکے واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

چیتن شرما کپتان کے کیبن سے نکلتے وقت.... اس چالاک لومڑ رابرٹ کو نہیں دیکھ سکا تھا، جو کافی دیر سے کیبن کے دروازے پر کھڑا کان لگائے ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ اس کے تعاقب میں چلا تھا تو اسے کپتان کے کیبن کی طرف جاتا دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

لہٰذا جیسے ہی چیتن شرما کنگ برڈ سے بات کرکے باہر نکلا، رابرٹ ایک طرف کو سرک گیا تھا۔

وہ اب ہونٹ بھینچے سوچ رہا تھا کہ چیتن شرما اس کے لیے آگے چل کر بھی بہت مسائل کھڑے کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی انگلستان ہی جارہا تھا اور نہ صرف یہ کہ وہ کوئی عام آدمی نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت ریاست ناگرہ کے ایک سفیر کی سی تھی۔

یہ قول اس کے اس نے اپنے تعارف میں کپتان سے کہا تھا کہ وہ مذکورہ ریاست کا سفیر ہی نہیں بلکہ ایک سیاسی ایجنٹ بھی تھا۔

لیکن چیتن شرما کے ایک جھوٹ پر رابرٹ اندر سے تلملا اٹھا تھا کہ اس نے سونجنا کو نابالغ قرار دیا تھا، یہ ایک ایسا قانونی پوائنٹ تھا جو رابرٹ کے خلاف جاتا تھا۔

رابرٹ تھوڑی دیر وہیں کھڑا چند ثانیے.... تذبذب میں مبتلا رہا کہ وہ اسی وقت کیبن میں داخل ہو کر خود ہی کپتان کنگ برڈ سے اس موضوع پر گفتگو کرلے لیکن پھر یہ سوچ کر جب کپتان خود اسے بلائے گا یا ملے گا تو تب ہی اس سے بات کرنا زیادہ مناسب رہے گا، لہٰذا یہ سوچ کر وہ اسی خاموشی سے واپس مڑ گیا۔

رابرٹ واپس ہال کیبن میں جانے کے بجائے جہاز کے لیگ کی طرف بڑھا۔ طوفان کی وجہ سے اپنا کیبن ٹوٹنے کے بعد وہاں اس نے ایک اسٹیوارڈ کی مدد سے اپنا وہ

صندوقچہ رکھوادیا تھا جس میں ریاست ناگرہ کا نادر و نایاب اور شاہی مال و اسباب رکھا ہوا تھا، اس میں سونے چاندی کے سکے بھی تھے اور اشرفیاں بھی.....

یہ رابرٹ کی مجبوری تھی، ورنہ وہ کبھی بھی ایسی بیش قیمت..... اشیا کا صندوقچہ وہاں نہیں رکھواتا، کیونکہ اس میں دولت تھی جسے وہ اب تک اپنے ساتھ اور جہاز کے رہائشی کیبن میں رکھے ہوئے تھا۔ یہاں جہاز کے تہہ خانے میں رکھنے سے اسے چوری کا خدشہ تھا اور راز کے آشکار ہونے کا بھی.....

لہٰذا اسٹیوارڈ سے اپنی تسلی کرنے کے بعد اس نے وہاں سے ہال کیبن کا رخ کیا۔

☆☆☆

..... چیتن شرما کپتان سے ملنے کے بعد دوبارہ جب ہال کیبن میں آیا تو اس نے ایک نظر اٹھا کر اس طرف دیکھا جدھر فرش پر سونجنا اور رابرٹ دیگر مسافروں کی طرح اپنے بستر وغیرہ لگائے بیٹھے تھے۔

اس نے دیکھا کہ سونجنا وہاں اکیلی بیٹھی تھی۔ ایک ریاست کی راجکماری کو اس حال میں فرش پر بیٹھا دیکھ کر چیتن شرما کا دل کڑھنے لگا۔ اس کے حال پر اسے ترس بھی آنے لگا۔ چنانچہ رابرٹ کو وہاں نہ پا کر وہ اس کی جانب بڑھا۔

جب وہ سونجنا کے قریب جا کر کھڑا ہوا تو سونجنا اسے دیکھ کر ڈر سی گئی۔ تب چیتن شرما نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پہلے اسے تعظیم پیش کی اور نرم لہجے میں بولا۔

''دیکھیے راجکماری صاحبہ! میں آپ کو پہچان چکا ہوں۔ مجھ سے گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آپ اپنا ایک نمک خوار سمجھیے.....'' اتنا کہہ کر وہ ذرا رکا تو سونجنا میں بھی اس سے بات کرنے کی ہمت پیدا ہوئی اور کچھ اٹکتے ہوئے لہجے میں اس سے بولی۔

''آ..... آپ کون ہیں.....؟''

اسے گفتگو کی طرف مائل دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنا تعارف کروایا۔

''چیتن..... چیتن شرما میرا نام ہے۔ میں آپ کی ریاست ناگرہ کے ایک سفیر کی حیثیت سے لندن جا رہا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسی معتبر اور اعلیٰ خاندانی حیثیت کی خاتون اس گورے لفنگے کے جھانسے میں کیسے آ گئی؟''

''میں کسی کے جھانسے میں نہیں آئی ہوں۔'' بالآخر سونجنا نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے اسے مسکت سا جواب دیا۔ اسے رابرٹ کی نصیحت یاد آ گئی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے اسے کسی سے ڈرنے یا کسی کی باتوں میں آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ گہری سانس لے کر آگے بولی۔

''میں کوئی بچی نہیں ہوں، اپنا برا بھلا جانتی ہوں۔ رابرٹ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں بھی اس سے پیار کرتی ہوں۔ ہم لندن جا کر شادی کرنے والے ہیں۔''

چیتن شرما نے ایک تشویش بھرے انداز میں اپنی بھویں اچکائیں اور اسی انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''راج کماری صاحبہ! یہ آپ کیا غضب کر رہی ہیں؟ بھگوان کے لیے آپ اپنی مان مریادا دیکھیے، اپنی حیثیت پہچانیے، آپ کے سامنے اس گورے لفنگے کی کیا حیثیت ہے بھلا۔''

''شرما جی! محبت صرف محبت ہوتی ہے اور وہی اس کی اصل حیثیت بھی۔ اس میں ذات پات اور اونچ مرتبوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔'' سونجنا نے اس بار تنک کر جواب دیا تھا، اس پر وہ خود بھی لمحہ بھر کو حیران ہوئی تھی۔ اتنی بہادری اور جرأت کہاں سے پیدا ہو گئی تھی اس میں؟ یا پھر یہ شاید اس محبت کی اثر پذیری تھی جس نے اسے اس قدر حوصلہ مند بنا دیا تھا۔ آگے بولی۔

''اور..... شرما جی! راج محل میں اب رہ ہی کیا گیا تھا، سوائے سازشوں کے۔ انہی سازشوں نے بالآخر ریاست کو جنگ اور تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔ یوں بھی وہ میرے لیے محل سے زیادہ سونے کا ایک پنجرہ ہی تھا۔''

گھاگ چیتن شرما اس کی باتیں سن کر ایک دم اندر سے کھٹکا۔ وہ سمجھ گیا کہ رابرٹ نے کن باتوں سے اسے خوف زدہ کر کے اور اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر..... بے وقوف بنایا تھا۔

کیونکہ یہ حقیقت تو وہ بھی جانتا تھا کہ ان دنوں ریاست ناگرہ نے اپنی دو پڑوسی ریاستوں پالن پور اور تریپال سے اتحاد کر کے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر ڈالی تھی، بے شک اس میں کچھ داخلی اور بیرونی وذاتی مفادات بھی کارفرما تھے اور یوں فرنگی افواج نے کوہ شمالیہ پر فوج کشی کر ڈالی تھی۔ یہاں تک کہ راج محل میں بھی بمباری کی گئی تھی۔ لہٰذا اس نے ایک گہری سانس لے کر اسے پھر حقیقت سمجھانے کی کوشش کی۔

''دیکھیے راج کماری صاحبہ! آپ کو یقیناً تصویر کا ایک ہی رخ دکھایا گیا ہے جبکہ حقیقت یہی ہے کہ کوہ شمالیہ کی اس جنگ میں فرنگیوں کو بری طرح شکست اٹھانی پڑی تھی۔'' پھر وہ ایک لمحہ سانس لینے کو رکا۔

وہ اپنی بات جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ رابرٹ نہ آن ٹپکے، سونجنا کو بھی یہی ڈر تھا۔ وہ بولا۔

"خیر! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں نے کپتان سے بات کرلی ہے۔ وہ ہوسکتا ہے آپ کو لندن کے سی پورٹ پر میرے حوالے کردے۔"

"آپ اب یہاں سے چلے جایئے۔ میں اور کچھ نہیں سننا چاہتی۔ رابرٹ آگیا تو پھر یہاں جھگڑا کھڑا ہوجائے گا۔" سونجنا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میرا اب جینا مرنا رابرٹ کے ساتھ ہے۔"

چیتن شرما کے دل پر گھونسا لگا۔ ایک گہری سانس لے کر آخر میں بولا۔

"تب پھر راج کماری صاحبہ! میری بھی ایک بات یاد رکھیے گا۔ یہ رابرٹ جیسے لفنگے جوانوں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، جو آپ جیسی سیدھی سادی اور معصوم لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر اور نئی دنیا کے خواب دکھلا کر انگلستان لے جاتے ہیں اور جب ان کا دل بھر جاتا ہے تو وہ انہیں لندن کے رنگین کلبوں اور قحبہ خانوں میں لے جاکر فروخت کردیتے ہیں لیکن بھگوان نہ کرے کہ آپ کے ساتھ ایسا ہو۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے گوشے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی آخری بات پر سونجنا کے دل میں ایک چھناکا سا ہوا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب رابرٹ ہال کیبن کے دروازے پر نمودار ہوا تھا۔

اس نے بالکل آخری لمحات میں چیتن شرما کو سونجنا کے پاس سے اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسے غصہ تو بہت آیا اور مارے طیش کے اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی جاکر اس کا دماغ ٹھیک کرڈالے مگر مصلحتاً اس نے اس کی طرف سے مکارانہ چشم پوشی کرلی اور اپنے ابال پر ضبط کا بند باندھے سونجنا کے پاس آگیا اور اس سے پوچھا۔

"یہ اب دوبارہ تمہارے پاس کیا کرنے آیا تھا؟" اس کا اشارہ چیتن کی طرف ہی تھا۔

سونجنا، جس کا دل و دماغ ہنوز چیتن شرما کی اس آخری لرزہ خیز بات پر انگ کررہ گیا تھا، اچانک رابرٹ کی بات پر خیالوں کے بھنور سے ابھر کر بولی۔

"آں..... ہاں! کک..... کچھ نہیں..... کچھ نہیں..... کک..... کیا کہہ رہا تھا وہ.....؟"

سونجنا کو اس انداز میں بوکھلا کر جواب دیتے ہوئے رابرٹ کو حیرت سی ہوئی۔ وہ بولا۔

"یہ تم کہاں کھوئی ہوئی تھیں؟ میں کیا پوچھ رہا تھا؟ میں نے خود اسے ابھی تمہارے پاس سے اٹھ کر اپنی جگہ پر جاتے دیکھا ہے۔"

تب سونجنا نے خود کو سنبھالا اور پھر چیتن شرما سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں صاف صاف رابرٹ کے گوش گزار کرنے کے بجائے یہ جھوٹ بولا کہ وہ یعنی چیتن شرما بدستور اسی بات پر مصر تھا کہ میں راج کماری سونجنا ہوں لیکن میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی، وغیرہ۔

رابرٹ کو سونجنا کے جواب میں دروغ گوئی کی بو آئی مگر وہ بھی کائیاں تھا۔ سمجھ تو گیا تھا کہ سونجنا اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ اس نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا اور خاموش رہا۔

ایک دوسرے کونے میں شفیق اپنے باپ مقبول مٹھون کے ساتھ بیٹھا اپنے "مطلوبہ" افراد کو آتے جاتے ہوئے بڑے غور سے تکے جارہا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر پہلے رابرٹ اور چیتن شرما کی آپس میں جھڑپ بھی دیکھی تھی اس کے بعد اس نے سونجنا کو ذرا دیر کے لیے اکیلا پاکر اس سے بات بھی کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر چیتن کو تھوڑی دیر بعد دوبارہ سونجنا سے گفتگو کرتے بھی دیکھا تھا اور اب رابرٹ وہاں آچکا تھا۔

وائٹ فالکن بحر بیکراں میں اندرونی و بیرونی حوادث سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ کیبنوں کی مرمت کا کام زور و شور اور تیزی سے جاری تھا۔ چند ایک کیبن جو مرمت کردیے گئے تھے ان میں ہال کیبن کے مسافر شفٹ ہوگئے تھے، باقی کچھ بچے تھے جو دو ایک روز میں مرمت کردیے جاتے۔

جو مرمت کردیے گئے تھے ان میں رابرٹ اور سونجنا کے علاوہ چیتن شرما کا بھی کیبن تھا۔ جبکہ ابھی شفیق اور چند دیگر مسافروں کے کیبن نہیں ہوئے تھے۔ ان پر کام جاری تھا۔

یہ اسی روز شام کا ذکر ہے۔ کپتان کنگ برڈ نے انہیں وعدے کے مطابق اپنے کیبن میں بلالیا۔

کنگ برڈ نے سونجنا اور رابرٹ سے اس گمبھیر معاملے پر تفصیل سے گفتگو کی اور دونوں کے بیانات غور سے سنے۔ رابرٹ اس موقع پر اپنا غصہ اور طیش بھلا کر چالاک لومڑ بن جاتا تھا اور اس نے کپتان کے ساتھ چکنی چپڑی باتیں کیں اور اسے قائل کیا کہ وہ شالیہ سمیت ریاست ناگرہ کے راجاؤں اور نوابوں نے اتحاد کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف بغاوت کرڈالی تھی اور ایک بڑی جنگ میں کوہ شالیہ اور بالخصوص ریاست ناگرہ بالکل تباہ ہوگئی تھی، وغیرہ۔

اس نے سونجنا سے بھی اپنے حق میں بیان دلوایا تھا۔ وہ

بے چاری کیا کرتی، اس وقت رابرٹ ہی اس کا سرپرست اور ساتھی تھا۔ یوں بھی وہ اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر چکی تھی۔

کپتان کنگ برڈ کو جھوٹ سچ اور چکنی چپڑی باتوں سے قائل کرنے کے بعد وہ سونجنا کو لے کر اپنے کیبن میں آ گیا۔

اس کے بعد کنگ برڈ نے چیتن شرما کو طلب کیا اور بالآخر اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ رابرٹ اور سونجنا اپنے برے بھلے کے خود ذمے دار ہیں نیز اس میں سونجنا کی اپنی مرضی کا بھی زیادہ دخل ہے۔

چیتن شرما کو اب تک یوں بھی صورت حال کا بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ یہ سب سن کر اپنے کیبن میں لوٹ آیا۔

یہاں آ کر وہ سوچنے لگا کہ آخر سونجنا کو کیسے اس شکرے رابرٹ کے چنگل سے بچایا جائے؟ خط والا معاملہ بھی اپنی جگہ اٹکا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ اس کے بارے میں سوچ چکا تھا کہ کسی طور بھی وہ یہ خط ملکۂ عالیہ کے سپرد نہیں کرے گا، کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ صریحاً غلط اور خطرناک ہوتا۔ اسے راج محل میں اس کا جواب دہ بھی ہونا پڑتا، جبکہ وہ اپنی ذمے داری نبھانے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا تھا۔

ابھی خط والا معاملہ اپنی جگہ اٹکا ہوا تھا کہ سونجنا والا مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ اس نے سوچا کہ خط کا کارنامہ نہ سہی سونجنا والے معرکے میں بھی اگر وہ کسی طرح کامیابی حاصل کر لے تو بھی راج محل میں اس کی عزت رہ جائے گی اور مرتبہ و منصب بھی بچا رہے گا۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟

اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک نام اس کے ذہن کی اسکرین میں چمکا تھا۔ وہ تھا اشوک کھٹپال.....

چیتن کو معلوم تھا کہ یہ شخص ایک آزاد ریاست کے سفیر یا خفیہ سیاسی ایجنٹ کے طور پر آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کے دور سے لندن میں مقیم تھا۔ لہٰذا چیتن شرما نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسی سے ان سارے گمبھیر مسائل کے سلسلے میں مشورہ اور مدد طلب کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ کچھ مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

رابرٹ بڑے غور اور گہری بھانپتی ہوئی نظروں سے اپنے سامنے کی برتھ پر بیٹھی سونجنا کو گھورے جا رہا تھا۔ اس وقت سونجنا کا معصوم اور سندر چہرہ کہیں کھویا ہوا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو سونجنا؟'' رابرٹ نے پوچھ لیا۔

سونجنا کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ رابرٹ کے مخاطب کرنے پر وہ ذرا چونکی مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسی طرح گم صم سے لہجے میں بولی۔

''رابرٹ! محبت تو کہتے ہیں اندھی ہوتی ہے پھر..... پھر کیوں میرے دل و دماغ میں اس سے متعلق شکوک و شبہات ابھرتے ہیں؟ ہم تو ایک دوسرے کو پا چکے ہیں پھر آخر کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا۔''

عیار رابرٹ اس کی دلی کیفیات سے ہی نہیں بلکہ اس کے ذہنی ہیجان سے بھی اب تک اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر محبت پاش مسکراہٹ سجاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور سونجنا کے قریب..... اس کے بالکل پاس آ کر بیٹھ گیا پھر اس نے بڑی چاہت اور پیار سے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے چوما اور اسے اپنے اور

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

قریب کرلیا۔ اس قدر کہ وہ اس کے ساتھ آن لگی۔ رابرٹ کے جوان اور توانا جسم کی گرمی اور سونجا کے دہکتے چمکتے بدن کی حلاوت نے جیسے دو آتشہ کا کام کیا۔ ایسے ہی میں لوہا گرم ہوا اور رابرٹ نے چوٹ لگائی۔

''دیکھو مائی ڈارلنگ! یہ ایک فطری عمل ہے اور ہر اس شخص کے ساتھ ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت..... جو ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے ہوں۔ درحقیقت یہ وسوسے اور شبہے بے انتہا اور بے لوث چاہت ہی کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔ جھوٹی محبت کر کے دیکھو ذرا کسی سے تم..... دیکھنا ایک ذرا سا شک بھی تمہیں نہ محسوس ہوگا اور نہ ہی کوئی اور ایسی بات یا بے چینی محسوس ہوگی۔''

سونجا ایک چھتنی ہوئی نو دمیدہ کلی کے جیسی لڑکی تھی۔ ادھر ایک ہاتھ نے چھوا اور وہ گلاب بننے لگی اور یہی ہوا بھی۔ رابرٹ نے مکاری سے پہلے محبت کی گرمی پہنچا کر اسے گلاب بنا دیا اور پھر اپنی لچھے دار باتوں کا سنہرا ہار اس کے گلے پر ڈال دیا لیکن کہا جاتا ہے کہ اللہ حسن دیتا ہے تو نزاکت بھی آ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی کسی کی محبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے سلیقہ بھی آ ہی جاتا ہے سونجا نے بھی قدرے سنبھل کر اسی سلیقے سے جواب میں مگر بہت دھیرے سے کہا۔

''تو پھر محبت کو اندھا کیوں کہتے ہیں؟ محبت کرنے والے تو بس ایک چاہت میں ڈوبے رہتے ہیں۔ کوئی کائنا اور کسی بال کی انہیں کب پروا یا احساس ہوتا ہے؟ سچا پریم تو پریمیوں کو ہر شے سے بے غم... کر دیتا ہے۔''

رابرٹ بہ ظاہر جن جذبات کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ بناوٹ کے سوا کچھ نہ تھے۔ شاید اسی لیے وہ صحیح طور پر سچی محبت کی پیاسی سونجا کو رام تو کر پا رہا تھا مگر عین الفت سمجھانے سے قاصر تھا۔ تاہم نچلا بیٹھنے والا وہ بھی نہیں تھا، کیونکہ جب وہ لاجواب سا ہونے لگتا تو پرانا حربہ استعمال کرتا۔ اس کے خیال کے مطابق اب اسے اس بات کی کوئی ضرورت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ سونجا کو اپنی جھوٹی محبت کو سچا ثابت کرنے کے لیے دماغ کھپائے، اس کی منزل ویسے بھی قریب تھی اور سونجا اس کی مٹھی میں پوری طرح آ چکی تھی۔ اب تو وہ اپنے کریہہ منصوبے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والا تھا۔

یوں وہ اس کی کمزور رگ سے بھی واقف تھا۔ ایک دم منہ بسور کر بولا۔

''صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی ہے۔'' بے چاری سونجا اس عیار کی بات پر تڑپ اٹھی اور بے حد رسان سے بولی۔

''یہ بات نہیں ہے رابرٹ! بس، میں اپنے دل کی کوئی بات تم سے نہیں چھپا سکتی، حالانکہ میں نے اس دن کے بعد تہیہ کر لیا تھا جب ایک ایسی بات پر تم ناراض ہو گئے تھے تو میں نے ایسی کوئی بات تم سے نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اب پھر.....''

''چلو کوئی بات نہیں، دراصل سونجا ڈارلنگ! میں اس کمینے چیتن شرما کی طرف سے فکر مند ہو گیا ہوں۔ یہ مردود کہیں ہمارے لندن پہنچتے ہی کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔''

سونجا بھی سوچنے لگی۔ رابرٹ نے ایک لمحے کے لیے سوچا تھا کہ وہ کیوں نہ لندن پہنچنے سے پہلے ہی چیتن کا خاتمہ کر ڈالے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے خود کو اس خطرناک اور سنگین اقدام سے باز رکھا کیونکہ اب معاملہ کچھ اور بن چکا تھا۔

وہ اب یہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اس صندوقچے اور سونجا کو لے کر انگلستان کی سرزمین پر بہ خیریت اتر جائے اس کے بعد وہ سونجا کو بھی کہیں کھپانے کی کوشش کرے گا۔ ایک دولت صندوقچے کی صورت اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی جبکہ دوسری چلتی پھرتی سونجا کی شکل میں اس کے ساتھ تھی۔

☆☆☆

وہ بھی اس آتش زیر پا کے لیے بالکل تیار تھے۔ تاہم انہیں ڈاکوؤں کی جانب سے اتنی جلدی اور اچانک حملہ کرنے کی توقع نہ تھی کیونکہ اریبہ نے ان کی جاسوسی کرنے کے بعد انہیں یہی بتایا تھا کہ ڈاکو پہلے جزیرے پر اترنے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ ان سے جان چھڑانے یا بھڑ جانے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس میں سردار کی خوب صورت بیٹی امیارا کے مشورے کا دخل تھا، وہ ابھی ان سے جنگ نہیں چاہتی تھی۔

لیکن اس کا غصہ ور اور کینہ پرور منگیتر چری اپا ان سے بری طرح خار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے دو ہی ساتھیوں، ولکونی اور بابیلا کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑا تھا۔

ان کے درمیان دو بدو تلوار بازی شروع ہو گئی۔ تلوار، تلوار سے ٹکرا رہی تھی اور ان کے ٹکرانے سے فضا میں مخصوص فولادی گونج پیدا ہوتی تھی۔

اریبہ، ازابیلا کو سنبھالے ہوئے تھی اور بڑی جوش بھری نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کو ان ڈاکوؤں سے لڑتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھی بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔

چری اپا اور ولکونی کے نیم برہنہ کسرتی جسم چمک رہے تھے۔ ان کے طاقت ور بازوؤں کی مچھلیاں بری طرح پھڑک رہی تھیں اور سینے اور کاندھے کے مسلز تنے ہوئے تھے۔

علی نے ایک موقع پر خونخوار چری اپا کا اپنی تلوار سے

ایک خطرناک وار بچایا تھا جو اس نے کمال پھرتی اور چالاکی سے اس کے دائیں پہلو پر کرنا چاہا تھا، پھر اگلے ہی لمحے علی نے تلوار اور ایک ہاتھ کے زور پر اسے زور سے دھکا دیا۔ چری اپا زینے سے جا ٹکرایا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تو علی نے اس کے دائیں شانے پر تلوار سے وار کیا۔ چری اپا نے خود کو اس مہلک وار سے بچانے کی خاطر چالاکی سے کام لیا اور خود کو گرنے سے سنبھالا دینے کے بجائے، زینے کی ریلنگ کی طرف گرا دیا۔ تلوار لوہے کی ریلنگ سے ٹکرائی اور چنگاریاں اڑیں۔

چری اپا نیچے گر چکا تھا اور تلوار پر اس کی گرفت مضبوط تھی لیکن اس نے تلوار سونتنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے گرتے ہی علی کی ٹانگوں سے اپنی ایک ٹانگ ٹکرائی۔

بدقسمتی سے علی اس داؤ میں آ گیا اور اچھل کر گرا۔۔۔۔ چری اپا نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہی اپنی تلوار اس کے سینے پر چلا دی۔ علی نے آخری حد تک اس مہیب وار سے خود کو بچانے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا مگر تلوار کی نوک نے اس کے سینے کو تو نہیں البتہ اس کے دائیں شانے میں چرکا لگا دیا۔

علی اس درد کو پی گیا اور بہ سرعت سنبھالا لیا۔ چری اپا نے تلوار دوسرے ہاتھ کی جانب پھینکی۔ وہ تلوار زنی میں خاصا ماہر معلوم ہوتا تھا جو دوسرے ہاتھ سے بھی تلوار چلانا جانتا تھا۔

ایک اور موقع پر دونوں آمنے سامنے ہو گئے اور ہاتھ اور تلوار کے زور پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔

دوسری جانب شاہ زمان دلکونی کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر تلواروں کے حربے آزمانے میں مصروف تھے۔ لڑائی کے دوران یہ ڈاکو اپنے حلق سے وحشیانہ آوازیں بھی خارج کر رہے تھے۔

اچانک دلکونی نے شاہ زمان کو تلوار اور ہاتھ کے زور پر چند قدم پیچھے دھکیلا، لیکن وہ شاہ زمان کو صرف ایک دو قدم ہی پیچھے دھکیل پایا تھا کہ شاہ زمان نے پوری قوت سے دلکونی پر جھپٹا مارا۔۔۔۔ دلکونی اپنی ہی جھونک میں نصف دائرے میں گھوما اور توازن کھو بیٹھا۔

ایسے ہی وقت میں جب دلکونی پر شاہ زمان موقع تاک کر اپنی تلوار چلانا چاہتا تھا کہ اس کی تلوار کی دھار اور دلکونی کی گردن کے بیچ ایک اور تلوار آ گئی۔

بلاشبہ زمان کے لیے یہ وار اچانک اور غیر متوقع ہی تھا کیونکہ اس وقت ہر کوئی کسی نہ کسی ڈاکو سے تلوار زنی میں مصروف تھا۔ یہ بابیلا تھی۔۔۔۔ جو کیپٹن جیمس سے مقابلہ کر رہی تھی، جبکہ کیپٹن جیمس کے پاس، بابیلا کی تیز اور مضبوط تلوار کے مقابلے میں صرف۔۔۔۔ وہ کندی لکڑی نما شے تھی جو اریبہ نے اسے دی تھی۔

تاہم وہ بھی تربیت یافتہ تھا۔ اسی سے کام چلا رہا تھا کیونکہ اس کے مقابلے میں بھی تو ایک عورت ہی تھی۔

بابیلا نے کیپٹن جیمس سے لڑائی کے دوران ایک مہلت ملنے کے دوران میں اسے نظر انداز کر کے اپنے ساتھی دلکونی کو زمان کے خطرناک وار سے بچایا تھا اس کی یوں مداخلت اور اپنا بر موقع وار خالی جاتے دیکھ کر شاہ زمان، بابیلا پر بگڑا مگر پھر اسی وقت کیپٹن جیمس نے بابیلا پر زوردار۔۔۔۔ وار کیا جو اس کے برہنہ کاندھے پر پڑا۔ بابیلا کے حلق سے مارے اذیت کے چیخ خارج ہوئی مگر وہ بھی جنگجو اور سخت جان عورت تھی، اس نے ایک وحشیانہ چیخ مارتے ہوئے کیپٹن جیمس پر ہلا بول دیا۔

شاہ زمان کو دوبارہ اپنے مدمقابل کی طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ وہ اس کی جانب تلوار سونتے بڑھ رہا تھا۔

وہ جیسے ہی قریب آیا زمان نے اس پر وار کیا، جو وہ ایک طرف جھک کر بچا گیا پھر اگلے ہی لمحے دلکونی نے پھرتی سے گھوم کر اسے اپنے دائیں بازو کی کہنی رسید کر ڈالی جو اس کے پہلو پر لگی۔ شاہ زمان تھوڑا ڈھے سا گیا، دلکونی اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک مخصوص انداز میں اچھل کر زمان کی پشت پر تلوار سے وار کیا تو ایسے ہی وقت میں چری اپا سے نبرد آزمائی کے دوران اتفاقاً علی کی نگاہ ادھر پڑ گئی۔

اس نے اپنے مدمقابل چری اپا کے اگلے وار کی پروا کیے بغیر زمان کو بچانے کی خاطر تلوار دلکونی کی جانب اچھال دی، جو فضا میں ایک مخصوص زاویے سے لہراتی ہوئی اس کی گردن سے ٹکرائی اور مہیب چرکا لگاتی ہوئی ایک طرف کو جا پڑی۔

دلکونی کے حلق سے ذبح کیے ہوئے بکرے جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور اسی لمحے وہ وحشت خوں رنگ۔۔۔۔ چیخ مارتا ہوا اپنے علی کی جانب دوڑا جبکہ ادھر پہلے سے مدمقابل چری اپا کو بھی علی کی اس جسارت اور جرأت نے بری طرح غضب ناک کر دیا تھا۔

شاہ زمان نے جب دیکھا کہ علی اب ان دونوں تلوار بدست وحشی ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر تنہا اور نہتا ہے تو وہ اس کی مدد کو دوڑ پڑا لیکن علی بھی غافل نہ تھا۔ اس نے چری اپا کے

قریب آتے ہی اس کی تلوار کو فضا میں لہراتے پا کر پھرتی سے جھکائی دی اور اسی طرح جھکے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ پر اپنے سر کی ٹکر رسید کر دی۔

چری اپا کے قدم زمین سے اکھڑ گئے۔ وہ پشت کے بل زینے کی ریلنگ سے ٹکرایا۔ علی اس پر چیتے کی طرح جھپٹا جبکہ اس پر پیچھے سے وار کرنے والے ولکونی کا راستہ شاہ زمان نے روک لیا۔

ولکونی کی گردن سے خون کی لکیریں بہہ رہی تھیں، یہ اوپری چرکا ابھی شاید اس کے لیے اتنا کاری ثابت نہیں ہوا تھا کہ وہ ڈھے جاتا۔ وہ دوبارہ زمان کے مقابلے پر آ گیا۔

اس نے جوشِ انتقام تلے دور ہی سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ زمان چیتے جیسی پھرتی کے ساتھ ایک طرف کو ہو گیا اور اپنی تلوار سے دوسرا وار کر ڈالا۔ اس بار ولکونی کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی۔ زمان کے وار نے اس کے دائیں پہلو کو چیر ڈالا تھا اور اب وہ عرشے پر پڑا اکھڑی ہوئی سانسیں لے رہا تھا۔

زمان تیزی کے ساتھ علی کی مدد کو لپکا جو نہتا، چری اپا کے وحشیانہ اور مہیب تلوار کے وار سے خود کو بچانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

ادھر بابیلا بھی جزوی طور پر زخمی ہونے کے باوجود کیپٹن جیمس کے ساتھ ڈٹی ہوئی تھی لیکن اپنے ساتھی ولکونی کی لرزہ خیز چیخ نے اسے بھی خونخوار اور آتشِ انتقام سے سرخ کر ڈالا۔ وہ کسی زخمی ناگن کی طرح تلوار سونتے کیپٹن جیمس پر جھپٹی اور اسی جوش میں اس نے تلوار کا وار گھما کے کیپٹن جیمس کی کھوپڑی پر کیا۔ ازابیلا جو اریبہ کے ساتھ مارے خوف کے چھپی ہوئی اپنے شوہر کو دیکھ لیتی تھی، بابیلا کو بجلی بن کر اپنے شوہر پر ٹوٹتے دیکھ کر مارے خوف کے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

''پلیز! میرے ہسبینڈ کی مدد کرو اریبہ.....!'' وہ ملتجیانہ لہجے میں اریبہ سے بولی جبکہ خود اریبہ کی نگاہِ خیر شاہ زمان کو تکے جا رہی تھی۔

کیپٹن جیمس نے بابیلا کا وار اسی کندراڈے روکا اور اسے اسی کے بل پر دوسرے ہاتھ کے زور پر پرے دھکیلا تو بابیلا کا پاؤں عرشے پر پڑی کسی شے سے ٹکرایا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ذرا پرے جا گری جو کیپٹن جیمس نے لپک کر اٹھالی اور بلا دیر اس نے بابیلا کی گردن پر وار کے لیے بلند کی۔ ایک لمحے کو..... یقینی موت کو سامنے دیکھ کر بابیلا کی سیاہ آنکھوں میں موت کا سایہ اس پھیل گیا۔

''نہیں کیپٹن! اسے مت مارنا.....'' یہ شاہ زمان تھا جو علی کے ساتھ مل کر چری اپا کو زیر کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس کی نظر اس طرف پڑی تو اس نے کیپٹن جیمس کو ایک عورت کے خون سے ہاتھ رنگنے سے روک دیا۔

یہ سب لوگ قریب قریب ہی اپنے مدمقابل سے پنجہ آزمائی میں مصروف تھے۔ کیپٹن جیمس نے تلوار ایک جانب پھینک دی۔

اسی وقت علی اور شاہ زمان نے چری اپا کو بے دست و پا کر ڈالا اور علی اس کی گردن پر اپنی تلوار جو اس نے بعد میں اٹھالی تھی، سے وار کرنا چاہتا تھا کہ ایک تیز نسوانی ملتجیانہ سی آواز ابھری۔

''نہیں، خدا..... کے لیے..... اسے مت مارو.....''

علی کا تلوار والا ہاتھ وہیں رک گیا۔ چری اپا فرش پر بے دست و پا پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

امپارا اپنے باپ سردار آٹوما کے ساتھ اچانک ہی شور کی آواز سن کر وہاں آ پہنچی تھی۔

اس نے گھنیری اور حسین پلکوں تلے سیاہ کشادہ آنکھوں سے علی کی طرف ممنون بھری نگاہوں سے دیکھا۔

علی نے سر جھٹکا اور چری اپا کی جان بخش دی۔

''تم لوگوں نے ہم پر حملہ کر کے اچھا نہیں کیا ہے.....'' سردار آٹوما کرخت لہجے میں ان سے بولا تو علی کو اس کی منافقت پر طیش آ گیا اور وہ آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''کھوٹ تمہارے دل میں تھا آٹوما! ہم تو نہتے ہیں۔ ہم کیسے حملہ کر سکتے ہیں۔ تمہارے ساتھی خود ہم پر ہلا بول چکے تھے۔''

شاہ زمان بھی آگے بڑھ کر جرأت انگیز لہجے میں بولا۔ ''تم لوگوں کی نیت شروع ہی سے خراب تھی اور تم لوگوں سے محتاط رہنے کا ہمیں بھی حق ہے۔ اب جو بھی ہمارے مقابلے میں آئے گا، ہم اس کا برا حشر کر دیں گے۔ اب ہمارے تمہارے راستے جدا ہیں۔''

''بہتر یہی ہے اب تم ہماری لانچ سے اپنا قبضہ ختم کر دو.....'' کیپٹن جیمس نے کہا۔

لانچ کسی گمنام جزیرے کے ساحل سے آن لگی تھی اور اتھلے پانی میں آ کر ایک طرف کو جھک کر پھنس گئی تھی۔ وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی تھی۔

اس دوران سیماب بدن اور جنگجو نظر آنے والی امپارا نے اپنے باپ آٹوما اور منگیتر چری اپا سے تھوڑی کھسر پھسر کرنے کے بعد علی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اب جو ہوا سو ہوا۔ ہم اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں۔ اب ہماری آپس کی جنگ نہیں بلکہ آپس کی بقا کا مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے۔ اسی لیے ہم دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور سب مل کر اس مصیبت۔۔۔''

''ہرگز نہیں۔'' علی نے امپارا کی بات کاٹ کر گونج دار آواز میں کہا۔ ''ہم تمہیں کئی بار آزما چکے ہیں، ہمارا اب ایک ہی فیصلہ ہے۔ تم لوگ اپنا راستہ لو اور ہماری لانچ سے فوراً اپنا قبضہ ختم کرو۔۔۔''

''لیکن ہم سب اس وقت ایک گمنام جزیرے میں پھنس چکے ہیں، یہاں سے کیسے نکلیں گے؟ جبکہ ہماری لانچ بھی خراب ہو چکی ہے۔ ہم سب کو مل کر اسے درست کرنا ہوگا۔''

امپارا نے علی کی طرف دیکھ کر کہا تو اس بار شاہ زمان نے اس سے مخاطب ہو کر رکھائی سے کہا۔ ''یہ ہمارا مسئلہ ہے، ہم جانیں۔ تم چاروں اسی وقت ہماری لانچ سے اتر جاؤ۔''

چری اپا کو شاہ زمان کی بات پر طیش آ گیا۔ وہ تلوار سونتنے لگا تو علی اور شاہ زمان بھی اس کے آگے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے، سردار آنوما نے بھی تلوار نکال لی تھی لیکن امپارا نے ہاتھ کا اشارہ کر کے انہیں لڑائی سے روک دیا۔

اس نے باپ کے کان میں جا کر کچھ کھسر پھسر کی اس کے بعد وہ چاروں یعنی سردار آنوما، چری اپا، بابیلا اور امپارا۔۔۔ لانچ چھوڑ کر پانی میں اتر گئے اور جزیرے کی طرف بڑھنے لگے۔

''خس کم جہاں پاک۔۔۔'' انہیں جاتے دیکھ کر علی نے زیر لب کہا۔

اس کے بعد یہ لوگ تھوڑی دیر تک انہیں جزیرے کی سمت جاتے دیکھتے رہے اور پھر جب وہ چاروں ڈاکو نظروں سے اوجھل ہو گئے تو یہ لوگ کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔

انہیں جو تھوڑے بہت زخم آئے تھے، ان کی مرہم پٹی کی ذمے داری اریبہ اور ازابیلا نے سنبھال لی۔

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ سر جوڑے بیٹھ گئے۔ لانچ ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ ان کا مشن یہ ناکام ہو گیا تھا۔ زادِ راہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس پر مستزاد انہیں اپنی بقا کا مسئلہ آن پڑا تھا۔

بالآخر متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ پہلے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرنا چاہیے اس کے بعد ہی آگے کا سوچا جائے گا۔

اس کے لیے علی ریحان اور شاہ زمان نے لانچ سے اتر کر جزیرے میں جانے کا فیصلہ کیا جبکہ کیپٹن جیمس، ازابیلا اور اریبہ لانچ میں ہی رکتے۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد علی اور زمان نے تلواریں اٹھائیں اور لانچ سے اتر گئے۔ وہ سینے تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، ان کے سامنے گمنام جزیرے کا ریتیلا ساحل تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگے۔

صبح کاذب کی روشنی پھیل چکی تھی۔ جزیرہ ایک اسرار بھری سی دھند میں لپٹا نظر آ رہا تھا پھر جب تک وہ جزیرے کے ساحل تک پہنچے دھوپ نکل آئی۔ انہوں نے دیکھا، یہ جزیرہ گمنام سہی لیکن بہت ہی دلفریب اور خوب صورت تھا۔

سامنے ہرا بھرا گھنا جنگل تھا جہاں قسم قسم کے پھل دار درخت، خوشنما پھول اور جنگلی بیلیں سانپ کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ایک جانب انہیں چند ایک پہاڑیوں کی چوٹیاں بھی دکھائی دیں۔ ساحلی جھیل تو بہت ہی جانفزا منظر پیش کرتی تھی جدھر۔۔۔ انہیں کچھ جانور بھی بھاگتے دوڑتے نظر آئے۔

اپنی وضع قطع سے یہ جزیرہ انہیں خاصے بڑے رقبے پر پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

''علی۔۔۔۔! وہ دیکھو۔'' اچانک زمان نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے علی سے کہا۔ علی نے اس سمت دیکھا۔

جزیرے کی مشرقی سمت میں گاڑھا گاڑھا سا دھواں اٹھ رہا تھا۔

''کیا اس طرف کوئی آبادی ہے؟'' علی نے کہا۔

''ہو سکتا ہے۔''

''ہمیں اسی طرف بڑھنا چاہیے۔'' زمان نے کہا۔ علی نے سر ہلا دیا۔ دونوں اسی سمت کی طرف بڑھے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں خاصی دیر تک چلنا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تھکن سے بے حال ہو کر ہانپنے لگے۔ تاہم وہ دھواں اٹھتی اس جگہ تک پہنچ ہی گئے۔ زمان میں تو مزید چلنے کی ہمت نہ ہو سکی البتہ علی نے تھوڑی اور ہمت کر کے پیش قدمی کی تو ایک ساحلی چٹان کی اوٹ سے دوسری جانب جھانکا۔

وہاں کی زمین خاصی نیچی تھی اور یہ جزیرے کا... مشرقی سرا محسوس ہوتا تھا۔ اسے ساحل سے تھوڑی دور ہی اتھلے پانی میں ایک بڑا سا بحری جہاز پھنسا ہوا نظر آ گیا۔ اس کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

اس جہاز کو دیکھتے ہی علی ریحان کی آنکھیں حیرت و مسرت سے پھیل گئیں اور بے اختیار اس کے منہ سے برآمد ہوا۔

''سی ہاک۔۔۔۔''

(جاری ہے)

قہر

فہمی فردوس

سلگتے ہوئے شعلوں میں سب کچھ جل کر بھسم ہوگیا تھا... یہ منظر اس کے لیے دلچسپ نہیں بلکہ عبرت پکڑنے کے لیے تھا۔ کیونکہ جس آگ میں وہ بچپن سے جلتی آرہی تھی اس کی لپیٹ نے ان غیر منصف رشتوں کو بھی لے لیا تھا جو خدا کی لاٹھی سے بے خبر ایک کمزور عورت کو مزید کمزور تر کرتے جارہے تھے اور بھول گئے تھے کہ اس کے گرم آنسوؤں کا لاوا انہیں جلا کر خاک کردے گا۔

مخفی جذبات کی نفرتوں میں گم چند گمراہ انسانوں کا سبق آموز ماجرا

''کیا تم نے شیروانی کا آرڈر دے دیا؟'' سیٹھ قربان نے اپنے اکلوتے ہونہار بیٹے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یس ڈیڈ۔'' خوبرو امریکا پلٹ ارسلان اپنے موبائل پر مصروف تھا۔ اسی مصروفیت میں سرسری انداز میں جواب دیا۔

''مگر شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ تیار تو ہو جائے گی نا؟''

''وہ ملک کا ایک مشہور برانڈ ہے۔ وعدہ خلافی کر کے اپنا معیار کبھی خراب نہیں کریں گے ڈیڈ۔'' ارسلان نے نگاہیں موبائل اسکرین پر جماتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر مجھے تو اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ شیروانی کے لیے اسپیشل آرڈر دینے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟ ریڈی میڈ

بھی تو بہت اچھی اور قیمتی شیروانیاں مل سکتی ہیں۔'' پاس بیٹھی ہوئی بیگم کوثر جہاں بولی۔

وہ تینوں اس وقت اپنے ٹی وی لاؤنج میں آرام دہ صوفوں میں دھنسے، ایک ہفتے بعد ہونے والی ارسلان کی شادی کے معاملات ڈسکس کررہے تھے۔

''بیگم! تیار شدہ شیروانی میری مرضی کی نہیں مل سکتی۔ یہ سیٹھ قربان کے بیٹے کی شیروانی ہوگی۔ کسی عام بندے کے بیٹے کی نہیں۔ موتیوں اور نگوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے ہیرے استعمال کیے جائیں گے۔''

یہ تاویل سن کر بیگم کوثر جہاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی اور گردن بھی فخر سے چند انچ اونچی ہوگئی۔

''مگر ڈیڈ! اتنا زیادہ خرچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟'' ارسلان نے موبائل بند کرکے جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے یار! تم کو کیسے سمجھاؤں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ جتنا بھی لٹاؤں گا اسی پر لٹاؤں گا۔''

''اوکے ڈیڈ۔'' ارسلان نے جواب دیا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

''باہر سے پڑھ کر آیا ہے نا ابھی۔ اس ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کے لیے وقت لگے گا اسے۔'' سیٹھ قربان ہنسا۔ بیگم کوثر جہاں بھی مسکرانے لگیں۔

''بیگم! میں چاہتا ہوں کہ اپنے بیٹے کی شادی اتنی دھوم دھام اور شان و شوکت سے کروں کہ لوگوں کے ذہنوں سے برسوں تک اس شادی سے جڑی یادیں محو نہ ہوں اور آپ بھی یہ بات ذہن میں رکھیں کسی قسم کی کوئی کمی نہ آنے پائے۔''

''فکر نہ کریں سیٹھ صاحب! ہر کام بہت اعلیٰ پیمانے پر کررہی ہوں۔ کسی معاملے میں آپ کی ناک نیچی نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

''ہاں بھئی دوسری طرف بھی لاہور کا ٹاپ کلاس بزنس مین ہے۔ اس کی بھی اکلوتی بیٹی تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔''

''اور کیسی مزے کی بات ہے سیٹھ صاحب، ان کی بیٹی تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے اور ہمارا بیٹا تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔'' کوثر جہاں بولی۔ تو اس بات پر دونوں ہنس پڑے۔

''بس بیگم قسمت کی بات ہے۔ کچھ لوگ بیٹوں کو ترستے ہیں اور کچھ بیٹیوں کو۔''

''جی ٹھیک کہتے ہیں آپ۔''

اسی وقت ملازمہ نے آکر پیغام دیا۔ ''صاحب! باہر باجی فاخرہ آئی ہیں۔''

''لو جی اس کو بھی اسی وقت آنا تھا۔'' وہ منہ میں بڑبڑائے اور ملازمہ سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہے؟''

''پتا نہیں جی..... وہ کہتی ہیں، چچا جان سے ملنا ہے۔''

''اچھا اسے اندر بھیج دو۔'' وہ بیزاری سے بولے۔

فاخرہ کے آنے کی اطلاع سن کر ان کے خوشگوار موڈ کا بیڑا غرق ہوچکا تھا۔

بیگم کوثر جہاں بھی اب سنجیدہ سی نظر آرہی تھیں، چند ثانیوں بعد ملازمہ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پینتیس چھتیس سال کی ایک عورت ستا ہوا چہرہ اور زرد رنگت لیے مجرموں کی طرح سر جھکائے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے سلام کیا۔

''السلام علیکم چچا جان! کیا حال ہے آپ کا؟''

''ہم ٹھیک ہیں۔'' سیٹھ قربان نے رکھی سے انداز میں جواب دیا۔ وہ پاس موجود ... ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیسے آئی ہو؟'' سیٹھ نے کھردرے سے لہجے میں پوچھا تو اس نے گھنیری پلکیں اٹھائیں جنہوں نے آنکھوں میں جمع کیے ہوئے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ پلکوں کی جھالر کیا اٹھی، آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہہ نکلے۔

''چچا جان..... میرا بیٹا بہت تکلیف میں ہے۔ ساری ساری رات تڑپتا ہے۔ مجھ سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ ڈاکٹر آپریشن کا کہہ رہے ہیں۔ آپریشن پر پانچ لاکھ روپے خرچ ہوگا۔ پلیز آپ میری مدد کریں۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کو روتا دیکھ کر کوثر جہاں نے منہ بنالیا اور سیٹھ نے بھی بیزاری سے پوچھا۔

''تو کیا چاہتی ہو اب؟ تم تو جانتی ہو بیٹے کی شادی کررہا ہوں..... ہاتھ بہت تنگ ہے۔ میں اتنے پیسے کہاں سے دوں؟''

''اب میں کہاں جاؤں۔ آپ کے سوا میرا کوئی سہارا بھی تو نہیں ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''چلو ایسا کرتا ہوں، میں بیس ہزار دے دیتا ہوں اس سے زیادہ کی میرے پاس گنجائش نہیں۔''

''میں بیس ہزار کا کیا کروں گی؟ پانچ لاکھ روپے چاہئیں چچا جان۔''

''معافی چاہتا ہوں فاخرہ! میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

''چچا جان! خدا کا خوف کریں۔ میرے والد کی

جائداد کا حصہ بھی تو آپ لوگوں کے پاس ہی ہے۔'' جو بات برسوں سے دل میں دبائے بیٹھی تھی وہ زبان پر آگئی۔

''تو آخر آگئیں اپنی اوقات پر..... طعنے دینے پر آ ہی گئی ہو تو کان کھول کر سن لو..... تمہارے باپ کے نام جب کچھ تھا ہی نہیں تو تمہارا حصہ کہاں سے ہمارے پاس آگیا؟''

''جو ظلم میرے دادا نے میرے ساتھ برسوں پہلے کیا تھا، آپ چاہیں تو اس کا ازالہ کر سکتے ہیں۔'' اس کا لہجہ پھر سے ملتجیانہ ہو گیا۔

''لڑکی! تم یہ بات اچھی طرح دل میں بٹھا لو کہ تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ قانونی اور شرعی طور پر تم ہماری جائداد میں حصہ دار نہیں بن سکتیں۔'' سیٹھ قربان دہاڑ کر بولا تو وہ بھی ساری مصلحتیں ایک طرف رکھتے ہوئے چلا کر بولی۔

''ہاں ہاں، ساری غلطی تو میری ہے کیونکہ میں نے بیٹی کے روپ میں جنم لیا۔ اگر میری جگہ بیٹا ہوتا تو میرا دادا ضرور میرے باپ کا حصہ میرے نام لگواتا مگر بیٹی سمجھ کے اس نے بھی مجھے نظر انداز کر دیا۔ میرے مستقبل کے حوالے سے کچھ نہ سوچا۔ اب میں کیا کروں کہاں جاؤں..... میری ماں نے تو ذلت بھری زندگی گزار کر جان دے دی۔ اب میں در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر زور و شور سے رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر دونوں میاں بیوی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر سیٹھ قربان کا دل تھوڑا پسیجا اور بولا۔

''اچھا ایسا کرو..... میں تمہیں پچاس ہزار کا چیک دے دیتا ہوں لیکن یہ صاف بتا دوں کہ یہ ابھی کیش نہیں ہوگا۔ اس کے لیے تمہیں دس پندرہ دن انتظار کرنا ہوگا۔ ارسلان کی شادی کے بعد ہی تم میرے اکاؤنٹ سے یہ رقم نکلوا سکتی ہو۔''

وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

سیٹھ نے اپنی جیب سے چیک بک نکالی۔ اس پر پچاس ہزار کی رقم کا اندراج کیا۔ سائن کیے اور چیک پھاڑ کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے چیک پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر اس پر نظریں جمائے دیکھتی رہی اور پھر اس کو پھاڑ کے اس کے چھوٹے چھوٹے پرزے کر ڈالے اور پھر کاغذ کے وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سیٹھ قربان کی طرف اچھال دیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پانچ لاکھ کی کمی پچاس ہزار سے کیسے پوری کر سکتی ہوں چچا جان.....'' اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا اور مزید بولی۔ ''میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔ بے شک وہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

چودھری حشمت اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ چار سو ایکڑ کے مالک چودھری حشمت کے جاہ و جلال اور تھمنڈ کی بدولت، بڑے بڑے اعلیٰ نسب لوگ اس سے دب کر رہتے تھے۔ چودھری کے دو بیٹے تھے۔ بڑا چودھری شیر علی اور چھوٹا چودھری قربان۔ شیر علی اپنے باپ کا چہیتا بیٹا تھا مگر اس کی عادات و اطوار باپ سے بالکل نہ ملتے تھے۔ وہ غریبوں کے ساتھ ہنس کے بات کرتا اور ہر ایک کی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔ چودھری اسے سمجھانے کی بہت کوشش کرتا کہ غریبوں سے فاصلہ رکھا کرو ان کی کمینوں کو زیادہ منہ نہ لگایا کرو، ورنہ سر پر چڑھ کر ناچنے لگتے ہیں مگر وہ ہنس کے ٹال دیتا۔ کہتا..... ''ابا جی یہ بھی انسان ہیں اور سب انسان برابر ہیں۔ سب کا دل اللہ نے ایک جیسا بنایا ہے۔'' چودھری اس کی باتیں سن کر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ اس کے باوجود بیٹے سے محبت میں کمی نہ آئی۔

لیکن محبت کی یہ فلک بوس عمارت اس دن اچانک زمیں بوس ہو گئی جب ایک جولاہے کی بیٹی پر اس کا دل آ گیا۔ گلی سے گزرتے ہوئے معصوم اور کم عمر زلیخا سے شیر علی کا خوبصورت ٹکراؤ ہوا۔ وہ اس کے دل کو بھا گئی۔ وہ بالکل چھوئی موئی کی طرح نرم و نازک اور خوبصورت تھی۔ گھر آ کر جب ماں کے سامنے اس نے زلیخا کا ہاتھ مانگنے کی بات کی تو اس نے دو ہتڑ مار کے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔ کہنے لگی کہ تمہارا باپ سنے گا تو غضب ہو جائے گا۔ اس بات کو یہیں دفن کر دو۔ مگر وہ بھی ضد کا پکا ثابت ہوا۔ شام کو باپ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''ابا جی! میں زلیخا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

چودھری چند منٹ تک تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں بیٹے کی طرف دیکھتا رہا، جیسے اس کا دماغی توازن بگڑنے کا یقین ہو چکا ہو۔ پھر ہتھے سے اکھڑ گیا اور بیٹے کو خوب جلی کٹی سنائیں۔ جائداد سے عاق کرنے کی دھمکی بھی دے ڈالی مگر شیر علی کے دماغ پر تو اس وقت زلیخا کے عشق کا بھوت سوار تھا، وہ کسی دھمکی کو خاطر میں نہ لایا اور اپنی بات منوانے کے لیے بھوک ہڑتال کر دی۔ شیر علی کی بھوک ہڑتال سے چودھری کا پتھر دل تو نہ پسیجا مگر ماں کا نرم و نازک دل موم کی طرح پگھل گیا۔ تیسرے دن جب شیر علی نڈھال سا بستر پر پڑا تھا تو وہ اپنے شوہر کے سامنے گڑگڑائیں۔ بیٹے کی خوشیوں کی بھیک مانگی تو چودھری نے بیٹے کی خاطر کہہ دیا کہ جاؤ جا کر اس جولاہے

سے رشتہ مانگو اور خود ہی شادی کر کے بہو کو گھر لے آؤ۔ میں اس شادی میں شرکت نہیں کروں گا۔ چودھرانی نے جا کر رشتہ مانگا اور ایک ماہ کے اندر اندر زلیخا کو بیاہ کر گھر لے آئی۔

چودھری نے کسی رسم میں شرکت نہ کی۔ شیر علی یہی سمجھتا رہا کہ وقتی غصہ ہے۔ اولاد کی محبت کے سامنے جلدی ٹھنڈا ہو جائے گا مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔

وقت گزرتا گیا، وہ ایک بچی کا باپ بن گیا۔ اس نے اپنی بچی کا نام بڑے فخر سے ''فاخرہ'' رکھا۔ بچی دو ماہ کی ہوگئی مگر دادا نے اس کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ کی۔

ایک دن شیر علی کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ بچی کو اٹھا کر اپنے باپ کے سامنے لے گیا۔ ''ابا جی! دیکھیں یہ آپ کی پوتی ہے۔'' اس نے کمبل میں لپٹی بچی کو باپ کی طرف بڑھایا۔

''پیچھے کر دا سے۔'' چودھری نے نخوت سے منہ پھیر لیا۔

''مگر ابا جی! اس معصوم کا کیا گناہ؟ آپ کو غصہ تو مجھ پر ہے نا۔ یہ تو بے قصور ہے۔'' شیر علی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''تم نے اپنی مرضی کرتے ہوئے، اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا۔ یہ بات اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ میں تمہاری بیوی اور بچوں کو کبھی قبول نہیں کروں گا۔ یہ ایک جولاہے کی نواسی ہے۔''

''مگر ابا جی..... یہ چودھری حشمت کی پوتی بھی تو ہے۔''

''نہیں، مجھے اپنے خون میں ملاوٹ نہیں چاہیے۔ اسے لے جاؤ۔''

علی شیر باپ کے رویے سے بہت دلبرداشتہ ہوا۔ اپنی اولاد کی یہ تضحیک اسے بہت گراں گزری لیکن وہ دل مسوس کر رہ گیا اور بچی کو لے کر الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔

اس کے بعد اس نے دوبارہ ایسی کوئی کوشش نہ کی اور ایک دن بیوی بچی کو لے کر گھر چھوڑ کر شہر چلا گیا۔

شہر جا کر ایک معمولی نوکری کر لی۔ پڑھا لکھا تو تھا ہی۔ باپ سے ورثے میں گھمنڈ اور تکبر تو نہ ملا تھا مگر ضد اور خودداری میں باپ سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔

وہ شہر گیا تو پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ اس کے جانے کے بعد چودھری قربان کے وارے نیارے ہو گئے۔ اس کے راستے کا پتھر خود ہی راستے سے ہٹ چکا تھا۔ وہ ہر سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔

ایک دن شیر علی دفتر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے سامنے پڑی میز پر اوندھے منہ گر گیا۔ دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ساتھیوں نے دیکھا تو جان نکل چکی تھی۔

چودھری حشمت کو جب بیٹے کی موت کی اطلاع ملی تو وہ دہل کر رہ گیا۔ چھوٹے بیٹے کو شہر بھیجا کہ جاؤ اور بھائی کی میت گاؤں میں لے آؤ۔

وہ گیا اور بھائی کے جسد خاکی کو گاؤں لے آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوہ اور یتیم بچی کو بھی لے آیا۔

شیر علی کی تجہیز و تکفین اپنے آبائی قبرستان میں کی گئی۔

آٹھ دس دن حویلی میں پکوان پکتے رہے۔ قورمے اور بریانی کی دیگیں چڑھتی رہیں۔

گیارھویں دن چودھری حشمت نے زلیخا کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''تم میرے بیٹے کی بیوی تھیں۔ میرے بیٹے کی زندگی تک تم یہاں رہ سکتی تھیں۔ اب وہ نہیں رہا تو تم بھی یہاں نہیں رہ سکتیں۔ اپنی بچی کو اٹھاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ۔''

''مگر میں کہاں جاؤں چودھری صاحب؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''جہاں دل چاہے چلی جاؤ۔ میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔''

وہ روتی دھوتی اپنی بچی کو لے کر اپنے باپ کے گھر چلی گئی اور اس طرح شیر علی کی زندگی کا باب ختم ہو گیا اور چودھری قربان کے راستے کی ہر رکاوٹ خود بخود دور ہو گئی۔ وہ سوا ایکڑ کا تن تنہا مالک بن بیٹھا تھا۔

چودھری حشمت نے اس کی شادی پر ہر وہ ارمان نکالے جو اس نے شیر علی کی شادی کے لیے دل میں دبائے ہوئے تھے۔ خود کو لوہے کی لٹھ کہنے والا چودھری حشمت بیٹے کی موت کے بعد ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ ایک سال کے اندر ہی غم نے اسے کھوکھلا کر دیا اور وہ گھل گھل کر مر گیا۔ اس کے مرتے ہی چودھری قربان نے لاہور شہر کا رخ کیا۔ وہاں اس نے ایک ٹیکسٹائل مل لگائی اور وہ چودھری قربان سے سیٹھ قربان بن گیا۔ اس کو خدا نے اولاد نرینہ کی شکل میں پہلے ارسلان دیا اور اس کے بعد اوپر تلے تین بیٹیاں دیں۔

ارسلان نے میٹرک کیا تو سیٹھ قربان نے اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکا بھیج دیا۔ بیٹا تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانا چاہتا تھا لیکن سیٹھ قربان کے دل میں اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان مچل اٹھا۔

☆☆☆

سیٹھ قربان دو ایکڑ پر نصب وسیع شامیانوں کے درمیان چکراتا پھر رہا تھا۔

وہ انتظامی امور کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی قسم کی کوئی کمی یا کوتاہی رہ جائے۔ پہلے دو دن کی تقریبات جیسے عالی شان گزری تھیں، وہ ویسے کی اس تقریب کو بھی اسی طرح شاندار اور بے مثال بنانا چاہتا تھا۔

بیگم اور بچوں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس نے اپنی آبائی حویلی میں ہی شادی کی تقریبات ادا کرنے کو فوقیت دی تھی۔

ایک طرف تو وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کو اپنا رعب اور شان و شوکت دکھانا چاہتا تھا اور دوسری طرف شہر سے آنے والے مہمانوں کو اپنی آبائی حویلی اور زمین و جائداد کی جھلک دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

.....اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

شہر سے آنے والے دوست اور..... احباب یہ سب انتظام دیکھ کر بہت متاثر ہوئے تھے۔ مہندی کا فنکشن تو حویلی کے لان میں ہی ارینج کیا گیا تھا۔ جہاں پُرشکوہ شامیانوں کے اندر ساری رات لاہور سے لائی گئی رقاصائیں رقص کرتی رہی تھیں اور شراب پانی کی طرح پی جاتی رہی تھی۔ اس کے ساتھ تلی ہوئی مچھلی اور بروسٹ مرغی کے تھال بھی گردش میں رہے تھے۔

اگلے دن جب برات تیار ہو کر لاہور کی جانب عازمِ سفر ہوئی تو دیکھنے والوں نے ایک انوکھا منظر دیکھا۔

کولہا چار گھوڑوں والی بگھی پر سوار تھا۔ اس کی شیروانی پر چھوٹے چھوٹے ہیرے جگمگا رہے تھے اور سر پر بندھی دستار کے درمیان ایک بڑے سائز کا ہیرا نصب تھا جو دور سے ہی لشکارے مار کر اپنے بیش قیمت ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

بگھی کے ساتھ چالیس پچاس مزید عربی نسل کے گھوڑے چل رہے تھے جن پر براتی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے قیمتی گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے راجا اندر کے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے۔

گاؤں کی عورتیں چھتوں سے اور مرد گلیوں اور بازاروں میں کھڑے یہ پُرشکوہ مناظر دیکھ رہے تھے۔

برات لاہور کے تاج محل ہوٹل میں پہنچی تو لڑکی کے باپ نے بھی ان کے استقبال میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہنے دی۔ بیٹی کے نرم و نازک وجود پر دس لاکھ کے عروسی لباس کے ساتھ پچاس لاکھ کی ڈائمنڈ جیولری سجا رکھی تھی۔ خالص دیسی گھی میں پکے ہوئے پکوانوں سے معزز مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ بیٹی کو پانچ کروڑ کا بنگلا دے کر رخصت کیا جبکہ داماد کو لینڈ کروزر پیش کی۔ دونوں گھرانے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ مارچ 2019ء
کی جھلکیاں

محسن اردو
وہ غیر مسلم تھا لیکن اس کا حکم تھا اسلامی کتب چھاپنے سے پہلے تمام مزدور وضو کر لیں۔ طباعت کی دنیا میں انقلاب برپا کر دینے والے کا زندگی نامہ

شہنشاہ جذبات
فلمی دنیا کے ایک تابندہ ستارے کی داستانِ جہد مسلسل

اتفاق
لوگ جسے بدقسمتی سمجھتے ہیں وہی ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے

کالا جادو
یورپ میں کالا جادو کس طرح متعارف ہوا، دلچسپ معلومات

کرب آشنائی
وہ سفید خون والے رشتے داروں میں گھری ہوئی تھی

اس کے علاوہ
بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے اور تاریخی حقائق۔
ایسی تحریریں جو سرگزشت کی پہچان ہیں

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے۔

نمود و نمائش کی عظیم الشان مثالیں پیش کر رہے تھے۔

سیٹھ قربان بہو کو بیاہ کر سیدھا اپنی آبائی حویلی میں آیا۔ رات گزری اور صبح ولیمے کی تقریب کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ اپنی زمینوں میں وسیع و عریض جگہ پر شامیانے نصب کیے گئے۔

خواتین اور مردوں کے حصے الگ الگ تھے۔ ان پر ہالوں طرح آرائش و زیبائش پر پیسا پانی کی طرح بہایا گیا۔ زمین پر دبیز قالین اور چھتوں سے بھاری بھرکم فانوس لٹکائے گئے۔ ان شامیانوں کو کھڑا کرنے کے لیے جابجا بھاری بھرکم اور آرائشی ستون کھڑے کیے گئے تھے۔ ان ستونوں کے ساتھ بھی لائٹیں لگی تھیں۔ سیٹھ قربان شامیانوں کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں شہر سے بلائے گئے تجربہ کار ... کک انواع و اقسام کے پکوان تیار کر رہے تھے۔

اس نے کھانے کا انتظام دیکھا۔ تسلی ہونے کے بعد عورتوں کے شامیانے کی طرف بڑھا۔ وہاں لڑکے ٹیبل اور کرسیاں سیٹ کر رہے تھے۔ کچھ لڑکے اسٹیج پر کھڑے اسٹیج کو سجا رہے تھے۔

سیٹھ قربان نے کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی میں وقت دیکھا تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو جائے گی' مجھے بھی اب کپڑے تبدیل کر لینے چاہئیں۔ یہ سوچتے ہوئے وہ حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کے پونے آٹھ بج چکے تھے۔ مہمان جوق در جوق اندر آ رہے تھے۔ ان مہمانوں میں گاؤں کے خالص دیہاتی اور شہر کے الٹرا ماڈرن لوگ بھی شامل تھے۔ سیٹھ قربان مہمانوں سے مصافحہ کرتا جا رہا تھا۔ مرد مہمانوں سے مل کر وہ خواتین والے شامیانے کی طرف بڑھا اور اندر جاتے ہی بیگم کوثر جہاں کی طرف لپکا۔

''بیگم ..... کسی قسم کی کوئی کمی تو نہیں؟'' اس نے کئی بار کا دہرایا ہوا جملہ پھر سے دہرایا۔

''نہیں کوئی کمی نہیں ..... ہر چیز بہت اعلیٰ طریقے سے ارینج کی گئی ہے۔'' بیگم نے شوہر کو مطمئن کرنے کی خاطر خواہ کوشش کی۔

سیٹھ قربان نے وہاں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا۔ مہمان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ پھر اس نے سامنے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے اپنے بیٹے اور بہو کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف جھکے، آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ بیٹا قیمتی تھری پیس سوٹ میں خوب جچ رہا تھا۔

سیٹھ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ ''سیٹھ قربان کے بیٹے کی شادی کو لوگ مدتوں یاد رکھیں گے۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' بیگم کوثر جہاں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''نہیں ..... اب تو دلہن کے میکے والوں کا انتظار ہے، وہ آ جائیں تو کھانا کھول دیں۔''

''آپ پریشان نہ ہوں آ جائیں گے۔ ابھی ابھی سمدھن کا فون آیا ہے۔ وہ بس پہنچنے ہی والے ہیں۔''

بیگم نے مسکرا کر جواب دیا تو سیٹھ قربان بھی مسکرانے لگا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ اب اس کی نظر اس راستے پر جمی ہوئی تھی جہاں سے مہمانوں کی گاڑیوں کے قافلے نے آنا تھا۔

☆☆☆

فاخرہ اپنے گھر کی کچی چھت پر منڈیر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہوں کا محور و مرکز بھی دور کھیتوں میں نصب وہی شامیانے تھے جہاں سے رنگ برنگی اشتہا آمیز خوشبوئیں اٹھ کر فضا میں بکھر رہی تھیں۔ وہ دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔

اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور گالوں پر بہنے لگے اور ماں کا کثرت سے کہا ہوا ایک جملہ ذہن میں گونجنے لگا۔

''فاخرہ! تم نے شکل صورت کے ساتھ ساتھ مجھ سے میرا نصیب بھی لے لیا۔'' اور تب وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیتی تھی۔

اس نے ہوش اپنے غریب نانا کے گھر میں ہی سنبھالا تھا۔ نانا بہت اچھے تھے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

نانا کے دو بچے تھے۔ اس کی ماں اور اس کا ماموں۔

ماموں پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس کا بھی ایک ہی بیٹا تھا جو فاخرہ سے تین چار سال بڑا تھا۔ فاخرہ ساجد کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئی۔ ساجد نے بی اے کیا تو شہر میں، ایک غیر معروف اور نجی بینک میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ دونوں بہن بھائیوں نے آپس میں مشورہ کر کے فاخرہ کی شادی ساجد سے کر دی۔ زلیخا نے حویلی والوں کے حوالے سے کوئی بھی آس امید نہیں لگائی تھی۔ اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ فاخرہ صرف اس کی بیٹی ہے۔

فاخرہ شادی کے بعد شوہر کے ساتھ شہر آ گئی۔ جلد ہی وہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔ اس کا بیٹا تین سال کا تھا جب

اس کا شوہر بینک ڈکیتی کی واردات میں ڈاکوؤں کی گولی کا نشانہ بن کر، مردہ حالت میں گھر آیا۔ اس نے ڈاکوؤں کے سامنے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی۔

تب ماں اسے گلے سے لگا کر بہت روئی اور کہنے لگی کہ کاش فاخرہ تم میرے جیسی قسمت لے کر پیدا نہ ہوتیں۔ تاریخ نے پھر سے خود کو دہرایا۔

زلیخا بھی جلد ہی ٹی بی کی بیماری میں گھل گھل کر مر گئی۔ اس نے علاج کرانے سے مرنا زیادہ بہتر اور آسان سمجھا۔ جبکہ نانا تو برسوں پہلے ہی ملک عدم سدھار چکے تھے۔

فاخرہ ماموں کے ساتھ زندگی کے شب و روز بسر کرنے لگی۔ بیٹے کو اس نے گاؤں کے اسکول میں داخل کروادیا۔ ماموں بھی اب بیمار رہتا تھا۔ زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنا مشکل ہوگیا۔ کئی بار نوبت فاقوں تک آ گئی۔

فاخرہ کئی بار اس پُرشکوہ حویلی کے پاس سے گزری جس میں اس کے باپ نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی اور جہاں اس کا باپ اس کی ماں کو بیاہ کر لے گیا تھا۔ جب حالات زیادہ تنگ ہو گئے تو اس نے سوچا کہ اسے اپنے چچا سے مدد مانگنی چاہیے۔ خون کا رشتہ ہے۔ شاید خون جوش مار جائے۔ یہی سوچ کر اس نے حویلی کی ایک ملازمہ سے چچا کا ایڈریس لیا اور ماموں کو ساتھ لے کر لاہور سیٹھ قربان کے بنگلے پر پہنچ گئی۔

چچا، چچی نے رسمی سے انداز میں اس کا استقبال کیا۔ اس نے چچا کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔ چودھری قربان کے دل میں رحم کی ایک موہوم سی لہر نے سر اٹھایا اور اس نے دس ہزار مہینے کی ہامی بھر لی۔ ان ماں بیٹے کے گزارے کے لیے یہ رقم کافی تھی۔ ان کی ضروریات بہت محدود تھیں۔

پھر اس کا بیٹا ابرار بیمار رہنے لگا۔ اسکول سے آتا تو چارپائی پر لیٹ جاتا۔ کئی بار سانس رکنے لگتی۔ سانس لینے کے لیے زور لگانے لگتا۔ فاخرہ بہت پریشان ہوئی۔

ایک دن اسے شہر ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے کچھ ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیے۔ ٹیسٹ کافی مہنگے تھے، اس نے ٹیسٹ کروائے اور جو رپورٹ سامنے آئی، وہ فاخرہ کو زندہ درگور کرنے کے لیے کافی تھی۔ رپورٹ کے مطابق اس کے لختِ جگر کے دل میں سوراخ تھا۔ یہ سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی زندگی کا محور و مرکز تو اب فقط ابرار کی ذات تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس کی بیماری کا واحد حل آپریشن تھا جس پر پانچ خرچ آتا۔ وہ روتی ہوئی پھر سے چچا کے پاس پہنچ گئی مگر چچا نے جب پچاس ہزار کا چیک اس کی طرف بڑھایا تو اس نے وہ چیک پھاڑ کر چچا کے منہ پر دے مارا اور ہر مہینے دس ہزار روپے خرچے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ وہ گھر آ گئی۔ بیٹے کی دن بدن خراب ہوتی ہوئی حالت کو دیکھ کر سوائے جلنے کڑھنے کے اور کچھ نہ کر سکی۔

جس رات مہندی کی عیش و نشاط والی محفل جمی تھی، اس رات اس کا بیٹا رات بھر تڑپتا رہا تھا وہ ایک منٹ کے لیے بھی سکون سے خود سویا تھا، نہ اسے سونے دیا تھا۔ اگلے دن برات کی شان و شوکت اور روانگی اس نے بھی اپنی چھت سے دیکھی تھی اور برات کا قافلہ گزر جانے کے بعد آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے رب سے کوئی شکوہ بھی کیا تھا۔

شام تک اس کے بیٹے کی حالت بہت زیادہ بگڑ چکی تھی۔ اب وہ روتا چلاتا نہیں رہا تھا بلکہ نیم بیہوش ہو چکا تھا اور کھینچ کھینچ کر گہری سانسیں لے رہا تھا۔

وہ بیٹے کے پاس بیٹھی پوری رات یہی دعا مانگتی رہی۔ ''یا اللہ اس کی تکلیف کو ختم کر کے اسے سکون دے دے۔''

کیونکہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ اس کو بچا نہیں سکتی۔ لہٰذا وہ اس کی موت کی دعا ہی مانگ رہی تھی۔

اپنی آنکھوں کے سامنے وہ اسے پل پل موت کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ رات کو جب برات واپس آئی اور برات واپس آنے کی خوشی میں انار اور پٹاخے چھوڑے گئے، تب اس کا بیٹا اس کی بانہوں میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ رات کے دس بجے بچے نے آنکھیں موند لیں اور پُرسکون ہو گیا۔

وہ ہمیشہ کے لیے ساری تکلیفوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کا ڈھیلا پڑتا جسم دیکھ کر فاخرہ کو بھی جیسے سکون سا مل گیا۔ وہ بیٹے کی تکلیف دیکھ دیکھ کر ہر روز، ہر پل مرتی تھی۔ آج بیٹے کو سکون ملا تو وہ بھی پُرسکون ہو گئی تھی۔

کچھ تکلیفیں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ انہیں رفع کرنے کے لیے موت بھی ایک نعمت محسوس ہونے لگتی ہے۔

گاؤں کی زیادہ تر عورتیں تو حویلی میں دلہن دیکھنے کے لیے جا پہنچی تھیں مگر اس غریب کے گھر بھی دس پندرہ عورتیں آ کر بیٹھ ہی گئیں۔

ساری رات میت کے پاس بیٹھی وہ چپ چاپ بیٹے کا منہ دیکھتی رہی۔ رونے کا کوٹا تو وہ پہلے ہی پورا کر چکی تھی۔ اب تو آنکھوں میں صرف ویرانی اور وحشت بچی تھی۔ صبح کے نو بجے جنازے کا وقت رکھا گیا۔ جنازہ اٹھنے سے چند منٹ پہلے چچا اور چچی بھی آئے۔ رسمی افسوس کیا اور فاخرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کے دلاسا دینے کی کوشش بھی کی۔

چچا نے پھر سے پچاس ہزار کا ایک چیک اس کی طرف بڑھایا۔

''پکڑلو فاخرہ پتر—— کام آئیں گے۔''

''نکی چچا—— اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔'' وہ تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ یہ کہہ کر کہ شادی کے بہت سے انتظامات کرنے ہیں۔

بیمار رخصت ہو گیا۔ محلے والیاں اور رشتے دار عورتیں بھی شام تک رخصت ہو گئیں۔ وہ صحن سے اٹھی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی چھت پر آ گئی۔

وہ چھت کی منڈیر سے ٹیک لگائے، منڈیر کی جالیوں سے شامیانوں کا یہ میلا دیکھنے لگی جہاں رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔

سیٹھ قربان شامیانوں کے آگے کھڑا اس راستے پر نظریں جمائے کھڑا تھا جہاں سے اس کے سمدھی نے اپنے قافلے سمیت آنا تھا۔

اس کا ایک پرانا دوست اور کزن ٹہلتا ہوا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''کیا بات ہے، کس کی راہ دیکھ رہے ہو سیٹھ؟''

''یار مہمان ابھی تک نہیں آئے—— وہ آئیں تو کھانا کھول دوں۔ لوگ انتظار کر کر کے اوب چکے ہیں۔''

''آ جاتے ہیں تھوڑی دیر تک—— ویسے برات گھوڑوں پر لے جانے کا آئیڈیا بہت شاندار تھا۔ یہ آئیڈیا کس نے دیا تھا؟''

''بس تھا کوئی سجن تمہاری طرح۔'' سیٹھ قربان ہنسا۔ ''تم بتاؤ کبھی ایسی برات دیکھی ہے؟'' سیٹھ نے فخر سے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

''نہیں یار! تم نے تو پھٹیاں اکھیڑ دیں۔ بہت مزہ آیا بچ میں اور مہندی کا فنکشن تو ایسا تھا کہ ساری زندگی یاد رہے گا۔'' وہ بائیں آنکھ میچ کر ہنسا۔

وہ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ مارچ کے وسطی دن چل رہے تھے۔ اس لیے یہ ہوا بھی بھلی لگ رہی تھی۔ چند ہی منٹ کے اندر اس ہوا نے تیز رفتار آندھی کا روپ دھار لیا اور آندھی طوفان میں بدل گئی۔ سیٹھ نے بوکھلا کر شامیانوں کی طرف دیکھا تو وہ بری طرح ہوا میں جھول رہے تھے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اسی وقت مردوں والی سائڈ کا شامیانہ گر گیا۔ ایک دو منٹ بعد ہی عورتوں کی سائڈ والا شامیانہ بھی گر گیا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ بڑے اور بچے شامیانوں کے نیچے زخمی پرندوں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ گرد و غبار نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے اچانک کوئی قہر نازل ہو گیا ہو۔ سیٹھ قربان اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چلا رہا تھا۔ وہ اپنے ملازموں کو آوازیں دے رہا تھا۔

ابھی باد و باراں کا یہ تند طوفان اپنے جوبن پر تھا کہ ایک نئی افتاد آ پڑی۔ شامیانوں میں اچانک آگ بھڑک اٹھی اور اس آگ نے دیکھتے ہی دیکھتے بھڑکتے شعلوں کا روپ دھار لیا۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ سیٹھ قربان دیوانوں کی طرح چلانے لگا۔

''آگ بجھاؤ...... آگ بجھاؤ......'' مگر وہاں آگ بجھانے کے لیے کوئی بھی خاطر خواہ انتظام موجود نہ تھا۔ کچھ لوگ جان بچا کر خیموں کے نیچے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے مگر زیادہ تر اندر ہی گھٹ کر اور جھلس کر مر گئے۔

سیٹھ قربان اپنے بال نوچ رہا تھا۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ وہ بار بار آگ کے شعلوں کی طرف جا رہا تھا اور اس کے دوست احباب اس کو زبردستی پکڑ رہے تھے۔ اسی وقت مہمانوں کی گاڑیاں بھی آ کر رکنے لگیں۔ یہ طوفان آدھے گھنٹے میں تھم گیا مگر اس وقت تک ہر چیز جل کر خاکستر ہو چکی تھی۔ سیٹھ نڈھال سا سر جھکائے زمین پر بیٹھا تھا۔

اس کے سامنے اس کی پوری دنیا جل کر بھسم ہو چکی تھی۔ اس کے بچے...... اس کی بیوی۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان جلے ہوئے شامیانوں کو دیکھ رہا تھا جو اب جلے ہوئے ملبے کے ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے اور اس ڈھیر سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔

سیٹھ قربان کی یہ خواہش پوری ہو گئی کہ وہ اس شادی کو ناقابل فراموش بنانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے بیٹے کی شادی ایسی ہو کہ لوگوں کے ذہنوں سے محو نہ ہونے پائے۔

اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی تھی۔ یہ شادی اب مدتوں یاد رکھے جانے کے قابل تھی۔ یہ تباہی و بربادی اور اس قدر جانی نقصان بھلا کب فراموش کیے جانے والا تھا۔

چھت کی منڈیر سے لگی فاخرہ بھی یہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے آگ لگتے بھی دیکھی اور آگ سے جل کر ہر چیز کو بھسم ہوتے بھی دیکھا اور اب وہ ان سلگتے ہوئے شامیانوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ حیرت سے آسمان کی طرف دیکھنے لگی جو اپنا قہر برسا کر اب پرسکون ہو چکا تھا۔

"مارشل آرٹ ایک فن ہے اور میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے بعد کبھی اس کا منفی استعمال نہ کیجیے گا بلکہ اپنی مہارت کو مثبت انداز میں استعمال کیجیے گا۔ آپ اس فن میں کتنی بھی مہارت حاصل کرلیں مگر آپ کی کوشش ہمیشہ یہی ہونی چاہیے کہ جھگڑے وغیرہ سے حتی الامکان بچا جائے۔ اگر کسی سے تلخ کلامی ہو بھی جائے تو اس بات کی نوبت نہ آنے دی جائے کہ معاملہ جسمانی تصادم تک جا پہنچے۔" چاؤ فان نے اپنے مارشل آرٹ کے شاگردوں کو لیکچر دیتے ہوئے کہا۔

چاؤ فان جاپانی نژاد تھا مگر برسوں پہلے جاپان سے

بھلائی کے ارادے سے سمت بدلنے والے ایک نیک انسان کی جنگ

فائٹنگ کا ہنر جہاں انسان کو تحفظ فراہم کرتا ہے وہاں کبھی کبھی اسے ظلم کا نشان بھی بنا دیتا ہے... بات صرف اس کے استعمال کی ہوتی ہے' چین اور جاپان جیسے ممالک اس معاملے میں بہت آگے ہیں جہاں فائٹنگ کے مختلف داؤپیچ کی تربیت کے لیے باقاعدہ بڑے بڑے ادارے موجود ہیں اور وہ بھی انہی اداروں کا تربیت یافتہ فائٹر تھا۔

عجیب

شاکر لطیف

امریکا آکر آباد ہوگیا تھا۔ اس نے شادی بھی فرگوسن نامی ایک امریکی لڑکی سے کی تھی۔ اب تو اس کی شادی کو بھی ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا اور اسے امریکی شہریت بھی حاصل ہوچکی تھی۔ وہ دو بچوں کا باپ تھا اور امریکا میں پیدا ہونے کی وجہ سے اس کے بچوں کو بھی امریکی شہریت حاصل تھی۔

چاؤ فان مارشل آرٹ میں بے پناہ مہارت رکھتا تھا اور مارشل آرٹ کا یہ فن اس نے اپنے آبائی ملک جاپان میں ہی سیکھا تھا۔ امریکا آنے کے بعد بھی وہ اسی فن سے وابستہ رہا بلکہ اس نے اپنے اس فن کو روزگار کا ذریعہ بھی بنایا تھا۔

اس نے یہاں مارشل آرٹ کی ٹریننگ کا ایک چھوٹا سا ادارہ کھول رکھا تھا جہاں وہ اس فن کے شوقین حضرات کو اس فن کے قدیم وجدید داؤ پیچ سکھاتا تھا۔

شروع شروع میں اس کا یہ ٹریننگ سینٹر خوب چلتا رہا اور چاؤ فان کو اتنی آمدن بھی ہوجاتی تھی کہ وہ ایک پُرآسائش زندگی گزار رہا تھا۔ ان دنوں امریکا کے نوجوانوں میں مارشل آرٹ سیکھنے کا ایک جنون پایا جاتا تھا۔ ان کے اس جنون کو ہوا دینے میں سب سے بڑا ہاتھ امریکی سنیماؤں پر چلنے والی فلموں کا تھا۔ ان فلموں کی زیادہ تر کہانیاں مارشل آرٹ کے ماہرین کے گرد ہی گھومتی تھیں۔ اسی لیے نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ اس فن کے قدردانوں میں شامل تھا۔ جس کی وجہ سے چاؤ فان کے ٹریننگ سینٹر میں اتنا رش ہوتا تھا کہ بسا اوقات جگہ کم پڑنے لگتی۔

کچھ عرصے بعد امریکی سنیماؤں پر چلنے والی فلموں کے موضوع بدل گئے۔ ہاتھوں کی لڑائی کی جگہ مسلح تصادم نے لے لی تو فلموں سے متاثر ہوکر چاؤ فان کے ٹریننگ سینٹر کا رخ کرنے والے نوجوانوں کا ذہن بھی تبدیل ہوگیا اور بہت سے نوجوانوں کا رجحان ہتھیار کی جانب ہونے لگا۔ انہیں لگنے لگا کہ اگر ایک شخص اپنی پوری زندگی مارشل آرٹ کا فن سیکھنے میں لگا دیتا ہے تو اس پر اس مسلح شخص کو برتری حاصل ہوگی جس نے صرف چند دن اسلحہ چلانے کی ٹریننگ حاصل کر رکھی ہوگی۔ وہ ایک گولی چلا کر کسی بھی مارشل آرٹ کے ماہر کو چشم زدن میں ڈھیر کرسکتا ہے تو پھر مارشل آرٹ سیکھنے پر اتنا وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ۔

نوجوانوں میں جیسے جیسے یہ سوچ پروان چڑھتی گئی، چاؤ فان کے ٹریننگ سینٹر میں اسٹوڈنٹس کی تعداد کم ہوتی گئی اور چاؤ فان جو کبھی اپنے اس ٹریننگ سینٹر کی بدولت ایک پُرتعیش زندگی گزار رہا تھا، ایسے حالات سے دوچار ہوگیا کہ اسے اپنے گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے بینک سے لون لینا پڑا۔ چاؤ فان نے بینک سے لون لیتے وقت اپنا فلیٹ اور ٹریننگ سینٹر کے لیے استعمال ہونے والی جگہ، دونوں گروی رکھوائے تھے۔ اس وقت تک اس کا خیال تھا کہ جلد ہی اس کے ٹریننگ سینٹر میں اسٹوڈنٹس کی تعداد میں اضافہ ہوجائے گا مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ حالات اس کی توقع کے برعکس مزید بدتر ہوتے چلے گئے۔ وہ بینک کے لون کی اقساط بھی ادا نہیں کر پایا تھا جس کی وجہ سے سود در سود چڑھتا چلا گیا اور اب یہ حالت ہوچکی تھی کہ اسے بینک کی طرف سے آخری نوٹس موصول ہوگیا تھا جس کے مطابق اگر وہ ایک ماہ کے اندر اندر بینک کا قرضہ بمع سود نہ ادا کر پاتا تو بینک اس کے فلیٹ اور مارشل آرٹ کے ٹریننگ سینٹر کو نیلام کرکے اپنا سرمایہ حاصل کرلیتا۔

چاؤ فان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ اب اسے مزید مہلت نہیں ملے گی۔ اسے ایک ماہ کے اندر اندر بینک کی رقم جو سود سمیت تقریباً تیس ہزار ڈالرز بنتی تھی کا بندوبست کرنا تھا اور فی الفور ایسا کوئی ذریعہ نظر نہیں آرہا تھا جس کی مدد سے وہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کر پاتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ چاؤ فان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اب تو اس کے ٹریننگ سینٹر میں بھی برائے نام اسٹوڈنٹس ہی رہ گئے تھے۔ جدید سائنس فکشن فلموں کی بھرمار نے نوجوانوں کی سوچ ہی بدل ڈالی تھی۔ اب انہیں مارشل آرٹ کے اس فن سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ چاؤ فان اس امید پر ہر روز اپنے ٹریننگ سینٹر میں آتا تھا کہ جلد ہی اس کے اسٹوڈنٹس کی تعداد میں اضافہ ہوجائے گا مگر شاید یہ بھی اس کی خوش فہمی تھی۔ جس ٹریننگ سینٹر میں کبھی تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی، اب وہاں گنتی کے اسٹوڈنٹس رہ گئے تھے۔

آج چاؤ فان انہیں خنجر زنی کی تربیت دے رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ متنبہ بھی کررہا تھا کہ اپنی مہارت کا کبھی بھی ناجائز یا غلط استعمال نہیں کرنا۔ اپنی سوچ کو ہمیشہ مثبت رکھنا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کو کبھی ایسے عجیب حالات کا سامنا کرنا پڑے جب آپ کو اپنی خنجر زنی کی مہارت کو استعمال کرنا پڑے۔ اسی لیے آپ سب نے خنجر زنی کو ایک آرٹ کے طور پر سیکھنا ہے۔ شوقیہ اس مہارت کو کسی پر نہیں آزمانا۔ امریکا میں کسی کو خنجر سے محض ڈرانے پر بھی سخت سزا ہوسکتی ہے۔ قانون کا احترام ہر امریکی شہری پر لازم ہے اور آپ نے بھی قانون کا احترام کرنا ہے۔

چاؤ فان نے تقریباً شام پانچ بجے کے قریب اپنے

مارشل آرٹ کے تمام شاگردوں کو چھٹی دے دی اور پھر اپنا ٹریننگ سینٹر بند کر کے خود بھی گھر روانہ ہوگیا۔ اس کا گھر وہاں سے زیادہ دوری پر نہ تھا اس لیے وہ کسی ٹیکسی وغیرہ پر جانے کے بجائے پیدل ہی اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ یہ اس کا معمول بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کو جسمانی مشقت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ پیدل چلنا بھی ایک طرح کی جسمانی مشقت ہی ہے۔ اگرچہ اپنے مارشل آرٹ کے شاگردوں کو ٹریننگ دینے کے دوران وہ خود بھی سخت جسمانی مشقت سے گزرتا تھا۔ تاہم اس کے باوجود وہ پیدل چلنے کی یہ اضافی ورزش بھی کرتا تھا۔

تقریباً بیس منٹ تک پیدل چلنے کے بعد وہ اس بلند و بالا عمارت کے پاس پہنچ گیا جس کی گیارھویں منزل پر اس کا فلیٹ واقع تھا، اگرچہ عمارت میں لفٹ نصب تھی مگر چاؤ فان نے اپنی عادت کے مطابق سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ سیڑھیوں کے راستے گیارھویں منزل تک پہنچتے پہنچتے بھی اس کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی۔

گھنٹی بجانے پر دروازہ اس کی بیوی فرگوسن نے کھولا تو وہ خاموشی سے سر جھکائے اندر داخل ہوگیا۔

''بچے نظر نہیں آرہے؟'' ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے فرگوسن سے سوال کیا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں۔'' فرگوسن نے جواب دیا مگر اس کا غصیلا لہجہ سن کر چاؤ فان چونک پڑا۔

''کیا بات ہے؟ تمہارے لہجے سے لگ رہا ہے کہ تم خاصی غصے میں ہو۔'' چاؤ فان نے نرم لہجے میں سوال کیا۔ وہ جانتا تھا کہ موجودہ معاشی حالات کی وجہ سے اس کی بیوی فرگوسن کچھ عرصے سے ڈپریشن میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتی تھی۔ چاؤ فان ہمیشہ اس سے نرم لہجے میں بات کرتا تھا۔ آج بھی اس نے حتی الامکان اپنا لہجہ نرم ہی رکھا تھا ورنہ یہ حقیقت تھی کہ معاشی پریشانیوں نے اسے بھی کافی حد تک چڑچڑا بنا دیا تھا۔

''آج ٹامی اور مارٹی کو اسکول سے نکال دیا گیا ہے..... پچھلے چار ماہ کی فیس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے۔'' فرگوسن نے جواب دیا تو چاؤ فان نے حلق سے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ ٹامی اور مارٹی چاؤ فان کے بچوں کے نام تھے اگرچہ چاؤ فان خود جاپانی نژاد تھا۔ تاہم اس کی بیوی نے بچوں کے نام امریکی طرز کے ہی رکھے تھے۔ چاؤ فان کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ اب تو اسے جاپان چھوڑے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا اور وہ خود بھی امریکی لائف اسٹائل اپنا چکا تھا۔

اس نے اپنے دونوں بچوں کو شہر کے ایک مہنگے اسکول میں داخل کروا رکھا تھا۔ جب اس کا ٹریننگ سینٹر چلتا تھا تو اس وقت اس کے لیے اپنے بچوں کی فیس ادا کرنا بہت آسان تھا۔ ٹریننگ سینٹر میں اسٹوڈنٹس کی تعداد کم ہونے پر چاؤ فان نے اپنی بیوی فرگوسن کے اس مشورے کو مسترد کر دیا کہ ٹریننگ سینٹر کی جگہ کو فروخت کر کے کوئی دوسرا بزنس شروع کر دے۔ مارشل آرٹ اس کا شوق بلکہ جنون تھا اور چاؤ فان کی دلی خواہش تھی کہ اپنے اس فن کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے۔ اسی لیے برسوں تک وہ اپنے اس ٹریننگ سینٹر کو اس امید پر چلاتا رہا کہ ایک دن اس کے کلب میں پھر سے اسٹوڈنٹس کا رش ہو جائے گا۔ اس دوران وہ اپنے گھر کے اخراجات بینک سے قرض لے کر پورے کرتا رہا مگر اب اس پر اتنا قرض چڑھ چکا تھا کہ بینک کی طرف سے آخری نوٹس آگیا تھا اور آج اس کے دونوں بچوں کو بھی فیس ادا نہ کرنے کی وجہ سے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ چاؤ فان کے معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور اسے کوئی ایسا حل نظر نہیں آرہا تھا جس سے وہ اپنے موجودہ حالات میں تبدیلی لا سکتا۔

فرگوسن نے اس کے سامنے موجود ٹیبل پر کافی کا کپ رکھا تو وہ چونک کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آگیا۔ نہ جانے وہ کب کچن میں جا کر اس کے لیے کافی بنا لائی تھی۔

چاؤ فان نے خاموشی سے کپ اٹھایا اور کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ اس دوران میں فرگوسن نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور چاؤ فان کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی پر چونکا دینے والی خبر چل رہی تھی اس لیے چاؤ فان بھی خبروں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ویسے اس قضیے سے وہ پہلے سے واقف تھا۔ شہر میں ہونے والے پراسرار قتل میں آج ایک اور کا اضافہ ہوگیا تھا۔ آج رابرٹ نامی ایک بوڑھے کو شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے پاس موجود نقدی اور قیمتی گھڑی غائب تھی۔ قاتل نے اس کی شہ رگ پر خنجر سے وار کیا تھا جس کی وجہ سے رابرٹ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ شہر میں ایک سیریل کلر پچھلے چند ماہ سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔

چاؤ فان پہلے بھی اس پراسرار قاتل اور ڈاکو کی اندوہناک وارداتوں کے بارے میں خبریں دیکھتا رہا تھا۔

اس پراسرار قاتل نے ابھی تک پورے شہر کی پولیس کو چکرا کر رکھا ہوا تھا۔ ابھی تک پولیس اس کے بارے میں کوئی ثبوت حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ موقعۂ واردات پر قاتل کے فنگر پرنٹس بھی نہیں ملتے تھے جس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہ تھا کہ یہ قاتل بہ وقتِ واردات اپنے ہاتھوں پر ربر کے دستانے پہنتا تھا۔ اس قاتل نے پورے شہر کو خوف میں مبتلا کر رکھا تھا۔

چاؤ فان ایسی خبروں کو دلچسپی سے دیکھتا تھا اور اس کی ایک وجہ بھی تھی۔ ابھی تک جتنے بھی قتل ہوئے تھے اس بارے میں پولیس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ قاتل نے کسی بھی مقتول پر خنجر کا دوسرا وار نہیں کیا۔ کسی مقتول کے جسم پر کوئی زخم نہیں ملتا تھا بس اس کی شہ رگ کاٹ دی جاتی تھی۔ پولیس کے مطابق قاتل خنجر زنی میں انتہائی مہارت رکھتا تھا اور چاؤ فان کے ان خبروں میں حد سے زیادہ دلچسپی لینے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ خود بھی ایک ماہر خنجر زن تھا اور اتنی صفائی سے کسی کی شہ رگ کاٹ دینا کسی اناڑی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے اخبارات اور ٹی وی پر مقتولین کی انتہائی قریب سے لی گئی تصاویر دیکھنے کے بعد ہی یہ رائے قائم کی تھی کہ قاتل خنجر زنی کے میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ تاہم کچھ باتوں نے چاؤ فان کو حیرت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ قاتل کا مقصد لوٹنا تھا یا مارنا؟ پولیس رپورٹ کے مطابق تمام مقتولین کی جیبوں سے ہر قیمتی شے اور نقدی نکال لی جاتی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل کا اصل مقصد شاید لوٹنا ہی تھا مگر پھر وہ اپنے شکار کو موت کے گھاٹ کیونکر اتار دیتا تھا؟ اپنے طور پر ایسے راہ گیروں کو لوٹنے والے ڈاکو کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے سے گریز کرتے تھے۔ تاہم مزاحمت کی صورت میں وہ ایسا کر گزرتے تھے مگر ان وارداتوں میں یکسانیت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل دانستہ اپنے شکار کو موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔ اس بارے میں پولیس کا موقف یہ تھا کہ قاتل کوئی جنونی شخص ہے جسے لوٹنے کے ساتھ ساتھ اپنے شکار کو بے بسی سے موت کے گھاٹ اتار دینے میں بھی مزہ آتا ہے۔ پولیس کے مطابق قاتل سیریل کلر اور ڈاکو ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی مریض بھی تھا۔

''اس بار وارداتیں ہمارے علاقے میں ہوئی ہے اور خنجر زنی میں تم بھی خاصی مہارت رکھتے ہو۔'' چاؤ فان نے اپنی بیوی فرگوسن کی بات سنی اور فوراً بولا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ قتل میں کر رہا ہوں۔'' اس کے لہجے میں غصے کی جھلک واضح تھی ورنہ وہ اپنی چڑچڑی بیوی سے زیادہ تر نرم لہجے میں بات کرتا تھا مگر آج اس نے جس طرح کی بات کی تھی، اسے سن کر چاؤ فان کو حقیقتاً غصہ آگیا تھا۔ وہ ایک قانون پسند اور پرامن شخص تھا۔ کسی کو قتل کرنا تو درکنار اس نے کبھی اس طرح کے مذموم فعل کا ارتکاب کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ شاید اس لیے اسے فرگوسن کی بات سن کر غصہ آگیا تھا۔

''میں نے نہ تو تم پر الزام لگایا ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں تمہارا نام لیا ہے پھر تمہارے غصے میں آنے کی کیا وجہ ہے؟'' فرگوسن بھی شاید اسے چڑانے کے ارادے سے اس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔

''تو پھر تم یہ فرض کرلو کہ یہ تمام قتل میں ہی کر رہا ہوں۔ تم سے جو ہوسکتا ہے کرلو۔'' چاؤ فان نے جھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میں ایک امریکی عورت ہوں۔ میں نے ہمیشہ قانون کا احترام اور پابندی کی ہے۔ ایسی کسی بھی صورت میں، میں تمہیں قانون کے حوالے کرنے کی پابند ہوں گی۔'' فرگوسن نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

چاؤ فان نے اس بار بغور فرگوسن کے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر اس کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ فرگوسن کے چہرے کا بغور جائزہ لینے پر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ یہ تمام باتیں محض شرارتاً کر رہی تھی ورنہ وقتی طور پر وہ اس کی باتوں سے واقعی چکرا گیا تھا۔

''دیکھو فرگوسن! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔'' چاؤ فان نے اس بار حتی الامکان اپنا لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو بس ذہنی تناؤ کم کرنے کے لیے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی تھی۔'' فرگوسن نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ویسے اگر واقعی تم وہ پراسرار قاتل ہوتے اور مجھے تمہارے بارے میں پتا چل جاتا تو میں حقیقتاً تمہیں پولیس کے حوالے کردیتی کیونکہ اس طرح ہمارے تمام معاشی مسائل حل ہوجاتے۔ تم جانتے ہی ہو کہ پولیس نے اس قاتل کی گرفتاری میں مدد فراہم کرنے والے کے لیے دو لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم کا اعلان کر رکھا ہے اور مجھے دو لاکھ ڈالرز کے بدلے تمہاری قربانی منظور ہے۔''

''اب تو میرے دل میں بھی یہ خواہش مچلنے

گئی ہے کہ کاش میں وہی ہوتا۔" چاؤ فان نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "دو لاکھ ڈالرز کی رقم اگر مجھے مل جائے تو میرے تمام مسائل حل ہو جائیں۔ ہم سب کی زندگی پہلے والی ڈگر پر آجائے گی۔"

"اب اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ مارٹی کی رپورٹ لے کر آئے ہو یا نہیں؟" فرگوسن نے کہا تو چاؤ فان کے چہرے پر ندامت کے تاثرات امڈ آئے۔

مارٹی اس کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔ پچھلے دنوں اس کے سر میں شدید درد ہوا تھا جس کے بعد فرگوسن اسے اسپتال لے گئی تھی۔ چاؤ فان اس وقت اپنے ٹریننگ سینٹر میں تھا۔ تاہم فرگوسن کے فون کرنے پر وہ بھی اسپتال پہنچ گیا تھا۔

ڈاکٹر کے انجکشن لگانے پر مارٹی کو آرام تو آگیا تھا مگر ڈاکٹر نے مارٹی کے سر کے کچھ ٹیسٹ بھی کیے تھے جن کی رپورٹ بعد میں ملنا تھی۔ ڈاکٹر نے فرگوسن اور چاؤ فان کو چند دن بعد آنے کا کہا تھا اس کا کہنا تھا کہ رپورٹ آنے کے بعد ہی مارٹی کے اس سر درد کی وجوہات کی تشخیص ہو سکے گی۔

آج رپورٹ مل جانی تھی مگر چاؤ فان اپنی پریشانیوں میں یہ بات ذہن سے محو کر بیٹھا تھا کہ آج اسے رپورٹس لینے اسپتال جانا تھا۔

"مجھے خیال نہیں رہا۔" چاؤ فان شرمندہ سے لہجے میں بولا۔ "کل لے آؤں گا۔"

فرگوسن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور دوبارہ ٹی وی دیکھنے میں منہمک ہو گئی۔ چاؤ فان بھی خبریں دیکھنے لگا۔

خبروں کا موضوع ابھی تک وہی پراسرار قاتل تھا جس نے چند ماہ میں ہی پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ شہر میں ڈکیتی و قتل کی ان وارداتوں کی شروعات اچانک ہی ہوئی تھی۔ اگرچہ شہر کے ایک بڑے حصے میں حکومت کی جانب سے جدید کیمرے نصب کیے گئے تھے۔ جن کی مدد سے ہر آنے جانے والے پر ایک کنٹرول روم میں بیٹھ کر آسانی سے نظر رکھی جا سکتی تھی مگر یہ قاتل بہت ہوشیار و چالاک تھا۔ وہ وارداتیں کرنے کے لیے ہمیشہ شہر کے مضافاتی علاقوں کا انتخاب کرتا تھا۔ ایسے علاقوں میں کیمرے نصب نہیں تھے۔ پولیس کی جانب سے یہ دعویٰ بھی کیا جا رہا تھا کہ اس قاتل کی گرفتاری اب زیادہ دور نہیں ہے۔ پولیس کے سراغرساں اس کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

"ایک طرف تو قاتل کے قریب پہنچنے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اس کی گرفتاری میں مدد دینے والے کے لیے دو لاکھ ڈالرز کی انعامی رقم کا اعلان بھی کیا جا رہا ہے۔" چاؤ فان برا سا منہ بناتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اگر پولیس واقعی قاتل کے قریب پہنچ چکی ہوتی تو پھر اس کی گرفتاری پر انعام رکھنے کے بجائے سیدھا اسے گرفتار ہی کر لیتی۔ یہ سب بہانے بس اس لیے بنائے جا رہے ہیں تاکہ شہریوں میں خوف و ہراس نہ پھیلے۔" یہ کہتے ہوئے چاؤ فان صوفے سے اٹھا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ آج وہ خاصی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اپنے مارشل آرٹ کے شاگردوں کو ٹریننگ دیتے وقت وہ خود بھی ان کے ساتھ جسمانی طور پر پوری طرح متحرک رہنے کا عادی تھا۔ اس طرح اس کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی مگر اب چاؤ فان کو محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس سلسلے کو برقرار نہیں رکھ پائے گا۔ اسے لگنے لگا تھا کہ اب اس میں پہلے جیسی پھرتی اور جوانی نہیں رہی اور وہ پہلے کی بہ نسبت اب جلدی تھک جاتا ہے۔ چاؤ فان نے باقی وقت اپنے کمرے میں ہی گزارا اور صرف رات کے کھانے کے دوران باہر نکلا۔

اگلے دن جب وہ اپنے ٹریننگ سینٹر روانہ ہوا تو فرگوسن نے اسے تاکید کی کہ مارٹی کی رپورٹس یاد سے لے کر آنا اور ڈاکٹر سے بھی رپورٹس کے بارے میں معلومات حاصل کر لینا۔

اس دن بھی سینٹر میں چاؤ فان شاگردوں کو خنجر زنی کی تربیت دیتا رہا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہاں سے فارغ ہو کر وہ اسپتال جائے گا اور پھر ڈاکٹر سے ملنے اور رپورٹس لینے کے بعد اسپتال سے ہی گھر روانہ ہوگا۔ جانے کے لیے اسے ٹیکسی کا استعمال کرنا تھا کیونکہ اسپتال وہاں سے خاصی دور تھا۔ اس کے علاوہ اسے مارکیٹ سے کچھ خریداری بھی کرنا تھی۔ اگرچہ فرگوسن نے اسے صبح گھر سے روانہ ہوتے وقت سامان کی ایک لمبی لسٹ تھمائی تھی اور چاؤ فان نے اس وقت فرگوسن کو یہ بتانے سے گریز کرتے ہوئے خاموشی سے وہ لسٹ تھام بھی لی کہ اس کے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ لسٹ میں درج تمام سامان خرید پاتا۔

اس کا ارادہ تو شام کو اسپتال کی جانب جانے کا تھا مگر اسپتال سے ڈاکٹر یوتھم کا فون آنے پر اس نے فوری طور پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر یوتھم اسپتال کے ایک سینئر ڈاکٹر تھے اور مارٹی کا چیک اپ کرنے کے بعد انہوں نے ہی اس کے سر کے مختلف ٹیسٹ تجویز کیے تھے مگر جس طرح انہوں نے فون کر کے چاؤ فان کو اسپتال آنے کا کہا تھا۔ اس سے چاؤ فان کو فکرمندی لاحق ہو گئی تھی۔

وہ اپنے مارشل آرٹ کے شاگردوں کو خنجر زنی کی ٹریننگ دے رہا تھا مگر ڈاکٹر بوتھم کا فون آنے کے بعد عجلت اور پریشانی میں اپنے شاگردوں کو چھٹی دے کر ایک ٹیکسی میں اسپتال روانہ ہوگیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر بھی وہ پریشان کن خیالات میں کھویا رہا۔

چاؤ فان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ عام طور پر کوئی بھی معالج اپنے کسی مریض کے کسی فیملی ممبر کو یوں فون کر کے نہیں بلاتا۔ ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب واقعی کوئی خطرے والی بات ہو اور حقیقت یہی تھی کہ ڈاکٹر بوتھم کے یوں اچانک بلائے جانے پر وہ ذہنی طور پر ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ چاؤ فان پہلے ہی خاصی پریشانیوں کا شکار تھا۔ ابھی تک اپنے مالی نقصانات تو وہ صبر وتحمل سے برداشت کرتا آیا تھا مگر اب معاملہ اس کی اولاد کا تھا۔ اسے اپنے دونوں بیٹوں سے بہت پیار تھا مگر مارٹی اس کی پہلی اولاد تھی۔ اس لیے شاید وہ اسے زیادہ چاہتا تھا۔

ٹیکسی اسپتال کے سامنے رکی تو وہ کرایہ ادا کر کے اسپتال کے مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اندر پہنچ کر اس نے کاؤنٹر پر ریسپشنسٹ کو اپنا نام اور آمد کا مقصد بتایا تو کچھ ہی دیر میں اسے ڈاکٹر بوتھم کے پاس پہنچا دیا گیا۔

ڈاکٹر بوتھم اسپتال میں اپنے لیے مختص کردہ کمرے میں ایک آرام دہ کرسی پر براجمان تھے۔ چاؤ فان بھی ان کے سامنے موجود کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا اور استفسار طلب نگاہوں سے ان کا چہرہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر بوتھم کے ہاتھوں میں اس وقت ایک فائل تھی اور وہ بغور اس فائل کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔

چاؤ فان نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سی فائل پڑھ رہے ہیں۔ تاہم اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید ڈاکٹر بوتھم مارٹی کی رپورٹس کا جائزہ لے رہے تھے۔ چاؤ فان کے لیے خاموشی کے وہ لمحات بڑے اعصاب شکن تھے۔ وہ جلد از جلد اس بات کو جاننے کا خواہش مند تھا کہ اس کے بیٹے مارٹی کو کیا ہوا تھا۔ رپورٹس میں کس مرض کی تشخیص ہوئی تھی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر بوتھم نے حلق سے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے فائل سامنے موجود ٹیبل پر رکھ دی۔

''مسٹر چاؤ فان! میں نے آپ کے بیٹے مارٹی کی رپورٹس متعدد بار پڑھی ہیں اور میرے خیال میں ابھی تو صورت حال زیادہ سنگین نہیں مگر اگر دو تین ماہ میں مارٹی کا آپریشن نہ کیا گیا تو پھر خطرے والی بات ہو سکتی ہے۔''

ڈاکٹر بوتھم نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''میرے بیٹے کو ہوا کیا ہے؟'' چاؤ فان نے حتی الامکان خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے بیٹے کے دماغ میں رسولی ہے۔'' ڈاکٹر بوتھم نے بدستور ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ ''ابھی تو یہ ابتدائی شکل میں ہے مگر اگر اسے آپریشن کے ذریعے نہ نکالا گیا تو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ معاملہ خطرناک ہوجائے گا..... پھر آپریشن بھی پیچیدہ ہوجائے گا۔''

''اوہ.....!'' چاؤ فان کے حلق سے فوری طور پر بس اتنا ہی نکل پایا۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ ''تو پھر ڈاکٹر آپ آپریشن کرلیں، میں پیپر سائن کر دیتا ہوں۔''

''یہی آپ کے بیٹے کے حق میں بہتر ہوگا۔'' ڈاکٹر بوتھم نے جواب دیا۔ ''آپ کا بیٹا خوش قسمت ہے کہ اس کے مرض کی بروقت تشخیص ہوگئی ہے۔ ورنہ دیر سے تشخیص ہونے پر معاملہ پیچیدہ ہوجاتا۔ میرے خیال میں اس منڈے کو ہی اس کا آپریشن کر دیا جائے تو بہتر ہے مگر میں آپ کو مطلع کرنا چاہوں گا کہ اگرچہ اس اسپتال میں سرکاری سطح پر مریضوں کو بہت سی سہولیات فری میں حاصل ہیں مگر برین ٹیومر کے اس آپریشن کے لیے آپ کو فیس جمع کروانی پڑے گی۔ آپریشن کا ٹوٹل خرچ دس ہزار ڈالرز ہے۔ آپ کو کم از کم چار ہزار ڈالرز پہلے جمع کروانے ہوں گے۔''

''ہوں.....'' چاؤ فان نے ہنکارا بھرا۔ دس ہزار ڈالرز کے اخراجات کے بارے میں سن کر وہ ذہنی طور پر الجھ گیا تھا۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں اس وقت چند سو ڈالرز سے زیادہ کی رقم نہیں بچی تھی۔ وہ بینک ڈیفالٹر ہو چکا تھا۔ بینک کی جانب سے جلد ہی اس کی جائداد کی نیلامی کا بھی امکان تھا۔ اس سلسلے میں اسے نوٹس بھی موصول ہو چکا تھا۔ چاؤ فان کے پاس ایسا کوئی حل نہیں تھا جس کی مدد سے وہ اس مالی بحران سے نکل پاتا۔ اوپر سے ڈاکٹر بوتھم نے اسے یہ روح فرسا خبر سنا دی تھی کہ اس کے بیٹے کو برین ٹیومر ہے۔ اس کا علاج نہ کیا گیا تو اس کی زندگی کو خطرات لاحق ہوجائیں گے۔ برین ٹیومر ابھی ابتدائی شکل میں تھا۔ علاج ممکن تھا مگر اس کے لیے بھی دس ہزار ڈالرز کی رقم درکار تھی اور چاؤ فان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ اپنے موجودہ حالات میں اس کے لیے اتنی رقم کا بندوبست کرنا بہت مشکل بلکہ ایک حد تک ناممکن ہی تھا۔

''آپ کل تک رقم کا بندوبست کرلیں۔'' ڈاکٹر بوتھم

کی آواز نے اسے خیالات کے گرداب سے باہر لا پھینکا۔
"یہ رپورٹس ابھی میرے پاس ہی رہنے دیں۔ میں یہ رپورٹس اپنے دیگر سینئر ساتھی ڈاکٹرز کو دکھانا چاہتا ہوں۔"
"ڈاکٹر بوتھم! کیا مجھے رقم جمع کروانے کے لیے چند دن کی مہلت مل سکتی ہے؟" چاؤ فان نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔
"جی ہاں....." ڈاکٹر بوتھم نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ "مگر آپ کو اس سے پہلے کچھ پیپرز سائن کرنے ہوں گے۔ آپ ان پیپرز کو ضمانتی پیپرز بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ کل تشریف لے آئیں۔ اسی دوران میں پیپرز وغیرہ کا بندوبست کرلوں گا۔"
چاؤ فان نے مزید کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ٹھیک ہے ڈاکٹر بوتھم تو پھر میں کل دوبارہ آؤں گا۔ اس دوران میں رقم کا بندوبست کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔" اس نے کہا تو ڈاکٹر بوتھم نے جواباً بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا جبکہ چاؤ فان خاموشی سے ان کے دفتر سے باہر نکل آیا اور کچھ ہی دیر میں اسپتال سے بھی باہر نکل آیا۔
اس نے واپسی کے لیے بھی ایک ٹیکسی پکڑی اور پھر ٹیکسی والے کو اپنے گھر کے قریب واقع ایک مارکیٹ کا پتا بتادیا۔ فرگوسن نے صبح اسے گھریلو سامان کی لسٹ تھمائی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ خریداری کرہی لے۔ وہ پہلے ہی مارٹی کی وجہ سے ذہنی طور پر خاصا پریشان تھا۔ اس لیے گھر جاتے ہی فرگوسن سے کسی قسم کی بدمزگی کے موڈ میں نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے فرگوسن کو مارٹی کی رپورٹس اور مرض کے بارے میں بھی آگاہ کرنا تھا اور فی الوقت اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ فرگوسن کو مارٹی کی موجودہ حالت کے بارے میں کیسے آگاہ کرے۔ فرگوسن اس کی طرح مضبوط اعصاب کی مالک نہیں تھی کہ اس روح فرسا خبر کو برداشت کر پاتی اور پھر مارٹی کی بیماری کے بارے میں جان کر تو چاؤ فان کے اپنے اعصاب بھی جواب دینے لگے تھے۔
چاؤ فان نے فوری طور پر یہ خبر فرگوسن کو نہ سنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ فوری طور پر فرگوسن کو یہ بری خبر سنانے کے بجائے کسی مناسب موقعے اور وقت پر اسے مطلع کرنا ہی بہتر ہوگا۔
ٹیکسی ڈرائیور نے اسے منزل مقصود پر پہنچایا تو وہ کرایہ ادا کرکے سامنے موجود مارکیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ آگے بڑھتے ہوئے بھی وہ اپنے ذہن میں کانٹ چھانٹ کر انتہائی ضروری سامان کی لسٹ ترتیب دے رہا تھا جو اس کی جیب میں موجود رقم سے خریدا جاسکے۔
مارکیٹ میں اس وقت خاصا رش تھا۔ ان میں بڑے بچے اور بوڑھے بھی موجود تھے جو اس مارکیٹ سے اپنی ضروریات کا سامان وغیرہ خریدنے آئے تھے۔
چاؤ فان نے اپنی جیب سے فرگوسن کی دی گئی سامان کی لسٹ نکالی اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اگرچہ وہ پہلے بھی اس لسٹ کا جائزہ لے چکا تھا۔ تاہم پریشانی اور ذہنی خلجان میں مبتلا ہوکر وہ بار بار ایسا کررہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ درج شدہ سامان میں سے کیا خریدے اور کیا نہیں۔ وہ کبھی کسی سامان کو خریدنے کا فیصلہ کرتا تو کبھی یہ سوچ کر اس سامان کو خریدنے کا ارادہ ملتوی کردیتا کہ شاید اس شے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ وہ آج ذہنی طور پر خاصی تھکاوٹ بھی محسوس کررہا تھا اور کم از کم آج گھر جاکر فرگوسن سے کسی قسم کا جھگڑا مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا مگر اب اسے احساس ہورہا تھا کہ جھگڑا نہ ہونے کے امکانات خاصے کم ہیں۔ فرگوسن گھر کی مالی پریشانیوں کی وجہ سے ذہنی تناؤ کا شکار رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ خاصی چڑچڑی ہوچکی تھی۔ اگر چاؤ فان اس کا مطلوبہ سامان لے کر نہ جاتا تو جھگڑے سے بچنا ناممکن تھا۔ سوچتے سوچتے چاؤ فان کا سر پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تو اس نے جھنجلا کر لسٹ دوبارہ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی اور پھر آگے بڑھتے ہوئے ایک بڑے الیکٹرونکس اسٹور میں داخل ہوگیا۔ فرگوسن کی دی گئی لسٹ میں کچھ الیکٹرونکس کا سامان بھی موجود تھا۔ مگر چاؤ فان کو اسٹور میں داخل ہوکر اپنے مطلوبہ سامان پر درج قیمت دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ فی الحال وہ اس سامان کو خریدنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ اپنی خریداری کو صرف کھانے پینے اور انتہائی ضروری سامان تک ہی محدود رکھے۔
یہی سوچتا ہوا وہ اسٹور کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ تاہم کاؤنٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہیں بے اختیار اس لمبے تڑنگے شخص کی جانب اٹھ گئی تھیں جو اپنا پرس نکال کر کاؤنٹر گرل کو پیسے ادا کررہا تھا۔ شاید اس نے کچھ سامان خریدا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے ہی اس نے اپنے پرس سے پیسے نکالے تھے اور چاؤ فان کو پہلی ہی نگاہ میں اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے پاس خاصی موٹی رقم موجود تھی۔
عام طور پر امریکی شہری اپنے بٹوے میں بھاری رقم رکھنے کے عادی نہیں ہوتے۔ پلاسٹک منی کے دور میں اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ خریداری کے لیے

کریڈٹ کارڈز وغیرہ کا استعمال اب معمول کی بات تھی مگر اس شخص نے عام امریکیوں کے برعکس اپنے بٹوے میں خاصی .... رقم رکھی ہوئی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر پیسے ادا کرنے کے لیے لمحہ بھر کے لیے ہی اپنے بٹوے سے نوٹوں کی ایک چھوٹی گڈی نکالی تھی جسے دیکھتے ہی چاؤ فان کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے پاس کم از کم چار سے پانچ ہزار ڈالرز کی رقم موجود تھی۔

چاؤ فان اس شخص کے پاس سے خاموشی سے گزرتے ہوئے اسٹور سے باہر نکل آیا۔ تاہم ان لمحات میں اس کے ذہن میں بڑی شدت کے ساتھ یہ خواہش ابھر رہی تھی کہ کاش اس شخص کے پاس موجود تمام رقم اس کی دسترس میں آجائے۔ اگر یہ پیسے اس کے پاس آجائیں تو اس کے کافی مسائل آسانی سے حل ہوجائیں گے۔

چاؤ فان کے الیکٹرونکس اسٹور سے باہر نکلنے کے چند لمحوں بعد ہی وہ لمبا تڑنگا شخص بھی اس الیکٹرونکس اسٹور سے باہر نکل آیا اور پھر ایک جانب بڑھ گیا۔ چاؤ اگرچہ مارشل آرٹ کا ٹرینگ سینٹر چلاتا تھا۔ لوگوں کو لڑائی کے داؤ پیچ سکھانا اس کا پیشہ اور شوق تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ عملی زندگی میں وہ ایک قانون پسند اور شریف شہری تھا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی کو لوٹنے کا ارادہ کرے گا۔ اس کا ماضی اس بات کا گواہ بھی تھا مگر آج نہ جانے اس کے ذہن میں یہ خیالات کہاں سے آگھسے تھے کہ اگر اس شخص سے اس کا بٹوا حاصل کرلیا جائے تو اس کے بہت سے معاشی مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ کم از کم وہ اپنے بیٹے کا علاج تو کروا ہی لے گا۔ ڈاکٹر نے اسے مارٹی کے آپریشن کے ابتدائی اخراجات فوری جمع کروانے کا کہا تھا۔ اگر اس لمبے تڑنگے شخص کی جیب میں موجود رقم چاؤ فان کو مل جاتی تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا تھا۔ ہر امن پسند اور قانون پسند انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب اس کا ذہن اسے شارٹ کٹ لینے پر اکساتا ہے۔ اس وقت چاؤ فان کے مزاج میں بھی بڑا جارحانہ تغیر پیدا ہورہا تھا۔ شدید پریشانی نے اسے ذہنی خلفشار میں مبتلا کردیا تھا۔ اس کے قدم بے اختیار اس شخص کے تعاقب میں اٹھ گئے جو اسٹور سے نکلا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ اس شخص سے اس کی جیب میں موجود رقم چھین لے گا۔ آج اپنے بیٹے کی خاطر وہ اس جرم کا ارتکاب کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ اس کی معاشی پریشانیوں کی وجہ وہ خود تھا پھر اس کا بیٹا کیوں سزا بھگتتا۔

اگرچہ اس وقت چاؤ فان کی جیب میں کسی قسم کا ہتھیار نہیں تھا اور اس کا شکار بھی خاصا جسیم تھا مگر اس کے باوجود چاؤ فان زیادہ پریشان نہیں تھا۔ وہ مارشل آرٹ کے ایسے خطرناک داؤ پیچ جانتا تھا کہ اس شخص کو محض ایک ہاتھ مار کر بے ہوش کرسکتا تھا لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ شخص پیدل آگے بڑھتے ہوئے مارکیٹ کی رش والی جگہ سے نکل کر کسی ویران مقام پر پہنچ جاتا۔ اتنے رش میں اگر چاؤ فان اسے بے ہوش کرکے اس کی جیب سے پیسے نکال کر نکل بھی جاتا تو بعد میں اس کی گرفتاری کے قوی امکانات موجود تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس مارکیٹ میں جگہ جگہ سی سی ٹی وی کیمرے موجود تھے جن کی مدد سے پولیس بعد میں آسانی سے اس تک پہنچ جاتی اور پھر وہ مارکیٹ میں موجود افراد کی نگاہوں میں بھی آجاتا۔ چاؤ فان اگر اس واردات کو سرانجام دینے کے بعد پکڑا جاتا تو اس کی ساری محنت ہی بیکار چلی جاتی۔ امریکا میں بیس سال رہ کر اس نے جو عزت کمائی تھی، وہ خاک میں مل ہی جاتی، ساتھ ہی ساتھ اسے لمبے عرصے کے لیے جیل یاترا بھی کرنی پڑتی۔

چاؤ فان نے قانون شکنی کا ارتکاب کرنے کا فیصلہ تو کرہی لیا تھا مگر اسے قانون کی گرفت میں نہیں آنا تھا۔ وہ خاموشی سے اس لمبے تڑنگے شخص کے پیچھے چلے جارہا تھا۔ اگر وہ شخص فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی کسی گاڑی میں سوار ہوکر وہاں سے روانہ ہوجاتا تو بھی چاؤ فان کے لیے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن ہوجاتا مگر ابھی تک وہ شخص فٹ پاتھ پر سیدھا آگے کی طرف بڑھا چلا جارہا تھا اور یہ صورت حال چاؤ فان کے لیے بھی تسلی بخش تھی کیونکہ اب وہ اس شخص سے رقم حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کرچکا تھا اس لیے خاصے پُراعتماد انداز میں چل رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ شخص اچانک ایک گلی میں مڑا تو چاؤ فان کو یوں لگا جیسے اس کی مراد برآئی ہو۔

یہاں سے اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ تنگ و تاریک گلیاں اس کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ انہی گلیوں سے گزر کر اکثر اپنے گھر کی جانب جاتا تھا۔ قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اگر وہ گلی کے کسی ویران مقام پر اس شخص کو بے ہوش کردیتا اور اس کی جیب سے مال نکال کر وہاں سے رفو چکر ہوجاتا تو پولیس کے لیے اس کا سراغ لگانا ناممکن ہوجاتا۔ کیونکہ چاؤ فان ان گلیوں سے واقف تھا اس لیے اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ ان گلیوں میں کہیں بھی سی سی ٹی وی کیمرے نصب نہیں ہیں جن کی مدد سے اس کی

شناخت ہوسکتی۔

چاؤ فان تیزی سے آگے بڑھا اور اس اندھیری گلی میں داخل ہوگیا جہاں وہ اجنبی شخص داخل ہوا تھا۔ وہ اس سے کچھ آگے ہی چل رہا تھا۔ چاؤ فان نے پہلی ہی نگاہ میں صورتِ حال کا ادراک کرلیا۔ اس وقت گلی میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ گویا یہ بہترین موقع تھا۔ اس شخص کے قریب جاتے ہوئے چاؤ فان کو لمحہ بھر کے لیے ندامت کے احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے تمام عمر اپنے مارشل آرٹ کے شاگردوں کو یہی سبق دیا تھا کہ اپنے فن اور مہارت کا کبھی بھی منفی استعمال نہیں کرنا۔ تاہم آج وہ خود اپنے فن کا منفی استعمال کرنے والا تھا۔ بیٹے کی محبت نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ بہرحال اب پیچھے ہٹنے کا وقت گزر چکا تھا۔

چاؤ فان اب اس شخص سے چند قدم کی دوری پر ہی رہ گیا تھا۔ اگر وہ پچھلی جانب سے اس شخص کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا ایک سخت وار کرتا تو اس کا بے ہوش ہوجانا ایک یقینی اور طے شدہ امر تھا۔ چاؤ فان دبے پاؤں چلتے ہوئے اس کے اتنا قریب پہنچ گیا کہ اس پر ایک کاری وار کرسکے مگر جیسے ہی چاؤ فان نے اس پر کھڑی ہتھیلی کا وار کرنے کے لیے اپنے اور اس کے درمیان چند قدم کا فاصلہ طے کیا، وہ شخص اتنی پھرتی اور سرعت سے پلٹا کہ چاؤ فان اس کی تیز طراری دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ششدر رہ گیا۔ اس شخص کی جسامت دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنی پھرتی سے حرکت کرسکتا ہے اس نے پھرتی سے چاؤ فان سے دو قدم دوری کا فاصلہ بنایا اور پھر تیزی سے اپنے ہاتھ میں موجود سامان کا تھیلا زمین پر پھینکتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے ہاتھ بھر کے سائز کا خنجر نکال لیا۔

''جب تم گلی میں داخل ہوئے تھے تو میں نے اسی وقت تمہیں مارک کرلیا تھا۔ تم میرا پیچھا کررہے ہو تو میں تمہیں بتانا چاہوں گا کہ میں اپنے تعاقب سے انجان نہیں ہوں۔ تمہارے ساتھی بھی کافی دنوں سے میری نگرانی کر رہے ہیں مگر میں ان کی نگرانی سے بے خبر نہیں ہوں۔ غالباً آج میری نگرانی کی ڈیوٹی تمہیں سونپی گئی ہے مگر آج تمہیں جان سے مار کر میں تمہارے ساتھیوں کو سبق دوں گا کہ مارتھر کو پکڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اب مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ لمبا تڑنگا شخص خنجر ہوا میں لہراتے ہوئے چاؤ فان کی جانب بڑھا۔

چاؤ فان کے لیے اس کا لہجہ اور باتیں حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم تھیں۔ آج سے پہلے اس نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر وہ شخص یہ دعویٰ کررہا تھا کہ وہ اس سے تو کیا اس کے ساتھیوں کی نگرانی سے بھی باخبر ہے۔ شاید اس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی اور وہ شخص چاؤ فان کو اپنے دشمنوں کا ہی کوئی ساتھی سمجھ رہا تھا۔ اس لیے خنجر نکال کر اس پر حملہ آور ہونے والا تھا۔

چاؤ فان نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگالیا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں خاصا بڑا خنجر موجود ہے اور اگر وہ اس کے جسم پر کوئی کاری وار کرنے میں کامیاب ہوگیا تو پھر اس کی موت یقینی ہے۔ وہ اس شخص کے پاس موجود رقم کے بارے میں جان کر اسے لوٹنے کے ارادے سے اس کے تعاقب میں آیا تھا مگر یہاں کی صورتِ حال اس کی سوچ کے بالکل برعکس

ہرن مینار

ہرن مینار شیخوپورہ شہر سے چار میل مغرب کی جانب واقع ہے۔ یہ مینار مغل شہنشاہ جہانگیر نے اپنے پالتو ہرن مُس راج کی یاد میں بنوایا تھا جو غلطی سے اس کا تیر لگنے سے ہلاک ہوگیا تھا۔ یہ مینار 1646ء میں بنوایا گیا تھا اور اس مینار کے اوپر جانے کے لیے 105 سیڑھیاں ہیں اور یہ بات بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اکبر بادشاہ (مغل اعظم) شہزادہ جہانگیر کو پیار سے شیخو کہتا تھا۔ اسی نسبت سے پاکستان کا مشہور شہر شیخوپورہ آباد ہوا تھا۔

☆☆☆

☆ مقبرہ جہانگیر جو اس وقت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کے بیٹے شاہ جہاں نے دس برس میں بنوایا تھا اور اس وقت اس پر دس لاکھ روپے خرچ آیا تھا۔

☆ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر صوفی بزرگ شیخ سلیم چشتی کا بڑا معتقد تھا۔

☆ تاج محل ساڑھے اٹھارہ سال کی مدت میں تین کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا تھا۔

عالمی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا (از محمد فیصل بٹ) سے انتخاب

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ثابت ہورہی تھی۔

چاؤ فان کو مزید سوچنے کا موقع نہ ملا، اس شخص نے بجلی کی سی تیزی سے چاؤ فان پر حملہ کردیا۔ اس نے چاؤ فان کی گردن پر بڑی مہارت سے وار کیا تھا۔ اگر چاؤ فان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس وار سے اس کی شہ رگ کٹ جاتی۔ چاؤ فان مارشل آرٹ کا کھلاڑی تھا۔ خنجر زنی میں اسے خاصی مہارت حاصل تھی۔ وہ انتہائی پھرتی سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔

اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر اس شخص نے چاؤ فان کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اسے یقین ہی نہ آیا ہو کہ وہ اس کے وار سے بچنے میں کامیاب ہوگیا ہے اور پھر اس کے چہرے پر یک بیک غصے کے تاثرات عود آئے۔ وہ ایک بار پھر چاؤ فان کی جانب بڑھا۔ اس بار وہ اپنے خنجر کو بڑی سرعت سے کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ میں منتقل کررہا تھا۔ چاؤ فان حملہ کرنے کی اس تکنیک سے بخوبی آگاہ تھا۔ یہ حربہ اس وقت اختیار کیا جاتا تھا جب حملہ آور کا مقصد اپنے شکار کو ڈراج دینا ہوتا ہے۔ اس تکنیک سے دفاع کنندہ اس کنفیوژن میں مبتلا ہوجاتا تھا کہ نہ جانے حملہ آور کس ہاتھ سے وار کرے گا۔ اس شخص نے بھی شاید اس لیے یہ حربہ اختیار کیا تھا۔ شاید اپنا پہلا وار خالی جاتے دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا شکار بھی لڑنے بھڑنے میں اناڑی نہیں ہے۔

قریب آتے ہی اس نے ایک بار پھر بجلی کی سی تیزی سے چاؤ فان پر وار کیا۔ اس بار بھی اس نے چاؤ فان کی گردن کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ چاؤ فان اس بار گلی کے ایک جانب ہوچکا تھا۔ اس کے پیچھے گلی کی دیوار تھی اس لیے مزید پیچھے ہٹنا ممکن نہ تھا۔ اس نے بڑی پھرتی اور مہارت سے اس شخص کا خود کی جانب بڑھتا ہوا خنجر والا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی کلائی ہاتھ میں آتے ہی چاؤ فان نے کلائی کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا تاکہ اس کا خنجر نیچے گر جائے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ شخص اس کی توقع سے زیادہ طاقتور تھا اس لیے جھٹکا لگنے کے باوجود خنجر اس کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹ سکا تھا۔ اپنی کوشش ناکام ہوتے دیکھ کر چاؤ نے دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلنا چاہا مگر اس جسیم شخص نے اپنا سارا وزن چاؤ فان پر ڈال دیا جس کی وجہ سے چاؤ فان ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ الٹا وہ خود اس شخص کا دباؤ برداشت نہ کرتے ہوئے دیوار سے جالگا۔ ایسی حالت میں چاؤ فان کافی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس دیوقامت اور جسیم شخص کی خنجر والی کلائی تھام رکھی تھی جبکہ اس کا دوسرا ہاتھ اس کے حریف نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ وہ شخص پورا زور لگا کر اپنا خنجر والا ہاتھ چاؤ فان کی گردن کے پاس لارہا تھا جبکہ چاؤ فان بھی اس کے خنجر والے ہاتھ کو اپنی گردن سے دور رکھنے کی پوری کوشش کررہا تھا تاہم اسے اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہورہا تھا کہ اگر یہی صورت حال مزید چند لمحے برقرار رہی تو وہ خنجر کو اپنی گردن میں پیوست ہونے سے نہیں روک پائے گا۔ اس کا حریف اگر خنجر زنی کی مہارت میں اس سے کچھ کم بھی تھا تو طاقت اور جسامت میں کہیں زیادہ تھا اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر وہ آہستہ آہستہ اس پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ اس کا خنجر اب چاؤ فان کی گردن سے چند انچ کی دوری پر رہ گیا تھا۔ چاؤ فان کو اب فوری طور پر کچھ کرنا تھا، ورنہ اس کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا دوسرا ہاتھ اس شخص کی گرفت سے چھڑایا اور پھر اس کے خنجر والے بازو کو بھی ایک زوردار جھٹکے سے اسی کی جانب موڑ دیا۔ اس کے حریف نے اپنا سارا وزن اس پر ڈال رکھا تھا، بازو مڑتے ہی وہ مزید آگے آیا اور اپنے ہی خنجر کا نشانہ بن گیا۔

اس کے وزن اور بازو مڑنے کے جھٹکے نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ خنجر اس کے دل میں دستے تک پیوست ہوگیا تھا۔ خنجر لگتے ہی اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاؤ فان کی جانب دیکھا اور پھر حلق سے اوغ کی آواز نکالتا ہوا پیچھے کی جانب زمین پر ایک دھماکے سے جاگرا۔ چند لمحوں تک اس کا وجود تڑپتا رہا اور پھر ساکن ہوگیا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی رمق معدوم ہوچکی تھی، وہ مرچکا تھا۔

چاؤ فان پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اس شخص کے مردہ وجود کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے اس کے بازو کا رخ موڑا تھا مگر کیونکہ وہ شخص آگے کی جانب وزن ڈالے ہوئے تھا اس لیے اپنے ہی خنجر کا شکار ہوگیا تھا۔ چاؤ فان نے اسے جان سے مارنے کا سوچا بھی نہ تھا۔ اس کے قدم تو بس اس اجنبی کے پاس موجود رقم دیکھ کر ڈگمگائے تھے مگر انجانے میں وہ اس کے ہاتھوں مارا جاچکا تھا۔ دولت کے لالچ اور بیٹے کی محبت نے اسے ڈاکو بننے پر تو مجبور کردیا تھا مگر وہ ڈاکو سے قاتل تک کا سفر اتنی تیزی سے طے کرلے گا، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پکڑا جاتا اسے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ابھی چاؤ فان نے یہ سوچا ہی تھا کہ گلی میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر تین لمبے تڑنگے اشخاص وہاں پہنچ گئے۔ چاؤ فان نے

حیرت بھرے انداز میں ان تینوں کو دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ تینوں کون تھے۔ انہوں نے خاصا نفیس لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں پسٹل بھی موجود تھا۔ ان میں دو نوجوان تھے جبکہ ایک بڑی عمر اور قدرے فربہ جسامت کا مالک تھا۔ قریب آتے ہی ایک نوجوان نے نیچے جھک کر چاؤ فان کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے اس شخص کا جائزہ لیا۔ دل میں پیوست خنجر سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شخص عدم سدھار چکا ہے تاہم پھر بھی نیچے جھکے نوجوان نے اس کی نبض چیک کی اور پھر کھڑا ہو گیا۔

''سارجنٹ مورگن! یہ مر چکا ہے۔'' نوجوان نے اس بڑی عمر اور قدرے فربہ جسامت کے شخص کو مخاطب کر کے کہا تو چاؤ فان کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ پولیس کے نرغے میں آ چکا ہے۔ گویا اب وہ گرفتار ہوگا، اس پر مقدمہ چلے گا اور پھر اسے ایک طویل عرصے کے لیے جیل یاترا بھی کرنی پڑے گی۔ زندگی پہلے ہی بہت مشکل تھی تاہم اب اس قتل کے جرم میں مزید مشکل اور کٹھن ہونے والی تھی۔ چاؤ فان دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے جذبات کے وقتی دھارے میں بہہ کر اس آدمی کو لوٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور پھر انجانے میں اسے قتل بھی کر بیٹھا تھا۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور چاؤ فان کو اپنے کیے کی سزا بھگتنا تھی۔ ظاہر ہے گزرا وقت واپس تو نہیں لایا جا سکتا۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا ان تینوں کا جائزہ لینے لگا۔ ''لاش اٹھوانے کا بندوبست کرو۔'' فربہ جسامت کے سارجنٹ نے ساتھ کھڑے نوجوان سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''میں فون کرتا ہوں۔'' نوجوان نے اپنے کوٹ کی جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا اور پھر فون ملانے لگا۔ جبکہ سارجنٹ مورگن چاؤ فان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے گہری نگاہوں سے چاؤ فان کا جائزہ لیا اور پھر قدم بڑھاتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ چاؤ فان کو اس کی آنکھیں اپنے وجود میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا میں تو بس.....'' چاؤ فان نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا مگر سارجنٹ مورگن نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

''صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسی نے تم پر حملہ کیا ہوگا۔ ہم کافی دنوں سے اس شخص کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ شہر میں ہونے والے پراسرار قتل کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ ہے۔ اس کا نام مارتھر ہے اور اس نے تقریباً چار سال سے زائد کا عرصہ جیل میں گزارا ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کی بیوی بھی اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ شاید اس وجہ سے اس نے جنون میں مبتلا ہو کر ڈگیتی کے دوران لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال اس پر شک ہوتے ہی ہم نے اس پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ ہم قانون کے محافظوں کے ساتھ یہ مجبوری ہمیشہ چمٹی رہتی ہے کہ ہم بغیر ثبوت کے کسی کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ ہم اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کرنے کے لیے ہی اس کا تعاقب کر رہے تھے کہ یہ اچانک ہمیں چکر دے کر نکل گیا۔ شاید اسے بھی اپنے تعاقب کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس کے اس طرح اچانک غائب ہونے سے ہمیں گمان گزرا کہ اس پر ہمارا شک درست ہے۔ یہی وہ پراسرار قاتل ہے جس کی وارداتوں نے شہر میں خوف ہراس پھیلا رکھا ہے اور یہ آج بھی کسی کو شکار بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہم نے مارکیٹ میں اسے تلاش کرنا شروع کر دیا اور پھر اچانک میری نظر اس پر پڑی۔ اس وقت یہ اس گلی کا موڑ مڑ رہا تھا، اگرچہ میں نے کافی دور سے اسے دیکھا تھا تاہم اس کی جسامت اور لمبا تڑنگا وجود دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ مارتھر ہی ہے۔ اس کے نظر آتے ہی ہم اس کی طرف دوڑے مگر سڑک پر گاڑیوں کے رش کی وجہ سے ہمیں اس تک پہنچنے میں دیر ہو گئی غالباً اسی دوران تم بھی گلی میں داخل ہوئے اور اس نے تمہیں تنہا دیکھ کر تم پر حملہ کر دیا مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کی سابقہ وارداتوں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خاصا ماہر خنجر زن تھا پھر تم نے اس کے خنجر کو اسی کے سینے میں کیسے پیوست کر دیا؟ خنجر دیکھنے کے بعد تو اب کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ یہ وہی ہے جس نے پورے شہر کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔''

سارجنٹ کی باتیں سن کر چاؤ فان کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اس نے ٹی وی پر نشر ہونے والی خبروں میں اس پراسرار قاتل کے بارے میں کافی کچھ سنا تھا۔ اس قاتل نے کئی افراد کو لوٹنے کے ساتھ ساتھ موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ پولیس والے اس پر شک ہونے کے بعد اس کا تعاقب کر رہے تھے اور اس مغالطے کا بھی شکار ہو گئے تھے کہ چاؤ فان بھی اس کا شکار تھا مگر اس بار شکاری شکار کے ہاتھوں ہی مارا گیا۔ کہتے ہیں کہ امید کی ہلکی سی کرن نظر آتے ہی انسان کا دماغ بہت تیزی سے کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ چاؤ فان کا دماغ بھی بہت تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس شخص کی ہلاکت اور ان تینوں افراد کے پولیس کے آدمی ہونے کے

بارے میں جاننے کے بعد وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب اسے ڈکیتی اور قتل کے جرم میں نہ جانے کتنے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے گا مگر یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس آدمی کو لوٹنے کی غرض سے وہ اس کا تعاقب کر رہا تھا، وہ وہی پراسرار قاتل ہوگا جس کے بارے میں وہ میڈیا پر خبریں دیکھتا رہا تھا۔ خنجر کی موجودگی اور اس شخص کا چاؤ فان کی گردن پر حملہ کرنے کا انداز چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ یہ وہی قاتل ہے۔ چاؤ فان وقتی لالچ کے تحت اس کے پیچھے ہولیا تھا۔ اس وقت تک وہ بھی اس کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ بہرحال مارتھر نامی وہ قاتل اب ایک لاش کی صورت میں زمین پر پڑا تھا اور پولیس اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ مارتھر نے چاؤ فان کو لوٹنے کے ارادے سے اس پر حملہ کیا اور پھر غیر متوقع یا حادثاتی طور پر خود اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اگر پولیس والے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے تو چاؤ فان کو ان کی غلط فہمی برقرار رکھنا تھی اور پھر بات اس حد تک تو درست تھی کہ چاؤ فان اسے صرف لوٹنا چاہتا تھا، جان سے مارنے کا اقدام تو اس نے مجبوری کے تحت اٹھایا تھا۔

''میرا نام چاؤ فان ہے۔'' مورگن کا مکمل اور ایک ہوتے ہی وہ بولا۔ ''میں ادھر پاس ہی رہتا ہوں، کچھ دیر قبل میں مارکیٹ سے پیدل گھر کی جانب روانہ ہوا تھا۔ غالباً اس وقت یہ میرے کچھ آگے چل رہا تھا اور پھر یہ اس گلی میں داخل ہوگیا۔ میں نے بھی ادھر ہی جانا تھا اس لیے میں بھی گلی میں داخل ہوگیا۔ اس وقت تک میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے آگے چلنے والا یہ شخص وہی خطرناک قاتل ہے جس نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔ حتیٰ کہ اس بات کا اندازہ تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوسکا جب اس نے خنجر نکال کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں نے تو بس خود کو بچانے کے لیے اس کے بازو کو جھٹکا دیا تھا اور یہ اپنے ہی خنجر کا شکار ہوگیا۔ ورنہ میں نے اس خنجر کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس کے دستے پر آپ کو میری انگلیوں کے نشانات بھی نہیں ملیں گے۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' سارجنٹ مورگن نے چاؤ فان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم نے اس سے خود کو بچایا کیسے..... کیا تم بھی خنجر زنی جانتے ہو؟''

''میں مارشل آرٹ کا ٹریننگ سینٹر چلاتا ہوں۔'' چاؤ فان نے جواب دیا۔

''تبھی تو میں کہوں کہ یہ شخص تم سے مار کیسے کھا گیا۔'' سارجنٹ مورگن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بہرحال تم نے شہریوں کو ایک خطرناک قاتل سے نجات دلائی ہے۔ تمہیں انعام تو ضرور ملے گا۔''

''کیا مطلب؟'' چاؤ فان نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ارے، شاید تم نے خبروں میں یہ نہیں سنا کہ اس قاتل کی زندہ یا مردہ گرفتاری میں مدد دینے والے کو حکومت کی جانب سے دو لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم بطور انعام دی جائے گی اور تم نے تو خود اسے مارا ہے اس لیے پولیس کی طرف سے بھرپور سفارش کی جائے گی کہ انعامی رقم حکومتی اعلان کے مطابق تمہیں فوراً ادا کی جائے۔'' سارجنٹ مورگن نے جواب دیا تو چاؤ فان کے ذہن میں اپنی بیوی کے وہ الفاظ گردش کرنے لگے جو شاید اس نے مذاقاً اس سے کہے تھے کہ اگر اسے یقین ہوجائے کہ شہر میں ہونے والے پراسرار قتل کے پیچھے چاؤ فان کا ہاتھ ہے تو وہ خود اسے پکڑوا دے گی کیونکہ قاتل کی زندہ یا مردہ گرفتاری میں تعاون کرنے پر دو لاکھ ڈالرز کی خطیر انعامی رقم رکھی گئی ہے۔ اس وقت فرگوسن اور چاؤ فان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دو لاکھ ڈالرز واقعی میں ان کے ہونے والے ہیں۔

مارتھر نامی اس شخص کی لاش اٹھانے کے لیے گاڑی آئی تو پولیس نے فوری کاغذی کارروائی کے بعد چاؤ فان کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

اس واقعے کے تقریباً دو ماہ گزرنے کے بعد چاؤ فان کی تمام معاشی... مشکلات گویا فضا میں تحلیل ہوگئی تھیں۔ اسے انعامی رقم مل گئی تھی۔ اس کے بیٹے کا کامیاب آپریشن بھی ہو چکا تھا۔ چاؤ فان اور اس قاتل کی اسٹوری کو اخبارات نے اس قدر اچھالا کہ اس کے ٹریننگ سینٹر اور مارشل آرٹ کی مہارت کی خبروں نے نوجوانوں کو ایک بار پھر مارشل آرٹ کی جانب راغب کر دیا۔ ان دنوں اس کے ٹریننگ سینٹر میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ چاؤ فان اپنا تمام قرض چکانے کے بعد بھی اچھے خاصے بینک بیلنس کا مالک ہے۔ اس کی حسین اور خوشگوار زندگی ایک بار پھر لوٹ آئی ہے۔ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں کیونکہ اس نے انہیں ایک خطرناک قاتل سے نجات دلائی تھی۔ چاؤ فان کے پاس آج بھی وہ اخباری تراشے موجود ہیں جن میں چاؤ فان کی تعریفوں کے پل باندھے گئے تھے اور شہ سرخیوں میں یہ خبر لگائی گئی تھی۔ ''ویلڈن مسٹر چاؤ فان! تم نے شہریوں کو ایک وحشی قاتل سے نجات دلا دی۔''

بارے میں جاننے کے بعد وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب اسے ڈکیتی اور قتل کے جرم میں نہ جانے کتنے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے گا مگر یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس آدمی کو لوٹنے کی غرض سے وہ اس کا تعاقب کر رہا تھا، وہ وہی پراسرار قاتل ہوگا جس کے بارے میں وہ میڈیا پر خبریں دیکھتا رہا تھا۔ خنجر کی موجودگی اور اس شخص کا چاؤ فان کی گردن پر حملہ کرنے کا انداز چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ یہ وہی قاتل ہے۔ چاؤ فان وقتی لالچ کے تحت اس کے پیچھے ہولیا تھا۔ اس وقت تک وہ بھی اس کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ بہرحال مارتھر نامی وہ قاتل اب ایک لاش کی صورت میں زمین پر پڑا تھا اور پولیس اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ مارتھر نے چاؤ فان کو لوٹنے کے ارادے سے اس پر حملہ کیا اور پھر غیر متوقع یا حادثاتی طور پر خود اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اگر پولیس والے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے تو چاؤ فان کو ان کی غلط فہمی برقرار رکھنا تھی اور پھر بات اس حد تک تو درست تھی کہ چاؤ فان اسے صرف لوٹنا چاہتا تھا، جان سے مارنے کا اقدام تو اس نے مجبوری کے تحت اٹھایا تھا۔

''میرا نام چاؤ فان ہے۔'' مورگن کا مکمل اور ایک ہوتے ہی وہ بولا۔ ''میں ادھر پاس ہی رہتا ہوں، کچھ دیر قبل میں مارکیٹ سے پیدل گھر کی جانب روانہ ہوا تھا۔ غالباً اس وقت یہ میرے کچھ آگے چل رہا تھا اور پھر یہ اس گلی میں داخل ہوگیا۔ میں نے بھی ادھر ہی جانا تھا اس لیے میں بھی گلی میں داخل ہوگیا۔ اس وقت تک میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے آگے چلنے والا یہ شخص وہی خطرناک قاتل ہے جس نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔ حتیٰ کہ اس بات کا اندازہ تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوسکا جب اس نے خنجر نکال کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں نے تو بس خود کو بچانے کے لیے اس کے بازو کو جھٹکا دیا تھا اور یہ اپنے ہی خنجر کا شکار ہوگیا۔ ورنہ میں نے اس خنجر کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس کے دستے پر آپ کو میری انگلیوں کے نشانات بھی نہیں ملیں گے۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' سارجنٹ مورگن نے چاؤ فان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم نے اس سے خود کو بچایا کیسے..... کیا تم بھی خنجر زنی جانتے ہو؟''

''میں مارشل آرٹ کا ٹریننگ سینٹر چلاتا ہوں۔'' چاؤ فان نے جواب دیا۔

''تبھی تو میں کہوں کہ یہ شخص تم سے مار کیسے کھا گیا۔'' سارجنٹ مورگن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بہرحال تم نے شہریوں کو ایک خطرناک قاتل سے نجات دلائی ہے۔ تمہیں انعام تو ضرور ملے گا۔''

''کیا مطلب؟'' چاؤ فان نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ارے، شاید تم نے خبروں میں یہ نہیں سنا کہ اس قاتل کی زندہ یا مردہ گرفتاری میں مدد دینے والے کو حکومت کی جانب سے دو لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم بطور انعام دی جائے گی اور تم نے تو خود اسے مارا ہے اس لیے پولیس کی طرف سے بھرپور سفارش کی جائے گی کہ انعامی رقم حکومتی اعلان کے مطابق تمہیں فوراً ادا کی جائے۔'' سارجنٹ مورگن نے جواب دیا تو چاؤ فان کے ذہن میں اپنی بیوی کے وہ الفاظ گردش کرنے لگے جو شاید اس نے مذاقاً اس سے کہے تھے کہ اگر اسے یقین ہوجائے کہ شہر میں ہونے والے پراسرار قتل کے پیچھے چاؤ فان کا ہاتھ ہے تو وہ خود اسے پکڑوا دے گی کیونکہ قاتل کی زندہ یا مردہ گرفتاری میں تعاون کرنے پر دو لاکھ ڈالرز کی خطیر انعامی رقم رکھی گئی ہے۔ اس وقت فرگوسن اور چاؤ فان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دو لاکھ ڈالرز واقعی میں ان کے ہونے والے ہیں۔

مارتھر نامی اس شخص کی لاش اٹھانے کے لیے گاڑی آئی تو پولیس نے فوری کاغذی کارروائی کے بعد چاؤ فان کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

اس واقعے کے تقریباً دو ماہ گزرنے کے بعد چاؤ فان کی تمام معاشی... مشکلات گویا فضا میں تحلیل ہوگئی تھیں۔ اسے انعامی رقم مل گئی تھی۔ اس کے بیٹے کا کامیاب آپریشن بھی ہو چکا تھا۔ چاؤ فان اور اس قاتل کی اسٹوری کو اخبارات نے اس قدر اچھالا کہ اس کے ٹریننگ سینٹر اور مارشل آرٹ کی مہارت کی خبروں نے نوجوانوں کو ایک بار پھر مارشل آرٹ کی جانب راغب کر دیا۔ ان دنوں اس کے ٹریننگ سینٹر میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ چاؤ فان اپنا تمام قرض چکانے کے بعد بھی اچھے خاصے بینک بیلنس کا مالک ہے۔ اس کی حسین اور خوشگوار زندگی ایک بار پھر لوٹ آئی ہے۔ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں کیونکہ اس نے انہیں ایک خطرناک قاتل سے نجات دلائی تھی۔ چاؤ فان کے پاس آج بھی وہ اخباری تراشے موجود ہیں جن میں چاؤ فان کی تعریفوں کے پل باندھے گئے تھے اور شہ سرخیوں میں یہ خبر لگائی گئی تھی۔ ''ویلڈن مسٹر چاؤ فان! تم نے شہریوں کو ایک وحشی قاتل سے نجات دلا دی۔''

ٹام اینڈ جیری

مرزا امجد بیگ

دو کشتیوں کے سوار والا محاورہ بہت مشہور ہے... اس کے باوجود کچھ لوگ خود کو بہت چالاک سمجھتے ہوئے اس کا تجربہ کرنے سے گریز نہیں کرتے اور... بالآخر ڈھاک کے تین پات... نتیجہ وہی نکلتا ہے۔ وہ بھی خود کو بہت ہوشیار سمجھ رہا تھا لیکن مرزا امجد نے ساری سمجھ داری اپنی وکالت کی دودھاری تلوار سے ادھیڑ ڈالی۔ میاں بیوی کا رشتہ اگر منافقت پر استوار ہو تو ایک دوسرے کا درد و غم ہلکا کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو اذیت دینے کے بہانے تلاش کیے جاتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر اگر قدرت نے عورت کو اولاد جیسی نعمت سے بھی محروم رکھا ہو مگر دولت کے ترازو میں بھی تول دیا ہو تو ایسے میں محبت اور خلوص کی جگہ لالچ و طمع دلوں میں مسکن ہو جاتی ہے۔ بہرحال واقعات کوئی بھی ہوں... انجام تو ہمیشہ نیتوں کی بنیاد پر نکلتے آئے ہیں۔

ایک مکار مجازی خدا کی فریب کاریوں کی عبرت اثر داستان

حق بات کی پہلی نشانی یہ ہے کہ معاشرے میں اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ جس کی کوئی مخالفت نہیں، وہ قطعاً حق نہیں!

اس مختصر سی جامع تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ ماہ اکتوبر کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ ان دنوں گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اگرچہ موسم سرما کا ابھی باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا تاہم شام میں عموماً اور رات میں خصوصاً خنکی ہو جاتی تھی اور یہی حال علی الصباح کا بھی تھا۔ میں عدالت جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے تیسری گھنٹی پر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ہیلو.....!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''السلام علیکم بیگ صاحب۔'' دوسری جانب ایک شناسا آواز ابھری۔ ''وحید نظامی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے جواباً کہا۔ ''وعلیکم السلام نظامی صاحب۔''

وحید نظامی کا تعلق سماجیات سے تھا۔ وہ ایک فلاحی ادارے کے روح رواں تھے۔ ان سے میرے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے لیکن بالمشافہ ملاقات بہت کم ہوتی تھی۔ زیادہ تر رابطہ فون پر ہی ہوا کرتا تھا اور وہ بھی اس وقت جب نظامی صاحب کو مجھ سے کوئی کام پڑتا تھا۔

''بیگ صاحب! کیا ابھی آپ سے مختصر بات ہو سکتی ہے؟'' نظامی نے پوچھا۔

''میں عدالت کے لیے نکلنے ہی والا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا اس وقت تو مختصر بات ہی ہو سکتی ہے۔ آپ حکم کریں، کیسے یاد فرمایا؟''

''میں ایک کیس آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور.....''

''اور یہ کہ آپ کی بات سننے سے پہلے میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں نظامی صاحب۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ دونوں طرف کوئی غلط فہمی موجود نہ رہے۔''

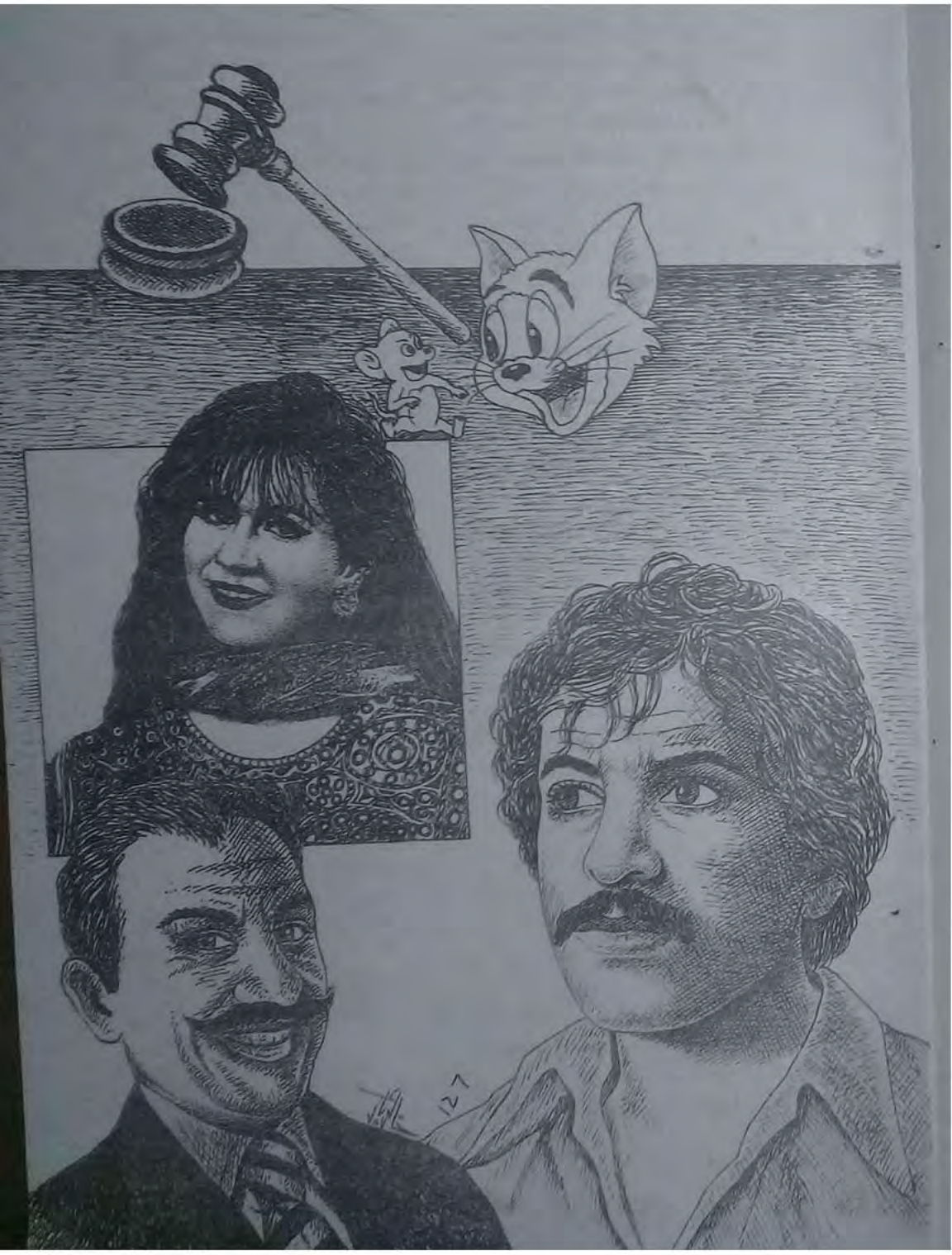

"جی ارشاد۔" وہ خوش دلی سے بولے۔ "آپ وضاحت پیش کریں۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔"

جو قارئین عرصہ دراز سے میری کہانیاں پڑھ رہے ہیں وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ میں سال میں ایک آدھ کیس بلا معاوضہ بھی لے لیا کرتا ہوں لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہی ہے کہ موکل مالی طور پر اتنا کمزور ہو کہ وہ میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو۔ اس طرح کسی مستحق کی مدد بھی ہو جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں، میرے اس عمل سے اقبال شعبے، میرے پیشے کی زکوٰۃ بھی نکل جاتی ہے۔

میں نے وحید نظامی کو صورت حال کی آگاہی دینے کے بعد دوٹوک انداز میں کہا۔ "میں اس سال کے دس ماہ میں دو بار اپنے پیشے کی زکوٰۃ نکال چکا ہوں لہٰذا اس کیس کے سلسلے میں آپ مجھ سے کسی تعاون کی توقع نہیں رکھیں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب۔" وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ "میں آپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ بس، آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے ــــ"

"کیسی درخواست؟" میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"آپ کا ہونے والا موکل کس حد تک اپنا بوجھ خود اٹھانے کی استطاعت رکھتا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ "اس سلسلے میں میرا ادارہ بھی اس کی مالی معاونت کرے گا۔ امید ہے، فیس کے حوالے سے آپ بھی ہاتھ ہولا رکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے نظامی صاحب! میں اپنی فیس میں خصوصی رعایت کر دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اب آپ مجھے کیس کی نوعیت بتا دیں؟"

"ایک مظلوم غریبی پر قتل کا الزام ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "راشدہ نامی گھروں میں کام کرنے والی ایک ماسی کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کر رکھا ہے۔ مقتول بھی ایک خاتون ہی ہے۔ راشدہ مقتول کے گھر میں صفائی ستھرائی کا کام کرنے آیا کرتی تھی۔"

"اوہ ــــ!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "کیا پولیس نے ملزم راشدہ کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے؟"

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "راشدہ اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔"

"قتل کی یہ واردات کب ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور پولیس نے راشدہ کو کب حراست میں لیا ہے؟"

میرے سوال کے جواب میں وحید نظامی نے بتایا۔ "پولیس کے اندازے کے مطابق وقوعہ سترہ اکتوبر کو پیش آیا تھا اور مقتول کی لاش اٹھارہ اکتوبر کو دریافت ہوئی تھی اور اسی روز یعنی اٹھارہ اکتوبر کو ملزم راشدہ کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ راشدہ پر اپنی مالکن کے قتل کے علاوہ چوری کا بھی الزام ہے۔"

"اوہ ــــ" میں نے متاسفانہ انداز میں پوچھا۔ "کس قسم کی چوری؟"

"مقتول کے شوہر نے پولیس کو بتایا ہے کہ گھر سے طلائی زیورات، نقدی اور کچھ سیونگ سرٹیفکیٹس بھی غائب ہوئے ہیں۔"

"آپ اس کیس کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "مجھے جتنا معلوم تھا وہ آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں ایک کام کرتا ہوں ــــ" لمحاتی توقف کر کے نظامی نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے سوال کیا۔ "بیگ صاحب! آپ عدالت سے فارغ ہونے کے بعد اپنے آفس کب تک پہنچیں گے؟"

"یہی کوئی تین اور چار بجے کے درمیان۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں ملزم کے شوہر کو آپ کے آفس بھیج دیتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "آپ اس سے تفصیلی ملاقات کر کے تمام تر معلومات حاصل کر لیں۔"

"ہاں۔ یہی مناسب رہے گا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔

الوداعی کلمات کے تبادلے کے بعد میں نے ٹیلی فونک رابطہ موقوف کر دیا۔

☆☆☆

وحید نظامی نے ملزم راشدہ کے لیے "غیر بینی" کا لفظ بالکل صحیح استعمال کیا تھا، اس بات کا اندازہ مجھے اس کے شوہر مظہر کو دیکھ کر بخوبی ہو گیا تھا۔ مظہر کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہو گی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک سیاہ رو شخص تھا۔ وہ کورنگی کے سائٹ ایریا میں کسی بسکٹ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ شکل صورت سے وہ ایک جفاکش اور سیدھا سادہ بندہ دکھائی دیتا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ "نظامی صاحب نے بتایا تھا کہ آپ فیس میں خصوصی رعایت کریں گے۔"

"بے شک کروں گا۔" میں نے حتمی انداز میں کہا۔

وہ میرے آفس کے قیمتی فرنیچر اور اعلیٰ درجے کی زیبائش کا جائزہ لینے کے بعد بے یقینی سے مجھے تکنے لگا جیسے اسے میری بات مذاق لگی ہو۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ دوسرے وکیلوں کی بہ نسبت میری فیس قدرے زیادہ ہے اسی لیے اپنے معیار کو قائم رکھنے کے لیے میں نے اپنے آفس کو ویل ڈیکوریٹڈ رکھا ہوا ہے۔ دکانداری کسی بھی نوعیت کی ہو اس کا تاثر اگر کلائنٹ پر اچھا پڑے تو وہ نسبتاً زیادہ پیسے ادا کرنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتا۔

میں نے مظہر کو متذبذب دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''نظامی صاحب نے تمہیں غلط نہیں بتایا لیکن فیس میں کمی کے حوالے سے میری ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط وکیل صاحب؟'' اس کی بے یقینی میں الجھن بھی شامل ہوگئی۔

میں نے اس کی معصومیت سے محظوظ ہوتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''میں صرف ان لوگوں کو فیس میں رعایت دیتا ہوں جو مجھ سے کچھ نہیں چھپاتے۔ غلط بیانی کرنے والوں کو میں خود سے کئی میل دور رکھتا ہوں لہٰذا اگر تمہیں میرا تعاون چاہیے تو میں تمہاری زبان سے صرف اور صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''وکیل صاحب! پہلی بات یہ کہ ہمارے پاس چھپانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ ''اور جہاں تک جھوٹ بولنے کی بات ہے تو ہمارے بڑوں نے یہ کام ہمیں سکھایا ہی نہیں۔ اگر ہمیں اس شعبے میں مہارت حاصل ہوتی تو پھر محنت مزدوری میں جان کھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم بھی چھل فریب اور دغابازی سے کافی ترقی کر چکے ہوتے۔''

میں نے حیرت بھری نظر سے مظہر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم بسکٹ فیکٹری میں کام کیا کرتے ہو؟''

مظہر کے اندر مجھے کسی فلسفی کی روح انگڑائی لیتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی باتوں سے دانش اور دانائی ٹپکتی تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا۔

''وکیل صاحب! میرا شمار لیبرز میں ہوتا ہے۔ عموماً میں بسکٹ کے کارٹن اٹھا کر ٹرک میں رکھتا ہوں یا پھر ہمارا سپروائزر جو کام بھی بتائے، وہ کرنا ہوتا ہے۔''

''محنت میں عظمت ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اپنی عظمت کو چار چاند لگانا چاہتے ہو تو مجھے تمام حالات سے تفصیلاً آگاہ کرو تاکہ میں اس کیس میں تمہاری بیوی کی پوزیشن کا بالکل درست اندازہ لگا سکوں۔''

چند لمحات تک سوچنے کے بعد وہ شروع ہوگیا۔ آئندہ آدھے گھنٹے میں اس نے مجھے ساری کہانی سنا ڈالی۔ میں اس کتھا میں سے غیر ضروری اور غیر متعلقہ باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ بھی اس کیس کے عواقب و جوانب سے پوری طرح واقف ہو جائیں اور عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ عرض کرتا چلوں کہ اس داستان میں سے کچھ باتیں میں دانستہ گول کر رہا ہوں تاکہ کہانی کے اندر سسپنس کا عنصر قائم و دائم رہے۔ ان باتوں کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں، مناسب مقامات پر کیا جائے گا۔

جیسا کہ آپ جان چکے ہیں، ملزم راشدہ کا شوہر مظہر ایک فیکٹری مزدور تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بوڑھی والدہ کے ساتھ اعظم بستی نامی ایک پسماندہ علاقے میں رہتا تھا۔ ان کی تین اولادیں تھیں۔ سات سالہ فوزیہ، پانچ سالہ کاشف اور تین سالہ عاطف، فوزیہ اور کاشف محلے ہی کے ایک اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ ملزم راشدہ صبح نو بجے سے سہ پہر تین بجے تک باسی کی حیثیت سے مختلف گھروں میں کام کیا کرتی تھی۔ وہ کم و بیش تین بجے گھر واپس آتی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں بچوں کی دادی نسیمہ بی بی گھر اور بچوں کو سنبھالتی تھی۔ نسیمہ کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی تاہم اس کے ہاتھ پاؤں میں ابھی اتنی جان باقی تھی کہ راشدہ کے غیاب میں وہ گھر بار کو اچھی طرح دیکھ لیتی تھی۔ راشدہ صبح گھر سے نکلتے وقت کھانا وغیرہ بنا کر جاتی تھی۔ وہ سب سے پہلا کام مقتول نادرہ ہی کے گھر میں کیا کرتی تھی۔ وہاں اس کے کام کے اوقات ساڑھے نو سے دس بجے تک تھے جن میں چند منٹس کی کمی بیشی ہو جایا کرتی تھی۔ ملزم راشدہ ہفتہ وار چھٹی جمعے کے روز کیا کرتی تھی۔

مقتول نادرہ ایک گھریلو عورت تھی۔ اس کا شوہر عدیل ایک پبلشنگ ہاؤس میں کام کرتا تھا۔ آپ آسانی کے لیے ''اسٹار پبلشرز'' فرض کر لیں۔ یہ ادارہ تاریخی اور دینی کتب کی اشاعت کے لیے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ لوگ دیگر مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرتے تھے۔ عدیل مارکیٹنگ اور کلیکشن کے شعبے سے وابستہ تھا اور اس سلسلے میں اسے اکثر شہر سے باہر جانا پڑتا تھا۔ وقوعہ کے روز بھی وہ کراچی میں موجود نہیں تھا۔ اسٹار پبلشرز کی مطبوعات ملک بھر میں جاتی تھیں۔

مقتول کی شادی کو لگ بھگ پانچ سال ہو گئے تھے

لیکن تاحال ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ پی ای سی ایچ سوسائٹی کے بلاک نمبر چھ، ای مارکیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ یہ چنیسر ہالٹ کے نزدیک، ریلوے لائن کے کنارے کا علاقہ تھا۔ اسی گز پر تعمیر شدہ دو منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر ان کی رہائش تھی۔ زیریں منزل یعنی گراؤنڈ فلور پر ان کے کرائے دار آباد تھے۔ عدیل پندرہ اکتوبر بروز جمعرات کام کے سلسلے میں کراچی سے باہر گیا تھا اور اس کی واپسی اٹھارہ اکتوبر بروز اتوار ہوئی تھی۔ وہ مہینے میں ایک یا دو بار چند روز کے لیے شہر سے باہر جایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں آن لائن بینکنگ کا رواج نہیں ہوا تھا۔ آج کل کی طرح رقم کی منتقلی کی یہ سہولت موجود نہیں تھی لہٰذا ادائیگی کا کام بھی عدیل کے ذمے تھا۔ وہ اپنے بیرونِ شہر دورے میں مختلف بک شاپ سے کتابوں کے آرڈرز لیتا اور پے منٹس وصول کرکے واپس آجاتا تھا۔ اس کا باس اس پر اعتماد کرتا تھا۔ اب کی بار جو وہ اپنے دورے سے لوٹا تو ایک سنسنی خیز صورتِ حال اس کی منتظر تھی۔

وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ اس نے بالائی منزل پر پہنچ کر اپنے دروازے پر دستک دی لیکن اندر کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین چار بار دروازہ بجا ڈالا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نادرہ پہلی دستک پر ہی اس کے لیے دروازہ کھول دیا کرتی تھی۔ گھر کے اندر سے ٹی وی کے چلنے کی آواز آرہی تھی اور اندر کی کوئی لائٹ بھی آن تھی۔ فوری طور پر عدیل کو یہی لگا کہ شاید اس کی بیوی واش روم میں ہے۔ چند منٹس کے انتظار کے بعد اس نے قدرے زیادہ قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اب کی بار بھی اندر سے کوئی رسپانس نہیں آیا۔ اس صورتِ حال نے عدیل کو تشویش میں مبتلا کردیا۔ لائٹس اور ٹی وی کے آن ہونے کا مطلب یہ تھا کہ نادرہ گھر کے اندر موجود ہے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ عدیل کی دستک کا جواب نہیں دے رہی تھی۔

عدیل کے بیان کے مطابق اس کے بار بار دروازہ دھڑدھڑانے کے باوجود بھی جب نادرہ نے اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا تو وہ زیریں منزل پر آباد کرائے داروں کے پاس چلا گیا تاکہ معلوم ہو کہ معاملہ کیا ہے۔ زیریں منزل پر ایاز علی اپنی بیوی... شبانہ اور دس سالہ بیٹی فرزانہ کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ ایاز علی کی محمود آباد گیٹ پر کپڑے کی دکان تھی۔ ایاز علی اتوار کو اپنی دکان بند رکھتا تھا لہٰذا دروازہ اسی نے کھولا۔ وہ اس وقت گھر میں موجود تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد عدیل نے اس سے دریافت کیا۔ ''ایاز صاحب! میں کافی دیر سے اپنا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں مگر نادرہ دروازہ نہیں کھول رہی۔ کیا وہ کہیں باہر تو نہیں گئی ہوئی۔ آپ لوگوں کو اس بارے میں کوئی خبر ہے؟''

''آپ اندر آجائیں عدیل بھائی۔'' ایاز نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔''

ایاز کے انداز نے عدیل کی تشویش میں اضافہ کردیا۔ ''ایسی کیا بات ہے؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں ایاز کی جانب دیکھا۔ ''جو دروازے پر کھڑے ہوکر نہیں جاسکتی۔''

''ہم میاں بیوی بھی نادرہ بھابی کی وجہ سے کافی فکرمند ہیں۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''کل سے وہ ہمیں نظر نہیں آئیں۔ گھر کے اندر ٹی وی چل رہا ہے اور لائٹس بھی آن ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میری بیوی کی آپ کی بیوی سے روزانہ دو تین مرتبہ ''ہیلو ہائے'' ہوتی ہے مگر کل اور آج ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پہلے تو ہم پریشان ہوتے رہے۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگئے کہ شاید وہ جلدی میں کہیں چلی گئی ہیں اور جاتے ہوئے ٹی وی، لائٹس وغیرہ کو آف کرنا بھول گئی ہیں۔''

''لیکن وہ جاکہاں سکتی ہے.....!'' عدیل نے متذبذب انداز میں کہا۔

ایاز کی بیوی شبانہ بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے خیال آرائی کی۔ ''ہوسکتا ہے، بھابی کسی عزیز رشتے دار کی طرف چلی گئی ہوں۔''

شبانہ پینتیس سال کی ایک گول مٹول گھریلو عورت تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ سے بھی ایک آدھ انچ کم ہی رہا ہوگا۔ اس قامت پر فربہ اندامی نے اسے فٹ بال کی صورت دے دی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں ایاز علی ایک دبلا پتلا دراز قامت شخص تھا۔ شبانہ وقتاً فوقتاً ایاز کی بغل میں آتی تھی۔

''نادرہ کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔'' عدیل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''آج تک وہ کسی سے ملنے نہیں گئی تو اب کیا گئی ہوگی اور اگر اسے زیادہ وقت کے لیے جانا بھی تھا تو کم از کم آپ لوگوں کو تو کچھ بتا کر جاتی۔''

''بھائی صاحب! یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' شبانہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''میں خود حیران ہوں کہ نادرہ بھابی اچانک کہاں غائب ہوگئی ہیں۔ کل صبح سے لے کر اب تک وہ نہ تو نیچے اتری ہیں اور نہ ہی ان کی آواز سنائی دی۔''

عدیل نے ایک اہم سوال کیا۔ ''کیا کل اور آج ماسی کام کرنے آئی تھی؟''

ان کی ماسی یعنی ملزم راشدہ جمعے کی ہفتہ وار چھٹی کیا کرتی تھی لہٰذا ہفتہ اور اتوار اسے کام کرنے آنا چاہیے تھا۔ شبانہ نے جواب دیا۔

''آج تو راشدہ کہیں نظر نہیں آئی۔ شاید اس نے چھٹی مار لی ہے یا پھر ہوسکتا ہے، وہ نادرہ بھابی سے چھٹی لے کر گئی ہو۔''

''یہ تو آج یعنی اتوار کی بات ہوئی۔'' عدیل نے سوالیہ نظر سے شبانہ کی طرف دیکھا۔ ''اور کل کا کیا.....؟''

''ہفتے کے دن ماسی کام کرنے آئی تھی۔'' شبانہ نے بتایا۔ ''جب وہ زینوں کی جھاڑو نکال رہی تھی تو میری اس سے بات ہوئی تھی لیکن.....''

شبانہ بولتے بولتے اچانک رکی تو عدیل پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''لیکن کیا؟''

''راشدہ ہمیشہ جمعے کی چھٹی کرتی ہے۔'' شبانہ نے جواب دیا۔ ''لیکن اس جمعے کو وہ کام کرنے آئی تھی۔''

صورتِ حال کافی الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح سیل فون نہیں ہوا کرتے تھے۔ رابطے کا واحد ذریعہ لینڈ لائن ٹیلی فون ہی تھا۔ نادرہ کے دور پار کے ایک انکل ہوا کرتے تھے جو ناظم آباد میں رہتے تھے۔ نادرہ کبھی کبھار ان کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ عدیل کے ذہن میں انہی انکل کا نام چمکا۔ اس نے فوراً فاروق نامی اس شخص کو فون کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد عدیل نے کہا۔

''انکل! کیا نادرہ آپ سے ملنے آئی ہوئی ہے؟''

''ارے بیٹا! ہمارے ایسے نصیب کہاں!'' فاروق نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ہزار بار دعوت دے چکا ہوں مگر آپ اسے لے کر آتے ہی نہیں ہو۔ میری گھر والی بھی تم لوگوں کا پوچھتی رہتی ہے۔ کبھی چکر لگاؤ نا.....!''

''جی..... انشاءاللہ.....'' عدیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم بہت جلد آپ کی یہ شکایت دور کردیں گے۔''

''کیا نادرہ گھر پر نہیں ہے؟'' فاروق نے پوچھا۔

''میں بیرونِ شہر دورے پر گیا ہوا تھا۔'' عدیل نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''آج ہی واپس آیا ہوں۔ نادرہ گھر میں موجود نہیں اس لیے آپ کو فون کرکے پوچھ لیا۔ خیر، آپ پریشان نہ ہوں۔ ہوسکتا ہے، وہ شاپنگ کے لیے کہیں دور نکل گئی ہو۔''

''ٹھیک ہے بیٹا! نادرہ جب خیریت سے واپس آجائے تو مجھے اطلاع دے دینا۔'' فاروق نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور کوشش کرکے آپ لوگ تھوڑا ٹائم نکالیں اور ہمیں مہمان نوازی کا موقع دیں۔''

''جی انکل، ضرور.....'' یہ کہتے ہوئے عدیل نے ٹیلی فون رکھ دیا۔

ایاز نے تشویش آمیز انداز میں کہا۔ ''عدیل بھائی! اب آپ کیا کریں گے؟''

''میں گھر کے اندر جاکر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

''آپ کے پاس گھر کی دوسری چابی تو ہوگی بھائی؟'' شبانہ نے سوالیہ نظر سے عدیل کی جانب دیکھا۔

''اگر میرے پاس چابی ہوتی تو میں آپ لوگوں کو ہرگز پریشان نہ کرتا۔'' عدیل اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ ایک اتفاق ہے کہ اس مرتبہ جاتے ہوئے میں گھر کی چابی بیگ میں رکھنا بھول گیا تھا۔''

''آپ کے پاس چابی نہیں ہے تو پھر لاک کیسے کھولیں گے؟'' شبانہ نے استفسار کیا۔

''ظاہر ہے، مجبوراً مجھے تالا توڑنا پڑے گا۔'' عدیل اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

''آپ چند منٹ رک جائیں۔'' ایاز نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میں بابو بھائی کو چیک کرتا ہوں۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوا تو تالا توڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔''

''بابو بھائی'' کو عدیل بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ شخص ''بابو بھائی تالا چابی والا'' کے نام سے مشہور تھا۔ سادہ الفاظ میں آپ بابو بھائی کو ''کی میکر'' سمجھ لیں۔ بابو کا گھر دو تین گلی کے فاصلے پر تھا۔ وہ اپنا اڈا تو کہیں اور لگاتا تھا لیکن آج چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے اس کے گھر پر پائے جانے کی امید تھی۔

یہ امید بر آئی۔ بابو بھائی نے اپنے اوزاروں کی مدد سے عدیل کے گھر کے داخلی دروازے کا لاک کھول ڈالا۔ اس کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ نادرہ کو کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

وہ اسی مربع گز پر تعمیر شدہ دو کمروں اور ایک لاؤنج پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا۔ ان دو کمروں میں ایک ڈرائنگ روم اور دوسرا بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ نادرہ کی خون آلود لاش بیڈ روم میں بیڈ کے اوپر پڑی تھی۔ اس کی لاش کی حالت کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ قتل کے وقت وہ اپنے بال سنوار رہی تھی کیونکہ اس کے بال کھلے تھے اور

عدیل نے ایک اہم سوال کیا۔ ''کیا کل اور آج ماسی کام کرنے آئی تھی؟''

ان کی ماسی یعنی ملزم راشدہ جمعے کی ہفتہ وار چھٹی کیا کرتی تھی لہٰذا ہفتہ اور اتوار اسے کام کرنے آنا چاہیے تھا۔ شبانہ نے جواب دیا۔

''آج تو راشدہ کہیں نظر نہیں آئی۔ شاید اس نے چھٹی مار لی ہے یا پھر ہوسکتا ہے، وہ نادرہ بھابی سے چھٹی لے کر گئی ہو۔''

''یہ تو آج یعنی اتوار کی بات ہوئی۔'' عدیل نے سوالیہ نظر سے شبانہ کی طرف دیکھا۔ ''اور کل کا کیا.....؟''

''ہفتے کے دن ماسی کام کرنے آئی تھی۔'' شبانہ نے بتایا۔ ''جب وہ زینوں کی جھاڑو نکال رہی تھی تو میری اس سے بات ہوئی تھی لیکن.....''

شبانہ بولتے بولتے اچانک رکی تو عدیل پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''لیکن کیا؟''

''راشدہ ہمیشہ جمعے کی چھٹی کرتی ہے۔'' شبانہ نے جواب دیا۔ ''لیکن اس جمعے کو وہ کام کرنے آئی تھی۔''

صورتِ حال کافی الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح سیل فون نہیں ہوا کرتے تھے۔ رابطے کا واحد ذریعہ لینڈ لائن ٹیلی فون ہی تھا۔ نادرہ کے دور پار کے ایک انکل ہوا کرتے تھے جو ناظم آباد میں رہتے تھے۔ نادرہ کبھی کبھار ان کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ عدیل کے ذہن میں انہی انکل کا نام چمکا۔ اس نے فوراً فاروق نامی اس شخص کو فون کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد عدیل نے کہا۔

''انکل! کیا نادرہ آپ سے ملنے آئی ہوئی ہے؟''

''ارے بیٹا! ہمارے ایسے نصیب کہاں!'' فاروق نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ہزار بار دعوت دے چکا ہوں مگر آپ اسے لے کر آتے ہی نہیں ہو۔ میری گھر والی بھی تم لوگوں کا پوچھتی رہتی ہے۔ کبھی چکر لگاؤ نا.....!''

''جی..... انشاءاللہ.....'' عدیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم بہت جلد آپ کی یہ شکایت دور کردیں گے۔''

''کیا نادرہ گھر پر نہیں ہے؟'' فاروق نے پوچھا۔

''میں بیرونِ شہر دورے پر گیا ہوا تھا۔'' عدیل نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''آج ہی واپس آیا ہوں۔ نادرہ گھر میں موجود نہیں اس لیے آپ کو فون کرکے پوچھ لیا۔ خیر، آپ پریشان نہ ہوں۔ ہوسکتا ہے، وہ شاپنگ کے لیے کہیں دور نکل گئی ہو۔''

''ٹھیک ہے بیٹا! نادرہ جب خیریت سے واپس آجائے تو مجھے اطلاع دے دینا۔'' فاروق نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور کوشش کرکے آپ لوگ تھوڑا ٹائم نکالیں اور ہمیں مہمان نوازی کا موقع دیں۔''

''جی انکل، ضرور.....'' یہ کہتے ہوئے عدیل نے ٹیلی فون رکھ دیا۔

ایاز نے تشویش آمیز انداز میں کہا۔ ''عدیل بھائی! اب آپ کیا کریں گے؟''

''میں گھر کے اندر جاکر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

''آپ کے پاس گھر کی دوسری چابی تو ہوگی بھائی؟'' شبانہ نے سوالیہ نظر سے عدیل کی جانب دیکھا۔

''اگر میرے پاس چابی ہوتی تو میں آپ لوگوں کو ہرگز پریشان نہ کرتا۔'' عدیل اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ ایک اتفاق ہے کہ اس مرتبہ جاتے ہوئے میں گھر کی چابی بیگ میں رکھنا بھول گیا تھا۔''

''آپ کے پاس چابی نہیں ہے تو پھر لاک کیسے کھولیں گے؟'' شبانہ نے استفسار کیا۔

''ظاہر ہے، مجبوراً مجھے تالا توڑنا پڑے گا۔'' عدیل اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

''آپ چند منٹ رک جائیں۔'' ایاز نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میں بابو بھائی کو چیک کرتا ہوں۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوا تو تالا توڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔''

''بابو بھائی'' کو عدیل بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ شخص ''بابو بھائی تالا چابی والا'' کے نام سے مشہور تھا۔ سادہ الفاظ میں آپ بابو بھائی کو ''کی میکر'' سمجھ لیں۔ بابو کا گھر دو تین گلی کے فاصلے پر تھا۔ وہ اپنا اڈا تو کہیں اور لگاتا تھا لیکن آج چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے اس کے گھر پر پائے جانے کی امید تھی۔

یہ امید بر آئی۔ بابو بھائی نے اپنے اوزاروں کی مدد سے عدیل کے گھر کے داخلی دروازے کا لاک کھول ڈالا۔ اس کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ نادرہ کو کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

وہ اسی مربع گز پر تعمیر شدہ دو کمروں اور ایک لاؤنج پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا۔ ان دو کمروں میں ایک ڈرائنگ روم اور دوسرا بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ نادرہ کی خون آلود لاش بیڈ روم میں بیڈ کے اوپر پڑی تھی۔ اس کی لاش کی حالت کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ قتل کے وقت وہ اپنے بال سنوار رہی تھی کیونکہ اس کے بال کھلے تھے اور

ہیئر برش بھی اس کی لاش کے نزدیک ہی بیڈ پر پڑا تھا۔ بیڈروم کی لائٹ آن تھی اور ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ کسی شقی القلب شخص نے مقتول کے سر کے عقبی حصے پر کسی آہنی اوزار سے ضرب لگا کر اس کی زندگی کا چراغ گل کردیا تھا مقامِ ضرب پر مقتول کی کھوپڑی بری طرح چٹخی ہوئی تھی جہاں سے خارج ہونے والے خون نے نادرہ کے لباس اور بیڈ شیٹ کو خون آلود کردیا تھا۔

اس صورتِ حال نے عدیل کی عجیب حالت کردی۔ اس پر مستزاد بیڈروم میں موجود کپڑوں والی بڑی چوبی الماری کے دونوں پٹ بھی وا تھے۔ کسی بیڈروم کے اندر کپڑوں والی الماری کا کھلا ہونا اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن اس کے کھلے ہوئے پٹ میں سے کپڑے اور دیگر سامان جس بے ترتیبی سے باہر کو الٹا ہوا تھا اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نے افراتفری میں الماری کے اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ چیک کرنے پر انکشاف ہوا کہ الماری کے لاکر کے اندر سے طلائی زیورات، کیش رقم اور دیگر سیونگ سرٹیفکیٹس غائب تھے۔ لاکر کو بھی الماری کی طرح کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ بادی النظر میں یہ قتل اور ڈکیتی کی واردات تھی۔

عدیل نے فی الفور پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ پولیس نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر اپنی کارروائی مکمل کی اور ڈرائنگ روم میں بچھے صوفوں کے پیچھے سے آلۂ قتل بھی برآمد کرلیا۔ آلۂ قتل ایک ڈیڑھ انچ موٹی اور بارہ انچ لمبی ہاون دستہ شکل کی راڈ تھی۔ مذکورہ راڈ کے ایک سرے پر خون جما ہوا تھا جس کے اندر چند بال بھی چپکے ہوئے تھے۔ پولیس نے آلۂ قتل کو اپنے قبضے میں لے کر نادرہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دیا تھا۔ اس کے بعد ملزم راشدہ کو اسی روز اس کے گھر واقع اعظم بستی سے لگ بھگ رات آٹھ بجے گرفتار کرلیا تھا۔ عدیل کے بیان کی روشنی میں جو شواہد سامنے آئے تھے وہ ماسی راشدہ کی جانب بڑے خطرناک اشارے کرتے تھے۔

آئندہ روز یعنی پیر انیس اکتوبر کی صبح پولیس نے راشدہ کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ایک ہفتے کا ریمانڈ حاصل کرلیا تھا۔ اس وقت وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں تھی۔

میں نے بیس اکتوبر بروز منگل اس کیس میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اسی شام میں نے متعلقہ تھانے جا کر ملزم راشدہ سے تفصیلی ملاقات بھی کرلی تھی۔ وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر میں نے اس کے نشاناتِ انگوٹھا ثبت کروالیے تھے۔ راشدہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی لہٰذا دستخط کرنے سے بھی نابلد تھی۔ جب کوئی ملزم عدالتی ریمانڈ پر ہوتا ہے تو اس سے ملاقات کرنا ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے لیکن میں اپنے مخصوص ہتھکنڈوں سے اس ناممکن کام کو ممکن بنالیا کرتا ہوں۔

ملزم راشدہ کی عمر تیس کے اریب قریب تھی۔ نظامی صاحب نے اس کے لیے ''غریبنی'' کا لفظ بالکل صحیح استعمال کیا تھا۔ وہ عام سی شکل صورت کی مالک ایک مسکین عورت تھی۔ اس واقعے نے راشدہ کو ذہنی اور اعصابی طور پر بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ مجھے ڈری سہمی ہوئی ایک منتشر الخیال عورت لگی۔ میں نے بڑی تکنیک کے ساتھ بیس پچیس منٹ میں اس کی پتا سن لی۔ اس کی کہانی عدیل کے بیان اور پولیس کی تفتیش سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اس کی کتھا میں، میں نے ایسے پوائنٹس تلاش کرلیے جس سے مجھے اس کی بے گناہی کا یقین ہوگیا۔ ان اہم نکات کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں کیا جائے گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر بھی ہوجائے۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق مقتول نادرہ کی موت سترہ اکتوبر بروز ہفتہ صبح نو اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کا سبب سر کے عقبی حصے میں لگنے والی وہی کاری ضرب بتائی گئی تھی جس نے اس کی کھوپڑی کو چٹخا ڈالا تھا۔ آلۂ قتل پر جمے ہوئے خون اور اس خون کے اندر لگے ہوئے بالوں کے لیبارٹری ٹیسٹ نے بھی اس امر کی تصدیق کردی تھی کہ مقتول نادرہ کو اسی آہنی راڈ کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

آئندہ روز میں نے ملزم کے شوہر مظہر کو اپنے پاس بلالیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا تم چاہتے ہو کہ میں جلد از جلد تمہاری بیوی کو اس دبال سے باہر نکال لوں؟''

اس کیس کو عدالت میں لگے اب دس سے زیادہ دن ہوگئے تھے۔ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے مزید ایک ہفتے کا ریمانڈ حاصل کرلیا تھا۔

''جی بالکل، میں یہی چاہتا ہوں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''تینوں بچے اپنی ماں کو بہت یاد کرتے ہیں، خاص طور پر چھوٹے عاطف کا برا حال ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے یہ کیس ہاتھ میں لیا ہے تو کامیابی سے اسے ہمکنار بھی کروں گا لیکن اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔''

''آپ جو کہیں گے، میں کرنے کو تیار ہوں وکیل صاحب۔'' وہ فدویانہ انداز میں بولا۔

''فی الحال تم اپنی بسکٹ فیکٹری سے دو تین دن کی چھٹی لے لو۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم ایسا کرلو گے؟''

''جی، کرلوں گا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب راشدہ کو پولیس نے گرفتار کیا تھا تو بھی میں نے ایک دو دن کی چھٹی کی تھی۔''

''میں تمہیں کسی ضروری کام سے کراچی سے باہر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم نے میری ہدایت کے مطابق کارکردگی دکھائی تو ہماری کامیابی کے امکانات روشن ہوجائیں گے۔''

''جو حکم وکیل صاحب۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

''میری تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ راشدہ جلد از جلد گھر واپس آجائے، اس مقصد کے لیے آپ مجھے کراچی سے باہر بھیجیں یا اس دنیا سے باہر، میں جانے کے لیے تیار ہوں۔''

مظہر تھوڑی دیر اور میرے پاس بیٹھا۔ میں نے اسے اپنے پروگرام کی تفصیل سے آگاہ کیا پھر ضروری ہدایات کے ساتھ رخصت کردیا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کردیا۔ میں پچھلی پیشی پر اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزمہ راشدہ کی درخواست ضمانت بھی عدالت میں دائر کرچکا تھا۔ عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو میں نے اپنی موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! ملزم ایک بہت ہی کمزور اور بے قصور عورت ہے۔ کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے لہٰذا عزت مآب عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کیا جائے۔''

''یور آنر! مثل مشہور ہے..... شکل مظلوماں، کرتوت ظالماں۔'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت رکوانے کی کوشش کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''اس کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے تمسخرانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ ''ضرب المثال کو کہیں بھی استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ان کی صحت کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ آپ نے تو اس محاورے کی ایسی کم تیسی کردی ہے۔''

میں نے یہ بات وکیل سرکار کو ذہنی طور پر الجھانے کے لیے کی تھی۔ وہ میری چال میں آگیا اور برا سا منہ بناتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

''میں نے ایسا کیا کردیا ہے؟''

''یہ محاورہ اس طرح ہے.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔ ''شکل مومناں، کرتوت کافراں!''

''تو کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''جس طرح دودھ سے دہی، لسی، مکھن، ملائی، کھیر، مٹھائی اور دیگر بے شمار چیزیں بنائی جاسکتی ہیں اسی طرح ایک محاورے سے دوسرا محاورہ کیوں نہیں بنایا جاسکتا۔ بات تو سمجھ میں آرہی ہے نا!''

''ہاں، بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مگر یہ بات ہے بہت رسوائی کی بلکہ..... بہت ڈھٹائی کی.....!''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ چونکی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میری موکل ایک بے گناہ اور مظلوم عورت ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ نے محاورے کی ٹانگ توڑنے کے شوق میں اس بے چاری کو ظالم سے تعبیر کردیا۔ اگر آپ کو ''محاورہ فیکٹری'' کھولنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے پاس ایک آدھ اہلِ زباں بھی رکھ لیں تاکہ آپ کے فرمودات کی اصلاح بھی ہوتی رہے۔ کسی بھی فیکٹری کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے اس کے اندر ''کوالٹی کنٹرول'' کا شعبہ ہونا بہت ضروری ہے ورنہ غیر معیاری مصنوعات چند دنوں میں فیکٹری کا بھٹا بٹھا دیتی ہیں.....''

میں نے وکیلِ استغاثہ پر بڑی گہری چوٹ کی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ میری بات کی گہرائی کو ناپ سکا تھا یا میرا مکالمہ اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ بس وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

''یور آنر!'' میں نے وکیلِ استغاثہ کو نظر انداز کرتے ہوئے جج کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''ملزم راشدہ کا تعلق اگرچہ ہمارے معاشرے کے ایک پسماندہ طبقے سے ہے مگر وہ ایک امن پسند اور معزز شہری اور اس سے بھی بڑھ کر وہ ایک ماں ہے۔ اس کے تین بچے جن کی عمریں تین سے سات سال کے درمیان ہیں، اپنی ماں کی گرفتاری کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ ان کے معصوم ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر ان کی ماں کا قصور کیا ہے۔ اسے کس جرم کی

پاداش میں ان سے دور کر دیا گیا ہے۔''

''جرم کی تفصیل پولیس کی رپورٹ میں موجود ہے۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کو چالان کی جو کاپی مہیا کی گئی ہے، لگتا ہے، آپ نے اسے توجہ سے نہیں پڑھا۔''

میں نے وکیلِ سرکار کے وار کو خوش دلی کی ڈھال پر روکا اور زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کے پیش کردہ چالان کو اول آخر اچھی طرح پڑھا ہے۔ اس رپورٹ کے اندر میری موکل پر کئی ایک الزامات عائد کیے گئے ہیں۔''

''میں بھی تو آپ کو یہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

''معذرت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ آپ کی کوشش انتہائی فضول اور لایعنی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ قانون کی اصطلاحات پڑھے بغیر ہی وکیل بن گئے ہیں۔''

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' میری چوٹ سے وہ بلبلا اٹھا۔

''میرے فاضل دوست.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قانون کی زبان میں ملزم اور مجرم بہ الفاظِ دیگر الزام اور جرم دو مختلف حیثیت کے حامل ہیں۔ جب تک کسی بھی شخص پر لگا ہوا الزام ثابت نہیں ہو جاتا وہ شخص ملزم ہی رہتا ہے۔ آپ نے استغاثہ کی جس رپورٹ کا ذکر کیا ہے اس میں میری موکل پر الزامات کی بھرمار دکھائی دیتی ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک الزام بھی ابھی تک عدالت میں ثابت ہونے کے بعد جرم کی مصدقہ شکل اختیار نہیں کر سکا لہٰذا قبل از وقت میری موکل کو مجرم گردانا سراسر زیادتی اور انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔''

''ملزم پر جو بھی الزام لگائے گئے ہیں انہیں عدالت میں ثابت بھی کیا جائے گا۔'' وہ بڑی رعونت سے بولا۔ ''آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''جب آپ ان الزامات کو اپنے دلائل سے ثابت کر دیں گے تو تب آپ میری موکل کو مجرم کہنے کے حق دار ہوں گے، اس سے پہلے ہرگز نہیں۔'' میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اور جہاں تک میرے فکرمند ہونے کا معاملہ ہے تو یہ میرا فرض عین ہے۔ اب آپ اپنی ''محاورہ فیکٹری'' میں اسے ''فرض عین'' یا ف، ق وغیرہ بنانے کی کوشش میں نہیں لگ جائیے گا.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے تمسخرانہ انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس کیس میں وکیلِ صفائی کی حیثیت سے پیش ہوا ہوں۔ اگر میں ملزم کے لیے فکرمند نہیں ہوں گا تو پھر اور کون اس بے چاری دکھیاری کا خیال کرے گا۔ کیا آپ مجھے میرے فرائض سے روکنا چاہتے ہیں؟''

وہ ایک دم گھبرا گیا۔ ''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا.....!''

''جنابِ عالی!'' میں وکیلِ استغاثہ کو چھوڑ کر جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''میری موکل بے گناہ ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسے اس کیس میں گھسیٹا گیا ہے۔ اس کا قتل ایسے فعل سے کوئی تعلق واسطہ نہیں لہٰذا اس کی درخواستِ ضمانت کو منظور کرنا انصاف کا تقاضا ہے۔''

''جنابِ عالی! ملزم قتل اور ڈکیتی کی منظم واردات میں ملوث ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے کہا۔ ''استغاثہ کے پاس ایسے چشم دید گواہ موجود ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں بہت کچھ دیکھ رکھا ہے لہٰذا ملزم کی درخواستِ ضمانت کو منظور کرنا مناسب نہیں ہوگا۔''

پہلے بھی کئی بار بتایا جا چکا ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے اور یہاں تو وکیلِ سرکار نے چشم دید گواہان کا شوشہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ مزید پندرہ بیس منٹ تک میرے اور وکیلِ استغاثہ کے بیچ ترش اور تلخ مکالمات کا سلسلہ جاری رہا۔ میں ملزم کی ضمانت کرانے اور وہ ضمانت رکوانے کی کوشش میں لگا رہا اور یہ بتانے میں، میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ اس کوشش میں وکیلِ استغاثہ کامیاب رہا تھا۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو ملزم کا شوہر مظہر بھی میرے ساتھ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں راشدہ کو جیل والی مخصوص وین میں بٹھا کر وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ یہ ساری کارروائی مظہر کی آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی جس نے اسے کافی دل شکستہ کر دیا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''حوصلہ رکھو مظہر۔ تم نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب میرا کام شروع ہوتا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاءاللہ! بہت جلد میں تمہاری بیوی کو باعزت رہا کرانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''مجھے آپ کی قابلیت پر کوئی شبہ نہیں ہے وکیل صاحب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے

کہ آپ راشدہ کو اس مصیبت سے نکال لیں گے لیکن اگر آج اس کی ضمانت ہوجاتی تو اچھا تھا۔ بچے، ماں کو اپنے پاس دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔''

''میں تمہارے دکھ کو محسوس کرسکتا ہوں مظہر۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے درد میں برابر کا شریک ہوں۔ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی لیکن تمہیں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا ہوم ورک مکمل کر رکھا ہے اور اس سلسلے میں تم نے بھی خاصا تعاون کیا ہے۔ بس، میں تمہیں آخری تکلیف دوں گا۔''

''کیسی تکلیف وکیل صاحب؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''میں کل تمہیں حیدرآباد روانہ کروں گا.....'' میں نے کہا۔

وہ تجسس بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے تو پہلے بھی مجھے کراچی سے باہر بھیجا تھا اور میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ اب آپ کس سلسلے میں مجھے حیدرآباد بھیج رہے ہیں؟''

''سلسلہ تو وہی پرانا ہے یعنی تمہاری بیوی کو اس جھنجٹ سے نجات دلانا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کچھ نئی باتیں میرے علم میں آئی ہیں۔ بس انہی کی تصدیق یا تردید کے لیے میں تمہیں حیدرآباد بھیج رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''جو آپ کا حکم، میں تیار ہوں۔'' میں نے ضروری ہدایات کے بعد اسے رخصت کردیا۔

☆☆☆

جج کرسیِ انصاف پر براجمان ہوچکا تو اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ اس روز عدالت کا کمرا پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ کوئی بھی کرسی خالی نظر نہیں آتی تھی۔ ملزم اور مقتول کے شوہروں کے علاوہ اہلِ محلہ میں سے مقتول کا کرائے دار ایاز علی بھی عدالت میں موجود تھا۔

جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کردیا۔

اس کے بعد ملزمہ کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا جو میری مؤکل اس سے پہلے پولیس کو دے چکی تھی۔ جب میں نے متعلقہ تھانے کی حوالات میں ملزم راشدہ سے ملاقات کی تھی تو میں نے اسے تمام تر باریکیاں اچھی طرح ذہن نشین کرادی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک غیر تعلیم یافتہ عورت تھی تاہم اس کی ذہانت اور سمجھ بوجھ نے مجھے متاثر کیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی بلکہ اس نے ان تمام نکات کو یاد بھی رکھا تھا جو میں نے اسے ذہن نشین کرائے تھے۔ اس کے بیان سے میں پوری طرح مطمئن تھا۔

راشدہ کا بیان مکمل ہوا تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ملزم خاصی پُراعتماد اور پُرسکون تھی۔ کسی بھی کیس میں سب سے زیادہ بے چاری حیثیت ملزم کی ہوتی ہے۔ اسے بڑی کڑی جرح کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کام کے لیے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خیر، راشدہ نے یہ مشکل مرحلہ بھی خوش اسلوبی سے طے کرلیا۔

اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کی باری آئی۔ استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہان کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں ان صفحات میں صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیان میں کوئی اہم اور دلچسپ نکتہ موجود ہوگا۔

استغاثہ کے پہلے گواہ کا نام شوکت حسین تھا۔ شوکت ایک جنرل اسٹور چلاتا تھا۔ اس کا اسٹور مقتول کے گھر کے سامنے گلی کی دوسری جانب واقع تھا۔ شوکت کی عمر پینتیس سے چالیس سال کے بیچ رہی ہوگی۔ وہ مناسب قد کا مالک ایک عام سی شکل صورت والا شخص تھا۔ شوکت نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروایا پھر وکیلِ استغاثہ نے اسے پکڑ لیا۔

''شوکت صاحب!'' وکیلِ استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں سر جھکائے کھڑی ملزم راشدہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں جناب۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

''آپ کو وقوعہ کا دن تو یاد ہوگا۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ..... جب مقتول نادرہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟''

''جی ہاں۔ مجھے یاد ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر ملزم کی سمت انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس عورت نے نادرہ صاحبہ کی جان لی ہے۔''

''سترہ اکتوبر کی صبح آپ اپنے اسٹور پر موجود تھے؟''

''جی۔ میں روزانہ صبح آٹھ بجے اسٹور کھولتا ہوں اور سہ پہر تین بجے تک میں اسٹور میں موجود رہتا ہوں۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد میرا چھوٹا بھائی فرید حسین ڈیوٹی سنبھالتا ہے۔ ہمارا اسٹور رات گیارہ بجے بند کردیا

جاتا ہے۔"

"وقوعہ کے روز یعنی سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ—" وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک آپ اسٹور پر موجود تھے؟"

"میں نے بتایا ہے نا، اس روز صبح آٹھ سے سہ پہر تین بجے تک میں اپنے اسٹور ہی پر تھا۔" گواہ نے جواب دیا۔ "لیکن آپ خاص طور پر نو سے گیارہ تک کے دو گھنٹے پر فوکس کر رہے ہیں۔"

"بالکل درست!" وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور اس کا سبب یہ ہے کہ اسی دوران میں مقتول نادرہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور آپ کو گواہی کے لیے عدالت میں بلایا گیا ہے کیونکہ انہی اوقات میں آپ نے ایک دلچسپ منظر دیکھا تھا۔ وہ منظر تو یقیناً آپ بھولے نہیں ہوں گے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!" شوکت حسین تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"آپ نے جو کچھ دیکھا اس کے بارے میں معزز عدالت کو بھی بتائیں۔" وکیل استغاثہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس حوالے سے آپ کے بیان کی بڑی اہمیت ہے۔"

"وہ ساڑھے نو یا دس کا وقت تھا۔" استغاثہ کے گواہ نے بتانا شروع کیا۔ "میں نے ملزم راشدہ کے شوہر مظہر کو بڑے پراسرار انداز میں مقتول نادرہ کے گھر کی جانب بڑھتے دیکھا۔ مظہر نے دائیں بائیں چوکس نظر سے دیکھنے کے بعد مقتول کے گھر کی گھنٹی بجائی اور دروازے سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر بالائی منزل پر لگی ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بالائی منزل والے موکھلے میں ملزم کی شکل دکھائی دی۔ یہ موکھلا اس لیے رکھا گیا تھا کہ وہاں سے رسی بندھی ٹوکری کو نیچے لٹکا کر سبزی وغیرہ لے لی جائے۔ نادرہ صاحبہ کو جب کسی سودے کی ضرورت ہوتی تو وہ ٹوکری میں پیسے رکھ کر نیچے کر دیتی تھیں اور مجھے اپنی ضرورت کے بارے میں بتا دیتی تھیں۔ میں ان کی مطلوبہ چیزیں اور بقایا پیسے ٹوکری میں ڈال دیتا تھا اور وہ ٹوکری کو رسی کی مدد سے اوپر کھینچ لیا کرتی تھیں۔"

"کیا وقوعہ کے روز ملزم نے بھی اس موکھلے میں سے کوئی ٹوکری نیچے لٹکائی تھی؟" وکیل استغاثہ نے گواہ کی بات پوری ہونے سے پہلے سوال داغ دیا۔ "اور آپ سے کسی سودے کی فرمائش کی تھی؟"

"نہیں جناب!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔"

"پھر کیسا ہوا تھا؟" وکیل استغاثہ نے سرسراتی ہوئے آواز میں استفسار کیا۔

گواہ شوکت حسین نے بتایا۔ "ملزم نے موکھلے میں سے گردن نکال کر نیچے کھڑے اپنے شوہر کو دیکھا پھر بڑی محتاط نظر سے اس نے دائیں بائیں گردن موڑ کر گلی کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی نیچے پھینک دی۔ مظہر نے اس پوٹلی کو کیچ کیا اور ایک جانب بڑھ گیا۔ کاش مجھے اس وقت پتا ہوتا کہ وہ مالِ مسروقہ لے کر فرار ہو رہا ہے تو میں دکان سے نکل کر اسے دبوچ لیتا۔ یہ تو نادرہ صاحبہ کی لاش دریافت ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ ملزم نے اپنی مالکن کو ٹھکانے لگانے کے بعد گھر میں سے طلائی زیورات، بھاری نقدی اور کچھ سیونگ سرٹیفکیٹس چرائے تھے۔ یقیناً اس پوٹلی کے اندر یہی چیزیں تھیں جو وقوعہ کے روز ملزم نے اپنے شوہر مظہر کو دی تھیں۔ پھر پانچ یا دس منٹ کے بعد وہ خود بھی وہاں سے روانہ ہو گئی تھی۔"

"لگ بھگ تیس ہزار مالیت کے طلائی زیورات، نقد رقم دس ہزار روپے اور بیس ہزار مالیت کے سیونگ سرٹیفکیٹس۔" وکیل استغاثہ نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ "کم و بیش ساٹھ ہزار روپے کا سامان ایک پوٹلی کے اندر رکھ کر بالائی منزل سے گلی میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد بڑے اطمینان سے ہاتھ جھاڑ کر ملزم جائے وقوعہ سے غائب ہو گئی اور مزے کی بات یہ کہ اگلے روز یعنی اتوار کی صبح وہ مقتول کے ہاں کام کرنے بھی نہیں آئی۔" لمحاتی توقف کر کے وکیل استغاثہ نے ایک گہری سانس لی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! یہ تو اچھا ہوا کہ اٹھارہ اکتوبر کی سہ پہر مقتول کا شوہر عدیل اپنے بیرون شہر دورے سے واپس آ گیا۔ اگر وہ نہیں آتا تو پتا نہیں کب تک، مقتول کی لاش اس کے بیڈروم میں پڑی سڑتی رہتی کیونکہ ملزم نے وہاں جو کارنامہ انجام دیا تھا اس کے بعد اس کا ادھر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

جج نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر وکیل استغاثہ سے سوال کیا۔ "آپ کو گواہ سے اور تو کچھ نہیں پوچھنا؟"

"نو سر!" وکیل نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"بیگ صاحب!" جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے

ہوئے کہا۔ ''ناؤ یور ٹرن''۔

میں وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں استغاثہ کے گواہ پر جرح شروع کرنے سے پہلے اپنے فاضل دوست سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

''یو آر پرمیٹڈ۔'' جج نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار کیا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ وکالت کے علاوہ اور کیا کیا کرتے ہیں؟''

''یہ میرا فل ٹائم پروفیشن ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ نے یہ کس طرح کا بے تکا سوال کیا ہے......''

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''جب میں آپ سے اگلا سوال کروں گا تو اول آخر ساری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔''

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! کیا آپ نے کبھی فزکس میں نوبل پرائز حاصل کیا ہے؟''

''جی نہیں!'' اس نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''کبھی آپ نے اپنی آنکھوں کا آپریشن کرایا ہو اور...... ہائی پاور اینٹی فیبرک لینس آنکھوں میں لگوائے ہوں؟''

''ہائی پاور اینٹی فیبرک لینس!'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہاٹ ڈو یو مین؟''

میں ایک خاص مقصد کے تحت وکیلِ استغاثہ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ میرے آؤٹ آف روٹین سوالات نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ میں نے اس کی برہمی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''مطلب...... ایسے طاقتور لینس جو کپڑے کے آر پار دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ان حیرت انگیز چمتکاری لینس کو اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں میں فٹ کروالے تو وہ دبیز کپڑے کے پیچھے رکھی چیزوں کو دیکھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔''

''میں نے کبھی ایسے لینس کے بارے میں نہیں سنا۔'' وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے اس کا خیال ہو کہ میں اسے الو بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ''اور اگر ایسے کوئی لینس ہوتے بھی ہیں تو میرا ان سے کیا لینا دینا؟''

''آپ ہی کا تو سب لینا دینا ہے میرے فاضل دوست!'' میں نے چھیڑ خانی کے عمل کو...... فائنل ٹچ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ کی آنکھوں میں اس صلاحیت کی جھلک دیکھی ہے۔''

''میری آنکھوں میں......'' بے ساختہ اس نے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھوا اور بکھری ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کب......؟''

''جب آپ نے معزز عدالت کے روبرو یہ فرمایا کہ......'' میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''لگ بھگ تیس ہزار مالیت کے طلائی زیورات، نقد رقم دس ہزار روپے اور بیس ہزار مالیت کے سیونگ سرٹیفکیٹس۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کے کہے ہوئے الفاظ کو دہرا دیا۔ ''کم و بیش ساٹھ ہزار روپے کا سامان ایک پوٹلی کے اندر رکھ کر بالائی منزل سے گلی میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد......''

''تو کیا آپ کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول کے گھر سے یہ تمام چیزیں چرائی گئی تھیں؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''مقتول کے شوہر عدیل نے ان چیزوں کے غیاب کی رپورٹ درج کرائی ہے۔ جائے وقوعہ پر تفتیشی افسر نے کھلی ہوئی الماری کو جس حالت میں دیکھا تھا اس سے بھی اسی نوعیت کی کہانی سامنے آتی ہے۔''

آپ کو تیس ہزار کے ''طلائی زیورات'' کے ذکر پر اپنے ذہن کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں موجودہ دور کی طرح سونا اتنا مہنگا نہیں ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو تیس ہزار روپے میں بہ مشکل چار پانچ گرام سونا ہی خریدا جاسکتا ہے جبکہ اس وقت اتنی رقم میں کسی دلہن کی پوری جیولری تیار ہو جاتی تھی۔

''اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ مذکورہ چیزیں مقتول کے بیڈ روم میں رکھی الماری میں سے چرائی گئی ہیں۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کس بنا پر یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وقوعہ کے روز میری موکل نے مقتول کے گھر کے موکھلے سے جو پوٹلی نیچے پھینکی تھی، اس کے اندر طلائی زیورات، نقدی اور سیونگ سرٹیفکیٹس رکھے ہوئے تھے؟ کیا آپ نے یعنی آپ کی آنکھوں نے بندھی ہوئی اس پوٹلی کے اندر کا احوال جان لیا تھا؟ اور یہ بھی بتائیں، کیا آپ اس وقت اس گلی میں موجود تھے جب میری موکل نے مذکورہ پوٹلی

ہوئے کہا۔ ''ناؤ یور ٹرن''۔

میں وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں استغاثہ کے گواہ پر جرح شروع کرنے سے پہلے اپنے فاضل دوست سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

''یو آر پرمیٹڈ۔'' جج نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار کیا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ وکالت کے علاوہ اور کیا کیا کرتے ہیں؟''

''یہ میرا فل ٹائم پروفیشن ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ نے یہ کس طرح کا بے تکا سوال کیا ہے......''

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''جب میں آپ سے اگلا سوال کروں گا تو اول آخر ساری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔''

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! کیا آپ نے کبھی فزکس میں نوبل پرائز حاصل کیا ہے؟''

''جی نہیں!'' اس نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''کبھی آپ نے اپنی آنکھوں کا آپریشن کرایا ہو اور...... ہائی پاور اینٹی فیبرک لینس آنکھوں میں لگوائے ہوں؟''

''ہائی پاور اینٹی فیبرک لینس!'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہاٹ ڈو یو مین؟''

میں ایک خاص مقصد کے تحت وکیلِ استغاثہ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ میرے آؤٹ آف روٹین سوالات نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ میں نے اس کی برہمی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''مطلب...... ایسے طاقتور لینس جو کپڑے کے آر پار دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ان حیرت انگیز چمتکاری لینس کو اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں میں فٹ کروالے تو وہ دبیز کپڑے کے پیچھے رکھی چیزوں کو دیکھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔''

''میں نے کبھی ایسے لینس کے بارے میں نہیں سنا۔'' وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے اس کا خیال ہو کہ میں اسے الو بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ''اور اگر ایسے کوئی لینس ہوتے بھی ہیں تو میرا ان سے کیا لینا دینا؟''

''آپ ہی کا تو سب لینا دینا ہے میرے فاضل دوست!'' میں نے چھیڑ خانی کے عمل کو...... فائنل ٹچ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ کی آنکھوں میں اس صلاحیت کی جھلک دیکھی ہے۔''

''میری آنکھوں میں......'' بے ساختہ اس نے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھوا اور بکھری ہوئی آواز میں استفسار کیا ''کب......؟''

''جب آپ نے معزز عدالت کے روبرو یہ فرمایا کہ......'' میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''لگ بھگ تیس ہزار مالیت کے طلائی زیورات، نقد رقم دس ہزار روپے اور بیس ہزار مالیت کے سیونگ سرٹیفکیٹس۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کے کہے ہوئے الفاظ کو دہرا دیا۔ ''کم و بیش ساٹھ ہزار روپے کا سامان ایک پوٹلی کے اندر رکھ کر بالائی منزل سے گلی میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد......''

''تو کیا آپ کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول کے گھر سے یہ تمام چیزیں چرائی گئی تھیں؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''مقتول کے شوہر عدیل نے ان چیزوں کے غیاب کی رپورٹ درج کرائی ہے۔ جائے وقوعہ پر تفتیشی افسر نے کھلی ہوئی الماری کو جس حالت میں دیکھا تھا اس سے بھی اسی نوعیت کی کہانی سامنے آتی ہے۔''

آپ کو تیس ہزار کے ''طلائی زیورات'' کے ذکر پر اپنے ذہن کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں موجودہ دور کی طرح سونا اتنا مہنگا نہیں ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو تیس ہزار روپے میں بہ مشکل چار پانچ گرام سونا ہی خریدا جاسکتا ہے جبکہ اس وقت اتنی رقم میں کسی دلہن کی پوری جیولری تیار ہو جاتی تھی۔

''اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ مذکورہ چیزیں مقتول کے بیڈ روم میں رکھی الماری میں سے چرائی گئی ہیں۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کس بنا پر یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ وقوعہ کے روز میری مؤکل نے مقتول کے گھر کے موکھلے سے جو پوٹلی نیچے پھینکی تھی، اس کے اندر طلائی زیورات، نقدی اور سیونگ سرٹیفکیٹس رکھے ہوئے تھے؟ کیا آپ نے یعنی آپ کی آنکھوں نے بندھی ہوئی اس پوٹلی کے اندر کا احوال جان لیا تھا؟ اور یہ بھی بتائیں، کیا آپ اس وقت اس گلی میں موجود تھے جب میری مؤکل نے مذکورہ پوٹلی

اپنے شوہر کی جانب پھینکی تھی؟''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''مقتول کی گلی میں میرا کیا کام؟''

''میں ایسی ویسی..... جو بھی باتیں کر رہا ہوں وہ تمام تر میں نے آپ کے بیان کے اندر ہی سے اخذ کی ہیں۔'' میں نے بھی جواباً قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا بارِ ثبوت بھی آپ ہی کے کندھوں پر ہے میرے فاضل دوست!''

میرے پے در پے تیکھے سوالات نے وکیلِ سرکار کو اچھا خاصا بوکھلا دیا تھا۔ سیدھا جواب دینے کے بجائے اس نے کٹ حجت بیویوں کے مانند الٹا مجھ ہی سے پوچھ لیا۔

''تو پھر آپ ہی بتا دیں کہ ملزم نے اس پوٹلی کے اندر کیا چھپا کر نیچے پھینکا تھا؟''

''کم از کم طلائی زیورات، نقدی اور سیونگ سرٹیفکیٹس تو ہرگز نہیں۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چٹانی لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے، آپ پوٹلی کے اندر موجود اشیا کی تفصیل سے اچھی طرح آگاہ ہیں بیگ صاحب!'' جج نے دلچسپ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''آف کورس یور آنر۔'' میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

جج اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

وکیلِ استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''تو پھر آپ ہی بتا دیں، اس پوٹلی کے اندر کیا بندھا ہوا تھا؟''

میں نے تفریح لینے کے انداز میں کہا۔ ''اگر آپ بارِ ثبوت میرے شانے پر نہ لادیں تو بتا دیتا ہوں۔''

''میں آپ کی طرح نہیں ہوں۔'' اس نے مجھ پر گہری چوٹ کی۔

میں نے جوابی چرکا لگاتے ہوئے کہا۔ ''آپ میری طرح ہو بھی نہیں سکتے بلکہ اس کائنات میں کوئی ایک شخص بھی کسی دوسرے شخص جیسا نہیں ہو سکتا۔ ایک اندازے کے مطابق انسان کی اس کرۂ ارض پر تاریخ تیرہ ہزار سال پرانی ہے اور اس عرصے کے دوران میں ابھی تک صد فیصد ایک جیسے دو انسان پیدا نہیں ہو سکے۔ میرا پروردگار بے شک قادرِ مطلق ہے۔''

بے ساختہ وکیلِ استغاثہ کے منہ سے نکلا۔ ''بے شک.....!''

''آپ کے خیال میں اس پوٹلی کے اندر کیا تھا؟'' جج نے براہِ راست مجھ سے استفسار کیا۔

''جنابِ عالی!'' میں نے جج کے سوال کے جواب میں ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''مالِ عطا کردہ۔''

''بیگ صاحب! مالِ عطا کردہ کی وضاحت کریں۔''

جج ان لمحات میں پوری طرح میری جانب متوجہ تھا۔

''جنابِ عالی! عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ صاحب ثروت لوگ اپنے گھر میں کام کرنے والے ملازمین کو مختلف طریقوں سے نوازتے رہتے ہیں اور اس حوالے میں صفائی ستھرائی کرنے والی ماسیاں سرِفہرست ہیں۔ لوگ اکثر انہیں بچا ہوا کھانا اور اپنی اترن دے دیا کرتے ہیں۔ اس اترن میں پرانے کپڑے اور جوتے شامل ہیں۔ وقوعہ کے روز مقتول نے اپنے اور اپنے شوہر عدیل کے استعمال شدہ پرانے کپڑے اٹھا کر ملزم کو دے دیے تھے جو یقیناً ملزم راشدہ، اس کے شوہر مظہر اور مظہر کی والدہ نسیمہ بی بی کے لیے تھے۔ ملزم کو چونکہ مقتول کے گھر سے نکل کر اور بھی کئی گھروں میں کام کرنے جانا تھا اس لیے اس ''مالِ عطا کردہ'' کی ایک پوٹلی بنا کر اپنے شوہر کو دے دی تھی۔ بس، اتنی سی بات ہے۔ یہ تمام تر ملبوسات ملزم کے گھر میں موجود ہیں۔ اگر عدالت کا حکم ہوگا تو بطور ثبوت ان چیزوں کو پیش کر دیا جائے گا اور ہاں.....'' میں نے چونکتے ہوئے انداز میں لمحاتی توقف کیا پھر وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''بطور ثبوت کے الفاظ پر مجھے یاد آیا کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ بارِ ثبوت میرے کندھوں پر نہیں ڈالیں گے..... یاد ہے نا؟''

وہ دسلگ کر رہ گیا اور الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''اگر اس پوٹلی کے اندر استعمال شدہ کپڑے اور جوتے وغیرہ تھے تو پھر مالِ مسروقہ کہاں گیا؟''

''یہ سوال مجھ سے پوچھنا تو نہیں بنتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔''

اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ ''آپ کیا کرنے والے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ کے اور..... اپنے حق میں..... دعائے خیر!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ سوال میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے پوچھوں گا اور وہ بھی آپ کے سامنے۔''

اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ میں اس کے ساتھ کون سا ہینڈ کرنے والا ہوں۔ وہ متذبذب نظر سے کبھی مجھے اور کبھی جج کی جانب تکنے لگا۔ میں نے جج سے مخاطب ہوتے

ہوئے نہایت ہی ادب سے کہا۔

''جناب عالی! مجھے وکیل سرکار سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

جج نے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے استغاثہ کے گواہ شوکت حسین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو چنداں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے پوٹلی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا..... کیونکہ آپ نے پوٹلی کے، بالائی منزل والے موکھلے سے نکل کر ملزم کے شوہر مظہر کے ہاتھوں تک پہنچنے کا جو آنکھوں دیکھا احوال بیان کیا ہے اس میں آپ نے کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مذکورہ پوٹلی کے اندر مالِ مسروقہ موجود تھا بلکہ آپ نے تو ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ..... کاش مجھے اس وقت پتا ہوتا کہ وہ (مظہر) مالِ مسروقہ لے کر فرار ہو رہا ہے تو میں دکان سے نکل کر اسے دبوچ لیتا..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا شوکت صاحب؟''

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے میں نے کوئی معما اس کے سامنے رکھ دیا ہو۔ شوکت پریشان نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا جیسے بہ زبان خاموشی وہ اپنے وکیل سے کہہ رہا ہو..... ذرا مجھے ڈیفنس کونسلر کی بات کا مطلب تو سمجھائیں۔ میں نے استغاثہ کے گواہ کو سمجھنے سمجھانے کا موقع نہیں دیا اور قدرے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''شوکت صاحب! ملزم کی والدہ کا کیا نام ہے؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا۔''

''آپ کو ملزم کے باپ کا نام تو یقیناً معلوم ہوگا؟''

''جی نہیں۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ملزم کے سسر کا نام۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یعنی مظہر کے والد کا نام.....؟''

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بے حد بیزاری سے بولا۔ ''وکیل صاحب! یہ آپ مجھ سے کس قسم کے سوال کر رہے ہیں؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ ''وکیلِ صفائی بے معنی اور غیر متعلق سوالات پوچھ کر استغاثہ کے معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عدالت سے میری استدعا ہے کہ وکیلِ موصوف کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''بیگ صاحب! آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''جناب عالی!'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''میرے سوالات غیر متعلق ہیں اور نہ ہی بے معنی۔ ہر سوال اپنے اندر معانی کا ایک جداگانہ جہاں رکھتا ہے اور اس کا استغاثہ کے گواہ شوکت حسین سے گہرا تعلق بھی ہے۔''

''آبجیکشن اوورروں۔'' جج نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''بیگ صاحب! جرح کو آگے بڑھانے سے پہلے آپ اس امر کے پابند ہیں کہ اپنے سوالات کی اہمیت کو عدالت کے سامنے اجاگر کریں۔''

''شیور یور آنر!'' میں نے سر کو تعظیمی جنبش دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''استغاثہ کے معزز گواہ شوکت حسین نے اپنے وکیل کے ایک سوال کے جواب میں عدالت کے روبرو بتایا تھا کہ وہ میری موکل اور اس کیس کی ملزم مسماۃ راشدہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اچھی طرح جاننے کا دعوے دار ہو تو پھر اصولاً یہی سمجھا جاتا ہے کہ پہلا شخص، دوسرے شخص کے والدین کے نام تو کم از کم ضرور جانتا ہوگا۔ اس اصول کے تحت میں نے استغاثہ کے گواہ سے کوئی بھی بے معنی اور غیر متعلق سوال نہیں کیا.....'' پھر میں نے شوکت حسین کی جانب دیکھتے ہوئے ان استفساری الفاظ میں اضافہ کیا۔

''شوکت صاحب! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''اصولاً تو آپ کی بات درست ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''لیکن میرا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ نے اخذ کیا ہے۔''

''تو پھر آپ اپنی زبان ہی سے بتا دیں کہ آخر آپ کا مطلب کیا تھا؟''

میں اپنی پیچ دار باتوں سے استغاثہ کے گواہ کے اعتماد کو مسمار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے عدالت کو یہ بتانا مقصود تھا کہ شوکت حسین کا بیان حقیقتِ حال سے کوسوں دور ہے۔ اسے وکیلِ استغاثہ نے جو سبق رٹوایا ہے وہ باتیں کرنے والے طوطے کے مانند اسی کو دہرائے جا رہا ہے اور اس کی ان باتوں میں کوئی وزن نہیں۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ میں اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیاب ہو چکا تھا۔

''ملزم کو اچھی طرح جاننے سے میری مراد یہ تھی کہ میں اس کا صورت آشنا ہوں۔'' اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں روزانہ اسے نادرہ صاحبہ کے گھر کام کرنے آتے دیکھتا تھا۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شوکت صاحب۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی وضاحت پر من و عن یقین کر لیا ہے۔''

وہ ایک گہری آسودہ سانس لے کر رہ گیا۔ یوں محسوس

ہوتا تھا، اس نے اس سانس کے ذریعے اپنے سینے کا بوجھ اتار پھینکا ہو۔ میں نے جرح کو اختتامی رخ پر موڑتے ہوئے کہا۔

''شوکت صاحب! اس کیس کی ابتدائی سماعت کے دوران میں آپ کے وکیل نے معزز عدالت کے سامنے یہ دعویٰ کیا تھا کہ استغاثہ کے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جو قتل اور ڈکیتی کی اس واردات کے عینی شاہدین کی حیثیت کے حامل ہیں۔ غالباً آپ کا شمار بھی انہی ''آئی وٹنس'' میں ہوتا ہے۔۔۔''

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا جواب دے۔ میں نے فوراً اس پر ایک کردیا۔

''شوکت صاحب! آپ کا یہ دعویٰ تو مس انڈر اسٹینڈنگ کے زمرے میں چلا گیا۔ آپ کا ملزم کو اچھی طرح ''جان کاری'' والا معاملہ ''صورت آشنائی'' میں بدل گیا۔ اب میں آپ سے آخری سوال پوچھنے جارہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔''

وہ متذبذب انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے مقتول نادرہ کا قتل ہوتے دیکھا تھا؟''

''نہیں تو۔۔۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی پھر تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟ کیا آپ کو الہام ہوا ہے؟''

''شوکت صاحب! میری ایسی قسمت کہاں کہ کبھی مجھے الہام ہو۔'' میں نے ٹھنڈی سانس چھوڑنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''البتہ جہاں تک معاملہ مجھے بات بتانے کا ہے تو۔۔۔ یہ بات تھوڑی دیر پہلے آپ ہی نے تو مجھے بتائی تھی۔''

''میں نے بتائی تھی!'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟'' میں نے تیز آواز میں دریافت کیا۔

وہ بولا۔ ''آپ کہیں مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے وکیل صاحب؟''

''کیا ہم آج سے پہلے کہیں ملے ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''نہیں۔۔۔ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے درمیان مذاق کا رشتہ ابھی تک قائم نہیں ہوسکا۔'' میں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا آپ کو یقین کرلینا چاہیے کہ میں نے ہرگز آپ سے مذاق نہیں کیا۔''

''مگر مجھے تو یاد نہیں آرہا۔۔۔'' وہ بدستور الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''کہ میں نے کب آپ سے کہا کہ ملزم راشدہ نے نادرہ صاحبہ کو میری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔''

''یہ کوئی پریشانی والی بات نہیں۔ میں آپ کو یاد دلا دیتا ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے مجھ سمیت تمام حاضرین عدالت بشمول منصف، ملزم کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ۔۔۔ ہاں، اسی عورت نے نادرہ صاحبہ کی جان لی ہے۔ اتنے وثوق سے یہ بات تو وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے قتل کی واردات ہوتے دیکھی ہو۔۔۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں جج اس مسئلے کے؟''

''وکیل صاحب! آپ تو میرے الفاظ پکڑ رہے ہیں۔'' وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''ملزم چونکہ نادرہ صاحبہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کی گئی تھی اسی لیے میں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر آپ تو۔۔۔ بال کی کھال اتار رہے ہیں۔''

''ضرورت پڑنے پر میں کھال کے بال بھی اتار سکتا ہوں۔'' میں نے سنگین الفاظ میں کہا۔ ''اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔''

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ۔۔۔۔!''

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر میں نے استغاثہ کے غبارے میں ایک ہلکی سی پن ماردی تھی۔ میری اس انتہائی قانونی حرکت نے استغاثہ کے ٹیوب لیس ٹائر میں مائنر پنکچر پیدا کردیا تھا جس میں سے دھیرے دھیرے ہوا نکلنا شروع ہوگئی تھی۔ مجھے اس لیگل ایکٹ کو جاری وساری رکھتے ہوئے ''پن مارنے کا عمل'' تواتر کے ساتھ آگے بڑھانا تھا تاکہ استغاثہ کے ٹائر کا پنکچر بتدریج مائنر سے میجر تک کا سفر طے کرلے۔ مجھے قوی امید تھی کہ یہ سفر دو تین مزید پیشیوں کی مار تھا۔ اس کے بعد اس ٹائر کو فلیٹ ہوجانا تھا۔ استغاثہ کی گاڑی رک جانے میں ہماری جیت تھی۔

اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے مقتول کے کرائے دار ایاز علی کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ ایاز علی کی

قدوقامت، جسامت اور وضع قطع ابتدائی صفحات میں بیان کی جاچکی ہے۔ ایاز علی اور اس کی بیوی شبانہ گھر کی زیریں منزل پر کرائے دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھے۔ ایاز علی نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

''ایاز صاحب!'' وکیل استغاثہ نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کب سے اس گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں؟''

''لگ بھگ دو سال سے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''اور مقتول کی ماسی یعنی کب سے ان کے ہاں کام کرنے آرہی ہے؟''

''میں صحیح طور پر نہیں بتا سکتا جناب۔''

''کیوں نہیں بتا سکتے؟'' وکیل استغاثہ نے قدرے تیز آواز میں پوچھا۔

''وکیل صاحب! بات یہ ہے کہ ہمیں جیسا کہ میں نے بتایا، اس گھر میں رہتے ہوئے کم وبیش دو سال ہوگئے ہیں۔'' ایاز علی نے کہا۔ ''ملزم راشدہ ہم سے پہلے سے وہاں کام کرنے آرہی ہے۔ کتنا پہلے سے، اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں۔''

''آپ کو اس سلسلے میں کوئی اندازہ قائم کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' وکیل استغاثہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''یہ بتائیں، آپ صبح گھر سے کتنے بجے نکلتے ہیں؟''

''جناب! گھر کے نزدیک ہی محمود آباد گیٹ پر میری کپڑے کی دکان ہے۔'' گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں روزانہ صبح گیارہ بجے اپنی دکان کھولتا ہوں اور رات دس سے گیارہ بجے کے درمیان کسی بھی وقت بند کردیتا ہوں۔ میرے گھر سے دکان تک کا سفر بہ مشکل دس منٹ کا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ میں روزانہ پونے گیارہ بجے گھر سے نکل کر اپنی دکان کی جانب روانہ ہوجاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' وکیل استغاثہ نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ملزم کے بیان کے مطابق وہ روزانہ صبح ساڑھے نو سے دس بجے تک یعنی آدھا گھنٹا مقتول کے گھر میں کام کرنے آیا کرتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزم کے اوقات کار کے دوران میں آپ اپنے گھر میں موجود ہوا کرتے تھے؟''

''جی، ظاہر سی بات ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میری بیٹی فرزانہ گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول میں پڑھنے جاتی ہے۔ فرزانہ کی عمر دس سال ہے۔ وہ پانچویں جماعت کی اسٹوڈنٹ ہے۔ میں اسے اسکول پہنچانے خود جاتا ہوں۔ چھٹی کے وقت میری بیوی شبانہ اسے اسکول سے لے لیتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فرزانہ کا اسکول آٹھ بجے لگتا ہے۔ میں فرزانہ کو اسکول پہنچانے کے بعد واپس گھر آکر ناشتا کرتا ہوں لہٰذا جب ملزم، مقتول کے گھر کام کرنے آتی ہے تو میں اپنے گھر پر موجود ہوتا ہوں۔''

''آپ ہفتہ وار چھٹی کس دن کرتے ہیں؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''اتوار کو۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''اور ملزم؟''

''وہ جمعے کے دن کام پر نہیں آیا کرتی تھی۔'' گواہ نے بتایا ''لیکن.....''

گواہ بولتے بولتے اچانک رکا تو وکیل استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''لیکن کیا ایاز صاحب؟''

''میں ایک بات پر حیران ہوں.....'' وہ تذبذب بھرے لہجے میں بولا۔

''کس بات پر؟''

''واقعات کے مطابق نادرہ صاحبہ کی موت ہفتے کے روز واقع ہوئی ہے۔'' گواہ نے الجھن زدہ انداز میں کہا جبکہ اس کی لاش اگلے روز یعنی اتوار کی سہ پہر دریافت کی گئی تھی۔ میری حیرت کا باعث یہ بات ہے کہ ملزم اپنے معمولات کے برعکس جمعے کے روز تو کام کرنے آئی لیکن اتوار کو غائب ہوگئی جبکہ وقوعہ کے روز وہ معمول کے مطابق، کام کرکے گئی تھی.....''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ملزم اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ آپ کی حیرت کا سبب اسی سے دریافت کرلیتے ہیں.....''

پھر وہ اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا اور ملزم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''تم نے وقوعہ سے ایک روز پہلے یعنی سولہ اکتوبر بروز جمعہ اپنی ہفتہ وار چھٹی کیوں نہیں کی تھی اور وقوعہ کے ایک روز بعد یعنی اٹھارہ اکتوبر، بروز اتوار تم نے چھٹی کیوں مار لی تھی؟''

جیسا کہ میں نے ابتدا میں بتایا، راشدہ ایک ذہین اور پُراعتماد عورت تھی۔ اگرچہ وہ ان دنوں اپنی زندگی کے نازک ترین حالات سے گزر رہی تھی لیکن اس نے کمال ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اعصاب پر قابو رکھا ہوا تھا۔ وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں اس نے بڑے

تحمل سے کہا۔

''میں جمعے کے روز اس لیے کام کرنے آگئی تھی کہ میں نے باجی (مقتول نادرہ) سے اتوار کی چھٹی مانگی تھی۔ باجی نے ایک شرط پر مجھے اتوار کی چھٹی دینے کی ہامی بھری تھی کہ اس کے بدلے مجھے جمعے کے روز کام کرنے آنا تھا۔ میں نے باجی کی بات مان لی تھی۔''

''بالکل جھوٹ!'' وکیل استغاثہ نے ملزم کو اپنے دباؤ میں لانے کے لیے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''تم نے جمعے کے روز بغیر پیشگی اطلاع کے چھٹی مار لی تھی۔ اگلے روز ہفتہ کی صبح جب تم کام پر آئیں تو مقتول نے تمہیں خوب ڈانٹ پلائی۔ تم پہلے ہی مقتول کی ڈانٹ پھٹکار سے عاجز تھیں۔ اس دن مقتول کا شوہر بھی گھر میں موجود نہیں تھا لہٰذا تم نے فوری طور پر اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا منصوبہ بنالیا۔ مقتول مزاج کی گرم اور غصے کی خاصی تیز تھی۔ وہ اکثر تمہیں ذرا ذرا سی بات پر ذلیل کرتی رہتی تھی۔ تم اس کی طرف سے بہت زیادہ ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ وقوعہ کے روز تمہارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ تم نے موقع پاکر آہنی راڈ سے ایک خطرناک وار کرکے اپنی مالکن کو فنا کے گھاٹ اتارا اور اس کی الماری کا صفایا کرڈالا پھر نقدی اور دیگر قیمتی چیزوں کو تم نے ایک پوٹلی میں باندھ کر موکھلے کے راستے اپنے شوہر تک پہنچادیا اور چند منٹ کے بعد خود بھی گھر سے نکل گئیں..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''نہیں.....'' ملزم نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے جو کہانی بنی ہے اس کا حقیقت سے کوئی بھی تعلق نہیں۔''

''پھر حقیقت کیا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''اگر میری بنی ہوئی کہانی تمہیں پسند نہیں آرہی تو تم اپنی تیار کردہ کوئی کہانی سناڈالو.....!''

''مجھے کہانیاں بننے اور سنانے کا کوئی شوق نہیں۔'' ملزم نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں حقیقت پر یقین رکھتی ہوں کیونکہ حقیقت سچی ہوتی ہے اور اس کیس کی سچائی بہت ہی سادہ اور مختصر سی ہے.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی۔

''یہ ٹھیک ہے کہ باجی کو غصہ بہت جلد آجاتا تھا اور وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتی تھیں لیکن وہ دل کی بہت اچھی تھیں۔ جتنی جلدی انہیں غصہ آتا تھا اتنی ہی جلدی غصہ اتر بھی جایا کرتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ نارمل ہوجایا کرتی تھیں۔ میں ان کی کہی سنی تلخ و ترش باتوں کا اس لیے بھی برا نہیں مانتی تھی کہ وہ تو صاحب جی کو بھی غصے میں کھری کھری سنادیا کرتی تھیں اور صاحب جی (عدیل) بڑے تحمل سے ان کی سن لیتے تھے۔ میں تو پھر بھی ان لوگوں کی نوکرانی تھی اور.....''

''اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔'' وکیل استغاثہ نے ہاتھ کے اشارے سے ملزم کو مزید بولنے سے روک دیا اور جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''مقتول کے گھریلو معاملات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ تم جمعے کو چھٹی نہ کرنے اور اتوار کو گول ہوجانے کی وجوہات تک محدود رہو۔''

''ہفتے کے روز میری پھوپی کی بیٹی ثمینہ کی شادی تھی۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''وہ لوگ اورنگی ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ انہوں نے شادی کے تمام انتظامات اپنے گھر ہی میں کیے تھے۔ مجھے اس شادی میں لازمی شرکت کرنا تھی۔ اورنگی ٹاؤن، اعظم بستی سے کافی دور ہے اسی لیے میں نے رات کو وہیں رکنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان حالات میں، اگلے روز یعنی اتوار کی صبح میں باجی کے گھر کا کام کرنے نہیں آسکتی تھی لہٰذا میں نے باجی سے اتوار کی چھٹی لے لی تھی جس کے بدلے میں مجھے جمعے کے دن کام پر آنا پڑا اور اس کا مجھے فائدہ بھی ہوا۔ جمعے کے دن باجی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آج اپنے کچھ کپڑے اور جوتے نکال کر رکھیں گی جو وہ اگلے روز یعنی ہفتے کو مجھے دینا چاہتی تھیں تاکہ میں ثمینہ کی شادی میں قیمتی کپڑے پہن سکوں اسی لیے میں نے ہفتہ کے روز مظہر کو باجی کے گھر آنے کے لیے کہا تھا تاکہ میں کپڑوں اور جوتوں کو ایک گٹھری میں باندھ کر اس کے حوالے کردوں کیونکہ مجھے اس کے بعد بھی چند گھروں میں کام کرنے جانا تھا اور میں نے سوچا، اس گٹھری کو بغل میں دبائے کہاں کہاں گھوموں گی چنانچہ میں نے موکھلے کے راستے وہ گٹھری مظہر کو دے دی تھی۔''

ابھی ملزم نے وکیل استغاثہ کے استفسار کے جواب میں جو کچھ بتایا اس میں سے بعض باتیں اس کے حلفیہ بیان میں بھی شامل تھیں۔ وکیل استغاثہ نے بے یقینی سے اس کی کتھا سنی اور اس کے خاموش ہونے پر خاصے کھرے لہجے میں کہا۔

''تم یہ نہیں سمجھنا کہ عدالت تمہاری اس کہانی پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلے گی۔ تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے تمہاری پھوپی، اس کی بیٹی ثمینہ اور دیگر افرادِ خانہ کو بطور گواہ اورنگی ٹاؤن سے یہاں بلایا جائے گا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا جاسکے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''جی وکیل صاحب!'' ملزم نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بڑی بردباری سے جواب دیا۔ ''اس نیک کام

میں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں۔''

وکیل استغاثہ ملزم کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی پر بل کھا کر رہ گیا۔ وہ اپنے تیز و تند حملوں سے ملزم کو اپنے دباؤ میں لا سکا تھا اور نہ ہی اس کے پایۂ استقامت میں ذرا سی بھی لرزش پیدا کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نظر سے میری موکل کو گھورتا رہا پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''تو تم اسی موقف پر ڈٹی ہوئی ہو کہ وقوعہ کے روز جس وقت تم مقتول کے گھر کا کام نمٹا کر وہاں سے رخصت ہوئیں تو مقتول زندہ سلامت تھی؟''

''جی بالکل!'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''اور باجی نے مجھے بتایا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ اپنے سر سے جوئیں نکالیں گی پھر غسل کریں گی۔''

''کیا مقتول کے سر میں جوئیں بھی تھیں؟'' وکیل استغاثہ نے دیدے گھما کر پوچھا۔

ملزم نے بڑے شائستہ انداز میں وکیل سرکار کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''کس عورت کے سر میں جوئیں نہیں ہوتیں؟ کیا آپ کی فیملی میں خواتین نہیں ہیں؟ یا ان میں سے کسی نے آپ کو اس حقیقت سے روشناس نہیں کیا.....؟''

ملزم کے تابڑ توڑ حملوں نے وکیل استغاثہ کی بقول کے، طبیعت صاف کر دی تھی۔ وہ برا سا منہ بنا کر اپنے گواہ کی جانب بڑھ گیا۔

''ایاز صاحب! کیا آپ بھی اپنے گھر کا کام ملزم ہی سے کرواتے تھے؟''

''نہیں جناب۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اللہ نہ کرے.....!''

''کیوں؟'' وکیل استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''ماسیوں سے کام کرانے میں کیا قباحت ہے؟''

''یہ لوگ بہت خطرناک ہوتی ہیں وکیل صاحب۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''یہ گھر کی صفائی ستھرائی کے کام کے لیے رکھی جاتی ہیں اور موقع ملتے ہی ہر شے پر جھاڑو پھیر کر چلی جاتی ہیں۔ ہمیں ایک تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔''

''کیسا تجربہ ایاز صاحب؟'' وکیل استغاثہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ای مارکیٹ والے گھر میں آنے سے قبل ہم محمود آباد کے آخری حصے میں رہا کرتے تھے جہاں سے منظور کالونی کی حدود شروع ہوتی ہے۔'' گواہ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس گھر میں ہم نے گھریلو کام کے لیے ایک ماسی رکھی ہوئی تھی کیونکہ اس وقت میری بیٹی فرزانہ بہت چھوٹی تھی لہٰذا میری بیوی شبانہ کا زیادہ وقت بچی کو سنبھالنے میں لگ جاتا تھا اور گھریلو کام دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے لہٰذا ہم نے اپنی سہولت کے لیے ایک ماسی رکھ لی۔ دو تین ماہ تک تو وہ ماسی بڑی محنت، جاں فشانی اور ایمان داری سے کام کرتی رہی۔ اگر غلطی سے ہمارے پیسے بھی کہیں گر جاتے تھے تو وہ جھاڑو نکالتے وقت اٹھا کر ہمیں دے دیا کرتی تھی۔ ہم اس کی ایمان داری پر بہت خوش تھے اور مقررہ تنخواہ کے علاوہ بھی اس کا خیال رکھتے تھے لیکن ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہمارا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بی جن اور باجی اللہ والی بنی ہوئی ہے۔ ہم نے اس پر اندھا بھروسا کرنا شروع کر دیا تھا پھر ایک روز وہ ہمیں چونا لگا کر غائب ہو گئی۔''

سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی وکیل استغاثہ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب یہ کہ وہ ایک روز ہمارے گھر سے تمام زیورات اور نقدی چرا کر کہیں چلی گئی اور ہم ہاتھ ملتے اپنی حماقت پر افسوس کرتے رہ گئے۔'' وہ ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ہماری تو خوش قسمتی تھی کہ ہم تینوں میں سے کسی کا جانی نقصان نہیں ہوا اور نہ تازہ ترین واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ ہماری مالکن کے گھر سے طلائی زیورات، سیونگ سرٹیفکیٹس اور نقدی تو گئی سو گئی، اس کے علاوہ اسے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔''

وکیل استغاثہ نے مزید ایک دو سوالات کرنے کے بعد گواہ کو فارغ کر دیا تو اپنی بات پر میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ ایاز علی سے سوال کیا۔

''آپ گزشتہ دو سال سے مقتول کے گھر کی زیریں منزل پر کرائے دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھے۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کتنا کرایہ دیا کرتے تھے؟''

''جب ہم دو سال پہلے اس گھر میں رہنے آئے تھے تو چھ سو روپے کرائے کی بات ہوئی تھی اور اب تک ہم ماہانہ چھ سو روپے ہی دیتے رہے ہیں۔'' استغاثہ کے گواہ نے جواب دیا۔ ''لیکن اب ہم سے کرایہ بڑھا کر سات سو کرنے کی بات کی جا رہی ہے۔''

آج سے چالیس سال پہلے جو گھر چھ، سات سو روپے کرائے پر مل جایا کرتا تھا وہ ان دنوں کم از کم پندرہ

ہزار روپے ماہانہ کرائے پر دستیاب ہوتا ہے۔ آپ خود اندازہ لگائیں کہ محض چالیس سالوں میں روپے کی قدر میں کتنی کمی واقع ہوئی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مہنگائی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

''وکیل استغاثہ سے سوال وجواب کے دوران میں آپ نے مقتول کے لیے کئی بار ''مالکن'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ تو عدیل صاحب کے کرائے دار تھے۔ ان کے لیے کسی بھی مقام پر آپ نے ''مالک'' کا لفظ استعمال کیوں نہیں کیا؟''

''کیونکہ وہ مکان مقتول نادرہ کے نام ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہمارے ساتھ کرائے کا جو ایگریمنٹ تیار کیا گیا تھا اس میں بھی اونر کی جگہ مقتول ہی کا نام درج ہے۔''

''یعنی آپ درحقیقت مقتول کے کرائے دار تھے؟'' میں نے تصدیقی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''اور وہی آپ کی اصل مکان مالک تھیں؟''

''جی بالکل!'' اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''ایاز صاحب! کیا وقوعہ کے روز آپ اپنے گھر میں موجود تھے؟'' میں نے جرح میں تیزی لاتے ہوئے پوچھا۔ ''یعنی سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ.....!''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

''پھر کہاں تھے؟''

''میں ایک ضروری کام سے حیدرآباد گیا ہوا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہاں کپڑے کے ایک بیوپاری سے مجھے کچھ رقم لینا تھی۔ اسی مقصد سے میں حیدرآباد گیا تھا۔''

''کیا کپڑے کے اس بیوپاری کا نام الیاس خان ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

جواب دینے سے پہلے اس نے استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھا پھر حیرت بھری آواز میں بولا۔ ''کیا آپ الیاس بھائی کو جانتے ہیں؟''

''میں الیاس خان کو بھی جانتا ہوں اور مجھے یہ بات بھی معلوم ہوچکی ہے کہ اس روز آپ حیدرآباد سے ناکام لوٹے تھے۔'' میں نے اس کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''الیاس خان نے رقم کی ادائیگی کے لیے آپ سے ایک ماہ کا ٹائم لے لیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

میں نے ملزم کے شوہر مظہر کے توسط سے بیرون کراچی جو معلومات حاصل کی تھیں ان کا ایک حصہ ایاز علی کی

غیر

ایک نوجوان نے اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے تمہاری یہ گھنی اور لمبی سیاہ زلفیں بہت پسند ہیں۔ جی چاہتا ہے ساری زندگی ان کے سائے میں گزار دوں۔''

محبوبہ نے مسکرا کر اپنے سر سے لمبے بالوں کی وگ اتار کر نوجوان کو دیتے ہوئے کہا۔

''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، انہیں گھر لے جاؤ اور جب تک چاہو ان کے سائے میں زندگی گزارو۔''

مرسلہ۔ صغیر احمد قریشی

بہانہ

منیجر۔ ''اس مہینے تم کئی چھٹیاں لے چکے ہو۔ ایک بار اپنی بیوی کو ٹرین پر سوار کرانے کے لیے چھٹی لی، پھر ساس کے جنازے میں شرکت کے لیے رخصت لی۔ ایک دفعہ تمہاری بچی بیمار پڑی اور ایک دفعہ تمہارے بچے کی رسم بسم اللہ تھی۔ آج پھر درخواست لے کر آگئے ہو۔ آج کیا ہوا؟''

منیجر۔ ''جناب! میری شادی ہونے والی ہے۔''

مرسلہ۔ راجہ علی اصغر، ریاض

☆☆☆

''معاف کرنا دوست، اس میں کوئی شک نہیں کہ میری سالانہ آمدنی پچاس ہزار ہے لیکن انکم ٹیکس دینے، بجلی، سوئی گیس اور اخباروں کے بل ادا کرنے، اپنی سیکریٹری اور کلرک کی تنخواہیں دینے، بچوں کے ٹیوٹر اور بیگم کے ڈاکٹر کی فیس کی ادائیگی کرنے اور گھر کے اخراجات اٹھانے کے بعد یقین کرو..... میرے پاس اتنی رقم نہیں بچتی کہ تمہیں آئس کریم کھلا سکوں۔''

مرسلہ: شاہینہ ریاض

ذات سے متعلق تھا۔ دیگر معلومات بھی بہت اہم تھیں۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟''

میں نے اس کی تشویش کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ نے الیاس خان سے مبلغ پانچ ہزار روپے لیتا ہیں؟''

''جی..... جی ہاں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''آپ یہ تو بتائیں کہ آخر یہ ساری باتیں آپ کو کیسے پتا چلی ہیں؟''

''اس کیس میں وکیل کون ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''ظاہر ہے، وکیل تو آپ ہی ہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''یا پھر دوسرے وکیل استغاثہ ہیں۔''

''اس وقت کٹہرے میں کون کھڑا ہے؟''

''جی، میں.....'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''آپ وکیل ہیں اور میرا ٹرائل کررہے ہیں۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اسے دیکھا۔ ''پھر سوال بھی مجھے ہی کرنے دیں۔ آپ چپ چاپ جواب دیتے جائیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی سمجھ رہا ہوں۔ اب میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے تیز و تند سوالات کی بدولت استغاثہ کے گواہ ایاز علی کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے جرح کو اختتامی موڑ کی جانب دھکیل دیا۔

''ایاز صاحب! کیا آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ مقتول کا شوہر عدیل کراچی سے باہر گیا ہوا ہے؟''

''جی۔ یہ بات میرے علم میں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''عدیل صاحب جمعرات پندرہ اکتوبر کو کاروباری دورے پر کراچی سے باہر چلے گئے تھے۔ ان کی واپسی اتوار اٹھارہ اکتوبر کو ہوئی۔ اسی سہ پہر بابو بھائی کی مدد سے عدیل صاحب نے گھر کے داخلی دروازے کا لاک کھلوایا تھا۔ جبھی یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آئی کہ نادرہ صاحبہ کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔''

میں نے اس کی بیان کردہ تفصیل کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال باہر کیا اور مدعا کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''ایاز صاحب! آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی نا کہ عدیل کی عدم موجودگی میں مقتول بالائی منزل پر بالکل تنہا رہ رہی تھی؟''

''جی، میں یہ جانتا تھا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''نادرہ صاحبہ کے کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھے اور وہ خود بھی کہیں آتی جاتی نہیں تھیں۔ میں نے پچھلے دو سالوں میں ان کے ہاں مہمانوں کی آمد و جامد بھی خال خال ہی دیکھی ہے۔''

''آپ دو سال کو تھری ناٹ تھری کی گولی داغ دیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم صرف دو دن پر فوکس کرتے ہیں۔ یعنی سولہ اور سترہ اکتوبر۔ کیا ان دنوں میں آپ نے مقتول کے گھر میں کسی کو آتے جاتے دیکھا تھا؟''

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''جی نہیں۔''

''اس دوران میں آپ کو بھی بالائی منزل پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا؟''

''یہ دو دن کیا، میں تو ان دو سالوں میں ایک بار بھی بالائی منزل کے زینے نہیں چڑھا۔'' وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ''کبھی ایسی کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ جب بھی کوئی کام ہوا تو عدیل صاحب خود ہی نیچے آجایا کرتے تھے اور ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بات ہوجاتی تھی۔ ہاں البتہ میری بیوی کبھی کبھار نادرہ صاحبہ سے گپ شپ کرنے اوپر چلی جایا کرتی تھی۔''

جس دوران میں استغاثہ کا گواہ بولتا رہا، میں اس کے چہرے اور آنکھوں میں نمودار ہونے والے تاثرات کا بغور جائزہ لیتا رہا تاکہ اس کے من کے بھید تک رسائی حاصل کرسکوں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس مقصد میں مجھے کس حد تک کامیابی حاصل.... ہوئی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ دقوعہ کے روز حیدرآباد جانے کے لیے اپنے گھر سے کتنے بجے روانہ ہوئے تھے؟''

''لگ بھگ صبح نو بجے۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور حیدرآباد کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''دوپہر میں.....'' اس نے بتایا۔ ''اس وقت ظہر کی اذان ہورہی تھی۔''

''کراچی سے حیدرآباد کم و بیش دو گھنٹے کا سفر ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''پھر آپ کو اس مسافت میں دگنا وقت یعنی چار گھنٹے کیسے لگ گئے؟''

''راستے میں گاڑی خراب ہوگئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''کیا گاڑی میں کوئی بہت بڑی خرابی ہوگئی تھی؟''

ذات سے متعلق تھا۔ دیگر معلومات بھی بہت اہم تھیں۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟''

میں نے اس کی تشویش کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ نے الیاس خان سے مبلغ پانچ ہزار روپے لیتا ہیں؟''

''جی..... جی ہاں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''آپ یہ تو بتائیں کہ آخر یہ ساری باتیں آپ کو کیسے پتا چلی ہیں؟''

''اس کیس میں وکیل کون ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''ظاہر ہے، وکیل تو آپ ہی ہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''یا پھر دوسرے وکیل استغاثہ ہیں۔''

''اس وقت کٹہرے میں کون کھڑا ہے؟''

''جی، میں.....'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''آپ وکیل ہیں اور میرا ٹرائل کررہے ہیں۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اسے دیکھا۔ ''پھر سوال بھی مجھے ہی کرنے دیں۔ آپ چپ چاپ جواب دیتے جائیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی سمجھ رہا ہوں۔ اب میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے تیز و تند سوالات کی بدولت استغاثہ کے گواہ ایاز علی کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے جرح کو اختتامی موڑ کی جانب دھکیل دیا۔

''ایاز صاحب! کیا آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ مقتول کا شوہر عدیل کراچی سے باہر گیا ہوا ہے؟''

''جی۔ یہ بات میرے علم میں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''عدیل صاحب جمعرات پندرہ اکتوبر کو کاروباری دورے پر کراچی سے باہر چلے گئے تھے۔ ان کی واپسی اتوار اٹھارہ اکتوبر کو ہوئی۔ اسی سہ پہر بابو بھائی کی مدد سے عدیل صاحب نے گھر کے داخلی دروازے کا لاک کھلوایا تھا۔ جبھی یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آئی کہ نادرہ صاحبہ کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔''

میں نے اس کی بیان کردہ تفصیل کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال باہر کیا اور مدعا کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''ایاز صاحب! آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی نا کہ عدیل کی عدم موجودگی میں مقتول بالائی منزل پر بالکل تنہا رہ رہی تھی؟''

''جی، میں یہ جانتا تھا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''نادرہ صاحبہ کے کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھے اور وہ خود بھی کہیں آتی جاتی نہیں تھیں۔ میں نے پچھلے دو سالوں میں ان کے ہاں مہمانوں کی آمد و جامد بھی خال خال ہی دیکھی ہے۔''

''آپ دو سال کو تھری ناٹ تھری کی گولی داغ دیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم صرف دو دن پر فوکس کرتے ہیں۔ یعنی سولہ اور سترہ اکتوبر۔ کیا ان دنوں میں آپ نے مقتول کے گھر میں کسی کو آتے جاتے دیکھا تھا؟''

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''جی نہیں۔''

''اس دوران میں آپ کو بھی بالائی منزل پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا؟''

''یہ دو دن کیا، میں تو ان دو سالوں میں ایک بار بھی بالائی منزل کے زینے نہیں چڑھا۔'' وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ''کبھی ایسی کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ جب بھی کوئی کام ہوا تو عدیل صاحب خود ہی نیچے آجایا کرتے تھے اور ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بات ہوجاتی تھی۔ ہاں البتہ میری بیوی کبھی کبھار نادرہ صاحبہ سے گپ شپ کرنے اوپر چلی جایا کرتی تھی۔''

جس دوران میں استغاثہ کا گواہ بولتا رہا، میں اس کے چہرے اور آنکھوں میں نمودار ہونے والے تاثرات کا بغور جائزہ لیتا رہا تاکہ اس کے من کے بھید تک رسائی حاصل کرسکوں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس مقصد میں مجھے کس حد تک کامیابی حاصل.... ہوئی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ دقوعہ کے روز حیدرآباد جانے کے لیے اپنے گھر سے کتنے بجے روانہ ہوئے تھے؟''

''لگ بھگ صبح نو بجے۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور حیدرآباد کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''دوپہر میں.....'' اس نے بتایا۔ ''اس وقت ظہر کی اذان ہورہی تھی۔''

''کراچی سے حیدرآباد کم و بیش دو گھنٹے کا سفر ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''پھر آپ کو اس مسافت میں دگنا وقت یعنی چار گھنٹے کیسے لگ گئے؟''

''راستے میں گاڑی خراب ہوگئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''کیا گاڑی میں کوئی بہت بڑی خرابی ہوگئی تھی؟''

میں نے پوچھا۔ ''جس کی وجہ سے آپ دو گھنٹے تاخیر سے حیدرآباد پہنچے تھے۔''
گاڑی سے اس کی مراد ٹرین نہیں بلکہ حیدرآباد والی بڑی بس تھی۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔
''گاڑی کی خرابی کو ٹھیک کرنے میں ایک گھنٹا لگ گیا تھا مگر پھر بھی نقص مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ گاڑی چلنے کے قابل ہوگئی تھی۔ ڈرائیور دانستہ گاڑی کو تیس، چالیس کی اسپیڈ پر چلا رہا تھا کہ کہیں تیز رفتاری کے باعث کوئی اور مسئلہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ گاڑی چل رہی تھی، یہی بڑی بات تھی۔ اگلے روز یعنی اتوار کی صبح میں نے ٹرین پکڑی اور کراچی آگیا پھر سہ پہر میں عدیل صاحب کی واپسی پر یہ سنگین انکشاف ہوا کہ ان کی بیوی کو قتل کر دیا گیا ہے۔''
''ایک بات ذہن میں رکھیں ایاز صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''آپ کی بیان کردہ کہانی کے ایک ایک واقعے کی تصدیق کی جائے گی۔''
''مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا ہے وکیل صاحب۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ قانون داں ہیں اور قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ آپ نے اب تک حیدرآباد کے حوالے سے جو معلوماتی انکشافات کیے ہیں اس کے پیش نظر میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنے ذرائع استعمال کر کے گاڑی کا نمبر، اس کے مالک کا نام، ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے نام معلوم کر لیے ہوں گے اور عین ممکن ہے کہ آپ نے اس مکینک کی کنڈلی بھی نکال لی ہو جو گھنٹا بھر گاڑی کے نیچے لیٹ کر اس کی خرابی دور کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا......!''
میں کافی دیر سے اپنے سوالات کی مدد سے استغاثہ کے گواہ کا لہو پی رہا تھا۔ اس نے جرح کے اختتام پر اپنا سارا غبار نکال لیا تھا۔ میں اس کی چبھتی ہوئی باتوں کے جواب میں، معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔
اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔
جج نے چار ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔
ہم عدالت کے کمرے سے نکلے تو ملزمہ کے شوہر مظہر نے مجھ سے کہا۔ ''وکیل صاحب! میرے پاس اتنا دماغ تو نہیں ہے کہ قانونی داؤ پیچ کو سمجھ سکوں لیکن میں اب تک کی عدالتی کارروائی سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں اس سے لگتا ہے، اس کیس پر رفتہ رفتہ آپ کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی ہے لیکن......''
''تم جتنا بھی سمجھے ہو، ٹھیک ہی سمجھے ہو۔'' میں نے اسے اچانک رکتا دیکھ کر چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''لیکن کیا؟''
''اس کیس کو عدالت میں لگے چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ اتنا ہی وقت اور بھی لگ سکتا ہے۔''
''تو اس میں تمہارے لیے پریشانی والی کون سی بات ہے۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں تو شکر کرنا چاہیے اگر یہ کیس ایک سال میں بھی نمٹ جائے ورنہ قتل کے مقدمات تو تادیر چلتے ہیں۔''
''وہ تو ٹھیک ہے مگر جتنی دیر ہو رہی ہے، اخراجات بھی اتنے ہی بڑھیں گے۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''میں نے آپ کو شروع میں صرف ایک بار ہی فیس دی تھی......''
''تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''اس کیس کے تمام تر عدالتی اخراجات کی ذمے داری وحید نظامی صاحب نے لے رکھی ہے اور جہاں تک میری فیس کا تعلق ہے تو یہ کیس ایک سال چلے یا دس سال، میں تم سے دوبارہ فیس کا مطالبہ نہیں کروں گا۔''
وہ تشکر بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا وکیل صاحب۔''
اس کی معصومیت بھری سادگی مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے جواباً کہا۔ ''میں تمہیں اس کام سے روکوں گا نہیں۔''
''کس کام سے وکیل صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
میں نے کہا۔ ''میرے احسان کو یاد رکھنے والے کام سے۔''
''بہت بہت شکریہ وکیل صاحب۔'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔
میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

اگلی پیشی لگ بھگ ایک ماہ بعد تھی لہٰذا مجھے اس کیس کے حوالے سے زیادہ کام کرنے کا موقع مل گیا۔ گزشتہ پیشی تک میرا فوکس استغاثہ کے گواہ ایاز علی پر تھا۔ اگر کاسٹک سوڈا سے اس کی مزید دھلائی کی جاتی تو اپنی موکلہ کو بے گناہ ثابت کرنا میرے لیے کافی آسان ہو جاتا لیکن اس دوران میں کچھ ایسے حقائق سامنے آئے کہ مجھے ایاز علی پر سے توجہ ہٹا کر کسی دوسرے رخ پر غور و فکر کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ مجھے جو تازہ ترین معلومات حاصل ہوئی تھیں ان میں

بلاشبہ مظہر نے بھی کافی دوڑ دھوپ کی تھی۔ علاوہ ازیں میں نے اپنے تعلقات اور وسائل کو استعمال کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں مقتول کا شوہر عدیل کھڑا تھا۔ عدیل کی عمر پینتیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے چہرے کی نمایاں چیز میں ایک تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں، دوسرے اس کے بالائی ہونٹ پر کٹ کا واضح نشان تھا۔

عدیل نے اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ نے اس پر مختصر سی جرح کرکے فارغ کردیا۔ وکیل استغاثہ کے سوالات میں عدیل کے لیے گہری ہمدردی پائی جاتی تھی۔ اس نے گواہ پر جرح کم اور دلی رنج و غم کا اظہار زیادہ کیا تھا۔

اپنی باری لینے سے پہلے میں نے جج سے ایک درخواست کی۔ ''جناب عالی!'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ ''اب تو کیس اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔ انکوائری آفیسر سے پوچھ تاچھ کا خیال آپ کو بہت دیر سے نہیں آیا؟''

''دیر آید، درست آید!'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا پھر استفساریہ نظر سے وکیل سرکار کو دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''میرے فاضل دوست! اگر قانون کی کسی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ کیس کے اختتامی مراحل میں تفتیشی افسر سے سوال کرنا قابلِ تادیب یا قابلِ تعزیر ہے تو میں اپنی درخواست واپس لے لیتا ہوں۔''

وہ لاجواب ہوکر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کا اعتراض انتہائی بودا اور مضحکہ خیز تھا لہٰذا جج نے انکوائری آفیسر کو وٹنس باکس میں آنے کا اشارہ کردیا۔ کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ کی سی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

اس کیس کا تفتیشی افسر ایک چاق و چوبند سب انسپکٹر تھا۔ وہ وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آئی او صاحب! آپ کے وکیل صاحب کو یہ مناسب نہیں لگا کہ میں نے آپ کو ٹرائل کے لیے کٹہرے میں بلایا ہے لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں کہ ان کے حوالے سے آپ کی جگہ اور کوئی میرے سوالات کے جوابات نہیں دے سکتا لہٰذا آپ کو زحمت دینے کا مجھے افسوس ہے۔''

''کوئی بات نہیں جناب۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''آپ پوچھیں جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟''

''مقتول نادرہ کے شوہر نے فون کرکے اس واقعے کے بارے میں ہمیں بتایا تھا۔'' آئی او نے بتایا۔ ''پولیس کے روزنامچے کے مطابق یہ اطلاع اتوار، اٹھارہ اکتوبر کی شام چھ بجے دی گئی تھی۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''سات بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور اسی شام آٹھ بجے آپ نے ملزم راشدہ کو اس کے گھر واقع اعظم بستی سے گرفتار کرلیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ایم آئی رائٹ؟''

''جی..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کیا آپ نے گرفتاری کے بعد ملزم کا کرائم ریکارڈ چیک کیا تھا؟''

''جی، کیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا ملزم اس واقعے سے پہلے کسی واردات میں ملوث یا نامزد پائی گئی ہے؟'' میں نے انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی نہیں۔''

''گویا آپ اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ پولیس ریکارڈ کے مطابق ملزم راشدہ اس کیس سے قبل کبھی تھانے کچہری کے معاملات میں نہیں پڑی؟''

''جی بالکل۔ ہمارا ریکارڈ یہی بتاتا ہے۔''

''اس کے باوجود بھی آپ نے ملزم کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ہسٹری شیٹرز خطرناک عادی مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے..... آخر کیوں؟'' میں نے آخری الفاظ بہت زور دے کر ادا کیے تھے۔

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''ہم نے ایسا کیا کردیا؟''

''کیا یہ سچ ہے کہ ملزم کا دوبار ریمانڈ لیا گیا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''ایک مرتبہ سات روز کا ریمانڈ اور پھر دوبارہ سات دن کا ریمانڈ!''

وہ اثبات میں منڈی ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی، یہ

سچ ہے۔''

''دوسری دفعہ ریمانڈ لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''ابتدائی سات یوم میں تفتیش مکمل نہیں ہوسکی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''آپ نے تیسری بار ملزم کا ریمانڈ حاصل نہیں کیا۔'' میں نے آئی او کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا واضح مطلب یہی نکلتا ہے کہ چودہ روزہ ریمانڈ کے بعد مزید ریمانڈ کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی.....!''

''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''یعنی ان چودہ دنوں میں آپ نے تفتیش کا کام بخیر وخوبی مکمل کرلیا تھا۔ اس کے بعد ہی آپ نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا سب انسپکٹر صاحب؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کے پیش کردہ چالان کے مطابق میری موکل پر دو سنگین الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ نمبر ایک، ملزم نے اپنی مالکن نادرہ کو موت کے گھاٹ اتارا۔ نمبر دو، مقتول کو موت کی نیند سلانے کے بعد ملزم نے مقتول کے بیڈ روم میں رکھی الماری میں سے تیس ہزار مالیت کے طلائی زیورات، کیش رقم دس ہزار اور بیس ہزار مالیت کے سیونگ سرٹیفکیٹس چرا لیے تھے۔ استغاثہ کے مطابق ملزم نے ان تمام چیزوں کو ایک پوٹلی میں رکھ کر موکھلے کے راستے اپنے شوہر مظہر تک پہنچا دیا تھا۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''اگرچہ استغاثہ کی جانب سے ابھی تک کوئی ایسا معتبر گواہ یا کوئی ایسا ٹھوس ثبوت عدالت میں پیش نہیں کیا گیا جس سے ثابت ہو کہ مذکورہ پوٹلی کے اندر ملزم نے طلائی زیورات، سیونگ سرٹیفکیٹس اور نقدی رقم ہی چھپا کر اپنے شوہر کے حوالے کی تھی لیکن چونکہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ نے تفتیش کا عمل مکمل کرنے کے بعد چالان عدالت میں پیش کیا ہے اس لیے.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس لیے میں آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ کا جواب دینے کا موڈ ہو تو.....؟''

''جناب! اس میں موڈ کی کیا بات ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ جو بھی سوال کریں گے، میں جواب دوں گا۔''

''نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی.....'' میں نے پوری طرح تنکے ہوئے ٹوسٹ پر بٹر نائف چلاتے ہوئے کہا۔ ''آئی او صاحب! معزز عدالت یہ جاننے کے لیے بے تاب ہے کہ کیا آپ نے مالِ مسروقہ بازیاب کرلیا تھا اور اگر..... کرلیا تھا تو چالان کی رپورٹ میں کہیں اس کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ مالِ مسروقہ کی کل مالیت لگ بھگ ساٹھ ہزار روپے بنتی ہے جو ظاہر ہے، کوئی معمولی رقم نہیں.....؟''

''سچی بات یہ ہے کہ ہم مالِ مسروقہ برآمد نہیں کر سکے تھے۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نے ایک ادھورے، ایک بوگس چالان کے ساتھ استغاثہ دائر کیا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ''چودہ روزہ ریمانڈ کے دوران میں آپ ملزم سے مالِ مسروقہ کا راز نہیں اگلوا سکے تھے۔''

''آپ ایسا ہی سمجھ لیں۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

لیکن میں اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ''بات میرے سمجھنے کی نہیں ہے آئی او صاحب۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو ایک ایسی حقیقت بیان کی ہے جس کی تردید کرنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ آپ کسی بھی قیمت پر زمینی حقائق کو نہیں جھٹلا سکتے.....''

میرے دباؤ کے جواب میں اس نے کوئی دلیل یا وضاحت پیش نہیں کی۔ میں نے اس پر پریشر بڑھانے کی غرض سے وہ سیلوفین بیگ اٹھا لیا جس کے اندر آلۂ قتل کو محفوظ کیا گیا تھا۔ آلۂ قتل اور اسی نوعیت کی دوسری شہادتوں کو سیلوفین بیگز میں محفوظ کرلیا جاتا ہے اور عدالتی کارروائی کے دوران میں یہ تمام چیزیں ایک میز پر رکھی رہتی ہیں۔ ان میں سے جن اشیا کا لیبارٹری ٹیسٹ ہو چکا ہوتا ہے۔ ان کے ٹیسٹ کی رپورٹ بھی کیس فائل کے اندر موجود ہوتی ہے۔

جیسا کہ کہانی کے ابتدائی حصے میں تفصیلاً بتایا جا چکا ہے کہ مقتول نادرہ کو ڈیڑھ انچ موٹی اور بارہ انچ لمبی آہنی سلاخ کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ یہی آلۂ قتل اس وقت میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیلوفین بیگ کے اندر موجود تھا۔ میں نے مذکورہ بیگ کو اس کیس کے تفتیشی افسر کی نگاہوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

''کیا اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش ہے کہ مقتول نادرہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو اسی آہنی سلاخ کے ایک خطرناک وار سے چٹخایا گیا تھا۔ یہ ضرب اتنی کاری

ثابت ہوئی کہ مقتول کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا؟''

''کوئی شک نہیں جناب!'' تفتیشی افسر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آلۂ قتل یہی آہنی راڈ ہے۔ اس کے ایک سرے پر جو خون جم کر سیاہ ہوچکا ہے اس کا موازنہ جب مقتول کے خون سے کیا گیا تو پتا چلا کہ سلاخ کے سرے پر مقتول ہی کا خون ہے۔ مزید برآں، اس خون کے اندر ہمیں چند بال بھی چپکے ہوئے ملے تھے۔ ان بالوں کے تجزیے سے بھی یہی بات ثابت ہوئی کہ مقتول نادرہ کو اسی آہنی راڈ کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور دورانِ ضرب میں مقتول کے سر کے چند بال راڈ کے خون آلود سرے پر چپک گئے تھے۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''اور یہ آلۂ قتل آپ کو مقتول کے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے کے پیچھے پڑا ملا تھا۔ ہیں نا.....؟''

''جی بالکل۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''کیا آپ نے آلۂ قتل پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات اٹھائے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور ملزم کے فنگر پرنٹس سے ان کا موازنہ کیا تھا؟''

''ہم نے کوشش کی تھی مگر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔'' اس نے بتایا۔

''کوشش کی تھی..... کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''مطلب یہ کہ آلۂ قتل کے کسی بھی حصے پر ہمیں ملزم کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے تھے۔'' وہ قدرے مایوس لہجے میں بولا۔

''آلۂ قتل پر اگر ملزم کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تو پھر کس کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے؟'' میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''کسی کے بھی نہیں۔''

''اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

''اس سے یہ ثابت ہوتا ہے وکیل صاحب کہ.....'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ملزم ایک نہایت ہی عیار اور چالاک عورت ہے۔ آلۂ قتل کو ڈرائنگ روم کے صوفے کے پیچھے پھینکنے سے پہلے اس نے مذکورہ آہنی سلاخ کو اچھی طرح صاف کردیا تھا۔''

''کیا آپ اپنے اس بیان پر ثابت قدمی سے جمے رہیں گے کہ میری موکل یعنی اس کیس کی ملزم راشدہ ایک عیار اور چالاک عورت ہے؟'' میں نے آئی او کو اپنے جال میں پھنساتے ہوئے پوچھا۔

''جی بالکل!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''ملزم عیار اور چالاک ہی نہیں بلکہ حد درجہ مکار اور چال باز بھی ہے۔''

''اتنی عیار، مکار، چال باز اور چالاک کہ آلۂ قتل پر سے اپنے فنگر پرنٹس مٹاتے وقت وہ یہ بھول گئی کہ آہنی سلاخ کے دوسرے سرے پر لگے ہوئے مقتول کے خون کو بھی صاف کرنا ہے۔'' میں نے مضحکہ خیز انداز میں تفتیشی افسر کو گھورا۔ ''اور یہ اتنی زبردست منصوبہ ساز ہے کہ آلۂ قتل کو کہیں ٹھکانے لگانے کے بجائے، جائے وقوعہ کے نزدیک ہی ایک صوفے کے پیچھے پھینک کر چلی گئی.....؟''

میرے ان تابڑ توڑ حملوں سے وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے... امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے نہایت ہی احترام بھرے انداز میں کہا۔

''جناب عالی! اس کیس کے تفتیشی افسر سے ہونے والے سوال و جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ میری موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آلۂ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے، پولیس ملزم سے مال مسروقہ برآمد نہیں کرسکی حالانکہ دوبار اس کا ریمانڈ حاصل کیا گیا۔ معزز عدالت بخوبی جانتی ہے کہ پولیس کے ٹرائل روم میں تفتیش کے نام پر ملزم کو ایسے ایسے کڑے آزمائشی مراحل سے گزارا جاتا ہے کہ مضبوط سے مضبوط قوت ارادی کا مالک بھی زبان کھولنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ بقول شخصے، پولیس کے تفتیشی ہتھکنڈے تو پتھروں کو بھی بولنے پر آمادہ کردیتے ہیں اور یہاں حال یہ ہے کہ.....'' میں نے لمحاتی توقف کرکے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اکیوزڈ باکس میں کھڑی اپنی موکل راشدہ کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''یہ معصوم، سیدھی سادی سی ماسی پولیس کے لیے خطرناک عادی مجرموں سے زیادہ سخت جان ثابت ہوئی ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی پولیس چودہ دن کی کڑی تفتیش کے دوران میں اس کی زبان سے مال مسروقہ کا راز نہیں اگلوا سکی۔ گویا، ملزم نے تفتیشی افسر کو ناکوں چنے چبوا ڈالے ہیں لیکن اگر دیانت داری سے زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے غور و فکر کیا جائے تو یہی بات سامنے آئے گی کہ میری موکل بے گناہ ہے۔ اس نے اپنی مالکن کو قتل کیا ہے اور نہ ہی اس کے گھر میں ڈکیتی ماری ہے۔ اس کی بدقسمتی کہ

حالات کی ستم ظریفی کے نتیجے میں آج وہ ملزموں والے کٹہرے میں کھڑی ہوئی ہے۔"

جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھا۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"اب اتنا وقت باقی نہیں بچا کہ استغاثہ کے گواہ پر جرح مکمل کی جائے لہٰذا اس کام کو آئندہ پیشی تک موخر کرنا پڑے گا۔"

استغاثہ کے گواہ سے جج کی مراد مقتول کا شوہر عدیل تھی۔ آج جب عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تھی تو پہلے وکیل استغاثہ نے گواہ پر اپنی جرح مکمل کی تھی جس کا مختصر احوال پچھلے صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے۔ وکیل استغاثہ کے بعد میری باری تھی لیکن میں نے عدیل کو ہولڈ کرا کے اس کیس کے انکوائری آفیسر کو پکڑ لیا تھا تاکہ استغاثہ کی خامیوں اور کمزوریوں کو اجاگر کرکے اپنی موکل کی بے گناہی کو دوام بخشا جائے اور اس مقصد میں مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

"جناب عالی!" میں نے جج کی بات کے جواب میں کہا۔ "معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ آئندہ پیشی پر اس کیس کو عدالت کے آغاز پر لگانے کا بندوبست کیا جائے تاکہ مجھے جرح کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل جائے۔ میں مقتول کے شوہر سے نہایت ہی اہم اور حساس نوعیت کی جرح کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے میری فرمائش کے احترام میں پیش کار کو خصوصی ہدایات جاری کردیں۔ اس کے بعد، دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

اس روز ہم عدالت سے باہر آئے تو ملزم کا شوہر خاصا مطمئن اور خوش دکھائی دیتا تھا۔ میں اس سے الوداعی مصافحہ کرکے پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھنے لگا تو اس نے جوش بھری آواز میں کہا۔

"وکیل صاحب! لگتا ہے، اگلی پیشی پر آپ کوئی دھماکا کرنے والے ہیں۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہورہا ہے۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اتنے دنوں میں تم نے نگر نگر کی خاک چھان کر جو خطرناک بارود جمع کیا ہے، اب اسے چنگاری دکھانے کا وقت آگیا ہے۔ ہم نے ہوم ورک بہت کرلیا، اب پریکٹیکل کا ٹائم ہے۔ جب بارود کے ڈھیر میں ماچس کی تیلی جلا کر پھینکی جائے گی تو لازماً ایک زوردار دھماکا ہوگا۔"

"ہمارے گھر میں ایک پرانا سا ٹی وی ہے۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جو کبھی چلتا ہے اور کبھی بند ہوجاتا ہے۔ جب بند ہوجاتا ہے تو ہم اس کی باڈی پر دو چار مکے اور تھپڑ رسید کرتے ہیں اور وہ چل پڑتا ہے۔"

اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "اس مثال کا کیا مطلب ہے؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اگر میں استغاثہ کے گواہوں پر گھونسے اور تھپڑ برساؤں تو وہ بھی میری مرضی کے مطابق چل پڑیں گے؟"

"یہ بھی اور وہ بھی....." وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "کیا یہ بھی اور کیا وہ بھی؟"

"مطلب یہ کہ آپ استغاثہ کے گواہوں کی دھلائی تو کر ہی رہے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تو ہوگیا "یہ" اور "وہ" سے میری مراد کارٹون ہے....."

میری الجھن حیرت میں بدل گئی۔ میں نے اس سادہ لوح انسان سے پوچھا۔ "ہماری گفتگو میں کارٹون کہاں سے آگیا؟"

"کارٹون تو ٹی وی میں آتا ہے وکیل صاحب۔" وہ معصومیت بھرے لہجے میں بتانے لگا۔ "میری بیٹی فوزیہ اور بیٹا کاشف حتیٰ کہ چھوٹا عاطف بھی بہت شوق سے وہ کارٹون دیکھتے ہیں جس میں ایک بدمعاش بلا، ایک معصوم چوہے کی زندگی خراب کیے رہتا ہے۔ میں اس کارٹون کا نام بھول رہا ہوں۔"

"ٹام اینڈ جیری!" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "جی جی، وہی۔"

"ٹام اینڈ جیری کو تم یہاں کہاں گھسیٹ لائے ہو؟"

"وہ جی آج کی عدالتی کارروائی کو دیکھ کر خود بخود میرے ذہن میں اس کارٹون کا نام آگیا تھا۔" وہ بڑی سادگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "آپ نے جس طرح اس کیس کے تفتیشی افسر کو گھیر رکھا تھا اس سے کارٹون والے بلے کی یاد آگئی۔"

اس کی معصومیت پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پوچھا۔ "تو کیا تم مجھے ٹام اور آئی او کو جیری کہہ رہے ہو؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں آپ کو بلا کہنے کی گستاخی بھلا کیسے کرسکتا ہوں۔ بات کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آج آپ نے بالکل ٹام کے انداز میں تفتیشی افسر کو جیری سمجھ کر گھیر رکھا تھا۔"

"لگتا ہے، تم بھی یہ کارٹون پروگرام بہت شوق سے

دیکھتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''مجھے ٹی وی دیکھنے کا کوئی ایسا خاص شوق تو نہیں ہے جناب۔ بس، بچوں کی خوشی کی خاطر اکثر ان کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔''

''اگر تم نے توجہ سے ''ٹام اینڈ جیری'' دیکھا ہے تو ایک اہم بات بھی نوٹ کی ہوگی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اول تو یہ کہ جیری بھی اتنا معصوم نہیں ہے جتنا اس نے دیکھنے والوں پر تاثر قائم کر رکھا ہے۔ اکثر لوگوں کو جیری سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر جیری کی حرکتوں پر باریک بینی سے غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنی شرارتوں سے ٹام کا ناک میں دم کیے رہتا ہے۔ ٹام ردعمل کے طور پر جو بھی جوابی کارروائی کرتا ہے وہ جیری کی شیطانیوں کے سبب ہی ہے۔ جب بھی جیری کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو ٹام پوری تندہی سے اس کی مدد بھی کرتا ہے مگر.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے خاصے سنگین لہجے میں کہا۔

''اگر بقول تمہارے، میں ٹام ہوں اور استغاثہ جیری تو ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کسی رعایت کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اگلی پیشی پر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دوں گا۔''

مظہر منہ سے کچھ نہیں بولا، یک ٹک ستائشی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں اسے اسی کیفیت میں چھوڑ کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر مقتول کے شوہر عدیل نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا دیا تھا اور وکیل استغاثہ نے اس پر جرح بھی مکمل کر لی تھی لیکن میری باری آنے سے قبل عدالت کی کارروائی کا مخصوص وقت ختم ہو گیا تھا لیکن آج پہلا کیس ہمارا ہی تھا لہٰذا وقت کی کمی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

''عدیل صاحب!'' میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے آپ کی بیوی کی ناگہانی موت کا بڑا دکھ ہے۔ میری یہی کوشش ہے کہ مقتول کا قاتل بے نقاب ہو جائے۔''

''قاتل تو اس وقت کٹہرے میں کھڑی ہے۔'' وہ ایکوزڈ باکس میں موجود میری موکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں بولا۔ ''اب آپ کو اور کون سے قاتل کی تلاش ہے؟''

''عدیل صاحب! آپ کے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ مجھے اس قاتل کی تلاش ہے جس نے پچھلے سال سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ صبح نو بجے سے گیارہ بجے کے دوران میں مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں آہنی راڈ کا خطرناک وار کر کے آپ کی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور جہاں تک ملزم راشدہ کا معاملہ ہے تو اب تک استغاثہ اسے آپ کی بیوی کا قاتل ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کر سکا۔ آپ کے گھر سے چوری ہونے والے قیمتی سامان اور نقدی کا معما بھی حل نہیں ہو سکا لیکن میں آپ کو ایک بات کا یقین دلاتا ہوں.....'' میں نے دانستہ ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''میں نہ صرف اپنی موکل کو بے گناہ ثابت کر کے باعزت بری کروالوں گا بلکہ آپ کی بیوی کے قاتل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کا بھی بندوبست کر دوں گا۔''

اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، وکیل صاحب! پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔

میں نے اس کی سوچ کو نظر انداز کرتے ہوئے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا اور کہا۔ ''عدیل صاحب! یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ حاجی صاحب آپ پر بہت بھروسا کرتے ہیں۔ آپ اپنے ادارے کی مارکیٹنگ اور کلیکشن کے لیے ملک کے طول و عرض میں جاتے ہیں۔ لاکھوں روپے کی کیش ہینڈلنگ آپ کے ہاتھ سے ہوتی ہے۔''

''اسٹار پبلشرز'' ایک فرضی نام ہے۔ اس اشاعتی ادارے کے اصل نام کو ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح مذکورہ ادارے کے مالک کا نام ظاہر کرنا بھی ٹھیک نہیں لہٰذا ''حاجی صاحب'' کے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں۔

''جناب! اتنا اعتماد، اتنی عزت کمانے کے لیے میں نے برسوں کڑی محنت کی ہے۔'' عدیل نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''کسی کی نظر میں اپنا مقام بنانا کوئی آسان کام نہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں عدیل صاحب۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی کی نگاہ میں کوئی مقام حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے اور آپ نے جو عزت اور اعتماد کمانے کی بات کی ہے نا، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اگر برسوں کی محنت لگتی ہے تو اسے کھونے کے لیے ایک لمحے کی دیر بھی نہیں لگتی۔ برسوں کی بنائی ہوئی عزت بعض اوقات ایک لمحے میں خاک میں مل کر رہ جاتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

آخری جملہ میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا پھر جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''آپ بجا فرما رہے ہیں.....''

''عدیل صاحب!'' میں نے استغاثہ کے گواہ کے کام اور گھر کو ''چینج اوور'' کے موڈ پر رکھ کر اپنے سوالات میں تیزی بھر دی۔ ''آپ کو اسٹار پبلشر کے پاس کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''چار سال۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے۔ میرا اشارہ آپ کی اور مقتول کی شادی کی طرف ہے.....؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ''لگ بھگ پانچ سال۔''

میں نے ''چینج اوور'' موڈ اس لیے اختیار کیا تھا تاکہ ادھر ادھر کے استفساری جب سے میں استغاثہ کے گواہ کو ذہنی طور پر پریشان کر سکوں۔ بوکھلاہٹ اور پریشانی کے عالم میں اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل سکتی تھی جو میری موکل کے حق میں جاتی..... اسی مقصد کے حصول کے لیے میں کبھی یہاں اور کبھی وہاں کے سوالات کر رہا تھا۔

''عدیل صاحب! میرے سننے میں آیا ہے کہ مقتول کے ساتھ آپ کی لو میرج تھی؟''

''جی، کسی حد تک ایسا کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کس حد تک؟''

''مطلب یہ کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور پھر ہم نے شادی کر لی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہماری اس پسندیدگی میں محبت، خلوص، اعتبار..... سب کچھ شامل تھا۔''

''وقوعہ کے روز یعنی سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ آپ اپنے گھر پر موجود نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ بیرونِ شہر کاروباری دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اگرچہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے لیکن معزز عدالت آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہے تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے۔ براہِ مہربانی یہ فرمائیے گا کہ آپ کب مذکورہ کاروباری دورے پر روانہ ہوئے تھے؟''

''میں جمعرات پندرہ اکتوبر کراچی سے روانہ ہوا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اور میری واپسی اتوار اٹھارہ اکتوبر سہ پہر میں ہوئی تھی۔''

''آپ کے بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ وقوعہ کے روز ہرگز ہرگز کراچی میں موجود نہیں تھے؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ ''ڈیفنس ایک ہی سوال کو بار بار کر کے استغاثہ کے گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی اس قسم کی حرکتوں سے عدالت کا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''کیا اس سوال کو دہرانے کا کوئی خاص سبب ہے؟''

''یس، یور آنر۔'' میں نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ''تھوڑی ہی دیر کے بعد اس خاص سبب کو بھی عدالت کے سامنے واضح کر دوں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس کے بعد میں استغاثہ کے گواہ سے یہ سوال نہیں کروں گا۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور وٹنس باکس میں کھڑے گواہ سے کہا۔ ''مسٹر عدیل! آپ ڈیفنس کونسلر کے سوال کا جواب دیں۔''

وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو نظر انداز کر کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ گواہ نے جج کی ہدایات کا پاس کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یس!'' اس کے انداز سے اعتماد جھلکتا تھا۔ ''اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ وقوعہ کے روز میں کراچی سے باہر تھا۔''

''آپ وقوعہ کے روز کراچی سے باہر کہاں تشریف فرما تھے اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آپ کو ایک بات پر حیرت نہیں ہوئی عدیل صاحب؟''

''کون سی بات پر؟'' وہ چوکنا نظر سے مجھے تکنے لگے۔

میں نے یہ سوال اچانک ہی کر دیا تھا جو درحقیقت کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ میری اس لائن کو آپ ایک چٹکلا سمجھ لیں۔ عدالتی کارروائی بھی میڈیکل کے شعبے کی مانند ہے۔ جس طرح بعض اوقات ہائی پوٹینسی قیمتی ادویہ کام نہیں کرتیں اور کوئی گھریلو ٹوٹکا حیرت انگیز کمال دکھا جاتا ہے، بالکل اسی طرح کرائے عدالت میں بھی بسا اوقات قانونی کتابوں کا علم اور داؤ پیچ ایک طرف رکھے رہ جاتے ہیں اور کوئی چٹکلا کام کر جاتا ہے۔

''آپ نے محض چار سال کی محنت سے اپنے سسر قبلہ حاجی صاحب کا اتنا اعتماد حاصل کر لیا کہ وہ لاکھوں روپے کی رقوم کے معاملات کے لیے آپ پر بھروسا کرنے لگے۔''

میں نے گواہ کے چونکے ہوئے سوال کے جواب میں کہا۔ ''لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر آپ کی پانچ سالہ محبت کوئی رنگ نہیں جما سکی۔ کیا آپ کو اس بات پر حیرت نہیں ہوتی؟''

''آخر اس سوال سے آپ کا مطلب کیا ہے؟'' وہ برہمی سے بولا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی بیگم یعنی مقتول نادرہ غصے کی بہت تیز تھیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''وہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتی تھیں اور تصور دار کو بے نقط کی سناڈالتی تھیں؟''

''جی، یہ حقیقت ہے کہ نادرہ کو غصہ بہت جلدی آجاتا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور اسے اپنے غصے پر قابو بھی نہیں رہتا تھا۔''

''اپنے غصے کے معاملے میں وہ کسی اپنے پرائے میں کوئی تخصیص نہیں کرتی تھیں۔'' میں نے تیزی سے اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ ''حتیٰ کہ غصے میں وہ یہ بھی بھول جاتی تھیں کہ آپ ان کے محبت کرنے والے مجازی خدا ہیں۔ وہ طیش کے عالم میں آپ کی بھی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دیتی تھیں اور آپ..... ان کے سامنے ایک بھیگا بلا بنے کھڑے رہتے تھے۔ ان کے غیظ و غضب کے آگے آپ کی کوئی پیش نہیں چلتی تھی؟''

''جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔'' وکیل استغاثہ اپنے معزز گواہ کی مدد کو لپکا۔ ''میرے فاضل دوست گواہ کی گھریلو زندگی کو زیر بحث لا کر سخت زیادتی کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے روکا جائے۔ استغاثہ کا گواہ اپنی بیوی مقتول نادرہ کے ساتھ گھر کے اندر کس نوعیت کی زندگی گزار رہا تھا اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

جج نے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! اس کیس کے متعلقات پر فوکس کریں پلیز۔''

''شیور یور آنر۔'' میں نے اپنی گردن کو تعظیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی جرح کو گواہ کے گھر سے باہر لا رہا ہوں۔'' پھر میں وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ عدیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ ای مارکیٹ، پی ای سی ایچ ایس بلاک سکس والا یہ دو منزلہ گھر مقتول کے نام پر ہے؟''

''یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ گھر میری مرحومہ بیوی کے نام پر ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لہٰذا میں انکار نہیں کر سکتا۔''

''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ مقتول نے یہ گھر آپ سے شادی کے بعد خریدا تھا یا پہلے سے اس کی ملکیت تھا؟''

''پہلے سے اس کی ملکیت تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''گویا آپ نے پانچ سال پہلے ایک ایسی عورت سے شادی کی تھی جو اسی گز پر تعمیر شدہ ایک شاندار دو منزلہ گھر کی مالک تھی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول کی رحلت کے بعد اب آپ اس گھر کے بلاشرکت غیرے مالک ہیں؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ قانونی معاملات کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''میں بہتر جانتا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کیونکہ مقتول میں سے آپ کی کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی اور ان کا کوئی بھائی بہن یا والدین میں سے بھی کوئی موجود نہیں ہے لہٰذا حالات و واقعات اور قانونی تقاضوں کے مطابق، مقتول کے تمام تر اثاثے کے وارث آپ ہی ہیں۔''

اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی، اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ایسا ہی ہے۔''

''اگر میں غلط نہیں تو اللہ کے حکم سے آپ بے اولاد نہیں مریں گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گھسائی کا عمل جاری رکھا۔ ''مقتول میں سے آپ کی اولاد نہیں ہوئی تو کیا ہوا، ماشاءاللہ! آپ کا ایک دو سالہ بیٹا تو ہے ہی..... ہیں نا؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''یہ عدالت کا کمرا ہے، کوئی ڈراما اسٹیج نہیں۔ وکیل صفائی پتا نہیں کون کون سی من گھڑت کہانیاں سنا رہے ہیں۔ استغاثہ کے گواہ نے صرف ایک ہی شادی کی تھی یعنی مقتول نادرہ سے اور مقتول میں سے اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔''

''تو میں نے کب کہا کہ دو سالہ نبیل مقتول کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔

''لو جی.....'' وہ لڑاکا عورتوں کی طرح اپنے ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔ ''فرضی بچے کا نام بھی سامنے آ گیا..... سبحان اللہ!''

''نہ تو نبیل کوئی فرضی کردار ہے اور نہ ہی نبیل کی ماں

شائستہ کوئی افسانوی کردار ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شائستہ، عدیل کی سیکنڈ وائف ہے۔ لگ بھگ تین سال پہلے انہوں نے شادی کی تھی۔ نبیل اور شائستہ کراچی ہی کے ایک پسماندہ علاقے خداداد کالونی میں، کرائے کے ایک مکان میں رہتے ہیں۔ اگر معزز عدالت ضرورت محسوس کرے گی تو شائستہ کو صفائی کے گواہ کے طور پر یہاں بلایا جاسکتا۔''

''بالفرض..... استغاثہ کے گواہ نے اگر دوسری شادی کر رکھی ہے اور دوسری بیوی میں سے اس کا کوئی دو سال کا بیٹا بھی ہے تو ان سب معاملات کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟'' وکیل استغاثہ نے بڑے چبھتے ہوئے انداز میں براہ راست مجھ سے سوال کیا۔ ''دوسری شادی کرنا اور دوسری بیوی میں سے اولاد پیدا کرنا کوئی جرم یا گناہ تو نہیں ہے.....؟''

''اس تعلق کی بھی وضاحت کردی جائے گی۔'' میں نے خشمگیں انداز میں وکیل مخالف کو گھورا۔ ''گواہ کے جواب کے بعد.....''

''مسٹر عدیل!'' جج نے استغاثہ کے گواہ سے استفسار کیا۔ ''کیا وکیل صفائی کا آپ کی دوسری شادی کے حوالے سے دعویٰ درست ہے؟ کیا شائستہ نامی کوئی عورت جو خداداد کالونی میں رہتی ہے وہ آپ کے دو سالہ بیٹے کی قانونی ماں ہے؟''

عدیل نے ہاتھ کی پشت سے اپنی پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو پونچھا پھر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''یس سر! شائستہ میری دوسری بیوی ہے اور نبیل میرا ہی بیٹا ہے۔''

''میرے فاضل دوست، مبارک ہو.....!'' میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب آپ کا معزز گواہ لاولد نہیں مرے گا۔ ماشاءاللہ! زوجہ دوم مسماۃ شائستہ نے دو سال پہلے گواہ کی نسل کو آگے بڑھانے کا بندوبست کردیا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو اب میں استغاثہ کے گواہ پر اپنی جرح مکمل کرلوں.....؟''

وکیل استغاثہ میری اس کاری ضرب پر خجل سا ہو کر رہ گیا۔

جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

''مسٹر جیری.....'' میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات شروع کی تو وہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''میں جیری نہیں، عدیل ہوں۔''

''سوری عدیل صاحب۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا پھر فوراً وضاحت بھی کردی۔ ''دراصل، آپ پر جرح کرتے ہوئے میرے ذہن میں ملزم کے شوہر کی کہی ہوئی ایک بات تازہ ہوگئی تھی لہٰذا میری زبان سے آپ کے لیے ''جیری'' کا لفظ پھسل گیا تھا۔''

''اچھا جی.....'' وہ میری پیش کردہ وضاحت میں دلچسپی لیتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''کیا میرے غیاب میں ملزم کے شوہر نے آپ کے سامنے مجھے جیری کہہ کر کوئی بات کی تھی؟''

''نہیں.....'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''درحقیقت، اس نے مجھے ٹام سے تشبیہ دی تھی۔''

''کمال ہے وکیل صاحب۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''آپ کے ٹام ہونے سے میں جیری کیسے ہوگیا؟''

''آپ کے ''کیسے؟'' کا جواب تھوڑی دیر کے بعد سامنے آجائے گا۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ میں اس کارٹون والا ٹام نہیں ہوں جو جیری سے محض اٹکھیلیاں کرتا ہے۔ وہ جیری کو دوڑاتا ہے، ہانپنے پر مجبور کرتا ہے اور اس کی جان ہلکان کر کے رکھ دیتا ہے مگر وہ جیری کا قصہ تمام کرنے کے بارے میں ہرگز نہیں سوچتا جبکہ اس کے بالکل برعکس میں ذرا دکھری ٹائپ کا ٹام ہوں۔ میں بڑے طریقے سلیقے سے جیری کی گردن ناپوں گا اور اسے جیل کی فضا میں دھکیل کر ہی دم لوں گا۔ زندگی کی

فرمانِ رسولؐ

دوسروں کا محتاج بننے کے بجائے خود صاحب الرائے اور پختہ ارادہ کرنے والے بنو، بن بلائے کسی کے گھر کھانے کے لیے نہ جاؤ۔ تم کہتے ہو کہ جو ہم سے نیکی کرے گا ہم بھی اس سے نیکی کریں گے اور جو ہم سے برائی کرے گا ہم بھی اس سے برائی کریں گے لیکن تمہیں چاہیے کہ تم اپنے آپ کو اس بات کا عادی بناؤ کہ جو تمہارے ساتھ نیکی کرے تم بھی اس کے ساتھ نیکی کرو اور جو تمہارے ساتھ بدی کرے، تم اس کے ساتھ بدی نہ کرو بلکہ اس پر بھی احسان کرو۔

اسوۂ رسول اکرمؐ۔ ترمذی۔ مشکوٰۃ

باقی ماندہ سانسیں اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے لینا ہوں گی۔ کارٹون والے جیری کے مانند رئیل لائف جیری سے کوئی رورعایت نہیں کی جائے گی۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا، بڑبڑاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کیا انٹ شنٹ بولے جارہے ہیں۔''

''عدیل صاحب! میں نے اس کی بوکھلاہٹ آمیز بیزاری کو نظرانداز کرتے ہوئے ''چیخ اوور'' کا عمل جاری رکھا اور پوچھا۔ ''کیا آپ اسموکنگ کرتے ہیں؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اگر میں غلط نہیں ہوں تو.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ ووڈبائن برانڈ کی سگریٹ پیتے ہیں؟''

میں نے اس کیس میں اپنی جیت کو مسلم کرنے کے لیے بڑی توجہ سے ہوم ورک کیا تھا۔ اس اندرون شہر اور بیرون شہر تحقیق میں ملزم کے شوہر مظہر نے بھی خاطر خواہ میرا ہاتھ بٹایا تھا۔

''جی بالکل، میں ووڈبائن سگریٹ ہی پسند کرتا ہوں۔'' گواہ نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو گھر کے اندر پرندے پالنے کا بھی شوق ہے؟''

''جی ہے!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''عدیل صاحب!'' میں نے جرح کے سلسلے کو فائنل ٹچ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے سامنے دعویٰ کیا ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی..... سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ آپ کراچی سے باہر اپنے کاروباری دورے میں مصروف تھے؟''

''جی..... یہی سچ ہے۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ سترہ اکتوبر کا پورا دن آپ کی کیا مصروفیات رہی تھیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا کیونکہ آپ کی بتائی ہوئی ایک ایک بات کی تصدیق بھی کی جائے گی۔ امید ہے، آپ مجھے نام بدلنے پر مجبور نہیں کریں گے۔''

''سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ کی صبح میں نواب شاہ پہنچا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ میرے ٹور کی واپسی کا سفر تھا۔ دوپہر کا کھانا میں نے نواب شاہ ہی میں کھایا تھا پھر سہ پہر کے وقت میں نواب شاہ سے حیدرآباد کی جانب روانہ ہوگیا تھا۔ حیدرآباد کا کام نمٹاتے ہوئے کافی دیر ہوگئی لہٰذا میں رات کو حیدرآباد ہی میں رک گیا تھا۔ اگلے روز یعنی اتوار کی دوپہر میں حیدرآباد سے نکلا اور سہ پہر کے وقت اپنے گھر کراچی پہنچ گیا تھا۔ آپ نے ایک دن کی مصروفیات بتانے کو کہا تھا، میں نے دو دن کی بیان کردیں۔''

''یہ تو آپ نے مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے عدیل صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر اجازت دیں تو آپ کے اس بیان کو لاک کردیا جائے؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی بالکل۔''

''فریز کردیا گیا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ نواب شاہ میں ''علم و ہنر بک اسٹال'' اور حیدرآباد میں ''شمع بک ڈپو'' پر آپ کی زیادہ تر بیٹھک ہوتی ہے؟''

اس نے حیرت بھری نظر سے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی کیفیت سے دوچار تھا۔ چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد اس نے جواب دیا۔

''جی، آپ درست کہہ رہے ہیں۔''

میں نے سوئی چبھونے والے انداز میں کہا۔ ''مسٹر عدیل! اس مرتبہ والے کاروباری دورے پر تو آپ نے ایک نئی تاریخ بھی مرتب کردی تھی۔ نہ صرف نواب شاہ بلکہ پوری دنیا میں اس نوعیت کا واقعہ کبھی پہلے رونما نہیں ہوا ہوگا۔''

''میں نے ایسا کردیا وکیل صاحب؟'' وہ سوچتی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''آپ نے مذکورہ روز علم و ہنر بک اسٹال کے مالک منظور حسین کے ساتھ ایک بھرپور لنچ کیا۔ اس کے بعد آپ لوگوں نے ایک ساتھ جمعے کی نماز ادا کی۔ پھر آپ نے منظور صاحب سے رخصت لی اور حیدرآباد کے لیے روانہ ہوگئے.....''

''تو اس میں نئی تاریخ رقم کرنے والی کون سی بات ہے۔'' گواہ کے بجائے وکیل استغاثہ نے برہمی سے پوچھا۔

''استغاثہ کے جواب میں آپ کو ''نئی تاریخ'' کی جھلک نظر آجائے گی۔ صبر کے دامن کو مضبوطی سے تھام کر انتظار فرمائیں۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کاٹ دار آواز میں کہا پھر گواہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''ایسا ہوا تھا یا نہیں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں نے اور منظور صاحب نے پہلے

ایک ساتھ لنچ کیا اس کے بعد مسجد جا کر جمعے کی نماز ادا کی تھی پھر میں حیدر آباد آ گیا تھا۔''

''میرے فاضل دوست.....'' میں نے تمسخرانہ انداز میں وکیل سرکار سے پوچھا۔ ''کچھ سمجھ میں آیا بارے اس مسئلے کے یا مجھے اے بی سی ڈی سے پڑھانا پڑے گا؟''

وکیل استغاثہ نے حقیقت کی تہ تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ مجھے جواب دینے کے بجائے وہ اپنے گواہ سے مستفسر ہوا۔

''عدیل صاحب! نواب شاہ تو آپ ہفتہ کے روز گئے تھے پھر آپ نے منظور صاحب کے ساتھ جمعے کی نماز کیسے ادا کی؟''

''جناب عالی!'' میں نے گواہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر بہ آواز بلند کہا۔ ''استغاثہ کے انتہائی معزز گواہ کے جھوٹ کا پول کھل چکا ہے۔ یہ شخص سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ نہیں بلکہ سولہ اکتوبر، بروز جمعہ نواب شاہ گیا تھا۔ اگر عدالت ضروری سمجھتی ہے تو علم و ہنر بک اسٹال کے مالک منظور حسین اور جمع بک ڈپو کے پروپرائٹر توصیف مرزا کو گواہی کے لیے اس عدالت تک آنے کی زحمت دی جا سکتی ہے۔ استغاثہ کا گواہ جمعے کی رات ہی واپس کراچی آ گیا تھا۔ ہفتے کا دن اس نے کہاں اور کس مصروفیت میں گزارا اس راز سے میں پردہ اٹھانے جا رہا ہوں.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

''عدیل صاحب! جمعہ، سولہ اکتوبر کی رات کم و بیش دس بجے آپ اپنی سیکنڈ وائف کے گھر واقع خداداد کالونی پہنچے تھے۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کریں گے؟ انکار کی صورت میں ماموں پان فروش نے بتایا ہے کہ مذکورہ روز کم و بیش رات دس بجے آپ نے اس سے ووڈ بائن سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔ آپ دونوں کے بیچ رسمی علیک سلیک بھی ہوئی تھی اور آپ نے ماموں کو بتایا تھا کہ آپ ابھی ابھی بیرون شہر دورے سے واپس آئے ہیں یعنی..... سولہ اکتوبر، بروز جمعہ رات دس بجے..... ہاں یا نہ.....؟''

''اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔'' وہ ہٹ دھرمی پر آمادہ ناراض بیویوں کے سے انداز میں بولا۔

''جواب تو تمہیں دینا پڑے گا۔'' میں ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا۔ ''یہ کمرائے عدالت ہے، کوئی آسٹریلین طوطوں کا پنجرہ نہیں جہاں تم اپنی من مانی کے لیے آزاد ہو۔''

جج نے بھی اسے سرزنش کی۔ ''آپ وکیل صفائی کو جواب دینے کے پابند ہیں۔'' میں جس انداز میں کڑی جرح کر کے استغاثہ کے گواہ کو بند گلی کی جانب دھکیل رہا تھا اسے جج اچھی طرح بھانپ چکا تھا اسی لیے اس نے گواہ کو سرزنش کی تھی۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میں نے شاکر ماموں سے سگریٹ کا پیکٹ خریدا تھا۔'' گواہ نے بادل ناخواستہ جواب دیا۔

''صرف ووڈ بائن سگریٹ کا پیکٹ خریدا تھا..... سے کام نہیں چلے گا۔'' میں نے کڑی نظر سے اسے گھورا۔ ''عدالت اس امر کی بھی تصدیق چاہتی ہے کہ یہ کام سولہ اکتوبر، بروز جمعۃ المبارک کی رات کیا گیا تھا؟''

''جی اس روز جمعہ ہی تھا۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔

''اس سے اگلے روز یعنی وقوعہ کے دن سترہ اکتوبر تم صبح ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان پلیا کے نیچے کیا کر رہے تھے؟'' میں یکے بعد دیگرے اس کے فرار کے راستے بند کرتا چلا جا رہا تھا۔

''کون سی پلیا؟'' وہ کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''شارع فیصل سے ای مارکیٹ پی ای سی ایچ سوسائٹی بلاک سکس کی جانب جانے کے دو اہم راستے ہیں۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''ایک چنیسر ہالٹ والے چوراہے سے رائٹ ٹرن لے کر اور دوسرے چوراہے سے لگ بھگ ڈھائی سو گز کے فاصلے پر پلیا کے نیچے سے۔ میں اس پلیا کی بات کر رہا ہوں جو ریلوے لائن کے نیچے بنی ہوئی ہے۔ عام دنوں میں یہ ٹریفک کے لیے شارٹ کٹ کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور موسم برسات میں یہ ایک بہتی ہوئی ندی کی شکل اختیار کر جاتی ہے؟''

''جی..... جی.....'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ ''میں بھی بسا اوقات پلیا والا راستہ ہی استعمال کرتا ہوں.....''

''یہ اطمینان بخش بات ہے کہ تمہاری یادداشت واپس آ رہی ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں نے ''بسا اوقات'' کے بارے میں نہیں پوچھا۔ میں اس وقت سترہ اکتوبر، بروز ہفتہ کی صبح کی بات کر رہا ہوں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق تمہاری بیوی کی موت کا وقت صبح نو سے گیارہ بجے کے بیچ بتایا گیا ہے۔ تمہارے متعدد ثابت شدہ جھوٹوں کو فی الحال ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ بس، معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ وقوعہ کے روز تم اپنے گھر کے انتہائی قریب، ریلوے والی پلیا کے نیچے کھڑے افضل کارپینٹر سے کیا بات

کر رہے تھے......؟‘‘
’’اوہ......‘‘ وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’تو آپ افضل کارپینٹر تک بھی پہنچ گئے؟‘‘

’’میں کب کب، کہاں کہاں پہنچ سکتا ہوں یہ تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا۔‘‘ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ’’اب شرافت سے میرے سوال کا جواب دے دو تاکہ میں استغاثہ کے تابوت میں آخری میخیں بھی ٹھونک ڈالوں۔ کوئی بھی جواب دینے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے افضل بڑھئی کو عدالت میں طلب کیا جاسکتا ہے۔‘‘

وہ یکایک صدیوں کا بیمار نظر آنے لگا، مریل سی آواز میں بولا۔ ’’میں نے افضل کارپینٹر کو آسٹریلین طوطوں کے لیے ایک پنجرہ بنانے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ اس روز پلیا کے نیچے افضل سے ملاقات ہوگئی تھی......‘‘

’’اس روز......کوئی بات نہیں ہوتی۔‘‘ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ’’عدالت ہر چیز میں پرفیکشن مانگتی ہے۔ یہ کہو، وقوعہ کے روز یعنی سترہ اکتوبر بروز ہفتہ!‘‘

اس نے میرے بتائے ہوئے الفاظ دہرائے پھر منت ریز لہجے میں بولا۔ ’’کیا مجھے ایک گلاس پانی مل جائے گا۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے......‘‘

’’تمہیں پانی بھی ملے گا اور مانی بھی لیکن کرائے عدالت میں نہیں بلکہ تھانے کی حوالات میں پہنچ کر۔‘‘ میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ’’وہاں پر تفتیشی افسر تمہارے حلق اور معدے کی بڑی تسلی بخش ترائی کرے گا۔ فی الحال، تم صبر و برداشت سے کام لو تاکہ میں اپنی جرح مکمل کرسکوں۔‘‘

عدیل کی حالت دیدنی تھی لیکن میں اس پر ذرا سا بھی ترس کھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ان نازک لمحات میں وہ بار بار امداد طلب نظروں سے وکیل استغاثہ کو اور کبھی انکوائری آفیسر کو دیکھ رہا تھا لیکن مثل مشہور ہے کہ اندھیرے میں انسان کا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے، مصیبت کی اس گھڑی میں عدیل کے ان دونوں ’’اپنوں‘‘ نے اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ معاملے کی تہ تک پہنچ چکے تھے۔

’’کیا مقتولہ کو اس بات کی خبر تھی کہ تم نے دو سال پہلے شادی کرلی تھی؟‘‘ میں نے جرح کی دکان بڑھاتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں استفسار کیا۔

’’پہلے اسے علم نہیں تھا۔‘‘ وہ اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ’’لیکن وقوعہ سے چند روز قبل وہ اس معاملے کے بارے میں جان گئی تھی۔‘‘

’’اور تبھی تم دونوں میں اچھی خاصی جھڑپ بھی ہوئی تھی!‘‘ میں نے اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہوئے کہا۔ ’’جس کے اختتام پر مقتولہ نے دوٹوک انداز میں تم پر واضح کردیا تھا کہ تمہاری دو کشتیوں کی مسافرت کبھی بھی، کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کی جائے گی۔ اگر تمہیں مقتولہ کے ساتھ رہنا ہے تو شائستہ کو طلاق دینا ہوگی۔ اس سلسلے میں جتنا بھی خرچہ آتا، وہ مقتولہ دینے کے لیے رضامند تھی اور اگر تم اپنی دوسری بیوی اور بچے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو پھر مقتولہ کے گھر میں اور اس کی زندگی میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مقتولہ کے اس حتمی فیصلے کے بعد تم نے اس سے یہی کہا تھا کہ بیرون شہر کے دورے سے واپس آکر تم اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو گے اور پھر......‘‘ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے جج کی جانب دیکھا اور کراری آواز میں اضافہ کیا۔

’’جناب عالی! بیرون شہر دورے کے دوران میں مقتولہ کے شوہر اور استغاثہ کے اس معزز گواہ نے جو فیصلہ کیا وہ مقتولہ کی دردناک موت کی صورت ہم سب کے سامنے ہے۔ گواہ نے آج کی عدالتی کارروائی میں متعدد بار دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ گواہ کو شامل تفتیش کرکے پولیس کو نیا چالان تیار کرنے کی ہدایات جاری کی جائیں تاکہ دودھ اور پانی کو الگ الگ دیکھا جاسکے۔ دیٹس آل یور آنر۔‘‘

جج نے میری فرمائش کے جواب میں تفتیشی افسر کو خصوصی ہدایات جاری کردیں اور سات روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

لہذا میں آپ کو ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ پولیس کسٹڈی میں عدیل نے کیا بیان دیا اور اس اعترافی بیان کی روشنی میں عدالت نے کیا فیصلہ سنایا۔ میں بس آپ کو تین اشارے دے سکتا ہوں۔

نمبر ایک، عدالت کے فیصلے کے بعد مظہر نے سکون کی سانس لی تھی۔

نمبر دو، مظہر کے سکون نے فوزیہ، کاشف اور عاطف کو خوشی سے نہال کردیا تھا۔

نمبر تین، میں کارٹون سیریز میں نظر آنے والا ٹام نہیں ہوں لیکن اگر کوئی شاطر شرافت کا لبادہ اوڑھ کر جیری کے مانند معصوم بننے کی کوشش کر رہا ہو تو پھر میں......!

(تحریر: حسام بٹ)

مشن

شاہ زین رضوان

احساسِ کمتری ہو یا احساسِ برتری، دونوں صورتوں میں سے جس میں بھی شدت یا زیادتی پائی جائے اکثر وہی احساس پوری شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے... اور یہی غالب احساس اسے بھی ایک غلط سمت میں لے جا رہا تھا کہ اچانک اسے ایک راہنما کی ہمراہی مل گئی لہٰذا اسے سمت تو بدلنا تھی مگر... اسے معلوم نہ تھا کہ رستہ بدلتے ہی اسے گرم آب و ہوا ایک نئی آزمائش میں ڈال دے گی... اور وہی اس کا امتحان بھی تھا جس میں ہر صورت اسے کامیابی سے ہمکنار ہونا تھا۔

پل پل حوصلہ شکنی کا شکار ہونے والی لڑکی کا ایک انوکھا کارنامہ

کلاس ختم ہو چکی تھی اور لیکچر ہال آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا۔ پروفیسر سیکی نے سامنے والی قطار میں بیٹھی ہوئی دبلی پتلی سنہرے بالوں والی لڑکی کی طرف دیکھا اور بولی۔

"پیاری لڑکی! کیا تم میری بات سنو گی؟"

انجلی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ وہ اپنے حلیے کے اعتبار سے کسی اسکول کی طالبہ لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ، کوٹ کے بٹن گردن تک بند اور اس کا بیگ کندھوں پر جھول رہا تھا۔

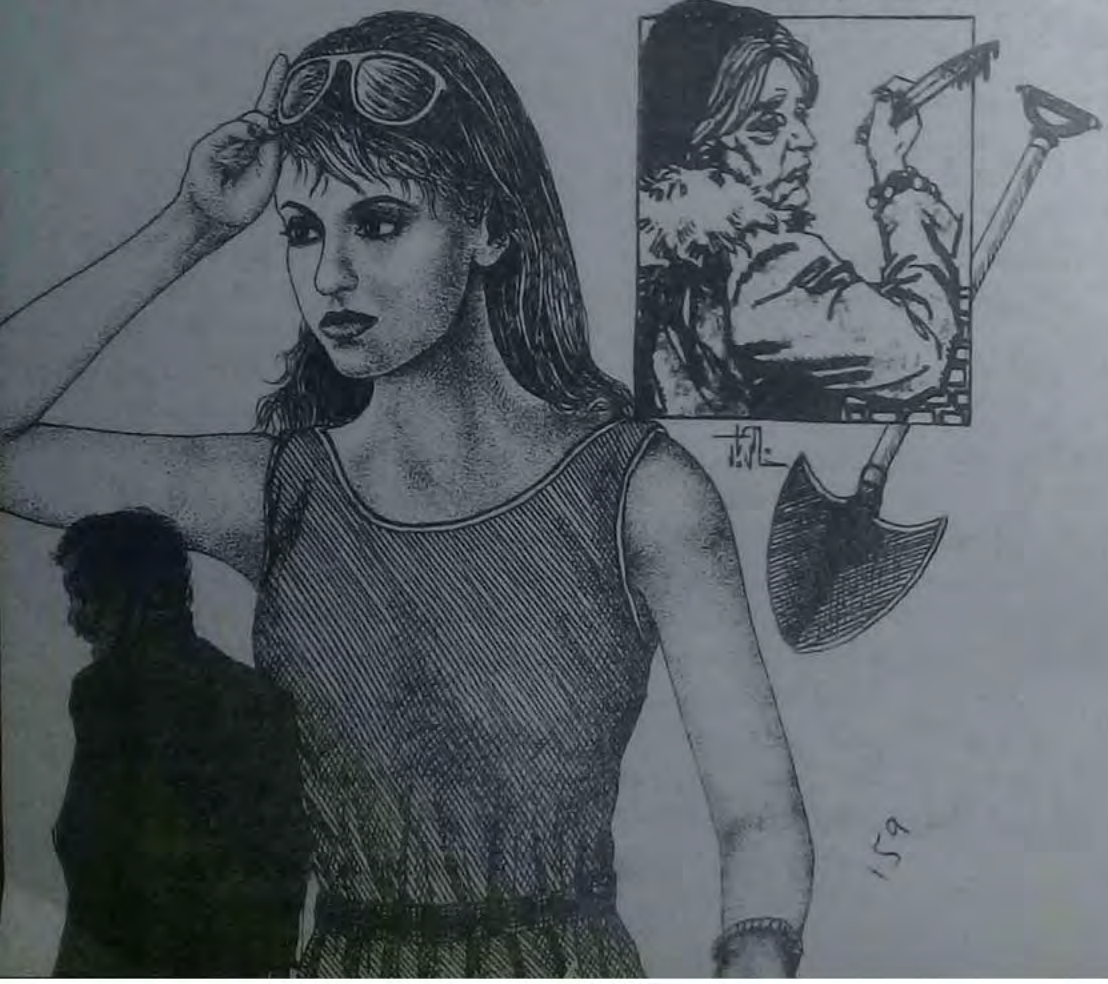

مشن

شاہ زین رضوان

احساسِ کمتری ہو یا احساسِ برتری، دونوں صورتوں میں سے جس میں بھی شدت یا زیادتی پائی جائے اکثر وہی احساس پوری شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے... اور یہی غالب احساس اسے بھی ایک غلط سمت میں لے جا رہا تھا کہ اچانک اسے ایک راہنما کی ہمراہی مل گئی لہٰذا اسے سمت تو بدلنا تھی مگر... اسے معلوم نہ تھا کہ رستہ بدلتے ہی اسے گرم آب و ہوا ایک نئی آزمائش میں ڈال دے گی... اور وہی اس کا امتحان بھی تھا جس میں ہر صورت اسے کامیابی سے ہمکنار ہونا تھا۔

پل پل حوصلہ شکنی کا شکار ہونے والی لڑکی کا ایک انوکھا کارنامہ

کلاس ختم ہو چکی تھی اور لیکچر ہال آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا۔ پروفیسر سیکی نے سامنے والی قطار میں بیٹھی ہوئی دبلی پتلی سنہرے بالوں والی لڑکی کی طرف دیکھا اور بولی۔

"پیاری لڑکی! کیا تم میری بات سنو گی؟"

انجلی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ وہ اپنے حلیے کے اعتبار سے کسی اسکول کی طالبہ لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ، کوٹ کے بٹن گردن تک بند اور اس کا بیگ کندھوں پر جھول رہا تھا۔

''یس میڈم؟'' اس نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔
''کیا تم نے کبھی انگلینڈ یا امریکا میں اسکول ٹیچر بننے کے لیے درخواست دینے کے بارے میں سوچا؟''
''نہیں۔'' وہ حیران ہو رہی تھی کہ میڈم نے اس سے یہ سوال کیوں کیا۔
''میرا خیال ہے کہ اگر تم اس بارے میں سوچو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ تم ایک اچھی طالبہ ہو لیکن تمہارے اندر تھوڑی سی جھجک ہے۔ کیا تمہیں اس کا احساس ہے؟''
''ہاں۔'' انجلی اس سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔
''مجھ میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ خاص طور سے بولنے میں بڑی جھجک ہوتی ہے۔''
''بالکل ٹھیک اور یہی چیز تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔ تم نے اپنی کلاس میں امریکا میں کیتھولک عقائد کے کرشماتی احیا پر جو پریزنٹیشن دی وہ انتہائی عمدہ، واضح اور دلائل سے بھرپور تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے تم اسے اپنے آپ تک محدود رکھنا چاہ رہی ہو۔ ہم تمہیں بہ مشکل سن پا رہے تھے۔ تم نے ایک دفعہ بھی نوٹس پر سے نظریں نہیں ہٹائیں جو ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتیں؟''
وہ بڑے نرم اور محتاط لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے اپنے کاغذات بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تمہاری زندگی میں کچھ مشکلات ہیں۔''
اس نے اپنی آواز نیچی کرلی۔ گو کہ لیکچر ہال مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ ''میں نے بھی بہت چھوٹی عمر میں اپنی ماں کو کھو دیا تھا۔ اس وقت میں صرف چودہ سال کی تھی۔ اس کے بعد میری زندگی کا بدترین دور شروع ہو گیا لیکن رفتہ رفتہ میں ان حالات کی عادی ہوتی گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں بیس سال لگ گئے کہ وہ سب سچ نہیں تھا۔ زندگی میں خوشگوار واقعات بھی رونما ہوتے ہیں اور بُرا وقت ہمیشہ نہیں رہتا۔''
انجلی نے اپنا سر نیچے کرلیا تاکہ اس کے جذبات عیاں نہ ہو سکیں۔ میڈم سیلی اس کے لیے ایک پروفیسر سے بڑھ کر تھی۔ اس عورت نے جو اس کی ماں کی عمر کی تھی، سال کے شروع میں ہی اسے اپنے پروں میں لے لیا تھا اور ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ انجلی نے بھی اسے مایوس نہیں کیا اور انتھک محنت کر کے اپنے آپ کو ایک اچھی طالبہ ثابت کیا تاکہ سیلی کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔
''معاف کرنا۔ میں کوئی ماہر نفسیات نہیں ہوں۔'' سیلی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نے یہ تاثر لیا ہے کہ تم اپنے آپ کو ہر چیز سے بچانے کی کوشش کرتی ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''
''نہیں۔'' انجلی نے کہا۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے بہ مشکل پروفیسر سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''
''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میڈم نے بات سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ ایک سال کے لیے ملک سے باہر جانا تمہارے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔ تمہیں نہ صرف دنیا دیکھنے اور نئے لوگوں سے ملنے کا موقع ملے گا بلکہ تمہارے اندر اعتماد اور خود پر یقین پیدا ہوگا۔ تم اس بارے میں ضرور سوچو۔''
انجلی کے لیے میڈم سیلی کا مشورہ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے کسی جھجک کے بغیر ضروری کارروائی کی اور اسے بہ آسانی آنے والے سال میں معاون فرنچ ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ اس کی پوسٹنگ ایسٹ یارک شائر کے شہر ہل، کے ایک سیکنڈری اسکول میں ہوئی تھی۔ نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ یہ ساحلی شہر شمالی لندن سے تین گھنٹے کی مسافت پر ہے۔
اسے جیسے ہی یہ اطلاع ملی وہ فوراً میڈم کو یہ خبر سنانے چلی گئی۔
''بہت خوب۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں وہاں جا کر اچھا تجربہ ملے گا لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود کو محدود کرنے یا چھپنے کی کوشش مت کرنا۔ دوست بناؤ۔ اپنے آپ کو متحرک رکھو۔ مختلف سرگرمیوں میں حصہ لو۔ حقیقی زندگی سے دور رہنا تمہارے لیے نقصان دہ ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ جب تم واپس آؤ تو میں تمہیں ایک بدلی ہوئی انجلی کے روپ میں دیکھوں۔''
انجلی جب جانے لگی تو میڈم نے کہا۔ ''اگر تم مجھے خط لکھنا چاہو تو مجھے خوشی ہوگی اور میں جان سکوں گی کہ تمہارا وقت کیسا گزر رہا ہے۔ یہ میرے گھر کا پتا ہے۔'' اس نے ایک کاغذ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔
''میں ضرور خط لکھوں گی۔'' انجلی نے وعدہ کیا۔
اس سے پہلے وہ شاید ہی کبھی اپنے شہر سے باہر گئی ہو۔ اس لیے اس کے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ جب وہ دو بھاری سوٹ کیس گھسیٹتی ہوئی لیون کے بس اسٹینڈ پر پہنچی جہاں سے اسے انگلینڈ جانے والی بس میں سوار ہونا تھا۔ یہ سفر ساری رات جاری رہا۔ اسے بڑی مشکل سے نیند آئی۔ ایک تو اس کی نشست غیر آرام دہ تھی، دوسرے اسے ان پچاس ہزار فرانک کی بھی فکر تھی جو اس نے ایک تھیلی میں رکھ کر

میٹر ریڈر کی عارضی ملازمت کرکے کمائی تھی اور یہی اس کی زندگی کی پہلی تنخواہ تھی۔ وہ ایک عمدہ ملازمت تھی۔ سوائے اس کے جب وہ کھیتوں میں جاتی تو کتے اس کی جانب لپکتے اور اسے اپنی چھوٹی سی رینالٹ کار میں بند ہونا پڑتا۔

وکٹوریہ اسٹیشن پر اس نے ناشتا کیا جو وہ اپنے ساتھ گھر سے لائی تھی۔ اس میں ایک سیب اور سینڈوچ شامل تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اس کے کانوں میں مختلف آوازیں آرہی تھیں اور سب لوگ انگریزی بول رہے تھے۔ اسے شدت سے اجنبیت کا احساس ہوا۔ وہ اپنے گھر سے بہت دور اور تنہا تھی۔ اسے ایک طویل عرصے تک اسی طرح رہنا تھا۔

وہ تین گھنٹے تک ایک سوٹ کیس پر بیٹھی دوسری بس کا انتظار کرتی رہی۔ یہ سفر اس کی توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا۔ جب وہ ہل بس اسٹیشن پہنچی تو رات ہوچکی تھی اور اسے گھر سے نکلے ہوئے ستائیس گھنٹے اور تیس منٹ ہوگئے تھے۔

''تمہیں آنے میں دیر ہوگئی میری جان۔''

یہ وہ ابتدائی الفاظ تھے جو اس کی مالکِ مکان مس سوزن نے کہے جو بے چینی سے پلیٹ فارم پر ٹہل رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے۔'' انجلی نے کہا اور وضاحت کرنے لگی کہ اس نے جان بوجھ کر دیر نہیں کی لیکن اس عورت نے اسے خاموش کردیا اور اسے لے کر ایک گرد آلود فورڈ کار... کی طرف بڑھ گئی جس کے بائیں دروازے پر ڈینٹ پڑا ہوا تھا۔

اس عورت کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ کافی نڈر، منہ پھٹ اور مرد مار لگ رہی تھی۔ اس نے ایک پرانا سا کوٹ پہن رکھا تھا اور بال کٹے ہوئے تھے۔ گاڑی چلانے کے دوران میں اس نے کئی مرتبہ زوردار آواز میں ناک سکیڑی اور مردوں کی طرح کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ وہ اپنی حرکات و سکنات کے اعتبار سے دیکھنے میں مرد ہی لگ رہی تھی۔ اس میں نسوانیت نام کو نہیں تھی یا اس نے اسے نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

انجلی نے اپنے سرخ ہاتھ زانو پر رکھے اور انگوٹھے کے جمے ہوئے کھرنڈ کو دیکھنے لگی جو کچھ عرصہ پہلے زخمی ہوگیا تھا۔ اس نے ناخن چباتے ہوئے سوچا کہ وہ کس طرح اس عورت کے ساتھ ایک سال گزار سکے گی؟

ان کے درمیان مختصر گفتگو ہونے کی وجہ یہ تھی کہ مس سوزن نے اس سے جو کچھ کہا، وہ بہ مشکل اس کا چوتھائی حصہ

... مس سوزن کون سی زبان بول رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انگریزی ہی تھی جو وہ برسوں سے پڑھتی آئی تھی لیکن اسے مس سوزن کا لہجہ اور ادائیگی بالکل مختلف لگی۔ یہ کم از کم اس انگریزی سے بالکل الگ تھی جو اس نے پڑھی اور سیکھی تھی۔

سرخ اینٹوں والا یہ مکان شہر کے شمال مغرب کے مضافاتی علاقے میں سڑک کے آخری سرے پر واقع تھا۔ اسے دیکھ کر انجلی کو تھوڑا سا بدشگونی کا احساس ہوا۔ گو کہ یہ ویرانی اندھیرے اور دھند کے سبب ہوسکتی تھی جس نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

مس سوزن نے گیٹ کے باہر کار روکی اور ڈکی کھول کر اس کے سوٹ کیس اس طرح اٹھا لیے جیسے وہ خالی ہوں۔ انجلی اس کے پیچھے تیزی سے چل دی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچے۔ وہ اس کا قدوقامت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کی پھیلی ہوئی کمر اور موٹی گردن دیکھ کر اسے خیال آیا کہ یہ عورت نیشنل رگبی ٹیم کے لیے کھیل سکتی تھی۔

اسے جو کمرا دیا گیا، اس نے کبھی اچھے دن دیکھے ہوں گے تاہم وہ صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ تھا۔ اس میں ایک ڈبل بیڈ، پڑھنے کی میز بمع لیمپ، کرسی، چولہا اور باتھ روم موجود تھا۔ کمرے کی کھڑکی سرسبز گارڈن میں کھلتی تھی جس کے گرد اینٹوں کی دیوار تھی اور کونے میں ایک لکڑی کا شیڈ بنا ہوا تھا۔

''تمہیں کھانے کے لیے کچھ چاہیے؟'' مس سوزن نے پوچھا۔

انجلی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ایک سینڈوچ کب تک اس کا ساتھ دے سکتا تھا لیکن اس نے کہہ دیا کہ اسے بھوک نہیں ہے۔

''اچھا شب بخیر، میری جان۔'' مس سوزن نے کہا اور اپنے رہائشی حصے میں چلی گئی۔

انجلی حیران تھی کہ مس سوزن اسے میری جان کہہ کر کیوں مخاطب کررہی ہے جبکہ وہ ایک دوسرے کو پہلے سے نہیں جانتی تھیں اور یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کا تکیہ کلام ہوگا یا پھر وہ ہر لڑکی کو اسی طرح مخاطب کرتی ہوگی پھر اس نے سرسری طور پر کمرے کا جائزہ لیا لیکن اس میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ بری طرح تھک کر چور ہوگئی تھی پھر اس نے لباس تبدیل کرنے کے بارے میں سوچا لیکن یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ اس کی دونوں ٹانگیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ جینز

نہیں اتار سکتی تھی۔ مجبوراً اسے اسی لباس میں سونا پڑا۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ دونوں عورتوں نے ساتھ ہی ناشتا کیا پھر مس سوزن اسے اپنا گھر دکھانے لے گئی۔ گارڈن سے متصل شیڈ میں کوئلے کا ڈھیر پڑا ہوا تھا جہاں سے انجلی اپنے چھوٹے سے اسٹوو کو جلانے کے لیے کوئلہ لے سکتی تھی۔ کوئلہ نکالنے کے لیے لکڑی کے دستے والا لوہے کا بیلچہ بھی وہاں رکھا ہوا تھا۔

وہ اسے کچن میں لے گئی اور کہا کہ وہ جب اور جو چاہے اپنے لیے بنا سکتی ہے۔ اسی طرح لیونگ روم، باتھ اور شاور استعمال کرنے پر بھی پابندی نہیں ہوگی۔ وہ تیز آواز میں موسیقی سن سکتی ہے اور اپنے ساتھ کسی کو بھی جب چاہے جتنے عرصے کے لیے گھر لا سکتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ یہاں رہ کر اپنے آپ کو آزاد اور پرسکون محسوس کرے۔ ''تم سمجھ رہی ہونا میری جان۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی ان باتوں سے انجلی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جیسا اس نے مس سوزن کے بارے میں سوچا تھا، وہ اس سے بالکل مختلف تھی۔ اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی اور وہ اپنے آپ کو ہر معاملے سے لاتعلق رکھنا چاہتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس نے انجلی کو پوری آزادی دے دی کہ وہ جو چاہے کرے۔ وہ اس کا کچن، لیونگ روم، باتھ روم اور شاور سب کچھ استعمال کر سکتی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ایک کمرے تک ہی محدود ہو جاتی۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ کوئی ناپسندیدہ شخصیت نہیں بلکہ ایک ہمدرد اور محبت کرنے والی عورت تھی۔

انجلی کو اپنے آپ کو ماحول میں ڈھالنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے بہت جلد وہاں کا لب ولہجہ اختیار کرلیا۔ پیسے بچانے کی خاطر وہ پورے ہفتے کہیں باہر نہیں جاتی تھی۔ اسے سیر وتفریح، شاپنگ اور سینما جانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کام اور انگریزی سیکھنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ تاہم اختتامِ ہفتہ وہ شہر میں مقیم دوسرے فرانسیسی دوستوں کے ساتھ تفریحی مقامات پر جاتی تھی۔ انہوں نے اکٹھے نارتھ سی اور اسکاربرگ کا دورہ بھی کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے اندر آزادی اور خود مختاری کا خوشگوار احساس ابھرنے لگا۔ وہ سوچتی تھی کہ اس نے اپنا شہر چھوڑ کر اچھا ہی کیا ورنہ ہمیشہ کنوئیں کا مینڈک بنی رہتی اور اس کے لیے وہ میڈم سیلی کی شکر گزار تھی۔

پھر اکتوبر کی وہ رات آئی جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ وہ معمول کے مطابق صبح میں سائیکل پر اسکول گئی۔ اس کے گھر سے اسکول کا فاصلہ صرف چار کلومیٹر تھا لیکن اگر تیز بارش اور ہوا چل رہی ہو تو یہ سفر کسی آزمائش سے کم نہ تھا۔

ایک بار پھر اسے سائیکل سے اتر کر پیدل چلنا پڑا۔ اس نے مضبوطی سے سائیکل کا ہینڈل پکڑ رکھا تھا اور تیز ہوا چلنے سے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ پانی پڑنے سے اس کا بیگ بھی گیلا ہو گیا تھا اس لیے اس نے اسے پلاسٹک میں لپیٹ کر سائیکل کے ہینڈل سے باندھ دیا۔ اس کا وہ دن بھی کچھ اچھا نہیں گزرا تھا۔ اس کے کچھ طالب علموں نے اس کی نرمی اور خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ خاص طور پر ان میں پندرہ سولہ لڑکوں کا ایک گروپ پیش پیش تھا۔ وہ جب کچھ پڑھاتی تو وہ پتھر کے مانند گونگے بہرے بن جاتے۔ پہلے روز تو وہ اسے خاموش بیٹھے دیکھتے رہے پھر آہستہ آہستہ وہ بدتمیزی پر اتر آئے۔ وہ اس کی نقل اتارتے اور بے عزتی کرتے۔ اسے شبہ تھا کہ وہ انگریزی میں اس کے بارے میں گندے لطیفے سناتے ہیں تاکہ پوری کلاس اس پر قہقہہ لگائے لیکن اس کی انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ ان لطیفوں کا مفہوم سمجھ سکتی۔

وہ چار بجے اسکول سے روانہ ہوئی۔ وہ کافی افسردہ اور مایوس تھی۔ اس روز اس کی بہت بے عزتی ہوئی تھی۔ اتفاق سے موسم بہتر ہو گیا تھا اور غیر متوقع طور پر ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی چنانچہ وہ بھی ترنگ میں آکر سائیکل کی سواری سے لطف اندوز ہونے لگی۔ راستے میں برکلے بینک تھا جو اس کے گھر کو جانے والی سڑک پر واقع تھا۔ اس نے بھی اپنا اکاؤنٹ وہیں کھول رکھا تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ سائیکل کھڑی کی۔ اس میں چین لاک لگایا اور بینک میں داخل ہو گئی۔ اس سے پہلے صرف دو گاہک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ جب اس کی باری آئی تو اس نے کیشیئر کو دو سو پچاس پاؤنڈ کا چیک دیا۔ وہ رقم کا لفافہ اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی کہ اس نے محسوس کیا کسی کی آنکھیں اس کی انگلیوں پر ہیں۔ کھڑکی کے باہر سے کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکی۔ اس کے بعد وہ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ وہ دبلا پتلا شخص تھا۔ اس نے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ہیٹ سے سر اور کان ڈھانپ رکھے تھے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سیدھی اس رقم پر تھیں۔

جب اس نے سائیکل کا تالا کھولا تو بھی سڑک کی دونوں جانب نظریں دوڑائیں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی اور خاموشی سے باقی فاصلہ طے کیا لیکن جب تک وہ گھر نہ پہنچ گئی، اسے چین نہیں آیا۔ وہ سائیکل سے اتری، گیٹ کھولا اور گھر کے

دائیں جانب چل دی۔ مس سوزن کی گاڑی پارکنگ لاٹ میں نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی گھر نہیں پہنچی۔ وہ ایک ویئر ہاؤس میں کام کرتی تھی اور عموماً چھ بجے سے پہلے اس کی واپسی نہیں ہوتی تھی۔

انجلی سائیکل شیڈ میں لے گئی اور اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ وہ سائیکل سے اپنا بیگ اتار رہی تھی کہ اس نے گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔ اس نے سوچا کہ اسے گیٹ مقفل کر دینا چاہیے تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس غلطی کا خمیازہ وہ ساری عمر بھگتے گی۔

وہ تعداد میں دو تھے۔ ان میں سے ایک وہی جیکٹ والا تھا جسے وہ بینک کے باہر دیکھ چکی تھی۔ دوسرا اس کے مقابلے میں بھاری بھرکم اور زیادہ عمر والا تھا۔ اس نے سیدھے ہاتھ میں ایک چاقو پکڑ رکھا تھا۔ انجلی کو لگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔

''رقم نکالو۔'' موٹے نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے سامنے چاقو لہرا رہا تھا۔

''رقم اس کے بیگ میں ہے۔'' جیکٹ والے نے کہا۔ وہ شیڈ کے دروازے میں کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔

موٹے نے ایک ہاتھ سے اس سے بیگ چھینا جسے وہ ابھی تک سینے سے لگائے ہوئے کھڑی تھی۔ اس نے بیگ کھول کر اس میں سے رقم کا لفافہ نکالا اور اسے اپنے ساتھی کی طرف اچھال دیا پھر وہاں سے جانے کے بجائے اس نے انجلی کو گردن سے پکڑا اور زبردستی اس کا بوسہ لے لیا۔

وہ فرانسیسی میں چلائی۔ ''نہیں ---- دور ہو جاؤ۔''

لیکن اس کا جوش اور بڑھ گیا۔ اس نے چاقو اس کی پسلیوں پر رکھا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ وہ دونوں ایسی انگریزی میں بات کر رہے تھے جو وہ نہ سمجھ سکی۔ دوسرے شخص نے شیڈ کا دروازہ بند کر لیا۔ اس طرح وہاں مکمل اندھیرا ہو گیا۔ یقیناً یہ ان کے منصوبے کا حصہ نہیں تھا اور وہ محض ڈکیتی کی نیت سے آئے تھے لیکن انجلی کو دیکھ کر ان کا ارادہ بدل گیا۔ ان کے لیے یہ ایک غیر متوقع بونس تھا۔ وہ بالکل تنہا ان کے رحم و کرم پر تھی اور اس الگ تھلگ مکان میں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

موٹا گھوم کر اس کے پیچھے گیا اور اسے اپنے بازوؤں سے پکڑ لیا پھر وہ اسے لیے ہوئے پیچھے کی جانب گرنے لگا۔ وہ زور سے چلائی۔

''چپ ہو جاؤ۔'' اس نے چاقو اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ جیکٹ والا اس کی طرف بڑھا اور اسے بے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ انجلی نے اپنے گھٹنے سے ضرب لگائی۔ اس نے جھلا کر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ موٹے نے چاقو کا دباؤ بڑھا دیا اور بولا۔

''اگر تم تعاون کرو گی تو ہم تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔''

چھوٹا شخص مسلسل اسے بے لباس کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ انجلی کو اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ اسے ان غنڈوں سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھا۔ ''مجھ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی جس کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے؟''

چھوٹا شخص اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ انجلی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس میں یہ منظر دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس آدمی کے ہاتھ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر رینگ رہے تھے۔ اس نے دوبارہ زوردار چیخ ماری اور اس کی گردن پر چاقو کا دباؤ مزید بڑھ گیا۔

اسی وقت شیڈ کا دروازہ کھلا اور مس سوزن اندر داخل ہوئی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا لیکن جب اسے محسوس ہوا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ حقیقت ہے تو پھر وہ اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ اس نے بیلچہ اٹھایا اور چھوٹے شخص کے پیچھے جا کر اس کے سر پر پوری قوت سے ضرب لگائی۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ شخص زمین پر گر پڑا۔ اس نے اس کی کمر اور کولہوں پر لاتیں ماریں اور بیلچے سے اس کے سر پر ضربیں لگائیں اور گالیاں دیتی رہی۔

موٹے نے انجلی کو چھوڑ دیا اور شیڈ کے کونے میں کھڑا تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے باوجود اس نے چاقو کا رخ سامنے کیا اور چلاتے ہوئے بولا۔

''رک جاؤ۔ تم اسے جان سے مار دو گی۔''

لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے دوست کو بچانے کے لیے آگے آتا اور جب مس سوزن آواز سن کر اس کی طرف پلٹی تو وہ دروازے کی طرف بھاگا۔ مس سوزن نے بیلچہ گھما کر اس کے ہاتھ پر مارا تو چاقو نیچے گر گیا۔ گو کہ اس کے ہاتھ پر چوٹ لگی تھی لیکن اس نے لپک کر دوسرے ہاتھ سے چاقو اٹھا لیا اور اپنی کلائی کو پکڑے ہوئے گالیاں بکتا ہوا بھاگ گیا۔ مس سوزن بیلچہ لے کر اس کے تعاقب میں گئی لیکن وہ اس کی پہنچ سے دور جا چکا تھا۔ وہ واپس شیڈ میں آ گئی۔

انجلی کھڑے ہو کر اپنا لباس درست کرنے لگی۔ اس

کی ٹانگیں بری طرح کپکپا رہی تھیں اور اس سے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔

''خطرہ ٹل گیا ہے میری جان۔'' مس سوزن نے اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔

وہ بہت دیر تک اس کے سینے میں سر دیے سسکیاں لیتی رہی۔ مس سوزن نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''سب ٹھیک ہے، کچھ نہیں ہوا۔ تم بالکل محفوظ ہو۔''

پھر انہوں نے اس شخص کی جانب دیکھا جو ان کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ مس سوزن نے جھک کر دیکھا۔ وہ پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کا پیٹ، سر کے بال اور لباس خون میں لت پت ہو گئے تھے۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں حیرت تھی لیکن ساتھ ہی ایک پیغام بھی تھا کہ میں مر چکا ہوں۔ مس سوزن نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

''اس کے پاس میری رقم ہے۔'' انجلی کو یاد آ گیا اور اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ لفافہ نکال لیا تاہم اس نے کوشش کی کہ اس کا چہرہ نہ دیکھ پائے۔

مس سوزن نے شیلف سے ایک ترپال اٹھائی اور لاش پر ڈال دی اور انجلی کو لے کر شیڈ سے باہر چلی گئی۔ دونوں عورتوں نے دن کا باقی وقت کچن میں گزارا۔ انجلی ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھی پھر بھی اس نے سوچا کہ انہیں پولیس کو اطلاع کر دینی چاہیے لیکن مس سوزن کو اس میں خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔

''تم نے دیکھا کہ میں نے اسے مار ڈالا؟''

''ہاں لیکن تم میرا دفاع کر رہی تھیں۔ اس وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔''

''اگر میں تمہیں بچانے کے لیے اس کے سر پر ایک یا دو ضربیں لگاتی تو اسے دفاع سمجھا جاتا۔ میں نے تو مار مار کر اس کا بھیجا باہر نکال دیا۔ میں جج کے سامنے اس کی وضاحت کس طرح کروں گی؟''

وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی لیکن پھر انہیں کیا کرنا چاہیے؟

''اس کا دوسرا ساتھی بھی تھا۔'' انجلی نے اعتراض اٹھایا۔ ''اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں کیا کرنے والے تھے۔ اس لیے وہ اپنی زبان بند رکھے گا۔ ویسے بھی اسے موقع نہیں ملا۔''

''نہیں۔ اس نے میرے ساتھ کچھ نہیں کیا۔'' انجلی بولی۔ ''تم وقت پر آ گئیں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

جب اس نے دوسری بار شکریہ ادا کیا تو اس کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنے لگے۔

''جا کر غسل کرو اور اپنا پسندیدہ میوزک سنو۔ باقی معاملات ہم رات کو طے کریں گے۔''

رات گئے مس سوزن نے انجلی کے دروازے پر دستک دی۔ ''میرا اندازہ تھا کہ ابھی تم نہیں سوئی ہو گی۔ کیا تم میری مدد کرنا چاہتی ہو؟ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم ضرور میرا ساتھ دو۔''

''میں آ رہی ہوں۔'' انجلی نے کہا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔''

مس سوزن نے اسے گارڈن میں بلا لیا۔ وہ دراصل ایک سرسبز مستطیل ٹکڑا تھا جس پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ یہ جگہ اس کے مکان کے عقب میں اور پڑوسی کے مکان کے درمیان میں تھی۔ پورے چاند کی روشنی نے اس جگہ کو منور کر دیا تھا۔

وہ دونوں عورتیں شیڈ میں پڑے ہوئے آدمی کو وہاں دفن کرنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ مس سوزن نے بالشت کی مدد سے اس کی لاش کی پیمائش کی اور اس کے حساب سے گڑھا کھودنے کے لیے نشان لگا لیا پھر وہ دونوں اس کام میں مصروف ہو گئیں لیکن انجلی کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا اور اس نے پہلے کبھی ایسا محنت طلب کام نہیں کیا تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے والی لڑکی تھی اور اس نے زندگی میں کبھی بیلچے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لہٰذا تھوڑی دیر بعد ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔

''رہنے دو۔'' مس سوزن بولی۔ وہ خود بھی پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔

''جاؤ، میرے لیے بیئر لے کر آؤ۔''

وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں اور مس سوزن بیلچہ چلانے میں بھی احتیاط سے کام لے رہی تھی کہ کہیں اس کی آواز سے پڑوسیوں کی آنکھ نہ کھل جائے۔ تھوڑی دیر بعد انجلی تین ٹھنڈی بیئر کی بوتلیں اور اوپنر لے کر واپس آ گئی۔

''میرا خیال ہے کہ گڑھے کی اتنی گہرائی کافی ہے۔'' اس نے مس سوزن سے کہا۔

''میں نہیں چاہتی کہ اگلے موسم بہار میں اس کے جسم کے اعضا میرے مالی کی ٹوکری میں نظر آئیں۔'' یہ کہہ کر مس سوزن نے زیادہ زور شور سے کھدائی شروع کر دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اتنی کھدائی کر چکی تھی کہ لاش کو.. بہ آسانی اس میں رکھا جا سکتا تھا۔ شیڈ میں مکمل اندھیرا تھا۔ وہ دونوں ٹٹولتی ہوئی لاش تک پہنچیں اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے باہر لے کر آئیں۔ گو کہ وہ اسے گھسیٹتی

ہوئی..... آخری آرام گاہ کی طرف لے جارہی تھیں کہ اچانک انجلی کو خیال آیا کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے، کیا وہ غیر معمولی نہیں ہے؟ لیکن اپنے اوپر ہونے والے حملے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک مختلف دنیا میں دھکیل دی گئی ہے اور اس کا یہ ردعمل فطری تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی اہم کام کر رہی ہے۔

اس شخص کو قبر میں اتارنے کے بعد مس سوزن نے اس کا چہرہ ایک چھوٹے تولیے سے ڈھانپ دیا اور نفرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیتی۔

''اس کا نام کیا تھا؟'' اس نے دوبارہ اپنا بیلچہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی۔'' انجلی نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟''

''ممکن ہے کہ تم نے دوسرے آدمی کو اس کا نام لیتے ہوئے سنا ہو؟''

''نہیں۔ مجھے یاد نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم اسے باب کہیں گے۔ چلو کام شروع کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے گڑھے کو بھرنا شروع کر دیا۔ انجلی بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس بار وہ پہلے کے مقابلے میں تازہ دم دکھائی دے رہی تھی اور بڑی مستعدی سے گڑھے کو بھرنے میں مس سوزن کی مدد کر رہی تھی۔ جب بھرائی مکمل ہوگئی تو انہوں نے اس جگہ کو مکمل طور پر ہموار کر دیا اور فالتو مٹی پورے باغ میں پھیلا دی۔ اب وہاں کسی گڑھے کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔

''چلو گھر چلتے ہیں۔'' مس سوزن نے کہا۔ ''ہمارا کام ختم ہوگیا۔''

کچن میں آکر دونوں نے برانڈی کا ایک ایک گلاس پیا۔ اس دوران میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی اور خاموش کھڑی رہیں۔ انجلی کو نیند آنے لگی۔ وہ اپنے کمرے میں جانا چاہ رہی تھی۔

''شب بخیر، مس سوزن۔'' اس نے کہا۔

''میں واقعی یہ سمجھتی ہوں کہ اب تم مجھے مس سوزن کہنا چھوڑ دو۔'' مکان کی مالکہ نے کہا۔ ''اس سے غیریت ٹپکتی ہے۔ اس کے بجائے تم مجھے میرے نک نیم پام سے پکارا کرو۔''

''شب بخیر پام!'' انجلی نے فوراً ہی تصحیح کر دی۔

''شب بخیر میری جان۔''

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ ایسی غریبی پر صبر کرنا جس میں عزت محفوظ ہو۔ ایسی امیری سے بہت بہتر ہے جس میں ذلت و رسوائی ہو۔

☆ وہ رزق کی فراخی جس میں شکر نہ ہو اور وہ معاشی تنگی جس میں صبر نہ ہو فتنہ بن جاتی ہے۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ نفرتوں کا سامنا ہمیشہ سچ بولنے والوں کو کرنا پڑتا ہے۔

☆ برا وقت وہ شفاف آئینہ ہے جو بہت سے چہروں سے میک اپ صاف کر کے ان کی اصل صورت دکھا دیتا ہے اور اچھا وقت وہ بادل ہے جو تیز دھوپ کو بھی روک کر سایہ مہیا کر دیتا ہے۔

☆ تو اللہ کی راہ میں اسے بھی دے جو اس کا مستحق ہے اور اسے بھی دے جو اس کا مستحق نہیں..... تو اللہ تعالیٰ تمہیں وہ بھی دے گا جس کا تو مستحق ہے اور وہ بھی دے گا جس کا تو مستحق نہیں۔

☆ درخت پر اوقات سے زیادہ پھل لگ جائے تو اس کی ٹہنیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ اسی طرح انسان کو اوقات سے زیادہ مل جائے تو وہ رشتوں کو توڑنا شروع کر دیتا ہے اور انجام کار درخت اپنے پھل سے محروم ہو جاتا ہے اور انسان اپنے رشتوں سے۔

☆ انسان کی جان نکل جائے تو زندہ نہیں رہتا اور اگر انسان کے دل سے احساس نکل جائے تو وہ انسان ہی نہیں رہتا۔

☆ کسی بھی چیز کی حد سے زیادہ خواہش بری ہی نہیں بلکہ مہلک ترین بھی ہے۔

☆ جو شخص زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔

☆ جو مذاق زیادہ کرتا ہے، لوگ اسے ہلکا اور بے حیثیت سمجھتے ہیں۔

☆ جو باتیں زیادہ کرتا ہے، اس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔

☆ جس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں، اس کی حیا کم ہو جاتی ہے۔

☆ جس کی حیا کم ہو جاتی ہے، اس کی پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے۔

☆ جس کی پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے، اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

اگلے روز صبح ساڑھے آٹھ بجے وہ معمول کے مطابق اپنی پہلی کلاس لے رہی تھی لیکن رات کی تھکاوٹ اور بے خوابی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ اس پر اس کے ایک شاگرد نے فقرہ کسا کہ شاید وہ پوری رات کسی پارٹی میں گزار کر آئی ہے۔ انجلی نے وقتی طور پر اس کی بدتمیزی کو نظر انداز کر دیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنی کرسی میں جھول رہا تھا تو انجلی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''سیدھے ہو کر بیٹھو۔''

اس لڑکے نے اس کی ڈانٹ پر توجہ نہ دی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر اس کے لہجے کا مذاق اڑانے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ اس کی نقل اتاری۔ دوسرے لڑکے بھی ہنسنے لگے۔ انجلی نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

''لڑکے، میری بات سنو۔ میں نے تمہارا بے ہودہ مذاق سمجھ لیا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ میں تمہاری زبان پوری طرح سیکھ چکی ہوں۔ تمہیں اس پر یقین کر لینا چاہیے۔ اس کے باوجود یوں لگتا ہے کہ تم میری زبان سمجھنے سے قاصر ہو۔ تم نے ابھی جو کہا اور اس سے پہلے جو کچھ کہتے رہے، وہ سب میں سمجھتی رہی ہوں۔ اس لیے تم اپنی چیزیں اٹھاؤ اور سب سے پیچھے جا کر بیٹھو اور اب تمہاری آواز نہ آئے۔ اسے میرے کان برداشت نہیں کر سکتے ورنہ میں پرنسپل سے تمہاری شکایت کروں گی اور ٹیچر پر فحش تبصرے کرنے کے الزام میں تمہارے مستقل اخراج کا مطالبہ کروں گی۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

انجلی نے گرامر یا تلفظ میں کوئی غلطی کیے بغیر بالکل صحیح اور سخت زبان میں بات کی تھی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے شاگردوں کے سامنے چار سے زیادہ لفظ ادا نہیں کیے تھے۔ ویسے بھی اسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ فرانسیسی کی کلاس میں وہ فرانسیسی ہی بولے گی۔ اس لیے اس کے شاگرد یہی سمجھتے رہے کہ ان کی ٹیچر کو انگریزی پر عبور نہیں ہے۔ اس لیے اسے یہ زبان بولنے میں دقت پیش آتی ہے۔ وہ بہت حیران ہوئے جب انہوں نے اسے اتنی اچھی انگریزی بولتے ہوئے سنا۔ اس لڑکے نے جواب دینا چاہا لیکن اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم سے اپنی زبان میں بات نہیں کی جا رہی؟''

اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ''کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''ہاں۔'' اس لڑکے نے کہا پھر اس نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور پچھلی قطار میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہر ایک کو یہ سزا مل سکتی ہے۔'' اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور دوبارہ فرانسیسی بولنے لگی۔

اس شام اسے خیال آیا کہ اسے انگلینڈ آئے ہوئے ایک مہینا ہو گیا ہے لیکن اس نے ابھی تک میڈم سیلی کو خط نہیں لکھا۔ وہ بہت دیر سے اپنے بیڈروم کی کھڑکی میں کھڑی اس تنگ مستطیل نما جگہ کو دیکھ رہی تھی جسے مس سوزن نے پتوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھ کر خط لکھنے لگی۔

''ڈیئر میڈم سیلی.....

مجھے خط لکھنے میں کچھ تاخیر ہو گئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ تم تو جانتی ہو کہ نئی جگہ پر سیٹ ہونے میں وقت لگتا ہے۔ سب سے پہلے میں اپنی رہائش گاہ کے بارے میں بتاتی ہوں۔ میرا قیام مس سوزن کے مکان میں اوپری منزل پر ہے جس کی کھڑکی سے ایک خوبصورت باغ نظر آتا ہے اور اس کے عقب میں.....''

اس کے بعد اس نے گھر اور باہر کی روزمرہ زندگی اور ساتھی ٹیچرز کے ساتھ تعلقات اور ہفتہ وار تفریح کا بھی ذکر کیا پھر اس نے اسکول میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں بتایا اور یہ کہ آہستہ آہستہ اس میں اعتماد آتا جا رہا ہے۔ اس نے خط کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا۔

''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں یہاں وہ کام کر رہی ہوں جنہیں کرنے کی فرانس میں ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں یہ ضرور کہوں گی کہ مس سوزن نے میری بہت اچھی تربیت کی ہے۔ وہ ایک توانا عورت ہے اور اس کے ساتھ رہ کر ہم وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے مجھے یہاں آنے کی تحریک دی۔ تمہاری انجلی۔''

اس نے کرسمس کی چھٹیاں فرانس میں گزاریں اور بہت سے لوگوں نے اس کے بارے میں تبصرہ کیا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ پُراعتماد نظر آ رہی ہے۔ واپس آنے کے بعد ایک بار پھر زندگی معمول پر آ گئی۔

یوب کو دفن کرنے کے بعد انجلی بہت زیادہ چوکس رہنے لگی تھی۔ اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اس کا ساتھی واپس نہ آ جائے۔ اس کی نظریں ہر وقت گردوپیش کا جائزہ لیتی رہتیں۔ چاہے وہ سڑک پر ہو، کسی دکان یا کھیل کے میدان میں۔ یہاں تک کہ چند روز اس نے ڈر کے مارے سائیکل بھی نہیں چلائی کہ وہ کہیں راستے میں اس پر

حملہ نہ کردے لیکن وہ موٹا کافی عرصے تک نظر نہیں آیا تو وہ بے فکر ہوگئی۔

ابھی موسم بہار شروع نہیں ہوا تھا کہ اس کے اندر بے یقینی کی کیفیت پھر لوٹ آئی۔ اس نے اکثر محسوس کیا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ کیفیت کئی روز رہی پھر اس نے اپریل کی ایک سہ پہر اسے دوبارہ دیکھا۔ بلاشبہ وہ جان چکا تھا کہ مس سوزن گھر پر نہیں ہے۔

انجلی کچن میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی جب وہ چائے کا کپ لے کر اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑی تو وہ دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے وہی چھ مہینے پہلے والی بدبو آرہی تھی۔ وہ جاقو ہاتھ میں لیے اس کی جانب بڑھا۔

''تم گھر میں اکیلی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

انجلی نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور سوچنے لگی کہ اب یہ رہے گا یا میں۔

''وہ کہاں ہے؟'' موٹے نے پوچھا۔

''کون؟'' وہ انجان بنتے ہوئے بولی۔

''تم جانتی ہو کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی غیر اخلاقی حرکت کرتا، انجلی نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے کہا۔ ''وہ باغ میں ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں؟''

وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

''میں تمہیں دکھاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ سائڈ بورڈ اور اس کے درمیان سے گزرنے لگی۔ عام طور پر مس سوزن کا بڑا دالا لکڑی کا سیلن نما رولر دراز میں ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ سائڈ بورڈ کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ انجلی نے اسے اٹھایا اور پوری قوت سے موٹے کی کنپٹی پر حملہ کیا۔ اسے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ جاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہ رہا انجلی نے اسی جگہ دوسرا وار کیا۔ وہ لڑکھڑایا اور فرش پر گر گیا۔ انجلی نے اپنی پیالی اٹھائی اور کمرے میں چلی گئی۔ مس سوزن کے آنے میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت باقی رہ گیا تھا۔

انہوں نے رات ہی میں موٹے آدمی کو بھی اس کے ساتھی کے برابر میں... دفن کر دیا۔ اس کی جسامت کو دیکھتے ہوئے انہیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ بڑا اور گہرا گڑھا کھودنا پڑا۔ چنانچہ مس سوزن نے تین اور انجلی نے دو بیئر کی بوتلیں پی ڈالیں کیونکہ اس بار اس نے بھی کھدائی میں حصہ لیا تھا۔ پہلے والی قبر پر گھاس اگ آئی تھی اور توقع تھی کہ گرمیوں سے پہلے یہ جگہ بھی ہری بھری ہو جائے گی۔

ایک سال پلک جھپکتے ہی گزر گیا اور انجلی فرانس واپس آگئی۔ اس نے دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کر دیا اور اچھے نمبروں کے ساتھ انگریزی میں ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے ماسٹرز کی تیاری شروع کر دی جس کا تھیسس لکھنے کے لیے اسے یونیورسٹی کی لائبریری میں بہت زیادہ وقت گزارنا پڑتا تھا جہاں وہ گھر کے مقابلے میں زیادہ لگن اور تندہی سے کام کر سکتی تھی اور اسے مطلوبہ کتابیں اور دستاویزات بھی آسانی سے حاصل ہو جاتیں۔

وہ خزاں کی ایک سہ پہر تھی۔ انجلی کام کرتے کرتے تھک گئی تو اس نے ایک چھوٹا سا وقفہ لیا اور وقت گزاری کے لیے ایک انگریزی میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اچانک اس کی آنکھیں ایک مضمون پر جم گئیں جس کا عنوان تھا..... ''ہل کی باغبان'' تصویر میں مس سوزن کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور وہ دو پولیس والوں کے ہمراہ کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انجلی کو اینٹوں والا مکان، سڑک اور اپنی مالک مکان کا پرانا کوٹ پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

اس مضمون کے مطابق علاقے میں کئی افراد کے پراسرار طور پر لاپتا ہونے کے بعد پولیس سرگرمی سے تحقیقات میں مصروف ہوگئی جس کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ ستاون سالہ مس پامیلا سوزن اب تک کم از کم سات افراد کو اپنے چھوٹے سے باغ میں دفن کر چکی ہے۔ وہ غیر شادی شدہ اور ایک ویئر ہاؤس میں ملازمت کرتی ہے۔ اس نے اپنے بیان میں اعتراف کیا کہ اس نے پہلا قتل تیس سال پہلے کیا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ اسے پہلی بار نوعمری میں جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ جنسی درندوں سے حساب کتاب چکانے میں لگ گئی۔ یہ ایک طرح کا مشن تھا جسے اس نے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ جب کبھی کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی یا اس کی کوشش ہوتی تو وہ اس کا بدلہ ضرور لیتی۔ یہ سارے قتل اس نے خود کیے اور اسے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

میگزین بند کرنے سے پہلے اس نے مس سوزن کی تصویر پر نظر ڈالی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو..... ''اپنا خیال رکھنا میری جان۔''

انجلی نے اپنا سر جھکا لیا اور بوجھل قدموں سے گھر آگئی۔

محفلِ شعر و سخن

❁ ریاض بٹ...... حسن ابدال
سوتی ہیں ان کی تہ میں کہ پتھر کے خبر
دل تو سمندروں سے بھی گہرے ہیں دوستو

❁ جاوید اختر رانا...... حیدرآباد
پردہ آنکھوں سے ہٹانے میں بہت دیر لگی
ہمیں دنیا نظر آنے میں بہت دیر لگی
نظر آتا ہے جو ویسا نہیں ہوتا کوئی شخص
خود کو یہ بات بتانے میں بہت دیر لگی

❁ زوہیب احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
پھیلی ہوئی ہے یاد کی گلیوں میں چاندنی
اک خواب اک خیال کا مہماں ہے خواب خواب

❁ عبدالجبار رومی انصاری...... بورے والا
تاج مانگا نہ تخت مانگا ہے
صرف تھوڑا سا وقت مانگا ہے
بھیک مانگی ہے چند لمحوں کی
بھکاری نے کب بخت مانگا ہے

❁ چلبلی ہیر...... جھنگ سٹی
نوکری، شاعری، گھربار، زمانہ، قدریں
اک محبت ہی کا آزار نہیں ہوتا...... یار......

❁ عبداللہ ترین...... کوئٹہ
شہنشاہوں کی چوکھٹ پہ سجدے نہیں کرتا میں......
مجھے نوازا ہے میرے اللہ نے میری اوقات سے بڑھ کر......

❁ محمد رشید سیال...... روہڑی، ضلع سکھر (سندھ)
میرا اس شہرِ عداوت میں بسیرا ہے فراز
جہاں لوگ سجدوں میں بھی لوگوں کا برا چاہتے ہیں

❁ وزیر محمد خان...... بٹل ہزارہ
دورِ گل رخصت ہوا، ہاتھوں میں پتھر رہ گئے
اس قدر بدلا زمانہ لوگ ششدر رہ گئے
جانے کیسے لوگ تھے جو نقشِ دائم بن گئے
آنکھ سے اوجھل ہوئے پر دل کے اندر رہ گئے

❁ آصف علی...... میرپور خاص
صاف کہہ دو اگر گلہ ہے کوئی
فیصلہ، فاصلے سے بہتر ہے

❁ ناظر خان...... پشاور
اتنے نخرے نہیں دیکھے جاتے
بھاڑ میں جائے محبت تیری

❁ عابد علی...... راولپنڈی
ہر حقیقت فریب لگتی ہے
جب کوئی اعتبار کھو بیٹھے

❁ محمد زریان سلطان...... کراچی
کتنے اُجلے دکھائی دیتے ہو
اتنے دن تک کہاں رہے ہو تم
بس مجھے دیکھتے ہی رہنے دو
منظروں سے بھرے ہوئے ہو تم

❁ بریرہ.....کراچی

برباد دلوں کا جائزہ لینے کے واسطے
وہ پوچھتے ہیں حال میرا کبھی کبھی

❁ وردہ جنید.....کراچی

کیوں مقبروں پہ زر کی چڑھاتا ہے چادریں
دے زندگی کے ننگے بدن پر لباس تو

❁ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی

اداسی کر کے اب تاریک مجھ کو
تری آنکھوں کا کاجل ہوگئی ہے
میں اپنے ہاتھ سے بھی کھو نہ جاؤں
تمہاری کھوج جنگل ہوگئی ہے

❁ یوسف علی.....سرگودھا

سمجھتا ہوں میں خود کو اور تنہا
وہ کہتا ہے محبت کر رہا ہے
ابھی کچھ دیر پلکیں مت جھپکنا
کوئی لمحہ عبادت کر رہا ہے

❁ مدحت.....کراچی

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

❁ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

جڑوں کو کاٹنے کا کہہ کے مٹی
بہت مشروط ہجرت کر رہی ہے
سنا ہے تیری خوشبو ہر گلی میں
ہواؤں سے شکایت کر رہی ہے

❁ عدیل احمد.....کراچی

رچی ہوئی ہے بدن میں مسافتوں کی تھکن
کچھ احتیاط سے اب تو گلے لگائیں مجھے
سماعتوں پہ صدا بار بن کے گزرے گی
جو ہو سکے تو اشارے ہی سے بلائیں مجھے

❁ کامران احمد.....کوئٹہ

سحر بھی آئی تو لائی اسی چراغ کی موت
جو ساری رات سسکتا رہا سحر کے لیے

❁ شاکر علی.....ملتان

آسماں سے مہ و خورشید اُتر آئے ہیں
ہیں دوست اور بھی میرے ادب کی دنیا میں

❁ فیاض ملک.....جھنگ سٹی

مجھے یہ چاندنی راتیں بہت بے کیف لگتی ہیں
جب آنکھوں میں ابھر آتا ہے تمہارا چاند سا چہرہ

❁ یوسف.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

آگہی کا خوف تو پھر آگہی کا خوف ہے
بے ارادہ بھی ترے ہاتھوں میں پتھر آئے گا
روشنی کی آس میں تو گھر کا دروازہ نہ کھول
تیرگی کا خوف سمٹے گا تو اندر آئے گا

❁ محمد طلحہ.....نارتھ کراچی

ستارے چپ ہیں مگر کچھ پتا تو دیتے ہیں
کوئی بھی سمت سہی راستہ تو دیتے ہیں
سلیم اتنی شناسائی بھی غنیمت ہے
گلی کے لوگ ہرا گھر بتا تو دیتے ہیں

❁ صبا سحر.....کراچی

ملے ہو تو جدا ہو جاؤ گے کیا
کوئی ہم پر سزا ہو جاؤ گے کیا
ذرا سی بات ہی تو درمیاں ہے
ذرا سی بات پر خفا ہو جاؤ گے کیا

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

تیری آواز آئی تھی مجھ کو
سُر کوئی پھیل گیا پانی میں

❁ ثاقب کمال.....کراچی

تیری تصویر پہ رکھی تھی طویل عرصے سے
میں نے جب آنکھ اٹھائی تو ستارہ نکلا

❁ نبیلہ خان.....پشاور

بگولوں کی طرح وحشت زدہ ہم
تجھے ہر سمت، ہر سو ڈھونڈتے ہیں

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

یہ اپنے خواب ہیں وہ زندگی ہے
چلو دیکھیں کدھر سچائیاں ہیں
جسے تم دیکھتے پہچانتے ہو
یہ میں کب ہوں مری پرچھائیاں ہیں

❁ شاہین تبسم.....پنڈی گھیب

ٹوٹ کر دور تک بکھرتا گیا
میں نے جب ٹوٹ کر محبت کی

❀ جہانگیر احمد ..... میرپور خاص
ایک سفر ہوگا انجان جزیروں کا
تم کو میرے خواب بلانے آئیں گے

❀ ممتاز خان ..... منڈی بہاؤالدین
زندگی کے سراب رستوں پر
زندگی کی تلاش جاری ہے

❀ محمود احمد ..... ٹنڈوالہیار
دھوپ نے تیز کرلیا خنجر
رات کے ساتھ ڈر رہا ہوں میں

❀ زبیر خان ..... لیہ
تیرے پیر کی مٹی ہم نے رکھ لی اپنی مٹھی میں
تیری آنکھیں، ہونٹ اور چہرہ لوگ اٹھا کر لے آئے ہیں

❀ امبر علی ..... میانوالی
بے ثباتی نے خوب شور کیا
جب کبھی آیا برا خیال مجھے

❀ جاوید خان ..... مری
تمہارا نام لب پر تھا بلندی سے گرا تھا جب
ہمارے دل کے ہونٹوں سے کوئی سسکی نہیں نکلی

❀ احمد علی ..... فیصل آباد
اصرار ہی کرتے ہو تو اپنا سمجھو
دینا ہی اگر ہے تو محبت دی جائے

❀ عالیہ خان ..... لاہور
ڈوبتی ناؤ جہاز کا رستہ کاٹ گئی
ساحل سے ٹکرا کے سمندر لوٹ گیا

❀ یاسر احمد ..... سبی
تُو کہاں لایا ہے مجھ کو ذات کے اندھے سفر
اپنی جانب لوٹنے کا راستہ کوئی نہیں

❀ نواز خان ..... سیالکوٹ
بوجھی ہیں اس نے کیسے نظر کی پہیلیاں
وہ شخص تو بلا کا نظر ناشناس تھا

❀ ناہید یوسف ..... اسلام آباد
ڈس گئے دیوار و در کو گہرے سناٹوں کا غم
حادثے چپ چاپ ہی سب گھر کے اندر ہوگئے

❀ محمد آذین رضوان ..... کراچی
عکس بینائی کا دشمن نکلا
آئینہ ٹوٹ گیا آنکھوں میں

❀ علیم احمد ..... گجرانوالہ
گئے نہیں مرے آنگن سے بارشوں کے نشاں
اگرچہ دھوپ کا احساس مجھ کو اب سے نہ تھا

❀ ناصر علی ..... رحیم یار خان
تیرے بارے میں کوئی رائے کہاں سے لاؤں
جھوٹ بولوں گا تو سچائی چلی جائے گی

❀ شکور احمد ..... چیچہ وطنی
اُسی کے دم سے تھے روشن مشامِ جاں میں چراغ
پھر اس کے بعد کبھی محفلیں سجائیں نہیں

❀ عاصم خان ..... اسلام آباد
سفر کا نشہ جو اترا تو یہ کھلا مجھ پر
تری طلب میں، میں اپنی طرف روانہ تھا

❀ رضا علی ..... چنیوٹ
کوئی پہچانتا نہ تھا مجھ کو
گرد چہرے پہ رہگذر کی تھی

❀ مہتاب احمد ..... حیدرآباد
سمندر سے کبھی ہم آغوش ہوکر
عجب دریا ہے پیاسا رہ گیا ہے

❀ عمران شیروانی ..... حیدرآباد
آسودگی میں بھی کوئی ناخوش رہا بہت
کوئی تباہیوں میں بھی اپنی خوشی سے تھا

❀ شاہد خان ..... سکھر
کھا کر شکست تم کو بچایا ہے ہار سے
دل کھول کر تو آج دعا دیجیے مجھے

کوپن برائے شمارہ اپریل 2019

مُحفلِ شِعر و سُخن

نام: --

پتا: --

کبھی کبھی سچ کہہ کر بھی انسان بہت بری طرح پھنس جاتا ہے۔ اسی لیے اس نے اصل بات اپنے سائے سے بھی چھپا کر رکھی... ورنہ اپنے محبوب کے بجائے وہ خود جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتی کیونکہ انجانے میں اس سے جو جرم سرزد ہو چکا تھا اس کی وجہ بھی تو اس کا محبوب ہی تھا... اگرچہ وہ اصل حقیقت سے واقف نہ تھا مگر اس کی محبت میں ہی اس سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔

ایک قاتل محبوبہ کا قصہ جسے محبوب سے جدائی کا کوئی غم نہ تھا

اصل بات

ثمر عباس

ڈونی یہ سن کر بہت ناراض ہوا جب مونیکا نے فون کر کے اسے بتایا کہ وہ گیارہ بجے سے پہلے اس کے ساتھ نہیں جا سکے گی۔ اس کی جگہ آنے والا لڑکا بیمار ہو گیا تھا لہٰذا مسٹر بیکسٹر نے اس کی ڈبل ڈیوٹی لگا دی تھی۔ بیکسٹر جانتا تھا کہ وہ کبھی انکار نہیں کرے گی اور وہ اس کا ہمیشہ فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ اسٹیوارٹ کی دکان پر کام کرتی تھی۔ جب کبھی کوئی غیر حاضر ہوتا تو اس کی جگہ کام کرنے کے لیے اسی کو بلایا جاتا اور ڈونی کو یہی بات کھٹکتی تھی۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ دکان پر زیادہ وقت گزارتی تھی جبکہ اس کے پاس ڈونی اور اپنے بچے کے لیے بہت کم وقت تھا بلکہ اس نے کبھی اس پر احتجاج بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اسے یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ اسٹور پر جا کر بیکسٹر کے سامنے کچھ اس طرح کے چبھتے ہوئے جملے کہے جیسے مونیکا کتنی تھکی ہوئی لگ رہی ہے یا اس نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے..... صرف بیکسٹر کو یہ جتانے کے لیے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور اسے پسند نہیں کرتا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ مونیکا کسی بھی طرح کے جھگڑے کو پسند نہیں کرتی تھی۔

خاص طور پر وہ جس میں اسے شامل کیا جائے اور وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ڈونی خود بھی لڑائی جھگڑے سے دور رہتا تھا۔

اس نے جیسے تیسے وقت گزارا اور گیارہ بجے اسے لینے کے لیے روانہ ہوگیا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہوچکی تھی۔ یہ دسمبر کے ابتدائی دن تھے لیکن ہوا خاموش اور سرد تھی۔ گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گو کہ اسے پارک کے کونے میں کوئی جاتا ہوا دکھائی دیا۔ شاید وہ کوئی جوڑا تھا۔ اس وقت اس کے اندر احساسِ برتری کی لہر ابھری۔ خاموش جھیل پر اس کے کزن کا کیمپ تھا جہاں وہ مونیکا کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اسے ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ وہ نوجوان جوڑوں کی طرح اِدھر اُدھر چھپتا پھرے۔

مونیکا اپنی دادی اور چھوٹے بیٹے کے ساتھ پرتھ روڈ پر واقع ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ جب ڈونی وہاں پہنچا تو وہ اسے پورچ میں ہی مل گئی۔ وہ اس ڈر سے اندر نہیں گئی کہ اگر اس کا بیٹا اٹھ گیا تو اسے دوبارہ سلانا مشکل ہوجائے گا لیکن اس کی دادی کے پاس نہ جانے کیا جادو تھا کہ وہ اسے منٹوں میں تھپک تھپک کر سلا دیتی تھی۔

ڈونی کار سے باہر آیا اور اسے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ مونیکا کی آنکھوں میں حیرت اور خوشی تھی جیسے اسے ڈونی کے آنے کی امید نہ ہو۔ اس کی دعا قبول ہوگئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ایک سال سے باہر جارہی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کا اسی طرح انتظار کیا کرتی تھی اور اسی لیے وہ اب بھی اس پر فدا تھا۔ کسی نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ابھی تک اسٹیوارڈز کا یونیفارم پہن رکھا تھا اور قمیص پر دائیں جانب اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ڈونی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اس سے لپٹ گئی۔

اس کا قد چھوٹا تھا جبکہ ڈونی طویل قامت تھا۔ وہ... بہ مشکل تمام اس کی ٹھوڑی تک پہنچ رہی تھی۔ ڈونی نے ایک دفعہ اسے زور سے بھینچا اور بارش سے بچنے کے لیے کار میں جا کر بیٹھ گیا لیکن مونیکا ابھی تک کار کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے چہرہ آسمان کی طرف کیا اور بولی۔ ''بس ایک منٹ۔''

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

''چشمے کے شیشے صاف کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ اتنے دھندلے ہوگئے ہیں کہ کچھ نظر نہیں آرہا۔'' یہ کہہ کر اس نے چشمہ اتارا اور پلٹ کر شیشے گیلے کرنے لگی پھر وہ کار میں بیٹھ گئی اور اپنی قمیص سے انہیں خشک کرنے لگی۔ جب اس نے چشمہ لگایا تو بولی۔

''یہ تو اور خراب ہوگئے۔ میں بھول گئی تھی کہ میری قمیص پر ملک شیک لگا ہوا ہے۔''

''میں نے کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ بلینڈر کا ڈھکنا مضبوطی سے بند کیا کرو۔'' اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔ اس نے کہا اور چشمہ لے کر اپنی قمیص سے صاف کرنے لگا پھر اس کا معائنہ کیا اور دوبارہ اس کے چہرے پر لگا دیا۔

مونیکا نے چاروں طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم تو اس کام میں ماہر ہو۔''

کار کو سڑک پر لاتے ہوئے ڈونی نے کہا۔ ''دیکھتے ہیں کہ یہ بے بی کیا کرتی ہے۔'' یہ فقرہ وہ مذاق میں کہا کرتے تھے کیونکہ اس کی پرانی نیلے رنگ کی ٹویوٹا زیادہ دور نہیں جاسکتی تھی اور وہ دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ اس نے مونیکا سے کہا کہ وہ میٹ سن کی دکان پر رکنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے لیے چھ بوتلوں کا کارٹن خرید سکے۔ وہ خود ابھی اکیس سال کا نہیں ہوا تھا جبکہ مونیکا کی عمر اس سے زیادہ تھی پھر ڈونی کو ایک اور بات یاد آگئی۔ اس نے کہا۔

''سنو..... اگر اگلی بار بیکسٹر تم سے ڈبل ڈیوٹی کرنے کے لیے کہے تو صاف انکار کر دینا۔''

مونیکا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور دوبارہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں ایسا نہیں کرسکتی۔''

''یقیناً تم ایسا کرسکتی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''بس ایک دفعہ ہمت کرنے کی ضرورت ہے۔''

میٹ سن، اس علاقے میں واحد گیس اسٹیشن اور اسٹور تھا جو نصف شب تک کھلا رہتا تھا۔ اس نے کار اندر موڑلی۔ پارکنگ لاٹ میں صرف اینڈریا کی کار کھڑی ہوتی تھی جو وہاں کلرک کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس نے اپنی کار پارکنگ لاٹ کے آخری حصے میں کھڑی کردی۔ اس کا رخ فائر ہاؤس کی جانب تھا۔

کار سے اترتے ہوئے مونیکا نے پوچھا کہ اسے بیئر کے علاوہ کچھ اور چاہیے تو اس نے منع کر دیا۔ وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ کوئی نمکین چیز لے لوں۔''

''پی نٹ بٹر۔'' اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔ وہ اسے اسٹور میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے وقت گزاری کے لیے ریڈیو لگا دیا لیکن وہاں بھی اسے کوئی پسندیدہ گانا سننے کو نہیں ملا۔ سڑک پر سے ایک ٹریکٹر ٹرالی گزری اور سیاہ دھواں چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے ریڈیو بند کر دیا اور مونیکا کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ نہ جانے کہاں رہ گئی تھی۔

یہ دسمبر کے ابتدائی دن تھے لیکن ہوا خاموش اور سرد تھی۔ گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گو کہ اسے پارک کے کونے میں کوئی جاتا ہوا دکھائی دیا۔ شاید وہ کوئی جوڑا تھا۔ اس وقت اس کے اندر احساسِ برتری کی لہر ابھری۔ خاموش جھیل پر اس کے کزن کا کیمپ تھا جہاں وہ مونیکا کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اسے ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ وہ نوجوان جوڑوں کی طرح اِدھر اُدھر چھپتا پھرے۔

مونیکا اپنی دادی اور چھوٹے بیٹے کے ساتھ پرتھ روڈ پر واقع ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ جب ڈونی وہاں پہنچا تو وہ اسے پورچ میں ہی مل گئی۔ وہ اس ڈر سے اندر نہیں گئی کہ اگر اس کا بیٹا اٹھ گیا تو اسے دوبارہ سلانا مشکل ہوجائے گا لیکن اس کی دادی کے پاس نہ جانے کیا جادو تھا کہ وہ اسے منٹوں میں تھپک تھپک کر سلا دیتی تھی۔

ڈونی کار سے باہر آیا اور اسے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ مونیکا کی آنکھوں میں حیرت اور خوشی تھی جیسے اسے ڈونی کے آنے کی امید نہ ہو۔ اس کی دعا قبول ہوگئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ایک سال سے باہر جارہی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کا اسی طرح انتظار کیا کرتی تھی اور اسی لیے وہ اب بھی اس پر فدا تھا۔ کسی نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ابھی تک اسٹیوارڈز کا یونیفارم پہن رکھا تھا اور قمیص پر دائیں جانب اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ڈونی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اس سے لپٹ گئی۔

اس کا قد چھوٹا تھا جبکہ ڈونی طویل قامت تھا۔ وہ... بہ مشکل تمام اس کی ٹھوڑی تک پہنچ رہی تھی۔ ڈونی نے ایک دفعہ اسے زور سے بھینچا اور بارش سے بچنے کے لیے کار میں جا کر بیٹھ گیا لیکن مونیکا ابھی تک کار کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے چہرہ آسمان کی طرف کیا اور بولی۔ ''بس ایک منٹ۔''

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

''چشمے کے شیشے صاف کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ اتنے دھندلے ہوگئے ہیں کہ کچھ نظر نہیں آرہا۔'' یہ کہہ کر اس نے چشمہ اتارا اور پلٹ کر شیشے گیلے کرنے لگی پھر وہ کار میں بیٹھ گئی اور اپنی قمیص سے انہیں خشک کرنے لگی۔ جب اس نے چشمہ لگایا تو بولی۔

کا معائنہ کیا اور دوبارہ اس کے چہرے پر لگا دیا۔

مونیکا نے چاروں طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم تو اس کام میں ماہر ہو۔''

کار کو سڑک پر لاتے ہوئے ڈونی نے کہا۔ ''دیکھتے ہیں کہ یہ بے بی کیا کرتی ہے۔'' یہ فقرہ وہ مذاق میں کہا کرتے تھے کیونکہ اس کی پرانی نیلے رنگ کی ٹویوٹا زیادہ دور نہیں جاسکتی تھی اور وہ دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ اس نے مونیکا سے کہا کہ وہ میٹ سن کی دکان پر رکنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے لیے چھ بوتلوں کا کارٹن خرید سکے۔ وہ خود ابھی اکیس سال کا نہیں ہوا تھا جبکہ مونیکا کی عمر اس سے زیادہ تھی پھر ڈونی کو ایک اور بات یاد آگئی۔ اس نے کہا۔

''سنو..... اگر اگلی بار بیکسٹر تم سے ڈبل ڈیوٹی کرنے کے لیے کہے تو صاف انکار کر دینا۔''

مونیکا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور دوبارہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں ایسا نہیں کرسکتی۔''

''یقیناً تم ایسا کرسکتی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''بس ایک دفعہ ہمت کرنے کی ضرورت ہے۔''

میٹ سن، اس علاقے میں واحد گیس اسٹیشن اور اسٹور تھا جو نصف شب تک کھلا رہتا تھا۔ اس نے کار اندر موڑلی۔ پارکنگ لاٹ میں صرف اینڈریا کی کار کھڑی ہوتی تھی جو وہاں کلرک کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس نے اپنی کار پارکنگ لاٹ کے آخری حصے میں کھڑی کردی۔ اس کا رخ فائر ہاؤس کی جانب تھا۔

کار سے اترتے ہوئے مونیکا نے پوچھا کہ اسے بیئر کے علاوہ کچھ اور چاہیے تو اس نے منع کر دیا۔ وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ کوئی نمکین چیز لے لوں۔''

''پی نٹ بٹر۔'' اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔ وہ اسے اسٹور میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے وقت گزاری کے لیے ریڈیو لگا دیا لیکن وہاں بھی اسے کوئی پسندیدہ گانا سننے کو نہیں ملا۔ سڑک پر سے ایک ٹریکٹر ٹرالی گزری اور سیاہ دھواں چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے ریڈیو بند کر دیا اور مونیکا کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ نہ جانے کہاں رہ گئی تھی۔

Leave a comment
Previous 1 ... 161 162 163 ... 280 Next
Copyright © All rights reserved.
Book by UU Novels

وہ خالی ہاتھ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی اور اس نے دروازے کی ناب کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس طرح جھکی جیسے اسے ابکائی آرہی ہو۔

''کیا ہوا؟'' وہ اس کی جانب تیزی سے لپکا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا کہ اسے قے نہ آجائے لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ کوشش کے باوجود اسے نہ روک سکی۔ ڈونی نے اس کی کمر سہلائی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ دونوں نیچے دیکھ رہے تھے۔ اس کی جینز پر کچھ لگا ہوا تھا اور کچھ چھینٹے اس کے جوتوں کے تسموں پر بھی گئے تھے۔ مونیکا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ اسے صاف کرنے لگی پھر اسے کچھ یاد آگیا اور وہ دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ''اینڈریا.....''

وہ بوڑھی عورت بیئر کولر کے پاس ساکت پڑی ہوئی تھی۔ آلو کے چپس کی ایک تھیلی بھی اس کے پاس ہی فرش پر گری ہوئی تھی۔ ڈونی اس کی نبض دیکھے بغیر بتا سکتا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ناخن چبانے لگا۔ مونیکا پیچھے ہٹی اور دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنا پرس ٹٹولنے لگی۔ وہ اس کے پاس گیا لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور مسلسل پرس ٹٹولتی رہی۔

''مجھے میرا فون نہیں مل رہا۔'' شاید وہ ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو چکی تھی۔

''جب تم نے اسے دیکھا تو کیا یہ اسی حالت میں تھی؟'' ڈونی کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔ ''کیا ہوا تھا؟'' اس نے گیس پمپ کے پیچھے سنسان سڑک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاید دل کا دورہ پڑا ہے۔''

''کیا تمہارے پاس فون ہے؟'' اس نے ڈونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں نو گیارہ کو فون کرنا ہوگا۔ ہمیں کچھ کرنا ہے۔''

''کچھ کرنا ہے۔'' یہ سنتے ہی اچانک اسے تحریک ہوئی۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا کاؤنٹر کے پیچھے گیا۔ جیبی چاقو کی مدد سے کیش کی دراز کھولی اور سارے نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے اور جلدی سے مونیکا کے پاس آگیا۔ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ ابھی تک اپنا پرس ٹٹول رہی تھی۔ ڈونی اسے لے کر کار تک آیا اور گنگناتے ہوئے بولا۔ ''دیکھیں یہ بے بی ہمیں کہاں لے جاتی ہے۔''

اس کی کار کا رخ جھیل پر واقع کیمپ کی طرف تھا۔ بوڑھی عورت کی موت سے پہنچنے والا صدمہ اب بے حسی میں تبدیل ہو چکا تھا جبکہ مونیکا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ ڈونی نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل ہچکیاں لے رہی تھی۔ ڈونی نے کہا۔ ''بس بھی کرو۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے سانس روکی اور دوبارہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''بے چاری اینڈریا۔''

''وہ بوڑھی تھی۔'' ڈونی بولا۔ ''اور بوڑھے لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔''

کچھ دور جانے کے بعد اس کی ہچکیاں تھم گئیں اور وہ قدرے پُرسکون لگی۔ اس نے ڈونی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم وہاں کیا کر رہے تھے؟''

ڈونی نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹائیں اور اس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔ وہ بولی۔ ''جب تم کاؤنٹر کے پیچھے گئے تھے؟''

''میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ مر چکی ہے تاکہ ہمیں ایمبولینس بلانے کی ضرورت نہ پڑے۔''

مونیکا نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔ ''بے چاری اینڈریا۔''

کافی دور جانے کے بعد وہ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے تو اچانک ہی اینڈریا کی لاش اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے بوڑھے رشتے داروں کو مرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ سب تابوت میں ہوتے تھے۔ اس نے ہلکی سی جھرجھری لی اور کار کو جھیل کی جانب جانے والی سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہوگا کیونکہ مجھے وہاں فون نظر نہیں آیا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کا سر راستے میں رکھی ٹرے سے ٹکرایا تھا۔'' مونیکا نے کہا۔

وہ محویت کے عالم میں کار چلا رہا تھا اور مونیکا کا ہاتھ اس کی ران پر تھا۔ اسے اپنے جسم میں سنسنی محسوس ہونے لگی پھر اس کے ہاتھ نے حرکت کی اور اس کی جینز کی جیب تک پہنچ گیا جہاں نوٹوں کی گڈی رکھی ہوئی تھی۔

''بتاؤ تم نے کیا کیا ہے؟'' مونیکا نے ایک بار پھر پوچھا۔

''بتا دوں گا۔'' اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

مونیکا نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور بولی۔ ''تم نے وہاں سے پیسے چرائے ہیں؟''

وہ کچھ نہیں بولا۔ شاید وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکتا تھا حالانکہ وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ دونوں کئی برسوں سے اس اسٹور میں خریداری کر رہے تھے۔ انہوں نے اب تک وہاں جو خرچ کیا، اس کا بہت چھوٹا سا حصہ اس نے واپس لیا ہے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اسٹور کا مالک میٹ سن بہت امیر

شخص ہے۔ وہ قیمتی کار میں گھومتا ہے اور عمدہ قسم کے سگار پیتا ہے۔ اتنی چھوٹی سی رقم کے چوری ہوجانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور یہ کہ انشورنس کمپنی یہ نقصان پورا کردے گی لیکن اسے یہ سب کہنے کا موقع نہیں ملا۔

''تم نے کتنے پیسے چرائے ہیں؟'' مونیکا نے پوچھا۔

اس نے کیمپ کے پاس جاکر کار روکی۔ یہ جگہ اس کے کزن راجر کی ملکیت تھی جو اس نے ڈونی کو استعمال کرنے کے لیے دے رکھی تھی۔ اس کے بدلے میں وہ وہاں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ یہ دراصل دو عارضی جھونپڑیاں تھیں جو ایک پرانے خستہ حال ٹریلر کے دونوں جانب بنائی گئی تھیں۔ اس میں ایک چھوٹا سا کچن، ایک صوفہ، ٹیلی وژن اور ایک بیڈ موجود تھا۔ انہوں نے کار سے اترنے سے پہلے رقم گنی۔ کل ایک سو سینتالیس ڈالرز تھے۔ یہ رقم اس کی توقع سے بہت کم تھی تاہم وہ مایوس نہیں ہوا۔ البتہ اس کے دل میں یہ خواہش ضرور ابھری کہ کاش یہ رقم اس سے کہیں زیادہ ہوتی۔

مونیکا نے ایک گہری سانس لی اور اپنا سر ڈونی کے کندھے پر رکھ دیا۔ کار اب بھی آہستہ چل رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا اور بولی۔ ''کیمرے کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

ڈونی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس نے تو خفیہ کیمرے کے بارے میں ایک دفعہ بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں ایک کونے میں شیلف کے اوپر کیمرا نصب ہے لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ کام نہیں کرتا۔ کیا اینڈریا نے اسے ایک دفعہ نہیں بتایا تھا کہ یہ صرف دکھانے کے لیے لگا ہوا ہے؟ اس نے مونیکا سے پوچھا۔ ''کیا وہ کیمرا کام کرتا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ کرتا ہوگا۔ ایسی جگہوں پر کیمرے کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔''

☆☆☆

جب مونیکا اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تو وہ ایک درخت پر کام کر رہا تھا۔ یہ واقعی پہلی نظر کی محبت تھی۔ البتہ اسے یہ یاد نہیں کہ وہ کون سا درخت یا کون سا دن تھا۔ اس نے کچھ عرصہ قبل ہی جیسی ٹری سروس میں کام کرنا شروع کیا تھا اور وہ پرتھ روڈ کے آخری سرے پر درختوں کی تراش خراش کر رہے تھے جہاں مونیکا رہتی تھی۔ گو کہ اس وقت ڈونی کو یہ بات معلوم نہیں تھی اور نہ ہی وہ مونیکا کو جانتا تھا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی کی نگاہوں کا مرکز بن گیا ہے۔

ایک روز وہ صبح کے وقت کافی لینے اسٹیوارٹز گیا تو مونیکا بولی۔ ''میں نے تمہیں درخت کاٹتے دیکھا ہے۔ میرے خدا! تم تو بہت بہادر ہو۔''

اس کی شرمیلی مسکراہٹ، ستائشی نظریں اور معصوم انداز اس کے دل میں ہلچل مچانے لگا۔ اسے لگا کہ وہ بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ اس کی عمر انیس سال تھی۔ اس کی جلد ریگ مال کی طرح کھردری اور چہرہ ایک طرف سے چپٹا تھا اور اس جانب رخسار کی ہڈی دبی ہوئی تھی۔ اسی لیے اس کی بہن روز میری اسے بدصورت ہونے کا طعنہ دیا کرتی تھی۔ اس نے کبھی اس کی بہادری کو نہیں سراہا بلکہ درختوں میں کام کرنے کو اس کی حماقت سمجھتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے خود بھی اپنے آپ کو کبھی بہادر نہیں جانا اور نہ ہی وہ کوئی خطرہ مول رہا تھا۔

اس نے مونیکا کو بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اسے دنیا کا بہادر ترین شخص سمجھتی ہے۔ اس کے احساس دلانے پر وہ خود بھی اس پر یقین کرنے لگا تھا۔ گو کہ اس رات اس نے جو خواب دیکھا، اس میں یہ یقین چکنا چور ہوگیا۔

اس رات محبت بھرے لمحات گزارنے کے بعد بھی اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ بہرحال ٹریلر کی چھت پر ٹپکنے والی بارش کی بوندوں کے جلترنگ سے اسے کچھ سکون ملا اور بالآخر وہ گہری نیند سوگیا۔ اس نے خواب میں ایک ویڈیو دیکھی جو ایک تاریک کمرے کی اسکرین پر چل رہی تھی اور اسے دیکھنے والوں میں پولیس آفیسرز اور سراغ رساں بھی شامل تھے۔ اس میں ایک اسٹور کا اندرونی منظر دکھایا گیا تھا (بلاشبہ وہ میٹ سن کا اسٹور ہی تھا) اور ایک طویل قامت شخص مشتبہ انداز میں درمیانی راستے سے گزر رہا تھا۔ سراغ رسانوں اور اس نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا جیسے وہ اس پراسرار شخص کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ڈونی سانس روکے سراغ رسانوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ کب اسے شناخت کرتے ہیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ مسلسل اسکرین پر نظریں جمائے رہے پھر ان کی دلچسپی ختم ہوگئی لیکن ان کے اٹھنے سے پہلے اسکرین پر ایک چہرہ نمودار ہوا..... وہ اینڈریا تھی۔

مونیکا کی چیخ سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ ''ڈونی۔''

وہ فرش پر کیوں پڑی ہوئی تھی؟ ڈونی نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''تم نے مجھے بستر سے دھکا دیا ہے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''تم نے چیخ ماری اور مجھے دھکا دے دیا۔''

''میں نے دھکا دے دیا؟'' وہ تعجب سے بولا۔
''ہاں۔تم نے مجھے لات بھی ماری۔''

وہ بستر سے اتر کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس کا دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا، میں خواب دیکھ رہا تھا۔ تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟''

وہ بہت دیر تک اس کا ہاتھ تھامے فرش پر بیٹھا رہا پھر وہ دوبارہ بستر پر آ گئے۔ وہ اس سے لپٹ کر لیٹ گئی۔ وہ اس کا سر، بازو، گردن اور کمر سہلاتا رہا۔ کافی دیر بعد وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور دوبارہ نیند کی وادی میں کھو گئے۔

دوسری صبح آسمان صاف ہو چکا تھا۔ مونیکا کی نیند ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہی ڈونی کا ہاتھ پکڑا اور اونگھنے لگی۔ ڈونی کو کافی کی طلب ہو رہی تھی لیکن وہ راستے میں کہیں نہیں رک سکتے تھے۔ مونیکا چاہتی تھی کہ بیٹے کے جاگنے سے پہلے گھر پہنچ جائے۔

مونیکا کے گھر میں داخل ہوتے وقت ڈونی نے سانس روک لی۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا، وہ کس بات کی توقع کر رہا تھا؟ کوئی ہلچل، جوش وخروش، سائرن کی آواز وغیرہ۔ اس کا خواب ابھی تک اس کے ساتھ تھا۔ کچن سے کافی کی خوشبو آ رہی تھی۔ ڈونی کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور ٹانگیں پھیلا دیں۔ وہ اپنے ذہن کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تبھی اس کے کانوں میں مونیکا کی آواز آئی۔ وہ دادی سے پوچھ رہی تھی کہ کیا اس کا بیٹا ٹریور جاگ گیا ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ ہاں اس نے کچھ ہل جل کی آواز سنی ہے۔ دادی کا اصلی نام جونیتا تھا لیکن سب اسے نیلی کہہ کر پکارتے تھے۔ اسے تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ ڈونی نے آنکھیں کھولیں تو اسے دیوار پر پانچ چھ تصویریں آویزاں نظر آئیں۔

مونیکا اس کے لیے کافی لے کر آئی۔ ٹریور دوڑتا ہوا آیا اور ڈونی کی ران پر بیٹھ گیا۔ اس کے ننھے سے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی ماں کو بالکل نظر انداز کر دیا جیسے وہ وہاں تھی ہی نہیں۔ ڈونی نے مونیکا کے چہرے پر ایک تکلیف دہ تاثر دیکھا۔ شاید وہ اس کی عادی تھی۔

جب وہ گھر پہنچا تو اسے بدلا ہوا ماحول نظر آیا۔ روز میری اور اس کی ماں دروازے کے سامنے میز پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں نے اسے گھور کر دیکھا پھر اس کی بہن بولی۔
''کیا تم نے اینڈریا کے بارے میں کچھ سنا؟''
''اسے کیا ہوا؟'' اس نے اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''وہ مردہ حالت میں پائی گئی ہے۔'' انہوں نے اسے وہی بتایا جو وہ اب تک سن چکی تھیں اور اس میں ڈونی کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان کے کہنے کے مطابق اس کی لاش فریڈ جانسن نے دریافت کی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ رات دو بجے بھی اسٹور کی لائٹ جل رہی تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ریاستی پولیس اور شیرف ابھی تک وہیں تھے اور جائے وقوعہ کے گرد زرد فیتہ باندھ دیا گیا تھا۔ روز میری دیکھنے کے لیے وہاں گئی تھی۔ وہ ابھی تک اس واقعے کی تفتیش کر رہے تھے۔ اس کے دل میں بے اختیار یہ جاننے کی خواہش جاگی کہ وہاں خفیہ کیمرا کام کر رہا ہے یا نہیں لیکن اس نے سختی سے اپنے آپ کو روک لیا۔ وہ مونیکا والی غلطی نہیں دہرانا چاہتا تھا جو اس نے نیلی سے پوچھ کر کی تھی جبکہ نیلی یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہاں کوئی کیمرا بھی ہے۔
''اسے کیا ہوا تھا...... کیا انہیں کچھ معلوم ہے یہ کوئی حادثہ تھا یا کچھ اور؟''
''میں نہیں جانتی اگر یہ محض حادثہ ہوتا تو وہ رات بھر وہاں کیوں رکتے؟''
''اگر یہ کوئی ڈاکا زنی یا کوئی اس جیسی واردات ہے تو وہاں یقیناً کیمرا لگا ہوا ہوگا۔'' ڈونی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔
''ہونہہ...... وہ کیمرا۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔
''روز میری!'' ماں نے اسے ڈانٹا۔
''معاف کرنا مام۔'' روز میری بولی۔ ''وہ کیمرا برسوں سے کام نہیں کر رہا ہے، وہ صرف دکھانے کے لیے ہے۔''
ڈونی کرسی کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔ ''اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کبھی کچھ نہ جان سکیں گے۔''
''وہ جان لیں گے۔'' ماں نے کہا۔ ''انہیں ہمیشہ مطلوبہ شخص مل جاتا ہے۔ جرم کبھی چھپتا نہیں۔''
ڈونی ان دونوں کو بحث کرتا چھوڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کی نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔
''تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟'' روز میری نے کہا جو اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔
''کچھ نہیں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''
''تمہارا چہرہ کسی بھوت کی طرح سفید ہو رہا ہے۔''
''میں نے کچھ نہیں کیا؟''
''یہ میں کب کہہ رہی ہوں۔'' روز میری نے کہا۔ ''لیکن تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''دفع کرو۔''

''ڈونی!'' اس کی ماں نے کچن سے آواز لگائی۔ ''تم دونوں ابھی تک بچوں کی طرح لڑتے ہو۔''

☆☆☆

مونیکا اس بوڑھی عورت کی آخری رسومات میں شرکت کرنا چاہ رہی تھی جبکہ ڈونی اس کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اینڈریا سے ان کی کوئی خاص جان پہچان نہیں تھی پھر وہ کیوں جاتی۔ اس طرح کسی کو شک ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں پولیس والے بھی ہوں اور وہ اپنی عقابی نگاہوں سے کسی مشکوک شخص کو تلاش کر رہے ہوں لیکن مونیکا مصر تھی۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ اس کے ساتھ نہ گیا تو وہ اکیلی ہی چلی جائے گی۔

ریان کی چھوٹی سی پارکنگ لاٹ گاڑیوں سے بھر گئی تھی۔ اس لیے بہت سی کاریں سڑک کے پار گال وے مارکیٹ کی لاٹ میں کھڑی کردی گئی تھیں۔ ڈونی نے کبھی کسی جنازے میں اتنی کاریں نہیں دیکھی تھیں۔ شام کا دھندلکا چھانے لگا تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی' جنازہ گاہ کی کھڑکیوں میں موم بتیاں روشن تھیں۔ لوگ باری باری اندر باہر آجارہے تھے۔ ڈونی خوش تھا کہ اس دھندلکے نے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کو چھپالیا ہے۔ مونیکا نے اندر جاکر تعزیتی کتاب پر دستخط کرنا چاہے لیکن ڈونی نے سر کی خفیف جنبش سے اسے متنبہ کردیا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی اور قلم واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

اس جگہ کافی رش تھا اور سوگواران تین تین چار چار کی ٹولیوں میں کھڑے باتیں کررہے تھے۔ تابوت کے قریب خاندان کے افراد کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں دو درمیانی عمر کی خواتین جو غالباً اینڈریا کی بیٹیاں تھیں اور ایک پختہ عمر کا شخص جو شاید اس کا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ نواسے نواسیاں، پوتے اور پوتیاں بھی موجود تھے۔ ڈونی نے اپنے آپ کو دوسروں سے نمایاں محسوس کیا کیونکہ وہ سب سے لمبا اور معمولی لباس میں تھا۔

مونیکا نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو یہاں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آرہا جو پولیس والوں جیسا ہو۔''

ڈونی نے بھی جواب میں سرگوشی کی۔ ''جلدی کرو۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

تابوت کی طرف جاتے ہوئے ڈونی نے لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا۔ وہ اپنے اپنے انداز میں واقعے پر تبصرے کررہے تھے۔ مثلاً کیا پولیس نے کسی کو گرفتار کیا؟ انہیں کوئی سراغ ملا؟ غالباً کوئی شخص ہائی وے سے گزر رہا ہوگا۔ شاید وہ اب نارتھ ڈکوٹا میں ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ کسی کے کسی شخص کا کام ہے جو جانتا تھا کہ وہ اس وقت اکیلی ہوگی جسے یہ بھی معلوم تھا کہ گیراج کام نہیں کررہا۔ کیا انہیں وہاں سے کوئی ہتھیار ملا؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ کتنی رقم چرائی گئی ہے؟

آخری تبصرہ سن کر ڈونی مضطرب ہوگیا۔ اگر اس نے رقم نہ چرائی ہوتی اور مونیکا کو لے کر چپ چاپ وہاں سے چلا جاتا تو یہ سب باتیں اس کے لیے بے معنی تھیں۔

''ہم یہاں کیا کررہے ہیں؟'' اس نے ایک بار پھر مونیکا سے سرگوشی میں کہا۔ ''ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔''

''اتنی جلدی کیا ہے۔ تعزیت تو کرنے دو۔'' یہ کہہ کر وہ خاندان کے افراد کی جانب بڑھی۔ ڈونی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ مونیکا نے اس کے علاوہ بھی کچھ کہا جسے وہ پوری طرح نہیں سمجھ سکا لیکن یوں لگا جیسے کہہ رہی ہو، انہیں بتا دینا چاہیے۔ اس نے گھبراہٹ میں اسے کندھے سے پکڑ کر روکا اور سرگوشی میں بولا۔

''تم کیا کہہ رہی تھیں؟''

''یہی کہ انہیں بتا دینا چاہیے کہ ہمیں اس کی موت کا کتنا افسوس ہے۔''

''اوہ میرے خدا! میں تو گھبرا گیا تھا۔''

وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا خاندان کے افراد کے پاس گیا۔ انہوں نے ہاتھ ملائے اور سب آپس میں بغل گیر ہوئے اور تعزیتی کلمات ادا کیے۔ اینڈریا کا آخری دیدار کرتے ہوئے مونیکا اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اینڈریا کی بیٹیوں نے اسے دوبارہ گلے لگالیا۔ دوسرے لوگ بھی اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ ایک شخص جسے ڈونی، اینڈریا کا بیٹا سمجھ رہا تھا، وہ اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم مسز ملز کو کیسے جانتے ہو؟''

ڈونی حیران رہ گیا۔ اس شخص نے ماں یا اینڈریا نہیں بلکہ مسز ملز کہا تھا۔

☆☆☆

جب موسم سرد ہونے لگتا تو وہ ہمیشہ درختوں میں کام کرنے کے دوران پہلے سے زیادہ محتاط ہوجاتا کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں دستانوں اور جوتوں میں بھی سن ہوجاتے تھے۔ اس کے باوجود وہ شاہ بلوط کے درخت پر چڑھ کر اس کے گلے ہوئے حصے کاٹ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک نیم منجمد تالاب اور چراگاہ پر گئی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے کی جانب پھسلنے لگا۔ اس نے اپنی حفاظت کے لیے جو

پٹی باندھ رکھی تھی، وہ بھی چبوترے پر پھسلنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے پکڑتا، وہ ایک اور تنے سے جا ٹکرایا اور ایک لمحے کے لیے اس سے لٹک گیا۔ یہ ایک طویل لمحہ تھا جب اس کی نظروں کے سامنے اینڈریا کا چہرہ آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں وہ الفاظ گونجنے لگے۔

''تم مسز بلز کو کیسے جانتے ہو؟''

جیسی نے نیچے سے آواز لگا کر پوچھا کہ کیا وہ ٹھیک ہے۔ اس وقت تک ڈونی نیچے آ چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے۔ وہ خاصا خوفزدہ تھا۔ اس نے ایک بار پھر اس آدمی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اگر وہ پولیس والا نہیں تو پھر کون تھا؟ گو کہ کسی نے اس کے بارے میں نہیں بتایا لیکن ڈونی کا خیال تھا کہ اس نے اسے صحیح طریقے سے ہینڈل کیا۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اینڈریا کو میٹ سن کے اسٹور کی وجہ سے جانتا تھا کیونکہ وہ اکثر وہاں جاتا رہتا تھا اور وہ ہمیشہ دوستانہ انداز میں پیش آتی تھی۔ وہ اس کی کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ وہ کبھی خفیہ کیمرے کے سامنے اس کا ڈانس نہیں بھول سکتا جو وہ ایڈسولیون کے آڈیشن کے لیے کیا کرتی تھی۔

اسے اس بات پر فخر تھا کہ اسے روز میری نے اینڈریا کے بارے میں جو تفصیلات بتائی تھیں، وہ اسے کتنی جلدی یاد آ گئیں اور اس نے بڑی روانی سے وہ سب پولیس والے کے سامنے بیان کر دیا لیکن مونیکا نے اسے یہ کہہ کر پریشان کر دیا۔ ''کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم جانتے تھے کہ کیمرا کام نہیں کر رہا۔'' اس کے پاس اس بات کا بھی جواب تھا اور وہ یہ کہ چوری کرتے وقت اس نے کیمرے کے بارے میں بالکل نہیں سوچا، یہ تو بعد میں مونیکا کے یاد دلانے پر اسے خیال آیا کہ کیمرا کام کر رہا تھا یا نہیں۔

انہوں نے جب کام ختم کیا تو سورج غروب ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی اور چہرے پر پڑنے والی پھوار اسے مزہ دے رہی تھی۔ اس نے ترنگ میں آ کر مونیکا کو فون کیا۔

''آج کچھ تفریح ہو جائے۔'' اس نے کہا۔ ''میری جیب میں پڑے ہوئے ایک سو سینتالیس ڈالرز مجھے کاٹ رہے ہیں۔''

''مجھے کام پر جانا ہے ڈونی۔''

''انہیں فون کر دو کہ تم بیمار ہو۔''

''میں یہ نہیں کر سکتی۔''

''کیوں نہیں کر سکتیں؟ وہ بھی تو تمہیں آئے دن روکتے رہتے ہیں۔''

''مسٹر بیکسٹر کے لیے پریشانی ہو جائے گی۔''

''اگر تم کہو تو میں تمہاری طرف سے فون کر دیتا ہوں۔ مجھے تمہارا کام کر کے خوشی ہوگی۔''

وہ کچھ سوچنے کے بعد بولی۔ ''اس سے تو بہتر ہے کہ میں وہاں جاؤں اور اس کے سر پر بالٹی دے ماروں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہی جذبہ ہونا چاہیے۔''

''تاکہ تم وہاں لوٹ مار کر سکو۔''

''جیسے بونی اور کلائیڈ۔''

''کون؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم چلنے کی تیاری کرو۔ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔''

پہلے وہ ولٹن مال گئے۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔ ہر جانب کرسمس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں جن سے ماحول کی خوبصورتی بڑھ گئی تھی۔ فلم شروع ہونے سے پہلے ٹریلر دکھائے جا رہے تھے۔ ڈونی نے اس کا چشمہ صاف کیا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چومنے لگی۔ وہ ایک مزاحیہ فلم تھی لیکن انہوں نے بہت کم قہقہے لگائے۔ ان کی توجہ فلم سے زیادہ دوسری باتوں پر تھی۔ ڈونی کا بازو اس کے کندھے پر تھا اور وہ ممکنہ حد تک اس کے قریب ہو گئی۔ جب اس کا بازو سن ہونے لگا تو ڈونی نے اسے مونیکا کی ران پر رکھ لیا اور اس کا گھٹنا دبانے لگا۔ جواب میں مونیکا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے چومنے لگی۔ یہاں تک کہ ڈونی نے دوبارہ اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال دیا حالانکہ انہیں قربت کے مواقع میسر تھے پھر بھی ڈونی کا دل نہیں بھرتا تھا۔ جنسی تعلق کے باوجود انہیں جہاں کہیں موقع ملتا، وہ ایک دوسرے سے چمٹ جاتے۔ یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا کیونکہ یہ کھیل مونیکا کے لیے نیا تھا۔ اس کے پاس تجربے کی کمی تھی۔ اس کی ماں منشیات فروخت کرتی تھی اور باپ کا بیشتر وقت جیل میں گزرا۔ کسی نے کبھی اسے اس طرح نہیں چمٹایا۔ یہ کمی ڈونی نے پوری کر دی تھی۔

یہی حال ڈونی کا تھا۔ اسے یاد نہیں کہ بچپن میں کبھی کسی نے اسے گود میں لیا یا سینے سے لگایا ہو۔ البتہ اتنا یاد تھا کہ روز میری ہمیشہ اسے تنگ کرتی اور برا بھلا کہتی رہتی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی ایک جھلک دیکھی تھی جب وہ روز میری کے پیچھے چھپ کر اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے اس کی ماں گودام کے دروازے پر کھڑی جھگڑا کر رہی تھی۔ یہی اس کے باپ کی پہلی اور آخری جھلک تھی۔ اس کے بعد اس نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اسے کبھی کسی کا

پیار نہیں ملا۔ یہ کمی مونیکا نے پوری کردی تھی۔

فلم دیکھنے کے بعد اس نے سوچا کہ کسی اچھی جگہ ڈنر کرنا چاہیے۔ وہ مونیکا کو ایک ایسے ریستوران میں لے گیا جہاں صرف پیسے والے ہی جاسکتے تھے اور وہاں کا بل دینا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے شیخی بگھارتے ہوئے مونیکا سے کہا کہ وہ جو چاہے منگوا سکتی ہے۔ خود اس نے اپنے لیے سب سے مہنگی ڈش Rib-eye کا انتخاب کیا اور ویٹرس کو تاکید کردی کہ یہ اچھی طرح بنی ہوئی ہونی چاہیے۔ ویٹرس نے سر سے پاؤں تک اس کا حلیہ دیکھا اور اس طرح آرڈر لکھنے لگی جیسے اس کے پین میں سیاہی ختم ہوگئی ہو۔

جب مونیکا نے اپنے لیے چیز برگر کا آرڈر دیا تو ڈونی کا منہ بن گیا۔ اس نے ویٹرس کو اشتہا آور مشروب اور کولڈ ڈرنک لانے کے لیے بھی کہا۔ وہ تو اپنے لیے بیئر بھی منگوانا چاہ رہا تھا لیکن ایسی صورت میں ویٹرس اس سے شناختی کارڈ مانگ سکتی تھی اور وہ اس کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد مونیکا نے کہا۔ ''مجھے تو یہ بہت بدمزاج لگتی ہے۔''

''پھر اسے ٹپ بھی نہیں ملے گی۔''

اس نے مونیکا کو یہ نہیں بتایا کہ شاید یہ اس لیے بدمزاجی کا مظاہرہ کررہی ہے کہ اسے پہلے سے ہی ٹپ ملنے کی امید نہیں ہے کیونکہ وہ دونوں دیکھنے میں بہت کم عمر اور معمولی لگ رہے ہیں۔ ایسے لوگ ٹپ نہیں دیتے۔ یہ بات اسے روز میری نے بتائی جو خود بھی ایک ویٹرس تھی۔ اگر کوئی اس طرح کا گاہک اس کی میز کی جانب بڑھتا تو وہ اپنی جگہ کسی دوسری ویٹرس کو بھیج دیتی۔

فوڈ کورٹ کے آگے پارک میں ایک گھومنے والا جھولا لگا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد مال کے سامنے سے گزرتے ہوئے ڈونی نے سوچا کہ کیوں نہ جھولے پر ایک چکر لیا جائے۔ یہ بھی ایک تفریح رہے گی اور اس طرح اس شام کا مزہ دوبالا ہوجائے گا لیکن مونیکا ہچکچا رہی تھی۔ ''مجھے یہ پسند نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک دفعہ ٹریور جھولے سے گر چکا ہے۔''

ڈونی کو یاد آگیا۔ ٹریور بچ پر بیٹھا ہوا تھا اور مونیکا اسے دیکھنے کے بجائے جھولے میں لگے ہوئے گھوڑوں، بندروں، ہاتھیوں اور زرافے کو دیکھ رہی تھی۔

''آجاؤ۔۔۔'' ڈونی نے کہا۔ ''تمہارے لیے سب سے اچھی سواری گھوڑے کی ہے۔''

مونیکا کو یہ مذاق پسند نہیں آیا۔ وہ منہ بناتے ہوئے جھولے کے رکنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت جھولے میں ایک ہی بچہ سواری کررہا تھا جبکہ انتظار کرنے والوں میں صرف وہ اور ڈونی شامل تھے تاہم آپریٹر بچے کو پورا وقت دینے کا پابند تھا۔

اس شخص نے ریلوے انجینئر کی ٹوپی پہن رکھی تھی اور وہ بڑی مہارت سے جھولے کو چکر دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے گنگنانے کی آواز بھی آرہی تھی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا تمہارے پاس کتا ہے؟''

ڈونی نے ادھر اُدھر دیکھا تاکہ یقین کرسکے کہ وہ اسی سے مخاطب ہے۔ ''نہیں۔۔۔'' اس نے کہا۔ ''ہم ایک ٹریلر پارک میں رہتے ہیں۔''

''تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''کبھی کتا نہیں پالنا۔ وہ تمہارا سکون غارت کردے گا۔''

''وہ کیسے؟'' مونیکا نے پوچھا۔ وہ اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ ڈونی سوچ رہا تھا کہ وہ شخص ایسی گفتگو کیوں کررہا ہے۔ شاید اسے ڈر تھا کہ یہ لوگ کہیں چلے نہ جائیں اس لیے اس نے یہ موضوع چھیڑ دیا تھا۔

وہ آدمی مونیکا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''بس تم میری بات یاد رکھنا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے جھولا روک دیا۔ بچہ نیچے اترا اور وہ دونوں جھولے میں سوار ہوگئے۔ اس آدمی نے ایک بار پھر اسے گھمانا شروع کردیا۔ کبھی اوپر نیچے کبھی دائرے کی شکل میں۔ وہ کافی دیر تک جھولے کی سواری کرتے رہے۔ شاید مقررہ وقت سے بھی زیادہ۔ شاید آپریٹر ان دونوں کو پسند کرنے لگا تھا یا اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے بعد وہاں کوئی گاہک اپنی باری کا انتظار نہیں کررہا تھا۔ اس لیے آپریٹر کو کوئی جلدی نہیں تھی۔

باہر مسلسل برف باری ہورہی تھی جس کی وجہ سے پارکنگ لاٹ کی روشنی ماند پڑگئی تھی لیکن وہاں اب بھی چند کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ تاہم ڈونی کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس کی گاڑی کے ٹائر اچھی حالت میں تھے اور اسے اپنی ڈرائیونگ پر اعتماد تھا چنانچہ وہ بے فکر ہوکر مونیکا کے ساتھ جھیل کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ ابھی راستے میں ہی تھے کہ نیلی نے مونیکا کو فون کیا اور پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔

''میں نے اسٹیوارٹ کو فون کیا تھا لیکن انہوں نے بتایا کہ تم بیماری کی وجہ سے کام پر نہیں آئیں۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا تم کسی اسپتال میں ہو؟''

''نہیں گرینڈ مام! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' مونیکا

نے کہا۔ ''دراصل ایک ضروری کام کی وجہ سے مجھے چھٹی کرنا پڑی اور اس کے لیے بیماری کا بہانہ بنانا ضروری تھا۔''

نیلی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کس ضروری کام سے گئی ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب مونیکا صبح سے پہلے واپس نہیں آئے گی۔ تاہم اس نے اپنا فرض نبھانا ضروری سمجھا اور بتایا کہ ٹریور کھیلتے ہوئے گر پڑا ہے اور اس نے اپنا ہونٹ کاٹ لیا ہے۔ اس وقت اسے ماں کی ضرورت ہے۔

''گرینڈ ماں! میں اس وقت نہیں آسکتی۔'' مونیکا نے کہا۔ ''موسم بہت خراب ہے اور مسلسل برف باری ہو رہی ہے۔ تم اسے کسی طرح سنبھال لو۔''

جس وقت وہ اپنی دادی سے بات کر رہی تھی تو ڈونی کو روز میری کا پیغام ملا۔ اسٹیٹ پولیس اس کے گھر آئی تھی۔ وہ ڈونی سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ جس وقت اینڈریا کی موت واقع ہوئی کوئی شخص اپنی کار میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے ڈونی کی نیلے رنگ کی پرانی ٹویوٹا کو میٹ سن کے اسٹور پر کھڑے دیکھا تھا۔ روز میری نے پولیس والوں کو بتادیا تھا کہ اسے ڈونی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس نے انہیں جھیل پر واقع کیمپ کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔

رات بھر وہ یہی سوچتے رہے کہ وہ کہاں جاسکتے ہیں اور کیا کرسکتے ہیں۔ اسے جیل جانا قبول نہیں تھا، چاہے وہ ایک دو سال کی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ مونیکا کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا تھا جبکہ اس کی جیب میں سو ڈالرز سے بھی کم رقم رہ گئی تھی۔ مونیکا کے بینک اکاؤنٹ میں بھی بمشکل تین سو ڈالرز ہوں گے۔ یہ رقم ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ البتہ فلوریڈا ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ روپوش ہوسکتا تھا لیکن اس کی ٹویوٹا اتنا طویل فاصلہ طے کرنے کے قابل نہیں تھی اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ راستے میں ہی پکڑا جائے۔ پھر وہ کیا کرے..... کہاں جائے؟

صبح ہوتے ہوتے مونیکا ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے ڈونی کا ہاتھ تھاما اور بولی۔ ''تم کب تک یہاں چھپ سکتے ہو؟ کبھی نہ کبھی تو یہاں سے نکلنا ہوگا۔ تم جہاں بھی جاؤ گے، پولیس تمہارا پیچھا کرے گی۔ اس بھاگ دوڑ سے بہتر ہے کہ تم گھر چلے جاؤ اور اگر پولیس والے دوبارہ آئیں تو انہیں سب کچھ سچ سچ بتادینا۔''

''کیا بتادوں؟''

''یہی کہ تم کچھ کھانے پینے کا سامان لینے میٹ سن کے اسٹور گئے تھے کہ تم نے اینڈریا کو زمین پر پڑے ہوئے دیکھا۔ وہ مرچکی تھی۔ تمہارے پاس فون نہیں تھا اس لیے پولیس کو اطلاع نہ کرسکے پھر تمہارے دل میں لالچ آیا۔ تم نے کیش رجسٹر سے رقم نکالی اور خاموشی سے گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔''

''پولیس مجھ پر شک کرسکتی ہے کہ میں نے ہی اسٹور لوٹنے کی خاطر اینڈریا کو قتل کیا ہوگا۔''

''بالکل نہیں۔ تم نے اس پر گولی نہیں چلائی۔ اس پر چاقو سے وار نہیں کیا۔ اس کا گلا نہیں گھونٹا۔ اس پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔ وہ بلڈ پریشر اور شوگر کی مریضہ تھی اور اس کی موت حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کردی تھی۔ اگر پولیس کے نزدیک یہ قتل ہوتا تو وہ لاش کا پوسٹ مارٹم ضرور کرواتے۔''

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم نے صرف ایک معمولی رقم چوری کی ہے۔ اگر تم یہ حرکت نہ کرتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ بہرحال جرم کیا ہے تو اس کی سزا بھی بھگتنا ہوگی۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ تین یا چھ ماہ کی جیل ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ میٹ سن تمہیں معاف کردے۔''

ڈونی کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے جرم کا اعتراف کرلینا چاہیے۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد واپس آؤ گے۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

ڈونی نے مونیکا کو اس کے گھر چھوڑا اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مونیکا نے دل میں سوچا کہ اچھا ہی ہوا۔ اس نے ڈونی کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے اینڈریا کو دھکا دیا تھا کیونکہ اس نے یہ کہہ کر بیئر دینے سے انکار کردیا تھا کہ وہ خود بیئر نہیں پیتی اور وہ ڈونی کے لیے بیئر خرید رہی ہے۔ اینڈریا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ زمین پر جا گری۔ اسی لمحے میں اس کی موت واقع ہوگئی۔

بے شک یہ ایک حادثہ تھا لیکن اس کی ذمے دار وہی تھی۔ اگر پولیس کو یہ بات معلوم ہوجاتی تو ڈونی کے ساتھ ساتھ وہ بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی جاتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی سزا کی مدت ڈونی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی۔ یہ سوچ کر ہی وہ کانپ گئی۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ''واقعی ہر بات کسی کو نہیں بتانی چاہیے، خواہ وہ اپنا محبوب ہی کیوں نہ ہو۔''

قسط نمبر: 25

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا اہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا ... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی لٹی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر انتظامات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں بیشمار سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ہیوسٹن میں واقع "سرکل اے" نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے "سرکل اے" میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو نی نمس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ "ونی لاؤنج" نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس نے علی کے دردِ دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مار ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر رخصت ہو گئی..... اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز شارو کو لیونارڈو نے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈ تا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ علی نے طیش کے عالم میں پیبلو کو قتل کر دیا۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور لیک جیکسن سے یوسٹن پہنچ گیا۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علی کو پیبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال..... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی..... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاؤ اور ریما ایپل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی "اسکل اینڈ بونز" سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے "اسکل اینڈ بونز" کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کرے۔ لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے بسی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور

کراچی روانہ ہوجانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔ علی نے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آ گیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہوگئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگالیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوگئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہوگیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے ویزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کردی۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کرکے علی کی والدہ کو قتل کردیا۔ علی نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت مینا کو بھی بتادی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائشگاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادرشاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادرشاہ کو اغوا کرکے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادرشاہ کو اغوا کرایا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کرکے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادرشاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور مینا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آ گیا۔ علی نے بنگلے پر جمشید کو چھوڑا تھا اور خاص نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن شیفرڈ کی مدد سے تلاش کیا جارہا تھا۔ اس کے در پر پردہ ڈیلفینا کا ہی ہاتھ تھا۔ علی نے نادرشاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کرکے اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے بنگلے کو نذر آتش کردیا۔ علی کو ایک عورت کی مدد سے ٹریس کرلیا گیا اور نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ راس آئی لینڈ پر ہے جہاں اسے چالیس دن گزارنے ہیں۔ وہیں اسے ایک لڑکی مل گئی جس سے دوستی ہونے پر اس نے بتایا کہ وہ اسکل اینڈ بونز کے لیے کام کرتی ہے اور اسے جان بوجھ کر وہاں بھیجا گیا ہے۔ ہٹ میں پیڈرو نامی شخص آیا جسے علی نے پہچان لیا کہ وہ چنگیز خان ہے۔ علی نے اسے اذیت ناک موت دی اور اپنے انتقام کی آگ بجھائی۔ کایا نے علی کو اشارہ دیا کہ وہ بھی اپنے دشمن کو اسی طرح اذیت دے کر مارنا چاہتی ہے۔ علی کے اس استفسار پر اس نے بتایا کہ سوسائٹی کے ممبر اسکمر نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہے اور وہ اس سے بھیانک انتقام لینا چاہتی ہے۔ پروگرام کے مطابق جب اسکمر کایا کو لینے آیا تو علی کی مدد سے اسے قابو کرلیا گیا اور کایا نے اسے بھیانک موت دی۔ علی نے اسکمر کا روپ دھارلیا اور کایا اور وہ بذریعہ جہاز کرائسٹ چرچ ائرپورٹ پر لینڈ کرگئے۔ علی اور کایا ایک ولا میں پہنچ گئے، مگر اسکل اینڈ بونز نے انہیں ٹریس کرلیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکلے اور کافی مارا ماری ہوئی۔ تاہم وہ بچ نکلنے میں کامیاب رہے۔ وہ دونوں ایک موٹیل میں ٹھہرے جہاں سے کایا کو اغوا کرلیا گیا۔ علی اس کی مدد کے لیے گیا، مگر وہ کایا کو نہ بچا سکا اور وہ ماری گئی۔ وہیں اچانک اس کی ملاقات جی ایم سرے ہوگئی۔ جی ایم سرے نے علی کو آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ جی ایم سرے نے ایک چھوٹے سے آپریشن کے ذریعے علی کے جسم سے ٹریکنگ ڈیوائس نکلوادی۔ جی ایم سرے چلے گئے مگر علی کو آئندہ کا لائحہ عمل بتاگئے۔ علی کو جہاز میں ایک لڑکی روماتل ملی۔ اس نے ایک جگہ فائرنگ کرکے کسی کو جان سے مارنا چاہا۔ نتیجے میں کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے۔ علی نے بھی اس کا تعاقب کیا اور روماتل کا تعاقب کرنے والوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ کافی مارا ماری کے بعد وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں اس نے ایڈتھ نامی لڑکی کی مدد کی اور اس کے ہمراہ میونخ آ گیا۔ وہاں ہوٹل میں ویٹر نے علی کو کسی عورت کی آمد کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ علی نجس میں نیچے پہنچا تو وہاں روماتل تو ریز موجود تھی۔ اچانک وہاں زوردار دھماکا ہوا اور روماتل علی کو لے کر ہوٹل سے نکل گئی۔ وہ دونوں ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ روماتل نے علی کی اصلیت کھوج لی اور کہا کہ اسے ایک مشن میں علی کی مدد درکار ہے۔ سوئے اتفاق وہ جس مشن پر جارہی تھی وہیں شارو بھی موجود تھی، اسے سائنس داں فریڈرک کی تجربہ گاہ سے کچھ فائلیں چرانا تھیں۔ علی اور وہ وہاں پہنچے۔ روماتل نے وہاں کارروائی کی اور شارو کے ہمراہ نکل گئی۔ علی وہاں سے فوکسی کار میں نکلا تو ریڈاوپل اس کے تعاقب میں تھی۔ علی نے اس میں سینئر بونز مین رابرٹ کو دیکھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

دونوں گاڑیاں کم وبیش تین سو میٹر کی مابینی دوری سے ایک دوسرے سے ''دل لگی'' کررہی تھیں۔ میں نے ریڈاوپل کی عقبی نشست پر جس فرزند ابلیس کو بیٹھے دیکھا تھا، میں اس کا مقروض تھا۔ نیوزی لینڈ میں اس حرام الدہر نے مجھ پر قرض کا ماؤنٹ ایورسٹ لاد دیا تھا۔ میں کایا کی المناک موت کو کسی بھی قیمت پر بھول نہیں سکتا تھا۔ میری اس بے مثال ساتھی کو اسی سینئر بونز مین کے ایما پر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کایا نے کسمپرسی کی حالت میں، کرائسٹ چرچ کی آک لینڈ اسٹریٹ پر میری بانہوں میں دم توڑا تھا۔ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اس پاکٹ سائز نیوزی لینڈر حسینہ کو بچا نہیں سکا تھا۔ میری تمام تر کوششیں ایس این بی (اسکل اینڈ بونز) کی ابلیسی قوت کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئی تھیں۔ سوسائٹی کے ہاتھوں یہ میری پہلی شکست تھی جس نے میرا دل خون کردیا تھا۔ ان لمحات میں، میں اپنی زندگی کے

ایک نازک موڑ پر کھڑا تھا۔ میں نے کایا کے بے جان جسم کو مخاطب کرتے ہوئے قسم کھائی تھی۔

''کایا! تمہارا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ میں رابرٹ کو آسکر اور چنگیز خان سے بھی زیادہ اذیت ناک موت ماروں گا۔''

اور میں اپنی اس قسم پر قائم ودائم تھا۔ مالک کا شکر کہ اس نے مجھے بہت جلد اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ ریڈ اوپل کی عقبی نشست پر رابرٹ کو موجود پاکر مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ شارو نے پروفیسر فریڈرک کے جس دوست کا ذکر کیا تھا، وہ یہی سینئر یونز مین رابرٹ تھا۔ یہ شیطان کا پجاری میری جانِ جگر کو پروفیسر کے ریسرچ سینٹر سے کہیں اور منتقل کرنے کے ارادے سے یہاں آیا تھا۔ میں نے دانت کچکچاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں اس شاگردِ لعین سے کہا۔

''تمہاری بدنصیبی تمہیں کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔ کایا کو موت سے ہم آغوش کرنا تمہارا مشن تھا اور یہ مشن تمہیں سوسائٹی نے سونپا تھا۔ اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ اس کارنامے پر تم نے جو سرخروئی حاصل کی ہے، میں اس کا بڑی دھوم دھام سے جنازہ نکالوں گا۔ تمہارے حشر نشر کو دیکھ کر سوسائٹی والے بھی کانپ اٹھیں گے.....!''

اس بڑبڑاہٹ کے دوران میں، عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں ریڈ اوپل پر میں نے مسلسل نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ آڈم اوپل اگرچہ پرانے ماڈل کی تھی تاہم اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا باوردی گارڈ بڑی پھرتی اور مہارت سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہیلگا نے مجھے بتایا تھا کہ دو مسلح گارڈز اسمتھ اور بریڈی ہر وقت پروفیسر کے ساتھ رہتے تھے۔ یقیناً یہ انہی دو میں سے کوئی ایک تھا کیونکہ ریسرچ سینٹر پر موجود باقی چار سکیورٹی گارڈز کو تو جیسیکا نے دردناک موت کا تحفہ دے ڈالا تھا۔ اب وہ آنجہانی ہو چکے تھے۔

میں نے پیلی صابن دانی (یلو فوکسی) کے اسٹیئرنگ کو قابو میں رکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر عقبی دروازے کو بند کر دیا۔ کھلے ہوئے دروازے کے ساتھ ڈرائیونگ میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ ہیلگا نے اچانک جو حرکت کی تھی، اس نے مجھے بے ساختہ بریک لگانے پر مجبور کر دیا تھا تاہم میں رکا نہیں تھا۔ جب جہنمی بلائیں آپ کے تعاقب میں ہوں تو پھر توقف، تعطل اور ٹھہراؤ کا رسک نہیں لینا چاہیے اسی لیے میں بڑی احتیاط کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میرا آگے بڑھنا یقیناً رابرٹ کو ناگوار گزر رہا تھا۔

ہیلگا نے ریسرچ سینٹر کے حالات کے حوالے سے پروفیسر کو جو رپورٹ دی تھی۔ اس کے مطابق پروفیسر کے دو ملاقاتیوں ڈاکٹر برجت اور اس کے فیلو ڈاکٹر رائیل نے لیبارٹری کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ برجت شارو کو اپنے ساتھ ہیلی کاپٹر میں اڑا لے گئی تھی اور رائیل کے ارادے بھی نیک نہیں لگتے تھے لہٰذا رابرٹ کو ڈاکٹر رائیل کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اگر ڈاکٹر رائیل اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر وہ اس کے ذریعے برجت تک بہ آسانی پہنچ سکتا تھا اور اس کی کسٹڈی سے شارو کو حاصل کر سکتا تھا۔ رابرٹ کا اصل ٹارگٹ شارو تھی اور گھٹیا انسان قطعاً یہ بات نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر رائیل کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ یہ میرے حق میں ایک پلس پوائنٹ تھا۔

برف سے دو طرفہ ڈھکی ہوئی لہراتی بل کھاتی تنگ سی سڑک پر ڈھلوان کے رخ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگر مجھے اس جاب میں دشواری محسوس ہو رہی تھی تو آسانی میں ریڈ اوپل والے بھی نہیں تھے۔ وہ مجھے چھاپنے کے لیے لحہ بہ لحہ گاڑی کی رفتار کو بڑھا رہے تھے اور میں ان سے بچنے کے لیے اسپیڈ بڑھانے پر مجبور تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ خطرناک تعاقب ہمیں کہاں لے جائے گا.....!

آج ہم تو سینئر R22 پنک ہیلی کاپٹر میں پروفیسر کے ریسرچ سینٹر تک پہنچے تھے۔ میں یہاں کے زمینی راستوں سے متعلق آگاہی نہیں رکھتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ ڈھلوانی پُرخطر راستہ کس وادی تک لے جائے گا۔ ان نازک لمحات میں میرا ذہن فرار یا پسپائی کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنی پیلی صابن دانی کو تیز رفتاری سے سرخ اوپل کے آگے دوڑاتا چلا جا رہا تھا مگر اسی دوران میں، میں رابرٹ کو گھیرنے اور گھیر کر مارنے کے بارے میں بھی غور و فکر کر رہا تھا۔ قدرت نے اس شیطان زادے کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا جو موقع مجھے فراہم کیا تھا، میں اسے ہرگز ہرگز ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

میرے عقب میں لگی ہوئی سرخ اوپل میں سے فائرنگ کی گئی۔ ایسی ہی خطرناک فائرنگ تھوڑی دیر پہلے بھی اس وقت کی گئی تھی جب ہیلگا فوکسی کی عقبی نشست پر بے یار و مددگار پڑی تھی۔ میں نے مشقیں کس کر اسے بے بس کر دیا تھا۔ فائرنگ کی ''تڑتڑاہٹ'' نے اس جوان بڑھیا کو چیخنے پر مجبور کر دیا تھا اور ان جان لیوا لمحات میں بھی میں اپنی شگفتہ بیانی سے چھیڑ چھاڑ کا عمل جاری رکھے ہوئے تھا۔ اب

ہیلگا میرے ہمراہ نہیں تھی۔ وہ خود کو بے قصور ثابت کرنے اور پروفیسر کی نگاہ میں تمغائے وفاداری حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر فوکسی میں سے باہر کود گئی تھی۔ وہ کودنے کا ارادہ رکھتی تھی اور میرے آناً فاناً بریک لگانے نے اس کی دلی مراد پوری کردی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ برفیلی ڈھلوان پر لڑھکنے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا تھا۔ وہ زندہ بھی تھی یا نہیں اور اگر وہ زندہ تھی تو کس حال میں تھی——!

اس وقت مجھے اپنی زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ قبل اس کے کہ ریڈ اوپل میں سے، مجھے روکنے کے لیے دوبارہ فائرنگ کی جاتی، میں نے پسنجرز سیٹ پر رکھی AK56 کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا پھر اس کی خطرناک نال کو کھڑکی میں سے باہر نکال کر مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ چند گز آگے وہ پتلی سڑک یو (U) کے مانند مڑ رہی تھی۔ میں نے مذکورہ موڑ سے پہلے اپنی گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی۔

دونوں گاڑیاں سو گز کے فاصلے سے آگے پیچھے اس موڑ پر مڑنے لگیں تو جغرافیائی اعتبار سے کچھ فاصلے پر سرخ اوپل کم و بیش میرے پہلو میں آگئی۔ اسی وقت میں نے گن سے دشمن کار پر فائرنگ کی۔ ریڈ اوپل میری فائرنگ سے محفوظ رہی تاہم میری جوابی فائرنگ نے انہیں یہ ضرور بتادیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔

ایک مرتبہ پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ بوبرین ایلپین رینج پر تاحدِ نگاہ جمی ہوئی سفید برف کے بیچوں بیچ یہ پتلی سی سڑک سیاہ ناگ کے مانند بل کھاتی دکھائی دیتی تھی۔ حد درجہ تیز رفتاری کے سبب ایسا محسوس ہوتا تھا، گاڑیاں اس سڑک پر دوڑ نہ رہی ہوں بلکہ پھسلتے ہوئے اسکیٹنگ کر رہی ہوں۔ پچھلی گاڑی سے وقفے وقفے سے مجھ پر فائرنگ کی جارہی تھی۔

میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا، راستہ عجیب و غریب صورت اختیار کرتا چلا جارہا تھا۔ اب اس پتلی سڑک کے دونوں کناروں پر برف کی دو، ڈھائی فٹ بلند دیواریں سی اٹھی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ دیواریں باقاعدہ تعمیر نہیں کی گئی تھیں بلکہ یہ برف باری کا اعجاز تھا۔ سڑک چونکہ استعمال میں رہتی تھی اس لیے اس کے اوپر برف کو جمنے کا خاطر خواہ موقع نہیں مل سکا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ دونوں گاڑیاں برف کی ایک چوڑی نالی کے اندر رواں دواں تھیں۔

دو کناروں والا یہ راستہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ ایک مرتبہ پھر ہم پہلے جیسی سڑک پر تھے۔ اچانک سرخ اوپل ڈرائیور نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ اس نے سڑک کو چھوڑ کر مجھے گھیرنے کے لیے گاڑی کو برفیلی زمین پر اتار دیا۔ گاڑی کے ٹائروں نے کچی برف کا سینہ روند ڈالا جس کے باعث بھربھری برف ایک طوفان کی صورت ریڈ اوپل کی دونوں جانب بلند ہونے لگی۔ ریڈ اوپل کے ڈرائیور کی یہ حکمتِ عملی میرے لیے سودمند ثابت ہوئی۔ گاڑی کے اطراف میں اچھلنے والی نرم برف نے ان لوگوں کی نگاہوں سے مجھے وقتی طور پر اوجھل کردیا تھا۔ میں نے اس سنہری موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوکسی کی رفتار میں اضافہ کردیا۔

اسی دوران میں ریڈ اوپل میں سے مجھ پر فائرنگ کی گئی لیکن میں فائرنگ رینج سے باہر ہونے کے باعث محفوظ رہا۔ چند لمحات کے بعد وہ لوگ دوبارہ سڑک پکڑ کر میرے تعاقب میں لگ چکے تھے تاہم ہمارا درمیانی فاصلہ نسبتاً بڑھ گیا تھا۔

میری نگاہ بڑی بے تابی سے کسی ایسے مقام کی تلاش میں تھی جہاں رابرٹ سے دو دو ہاتھ کرنے کا مجھے کماحقہ، موقع ملتا۔ میری اس جستجو نے مجھے اس پہاڑ کے دامن میں ایک قدرے ہموار جگہ پر پہنچادیا جہاں پر چند منچلوں نے کار ریس کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ علاقہ کافی حد تک آباد تھا۔ وہاں دکانیں، ہوٹل اور مکانات دکھائی دیتے تھے۔ اس علاقے کی آبادی اگرچہ زیادہ نہیں تھی تاہم وہاں اچھی خاصی رونق تھی۔ وہاں کے مقامی افراد نے ہی اس ''کار ریس'' کا انتظام کیا تھا۔ اس ریس میں کل چھ کاریں حصہ لے رہی تھیں اور مذکورہ ریس ایک کھلے برف پوش میدان میں، ایک دائرے کی شکل میں ہو رہی تھی۔ تماشائی اس میدان کے کناروں پر یہ تماشا دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ میدان میں چھوٹی جھنڈیاں لگا کر گاڑیوں کے دوڑنے کا راستہ متعین کردیا گیا تھا۔ وضع کردہ یہ ریسنگ ٹریک اتنا چوڑا تھا جس پر تین گاڑیاں بیک وقت پہلو بہ پہلو دوڑ سکتی تھیں۔ اس ریس میں جیت کے لیے ان لوگوں نے کیا قواعد و ضوابط مقرر کر رکھے تھے، اس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ ہمیں تو حالات کان سے پکڑ کر ناک کی سیدھ میں یہاں لے آئے تھے۔

ہماری گاڑیاں یکے بعد دیگرے ریس کے میدان میں داخل ہوگئیں۔ لوگ اتنے انہماک سے ریس دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے ہمیں اس ریس میں حصہ لینے والے سمجھ لیا اور تالیاں بجا بجا کر داد دینے لگے۔ ہمارا مقصد اس ریس میں کامیابی حاصل کرنا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو رابرٹ کو گھیرنے کے چکر میں تھا اور رابرٹ، ڈاکٹر رائیل کو چھاپنے کا ارادہ رکھتا تھا اور تماشائی صرف لطف اندوز ہونے سے مطلب رکھتے

تھے۔ اس ریس میں ہماری شمولیت نے تماشائیوں کا مزہ دوبالا کردیا تھا۔ وہ جی بھر کر محظوظ ہورہے تھے اور دل کھول کر داد دے رہے تھے۔

جلد ہی ریڈ اوپل، دو ریس کاروں کے بیچ میں آگئی۔ اس وقت میری فوکسی، اوپل کے پیچھے تھی۔ جب ہم اس ریس میں ''شامل'' ہوئے تھے تو میں آگے اور رابرٹ پیچھے تھا مگر دو چکروں کے بعد معاملہ برعکس ہوگیا تھا۔ دائرے میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ لگاتے ہوئے عموماً ایسا ہوجاتا ہے۔ جس کی رفتار زیادہ ہوتی ہے، وہ آگے ہونے کے باوجود بھی تھوڑی ہی دیر میں پیچھے دکھائی دینے لگتا ہے۔

رابرٹ کے ڈرائیور نے جھنجلا کر یکے بعد دیگرے اپنے دائیں بائیں والی کاروں کے پہلوؤں میں زوردار ٹکریں رسید کیں، یہ دیکھ کر ان کاروں والوں کو بھی طیش آگیا۔ وہ دونوں سائڈز سے ریڈ اوپل کو دبانے کی کوشش کرنے لگے۔ ریڈ اوپل ان کے بیچ سینڈوچ بن کر رہ گئی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ میں بھی ریڈ اوپل کے پچھواڑے پر وقفے وقفے سے ٹکریں رسید کررہا تھا۔ ان لمحات میں برج اسٹریٹ والا منظر میرے تصور میں روشن ہوگیا۔

کرائسٹ چرچ سٹی کے علاقے ساؤتھ نیو برائٹن میں برج اسٹریٹ پر میرے اور رابرٹ کے بیچ ایک خطرناک کار ریس ہوئی تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس وقت رابرٹ نے ریڈ فورڈ جیپ میں میرا پیچھا کیا تھا اور اب وہ ریڈ اوپل میں میرا تعاقب کررہا تھا۔ تب میرے پاس بولٹ ایکشن رمنگٹن وی ٹی آر رائفل تھی جس کی مدد سے میں نے ریڈ فورڈ جیپ کی ایسی کم تیسی کرکے رکھ دی تھی اور اب میری گود میں AK56 رائفل تھی۔ برج اسٹریٹ والی خطرناک کار چیزنگ کے وقت کایا میرے پہلو میں موجود تھی اور اس وقت میرا پہلو کایا کے وجود سے خالی تھا۔ کایا کو مجھ سے چھیننے والا یہی خبیث الاخبث رابرٹ ہی تھا.....!

میرے اندر غم و غصے کی ایک شدید لہر اٹھی جس نے میری سوچ میں نفرت اور انتقام کے زیر اثر..... ایک زلزلہ سا برپا کردیا۔ میں نے آناً فاناً میں ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میرے آگے چند گز کے فاصلے پر رابرٹ والی ریڈ اوپل، ریس کی دو کاروں کے بیچ سینڈوچ بنی ہوئی تھی جو اسے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے بار بار اسٹیئرنگ گھما کر ٹکریں مار رہی تھیں۔ ریس میں حصہ لینے والی کاروں کی ٹکریں اس وقت شرما کر رہ گئیں جب فوکسی نے ریڈ اوپل کے عقبی حصے میں ایک دھواں دھار ٹھوکر ماری۔ میں نے فوکسی کی اسپیڈ کو خطرناک حد تک بڑھا کر اسے راکٹ بنا دیا تھا لہٰذا اس کے بونٹ کی ٹکر نے اوپل کے اوسان خطا کردیے اور وہ توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند دونوں کاروں کے درمیان سے نکل کر کافی آگے چلی گئی۔

میں نے رابرٹ والی کار کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ میرا ایک فوری فیصلہ تھا اور اس حرکت کے لیے مجھے نتائج کی قطعاً پروا نہیں تھی۔ ان لمحات میں رابرٹ میرا ٹارگٹ تھا۔ میں اسے جتنا بھی نقصان پہنچاتا، میرے حساب سے بہت کم ہوتا۔ اسے ہر سانس پر یہ پتا چلنا چاہیے تھا کہ مالک نے ہر سیر کے لیے سوا سیر پیدا کررکھا ہے۔ اس نے مجھ پر جو ادھار چڑھا رکھا تھا، اس کی سود در سود واپسی کا وقت آن پہنچا تھا۔

میں نے فوکسی کے بل بوتے پر رابرٹ والی اوپل کے عقبی حصے میں جو طوفانی ٹکر رسید کی تھی، اس کے کثیر الجہت نتائج برآمد ہوئے۔ اول، کار کے اندر رابرٹ کا جسم اسپرنگ کے مانند اچھلا اور گاڑی کی چھت سے ٹکرانے کے بعد پسنجرز سیٹ کی پشت گاہ سے متصادم ہوا پھر کچرے سے بھرے ہوئے شاپنگ بیگ کی طرح ''دھپ'' کی آواز کے ساتھ دونوں سیٹوں کے درمیانی خلا میں لینڈ کرگیا۔ یہ گاڑی کا وہی حصہ تھا جہاں پر تھوڑی دیر پہلے رابرٹ پاؤں رکھے بیٹھا تھا۔ دوم، جیسے ہی ریڈ اوپل دو کاروں کے بیچ سے آگے نکلی، فوکسی کی ٹکر کے زور نے یکا یک اس کے اگلے دونوں دروازے کھول دیے۔ اس طوفانی ٹکر نے ریڈ اوپل کا توازن بری طرح بگاڑ دیا تھا۔ رہی سہی کسر دائیں بائیں والی ریس کاروں نے پوری کردی۔ وہ ریڈ اوپل کے کھلے ہوئے اگلے دروازوں کو ٹکریں مارتے ہوئے تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئیں۔ اسی لمحے میں نے ''دے مار، ساڑھے چار'' کے اصول پر ریڈ اوپل کی دُم پر ایک اور ٹکر رسید کردی۔

اوپل کا ڈرائیور اسٹیئرنگ پر سے اپنا کنٹرول کھو چکا تھا۔ میری حالیہ ٹکر نے بڑی بے دردی سے اسے گاڑی کے باہر پھینک دیا۔ اسی اثنا میں عقب سے آنے والی دو کاریں لہراتی ہوئی اوپل کے نزدیک پہنچ گئیں۔ اس وقت ریڈ اوپل جس کیفیت سے دوچار تھی اس کے پیش نظر دونوں کاروں نے یک بیک بریک لگا دیے۔ وہ کوئی تارکول والی عام روڈ نہیں تھی کہ فضا کاروں کے ٹائروں کی ''چرچراہٹ'' سے گونج اٹھتی۔ ریس کے میدان میں تاحد نگاہ سخت برف کی ایک سفید چادر سی بچھی ہوئی تھی۔ اس برفیلی، پھسلواں زمین پر ٹائروں کی رگڑ نے تیز سیٹی ایسی آواز پیدا کی۔ اس کے بعد ایک خوفناک منظر دیکھنے کو ملا۔

بریک لگانے کے بعد دونوں کاریں برفیلی زمین پر پھسلتے ہوئے تیز رفتاری سے آگے بڑھی تھیں۔ ان میں سے ایک سیدھی جاکر ریڈ اوپل میں ٹھکی اور دوسری نے رابرٹ کے مسلح گارڈ کو بڑی بے رحمی سے کچل ڈالا۔ ریڈ اوپل سے ''ایکسپورٹ'' ہونے والا ڈرائیور اوندھے منہ ریس کے ٹریک پر گرا تھا۔ برفیلی زمین سے ہونے والے خوف ناک تصادم نے اس کی مت ماردی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ برآمد ہوگی لیکن عقب سے آنے والی تیز رفتار، پھسلتی ہوئی کار نے اسے چیخنے چلّانے کا موقع ہی نہیں دیا اور بے دردی سے اسے روندتے ہوئے آگے نکل گئی۔ ماحول پر یکا یک سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

ڈرائیور کے بے حس و حرکت جسم نے وہاں موجود لوگوں میں سراسیمگی پھیلا دی۔ تماشائی تیزی سے اس کی جانب بڑھے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد ریڈ اوپل کی سمت بھی گئی۔ ڈرائیور کے باہر گر جانے کے باعث ریڈ اوپل اپنے پہلو میں الٹ گئی تھی۔ اس وقت وہ برفیلی زمین پر چت ''لیٹی'' ہوئی تھی یعنی اس کی چھت زمین سے لگی ہوئی تھی اور چاروں پہیے آسمان کو سلامی دے رہے تھے اور میرا ٹارگٹ رابرٹ اسی چاروں خانے چت الٹی ہوئی ریڈ اوپل کے اندر پھنسا ہوا تھا۔

اس خونیں واقعے نے تفریح سے معمور فضا میں افراتفری مچادی تھی۔ کار ریس کو روک دیا گیا تھا۔ ریس میں حصہ لینے والے لوگوں سمیت تمام افراد کی توجہ ریڈ اوپل اور اس کے ڈرائیور پر مرکوز ہوگئی تھی۔ میں بھی فوکسی کو ایک جانب روک کر جائے وقوعہ کے نزدیک آگیا تھا۔

میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور میرے ذہن نے جو اندازہ قائم کیا، اس کے مطابق اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ ڈرائیور اپنی سانسیں پوری کر چکا تھا۔ اب اس کے لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے بری طرح کچلے ہوئے بدن سے زندگی رخصت ہوچکی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے تک یہی بندہ میری موت کا خواہاں تھا اور مجھے نابود کرنے کے لیے وہ متعدد بار فوکسی پر گولیاں برسا چکا تھا لیکن موت اور زندگی بھلا کب کسی کے اختیار میں ہوئی ہے۔ جس کا وقت پورا ہوجاتا ہے اسے کوئی بچا نہیں سکتا اور جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے.....!

میرے دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے اجتماعی قوت کا عملی مظاہرہ کر کے الٹی ہوئی ریڈ اوپل کو سیدھا کرلیا اور اس کے اندر سے زخمی رابرٹ کو باہر نکال لیا۔ اس کے چہرے سے جابجا لہو رس رہا تھا۔ اندرونی جسمانی ٹوٹ پھوٹ اس کے علاوہ تھی جس کا تخمینہ مکمل ''چیک اپ'' کے بعد ہی لگایا جاسکتا تھا اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ رابرٹ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ شاید اس کے سر پر لگنے والی کسی کاری ضرب نے اسے حواس سے بیگانا کردیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ان دو افراد کے نزدیک چلا گیا جنہوں نے بغل میں اپنے بازو ڈال کر رابرٹ کو سیدھا کھڑا کر رکھا تھا۔

''تم لوگ اسے میری فوکسی میں پہنچا دو۔'' میں نے پریشانی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ''اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں اسے کسی قریبی اسپتال لے جانا چاہتا ہوں۔''

میری درخواست نما پیشکش میں اچھی خاصی معقولیت بھری ہوئی تھی تاہم ایک شخص نے شک آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''تم کون ہو اور..... اس زخمی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''میں رافیل ہوں اور یہ میرا دوست رابرٹ ہے۔''

میں نے موقع محل کی مناسبت سے وضاحت پیش کردی پھر ڈرائیور کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''اس بدبخت نے میرے دوست رابرٹ کو زبردستی اغوا کرلیا تھا اور میں اپنے دوست کو چھڑانے کے لیے اس کے تعاقب میں تھا۔''

''مگر ہم نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، تم فوکسی سے ریڈ اوپل کو ایک کے بعد ایک ٹکر مار رہے تھے۔'' ایک شخص نے اعتراض اٹھایا۔ ''پھر تم اس زخمی کے دوست کیسے ہوسکتے ہو؟''

اس کے سوال میں اگرچہ اچھا خاصا وزن تھا تاہم میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ میں نے وہاں موجود افراد پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر سمجھانے والے انداز میں منت ریز لہجے میں کہا۔

''رابرٹ کے اغوا نے میرے ذہن کو بری طرح منتشر کر رکھا تھا اور میں ہر قیمت پر اس اغوا کار کو روکنا چاہتا تھا۔ جب ہماری گاڑیاں اس کار ریس میں داخل ہوئیں تو میری سمجھ میں یہی آیا کہ جس طرح ٹکریں مار مار کر دوسری کاریں ایک دوسرے کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کر رہی ہیں، مجھے بھی ویسا ہی کرنا چاہیے اور میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ ریس والی کاروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ریڈ اوپل کو اپنی گاڑی سے ٹکریں رسید کرنا شروع کردیں جس

کا جو نتیجہ برآمد ہوا، وہ آپ سب کے سامنے ہے۔"

اس کوہی وادی میں بسنے والے سادہ مزاج لوگوں نے میری سنائی ہوئی کہانی پر یقین کرلیا اور بے ہوش گھائل رابرٹ کو لے کر میری گاڑی کی جانب بڑھنے لگے۔ مالک کا شکر کہ ان میں سے کسی کا دھیان گارڈ کی وردی کی جانب نہیں گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر باوردی مسلح سیکیورٹی گارڈ کی ذات کے حوالے سے ان کے ذہنوں میں درجنوں سوالات ابھرتے۔ اس کے بعد وہ بہ آسانی رابرٹ کو میرے حوالے نہ کرتے۔

جب وہ رابرٹ کو سہارا دے کر پہلی سائبن وانی کے نزدیک پہنچے تو فضا میں کسی ہیلی کاپٹر کی اڑان کی آواز سنائی دی۔ میرے دل نے پکار کر کہا۔ یہ پروفیسر فریڈرک کا بھیجا ہوا ہیلی کاپٹر ہوگا۔ مذکورہ ہیلی کاپٹر کے حوالے سے مجھے بڑی اسٹرانگ فیل آرہی تھی۔ میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں چلّا کر تحکمانہ انداز میں کہا۔

"جلدی کرو... اس مردود کے ساتھی ہیلی کاپٹر میں ادھر ہی آرہے ہیں۔" میں نے بات کرتے ہوئے مردہ سیکیورٹی گارڈ کی جانب اشارہ بھی کردیا۔ "یہ خطرناک جرائم پیشہ افراد ہیں۔ ہم نے ان کے کارناموں کے بارے میں پولیس کو آگاہ کردیا تھا اس لیے یہ لوگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ لوگ یہاں پہنچ گئے تو ہمیں دیکھتے ہی گولی ماردیں گے۔"

میں ان لمحات میں اتنی عمدہ اداکاری کررہا تھا کہ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی میری کہانی پر شک نہیں ہوا۔ ان کی آنکھوں میں ہمارے لیے ہمدردی اور خیرسگالی کے جذبات چمک رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"اگر ہیلی کاپٹر میں آنے والوں نے ہم سے تمہارے بارے میں کچھ پوچھا تو ہم انہیں کیا جواب دیں؟"

"جو حقیقت ہے، وہ انہیں بتادینا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے ریس کے میدان میں جو کچھ دیکھا، من وعن وہی بیان کرنا اور آخر میں کہہ دینا کہ رائیل نامی ایک شخص یعنی میں گن پوائنٹ پر اپنے ساتھی رابرٹ کو لے گیا ہے۔ آپ لوگ اس کی گن کے سامنے کوئی مزاحمت پیش نہیں کرسکے اور زخمی رابرٹ کو رائیل کے ساتھ جانے سے نہیں روک سکے... ویری سمپل!"

"یہ اتنا بھی سمپل نہیں ہے جتنا تم بیان کررہے ہو۔" ایک افلاطون ٹائپ کے شخص نے اعتراض جڑ دیا۔ "یہ گن کا قصہ کہاں سے آگیا؟ ہم نے تو تمہارے پاس کوئی گن نہیں دیکھی۔"

"نہیں دیکھی تو ابھی دکھا دیتا ہوں۔" میں نے ٹوکسی کے ڈرائیونگ سائڈ والے شیشے سے ہاتھ ڈال کر اندر سیٹ پر رکھی ہوئی خطرناک گن AK56 اٹھالی پھر سوال کرنے والے کی نگاہوں کے سامنے سیدھی کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ "لو دیکھ لو، میرے پاس یہ رائفل ہے...!"

گن کا بیرل مذکورہ شخص کی جانب اٹھا ہوا تھا اور میں نے گن کو کچھ ایسے انداز میں تھام رکھا تھا کہ اب تب میں فائرنگ شروع کردوں گا۔ وہ شخص سہم کر "ہینڈز اپ" ہوگیا۔ مجمعے میں موجود دوسرے لوگ بھی سراسیمہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں فائر نہیں کروں گا۔ میں تم لوگوں کا دشمن نہیں ہوں۔ بس، مجھے یہاں سے جانے دیں اور وہ بھی بہت جلدی۔"

ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی اور اب وہ فضا میں دکھائی بھی دینے لگا تھا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا اور... یقیناً میرا اندازہ درست تھا کہ وہ ہیلی کاپٹر وہی تھا جس میں دو گھنٹے پہلے پروفیسر فریڈرک اپنے ریسرچ سینٹر پہنچا تھا۔ اس ہیلی کاپٹر میں پروفیسر کے ساتھ پائلٹ کے علاوہ دو سیکیورٹی گارڈز اور رابرٹ بھی موجود تھا۔ ان دو سیکیورٹی گارڈز میں سے ایک تو اپنے بھیانک انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اسمتھ یا بریڈی؟ اس بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ رابرٹ شدید زخمی اور بے ہوش تھا۔ تازہ ترین اعدادوشمار کے مطابق آنے والے ہیلی کاپٹر میں زیادہ سے زیادہ تین افراد ہوسکتے تھے یعنی پائلٹ، پروفیسر فریڈرک اور اسمتھ یا بریڈی میں سے زندہ باقی بچ جانے والا سیکیورٹی گارڈز ایسا تھا یا نہیں، یہ ہیلی کاپٹر کے زمین پر لینڈ کرنے کے بعد ہی دیکھا جاسکتا تھا اور میں اس وقت سے پہلے ہی رابرٹ کو لے کر دور... بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔

میں تصور میں، آنے والے ہیلی کاپٹر کے بارے میں اندازے قائم کرنے میں مصروف تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ایک سنجیدہ مردانہ آواز تھی اور اس آواز میں تحکمانہ ٹھہراؤ پایا جاتا تھا۔ وہ رابرٹ کو لانے والے افراد سے کہہ رہا تھا۔

"زخمی شخص کو پہلی ٹوکسی میں مت ڈالو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے چونک کر اس معمر شخص کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ "کیا ٹھیک نہیں ہے؟"

''نوجوان ——!'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے تدبر سے جواب دیا۔ ''تمہارے دشمن اس پیلی گاڑی کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اگر تم اس میں یہاں سے روانہ ہوئے تو وہ بہ آسانی تمہیں ڈھونڈ لیں گے۔ ایک تو پیلا رنگ اس برفیلی فضا میں خاصا نمایاں نظر آتا ہے، دوسرے واکس واگن (فوکسی ویگن) اپنی مخصوص شیپ کی وجہ سے فوراً پہچان لی جاتی ہے اور تیسرے یہ مت بھولو کہ تمہارے دشمنوں کے پاس ہیلی کاپٹر بھی ہے۔''

اس عمر رسیدہ، جہاں دیدہ شخص کی کوئی بھی بات بے وزن اور بے معنی نہیں تھی۔ اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ میں حکمت اور دانش بھری ہوئی تھی۔ میں نے قدرے تلخ لہجے میں استفسار کیا۔

''محترم! تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے زخمی دوست کو کندھے پر لاد کر لے جاؤں ——؟''

''میں نے ایسا کب کہا؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اسی طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو پھر آپ کا مطلب یہ ہوگا کہ میں خود کو اور اپنے گھائل ساتھی کو سولومن کیپ (سلیمانی ٹوپی) پہنا کر یہاں سے لے جاؤں تاکہ کوئی ہم دونوں کو دیکھ نہ سکے —— ہیں نا ——!''

''اس واہیات صورتِ حال نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''سیدھی سی بات ہے کہ تم اپنی فوکسی یہیں پر چھوڑ جاؤ اور کسی بھی دوسری گاڑی میں اپنے دوست کو ڈال کر لے جاؤ۔ کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر تم یہاں والی گاڑی کو چھوڑ دینا۔ اگر ہیلی کاپٹر میں آنے والوں نے ہم سے تمہارے یا فوکسی کے بارے میں کوئی سوال کیا تو ہم کہہ دیں گے کہ تم نے یہ سب کچھ گن پوائنٹ پر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ ہم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس کریں گے اور نہ ہی یہاں کسی نوعیت کی ہنگامہ آرائی کریں گے۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

''جی ——'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا پھر میری نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔

ہیلی کاپٹر بتدریج ہماری سمت آ رہا تھا۔ یقیناً ہیلی کاپٹر کے اندر موجود کسی شخص نے طاقتور ٹیلی اسکوپ کی مدد سے پیلی صابن دانی کو کھوج نکالا تھا۔ یکایک میری تشویش میں حد درجہ اضافہ ہو گیا اور میں نے صورتِ حال کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے اس سرد و گرم چشیدہ معمر شخص کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے نوجوان!'' اسی عمر رسیدہ شخص کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''ہم کسی طرح ہیلی کاپٹر میں آنے والوں کو زیادہ سے زیادہ دیر تک یہاں الجھائے رکھنے کی کوشش کریں گے تاکہ تم بہ آسانی یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ تم فوراً اپنے زخمی ساتھی کو اسپتال پہنچاؤ اور خود پولیس اسٹیشن جا کر اس واقعے کی رپورٹ کرو۔ اگر تم نے ہم سے کوئی غلط بیانی نہیں کی تو مجھے یقین ہے کہ تم پر اور تمہارے زخمی ساتھی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں سے بڑی منظم اور مربوط دروغ گوئی کی تھی لیکن میرے اس بیان میں بدنیتی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ میری وقتی مجبوری اور پیشِ نظر حالات کا تقاضا تھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اوکے سر ——!''

☆☆☆

اس کوہی وادی میں مقامی سطح پر جو کار ریس منعقد کی گئی تھی اس میں کوئی بھی اسپورٹس کار شامل نہیں تھی۔ وہ سب ریس میں حصہ لینے والے من چلے مہم جو افراد کی ذاتی استعمال کی عام کاریں تھیں جن میں سے ایک کار اس وقت میرے استعمال میں تھی۔

اس وقت سہ پہر کا عمل تھا۔ پچھلے تین چار گھنٹے میں نے کڑی دوڑ دھوپ میں گزارے تھے۔ مالک کا شکر کہ میں پروفیسر کے ہیلی کاپٹر کی رینج سے بہت دور نکل آیا تھا۔ پروفیسر فریڈرک اس ہیلی کاپٹر کے اندر موجود تھا یا نہیں، اس بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا البتہ ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ ہیلی کاپٹر میں جو کوئی بھی تھا یا تھے، وہ میرے دوست تو ہرگز نہیں تھے۔

میرا سفر جاری تھا اور کار کی عقبی نشست پر رابرٹ نیم جاں بے ہوش پڑا تھا۔ میں وقفے وقفے سے عقبی سیٹ کا منظر دکھانے والے آئینے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی جانب سے میں ایک لمحے کی غفلت نہیں برت سکتا تھا کیونکہ وہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ وہ شیطان کا چیلا، سینئر بونز مین تھا۔ سوسائٹی کے اندر اس کا ایک مقام اور مرتبہ تھا۔ میں اس کی طاقت اور اختیار کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس کے ایما پر میری نیوزی لینڈر پاکٹ سائز دوست کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور میں

''نوجوان ——!'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے تدبر سے جواب دیا۔ ''تمہارے دشمن اس پیلی گاڑی کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اگر تم اس میں یہاں سے روانہ ہوئے تو وہ بہ آسانی تمہیں ڈھونڈ لیں گے۔ ایک تو پیلا رنگ اس بر کھلی فضا میں خاصا نمایاں نظر آتا ہے، دوسرے واکس واگن (فوکسی ویگن) اپنے مخصوص شیپ کی وجہ سے فوراً پہچان لی جاتی ہے اور تیسرے، یہ مت بھولو کہ تمہارے دشمنوں کے پاس ہیلی کاپٹر بھی ہے۔''

اس عمر رسیدہ، جہاں دیدہ شخص کی کوئی بھی بات بے وزن اور بے معنی نہیں تھی۔ اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ میں حکمت اور دانش بھری ہوئی تھی۔ میں نے قدرے تلخ لہجے میں استفسار کیا۔

''محترم! تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے زخمی دوست کو کندھے پر لاد کر لے جاؤں ——؟''

''میں نے ایسا کب کہا؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اسی طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو پھر آپ کا مطلب یہ ہوگا کہ میں خود کو اور اپنے گھائل ساتھی کو سولومن کیپ (سلیمانی ٹوپی) پہنا کر یہاں سے لے جاؤں تاکہ کوئی ہم دونوں کو دیکھ نہ سکے —— ہیں نا ——!''

''اس واہیات صورتِ حال نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''سیدھی سی بات ہے کہ تم اپنی فوکسی یہیں پر چھوڑ جاؤ اور کسی بھی دوسری گاڑی میں اپنے دوست کو ڈال کر لے جاؤ۔ کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر تم یہاں والی گاڑی کو چھوڑ دینا۔ اگر ہیلی کاپٹر میں آنے والوں نے ہم سے تمہارے یا فوکسی کے بارے میں کوئی سوال کیا تو ہم کہہ دیں گے کہ تم نے یہ سب کچھ گن پوائنٹ پر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ ہم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس کریں گے اور نہ ہی یہاں کسی نوعیت کی ہنگامہ آرائی کریں گے۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

''جی ——'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا پھر میری نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔

ہیلی کاپٹر بتدریج ہماری سمت آ رہا تھا۔ یقیناً ہیلی کاپٹر کے اندر موجود کسی شخص نے طاقتور ٹیلی اسکوپ کی مدد سے پیلی صابن دانی کو کھوج نکالا تھا۔ یکایک میری تشویش میں حد درجہ اضافہ ہو گیا اور میں نے صورتِ حال کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے اس سرد و گرم چشیدہ معمر شخص کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے نوجوان!'' اسی عمر رسیدہ شخص کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''ہم کسی طرح ہیلی کاپٹر میں آنے والوں کو زیادہ سے زیادہ دیر تک یہاں الجھائے رکھنے کی کوشش کریں گے تاکہ تم بہ آسانی یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ تم فوراً اپنے زخمی ساتھی کو اسپتال پہنچاؤ اور خود پولیس اسٹیشن جا کر اس واقعے کی رپورٹ کرو۔ اگر تم نے ہم سے کوئی غلط بیانی نہیں کی تو مجھے یقین ہے کہ تم پر اور تمہارے زخمی ساتھی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں سے بڑی منظم اور مربوط دروغ گوئی کی تھی لیکن میرے اس بیان میں بدنیتی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ میری وقتی مجبوری اور پیشِ نظر حالات کا تقاضا تھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''او کے سر ——!''

☆☆☆

اس کوہی وادی میں مقامی سطح پر جو کار ریس منعقد کی گئی تھی اس میں کوئی بھی اسپورٹس کار شامل نہیں تھی۔ وہ سب ریس میں حصہ لینے والے من چلے مہم جو افراد کی ذاتی استعمال کی عام کاریں تھیں جن میں سے ایک کار اس وقت میرے استعمال میں تھی۔

اس وقت سہ پہر کا عمل تھا۔ پچھلے تین چار گھنٹے میں نے کڑی دوڑ دھوپ میں گزارے تھے۔ مالک کا شکر کہ میں پروفیسر کے ہیلی کاپٹر کی رینج سے بہت دور نکل آیا تھا۔ پروفیسر فریڈرک اس ہیلی کاپٹر کے اندر موجود تھا یا نہیں، اس بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا البتہ ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ ہیلی کاپٹر میں جو کوئی بھی تھا یا تھے، وہ میرے دوست تو ہرگز نہیں تھے۔

میرا سفر جاری تھا اور کار کی عقبی نشست پر رابرٹ تاحال بے ہوش پڑا تھا۔ میں وقفے وقفے سے عقبی سیٹ کا منظر دکھانے والے آئینے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی جانب سے میں ایک لمحے کی غفلت نہیں برت سکتا تھا کیونکہ وہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ وہ شیطان کا چیلا، سینئر بونز مین تھا۔ سوسائٹی کے اندر اس کا ایک مقام اور مرتبہ تھا۔ میں اس کی طاقت اور اختیار کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس کے ایما پر میری نیوزی لینڈر پاکٹ سائز دوست کو میری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور میں

حسرت اور بے بسی کی تصویر بنا کایا کو دم توڑتا دیکھتا رہ گیا تھا۔ ان لمحات میں، میں حد درجہ مجبور اور لاچار تھا۔ حالات کچھ اس انداز میں پیش آئے تھے کہ میں کایا کو بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ وقت کی یہی تو خوبی ہے..... کہ جب یہ چال چلتا ہے تو انسان کی ساری حکمت عملی، اختیار اور طاقت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

لیکن اب میں نہ تو لاچار تھا اور نہ ہی بے بس۔ میرا ٹارگٹ اس وقت میری تحویل میں تھا۔ اس کی پشت پر چاہے ''ایس این بی'' ہو یا ''الومیناتی'' ہو اور یا پھر اس کرۂ ارض کی کوئی بھی فعال ایجنسی، میں کسی کے روکنے سے رکنے والا نہیں تھا۔ آج رابرٹ کو میرے جبر سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

ایک بات کا مجھے اطمینان ہو چکا تھا کہ بے ہوش رابرٹ کے پاس ایسا کوئی سائنسی آلہ موجود نہیں تھا جس سے خارج ہونے والے سگنل سے اس کی تازہ ترین لوکیشن کو فائنڈ آؤٹ کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کوئی ذریعہ ہوتا تو اب تک سوسائٹی کا نیٹ ورک رابرٹ کو ٹریس کر کے مجھے چھاپ چکا ہوتا۔

مجھے شدت سے بھوک کا احساس ہوا۔ آج علی الصباح جب میں ایلپن روز والے گیسٹ ہاؤس سے جیسیکا کے ساتھ روانہ ہوا تھا تو ہم دونوں نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ایک کھیل بھی اڑ کر میرے منہ میں نہیں گئی تھی اور اس دوران میں، میں مسلسل ایکشن میں بھی رہا تھا۔ اس مارا ماری کے نتیجے میں بھوک لگنا ایک لازمی امر تھا۔

جب میں ریس کورس گراؤنڈ سے رابرٹ کو لے کر روانہ ہوا تھا تو مقامی لوگوں نے خیرسگالی کے طور پر چند تھیلے بھی کار میں رکھ دیے تھے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق مذکورہ تھیلوں میں اشیائے خورونوش بھری ہونا چاہیے تھی۔ مجھے سردست کسی ایسے محفوظ مقام کی تلاش تھی جہاں پر بیٹھ کر تسلی سے پیٹ پوجا کی جا سکتی ہو اور وہ جگہ رابرٹ کے ٹرائل کے لیے بھی موزوں ہو۔ یقیناً کسی گنجان آباد علاقے میں، میں اس تخم ابلیس کو تختۂ مشق نہیں بنا سکتا تھا۔

جلد ہی مجھے اپنی مرضی کا ایک مقام مل گیا۔ وہ دامن کوہ میں، درختوں کے جھنڈ میں بنا ہوا ایک چوبی کاٹیج تھا۔ مذکورہ کاٹیج بالکل الگ تھلگ ایک ویران جگہ پر تھا۔ نزدیک جا کر پتا چلا کہ اس کاٹیج کی حالت خاصی خستہ ہو چکی تھی۔ بادی النظر میں یہی لگتا تھا کہ طویل عرصے سے کسی انسان کا ادھر سے گزر نہیں ہوا۔ کاٹیج کے چوبی در و دیوار سے ماتمی ویرانی ٹپکتی تھی اور جا بجا جالے بھی لگے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایسے وحشت ناک ویران مقامات عموماً ہارر موویز میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ ''بھوت کاٹیج'' میرے مشن کی تکمیل کے لیے انتہائی موزوں اور مناسب تھا۔ یہاں پر میں بڑی تسلی کے ساتھ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔

میں نے کار کو کاٹیج کی عقبی جانب دور تک پھیلے ہوئے گھنے درختوں کے جھنڈ میں چھپا دیا اور بے ہوش رابرٹ کو کسی بھری ہوئی بوری کے مانند برفیلی زمین پر گھسیٹتے ہوئے کاٹیج کے اندر پہنچا دیا۔ بستی والے مہربان لوگوں نے مجھے جو تھیلے دیے تھے، میں انہیں بھی کاٹیج میں اٹھا لایا تھا۔ کار کو لاک کرنے سے قبل میں نے اس کا فیول وغیرہ چیک کر کے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ منصوبے کی تکمیل کے بعد وہ مجھے... بہ سہولت کسی قریبی آباد علاقے میں پہنچا سکتی تھی۔

سامان کے نام پر میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا بیگ ایلپن روز والے گیسٹ ہاؤس ہی میں رہ گیا تھا البتہ میری آئی ڈی، میرا پاسپورٹ اور دیگر ضروری ڈاکومنٹس میرے لباس میں موجود اور محفوظ تھے۔ میرے پرس میں کریڈٹ کارڈز کے علاوہ نقدی کی صورت میں، ڈالرز اور یورو کی شکل میں اچھا خاصا اماؤنٹ موجود تھا۔ میں اپنی حالیہ پوزیشن میں بھی ڈاکٹر رافیل کی حیثیت سے دنیا میں کہیں بھی سفر کرنے کے لیے آزاد و خودمختار تھا۔ کسی زمانے میں وہ کاٹیج یقیناً کسی انسان یا انسانوں کے زیر استعمال رہا ہوگا۔ کاٹیج کی اندرونی سیٹنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کبھی دو یا دو سے زیادہ افراد سکونت پذیر رہے تھے لیکن پھر طویل عرصے سے وہاں کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔

یہاں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے بے ہوش رابرٹ کو ایک کہنہ سال جالا زدہ بستر پر لٹا دیا اور اس کی مکمل تلاشی لے ڈالی۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اس کی جامہ تلاشی سے مجھے ایک جدید آئی فون، کچھ کرنسی نوٹ اور چند کریڈٹ کارڈز ملے جن کے مطابق وہ ایک بزنس مین تھا جس کا کاروبار دنیا کے متعدد ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنا پاسپورٹ یا کوئی دوسری آئی ڈی کیری کیے ہوئے نہیں تھا۔ اس کے لباس سے برآمد ہونے والا آئی فون آف تھا۔ یا تو اس نے ازخود اپنے سیل فون کو آف کر رکھا تھا یا پھر ریڈ اوپل الٹ جانے کے باعث کوئی بٹن دب جانے سے فون خودبخود آف ہو گیا تھا۔

میں نے رابرٹ کے سیل فون کو آن کرنے کی غلطی نہیں کی کیونکہ میرا یہ عمل کسی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ فون آن ہوتے ہی سوسائٹی کے حساس ٹریکنگ اینڈ ٹریسنگ سسٹم پر اس کی لوکیشن بھی نمایاں ہونے لگتی اور پھر سوسائٹی کا نیٹ ورک فوراً حرکت میں آ جاتا۔ وہ

پچھلے کئی گھنٹوں سے اپنے لوگوں سے رابطے میں نہیں تھا۔ سوسائٹی والے اسے کھوج لگانے کے لیے فوراً سے پیشتر اس کانچ تک رسائل حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے اور میں اپنے بنے بنائے کھیل کو بگاڑنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے رابرٹ کو الف ننگا کرکے باڈی سرچ کا کام بھی مکمل کرلیا۔ میں اپنے اس شک کو رفع کرنا چاہتا تھا کہ کہیں اس کے بدن میں کوئی ٹریکنگ ڈیوائس تو نہیں چھپائی گئی۔ مجھے اس کے بدن کے کسی بھی حصے پر ایسے کوئی بھی آثار نظر نہیں آئے جس سے میں مطمئن ہوگیا کہ سوسائٹی والے کسی بھی ذریعے سے اس کانچ کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ رابرٹ کو بے لباس ہی چھوڑ کر میں تھیلوں کی تلاشی میں مصروف ہوگیا۔ وہ میری نظر میں ننگِ انسانیت تھا لہٰذا اس کا ستر ڈھکا ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایس این بی سوسائٹی میں رابرٹ والی ڈگری تک پہنچنے کے لیے شیطان اپنے چیلوں سے وہ وہ شرمناک، مکروہ اور انسانیت سوز کام کراتا ہے کہ آپ اس کا تصور نہیں کرسکتے۔ میں سوسائٹی کے اندرونی اور بیرونی معاملات سے اچھی طرح آگاہ ہوچکا تھا اسی لیے اس ابلیسی کمیونٹی کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ لوگ طاقت، اختیار اور وسائل میں مجھ پر بھاری سبقت رکھتے تھے۔ وہ انسانوں کے ذہنوں کو تسخیر کرنے کے لیے قبالہ نامی خطرناک جادو کا استعمال بھی کرتے تھے مگر میرا یہ ایمان تھا کہ شیطانی اعمال کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ اگر ابلیسی قوتوں کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑے ہوجائیں تو وہ آپ کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتیں اور میں خم ٹھونک کر ثابت قدمی سے ان کے مقابل کھڑا تھا، اس یقین کے ساتھ کہ اگرچہ میں اکیلا ہوں لیکن میرا مالک میری شہ رگ سے زیادہ میرے قریب ہے۔ میں اپنے مالک کی محفوظ پناہ میں ہوں اور مالک کی مرضی کے بغیر کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

میرے اندازے کے عین مطابق ان تھیلوں میں کھانے پینے کا سامان بھرا ہوا تھا۔ کلب سینڈوچ، ہیم برگرز (پیٹی برگرز) فرائز، سافٹ ڈرنک کے کین اور ایک ہاٹ ڈرنک کی بوتل۔ یہ اشیائے خورونوش دو افراد کے پیٹ بھر کر کھانے کے لیے کافی تھیں۔

میں کانچ کے کچن کو کھوجنے نکل کھڑا ہوا اور چند منٹ میں وہاں کا سروے کرڈالا۔ مذکورہ کچن میں لگے حالوں اور ہر چیز پر جمی گرد سے اندازہ ہوتا تھا کہ عرصہ دراز سے کسی نے اسے استعمال نہیں کیا۔ کچن کے اندر مجھے اپنے مطلب کی بہت ساری چیزیں مل گئیں۔ ان میں نائیلون کی مضبوط ڈوری، تیز دھار چھری، کیروسین آئل کا کین، ماچس کا پیکٹ وغیرہ شامل تھیں۔ میں نائیلون کی ڈوری اور چھری لے کر واپس رابرٹ کے پاس آگیا۔

رابرٹ بدستور عالم بے ہوشی میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ اس جہاں سے اُس جہاں منتقل ہوکر آنجہانی تو نہیں ہوگیا۔ اگر واقعتاً ایسا ہوجاتا تو زندگی بھر مجھے اس کا قلق رہتا۔ اس صورت میں، میں نے اسے جس عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا، وہ دھرا رہ جاتا لیکن مالک کو میری خواہش کی تکمیل منظور تھی، اسی لیے تو سوئے اتفاق وہ میرے ہتھے چڑھا تھا۔

میں نے ننگ دھڑنگ پڑے ہوئے اس راندۂ درگاہِ ایزدی کے ہونہار چیلے کی سانسیں چیک کیں۔ اس کے سینے میں دم ہولے ہولے آجارہا تھا۔ پھر میں نے اس کی نبض ٹٹول کر دیکھی۔ میں کوئی ماہر نبض شناس طبیب نہیں تھا تاہم مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میرا شکار زندہ تھا۔ اس کی نبض دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ ابھی تک آنجہانی جہنم مکانی نہیں ہوا تھا۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ اس لعینِ زماں کا انجام میرے ہاتھوں لکھا ہوا تھا۔

رابرٹ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ یکایک اٹھ کر کانچ سے فرار ہونے کی کوشش کرتا یا نظر بچا کر وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا لیکن قدرت نے اسے میرے نام لکھ دیا تھا۔ وہ میرے لیے ''عطیۂ خداوندی'' تھا لہٰذا اس کی قدر اور حفاظت کرنا مجھ پر لازم تھا۔ میں اپنے واجبات اور فرائض میں جت گیا۔

سب سے پہلے میں نے نائیلون کی ڈوری سے اس کی دونوں کلائیاں کس کر پشت پر باندھ دیں، گویا میں نے اس کی مشکیں کس دی تھیں۔ اس کے بعد میں نے نائیلون کی ڈوری کا ایک مضبوط پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا جو کسی کتے کے پٹے کے مانند اس کی گردن میں فٹ ہوگیا۔ اس پٹے میں سے نائیلون کی ڈوری کو گزار کر میں نے اسے ایک خطرناک پالتو جانور بنا ڈالا پھر میں نے اسے بستر سے نیچے پھینک دیا اور ڈوری کا دوسرا آزاد سرا اپنے قبضے میں کرکے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا اور پیٹ پوجا میں مصروف ہوگیا۔

وہ اگست دو ہزار چودہ کی کوئی تاریخ تھی۔ یہ یورپ میں موسمِ گرما کے دن تھے مگر یورپ کا موسمِ گرما بھی پاکستان کے موسمِ سرما کے برابر ہی ہوتا ہے اور پھر ایلپین رینج کا وہ علاقہ تو خوفناک ٹھنڈک کے معاملے میں اپنی مثال آپ تھا۔

ماؤنٹ زگز پٹ زے کے دامن میں پھیلا ہوا بویرین ایلپن کا کوہی سلسلہ اس موسم میں بھی سفید برف سے ڈھکا دکھائی دیتا تھا اور سردی کا عالم یہ تھا کہ گرم لباس کے باوجود بھی وہ اپنی سختی اور شدت کا برابر احساس دلا رہی تھی۔ میں بے لباس پڑے رابرٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس ملعون نے سوسائٹی والوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر پتا نہیں کتنے مجبور اور بے بس لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ آج یہ خود بے کسی کی تصویر بنا پڑا تھا۔ انسان ظلم و زیادتی کرتے وقت قطعاً یہ نہیں سوچتا کہ کسی دن اس کی باری بھی آسکتی ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے۔ ہمارا ہر اچھا یا بُرا عمل کائنات کی دیوارِ انصاف سے ٹکرا کر صدائے بازگشت کی طرح لوٹ آتا ہے اور اس کائناتی فیصلے کے خلاف دنیا کی کسی بھی عدالت میں اپیل دائر نہیں کی جاسکتی۔

رابرٹ کا بے حس و حرکت جسم زیادہ دیر تک موسم کی شدت کو برداشت نہیں کرسکا۔ میں نے اس کے بدن میں ہلکی جنبش ملاحظہ کی۔ بادی النظر میں اسے ہوش آرہا تھا۔ میں پیٹ پوجا سے نمٹ چکا تھا۔ میں نے ہاٹ ڈرنک کی بوتل اٹھائی اور کسمساتے ہوئے نیم بے ہوش رابرٹ کے نزدیک پہنچ گیا پھر میں نے بوتل کھول کر اس کا سنہری سیال رابرٹ کے زخمی چہرے پر گرادیا۔

کولڈ ڈرنک کے کین میں نے اپنے معدے میں اتار لیے تھے تاہم یہ ہاٹ ڈرنک میرے لیے کسی دلچسپی کی حامل نہیں تھی۔ میں نے آج تک اس محلول کو چکھا تک نہیں تھا حالانکہ زندگی میں بارہا مجھے اس سے مستفید ہونے کے مواقع ملے تھے۔

میری حرکت کے خاصے سودمند نتائج برآمد ہوئے اور یہ ثابت ہوگیا کہ حرکت میں برکت ہے۔ الکحل والے مشروب نے گویا رابرٹ کے زخمی چہرے میں آگ لگادی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی سے عالمِ ہوش میں داخل ہوا تو اس کے حلق سے دردناک چیخ خارج ہوئی۔

میں جس مقصد کو ذہن میں رکھ کر اس کاٹیج میں پناہ گزیں ہوا تھا، اس کے پیشِ نظر میں نے کاٹیج کا دروازہ اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کردی تھیں تاکہ کاٹیج کے اندر ہونے والی کارروائی کے صوتی اثرات بیرونی فضا تک رسائی حاصل نہ کرسکیں۔

تکلیف کی شدت سے رابرٹ نے آنکھیں کھول دیں پھر میکانکی انداز میں اس نے اپنے ہاتھوں کو چہرے کی طرف لانے کی کوشش کی لیکن اس سعی میں اسے ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ تو میں نے اس کی پشت پر نائیلون کی ڈوری سے جکڑ رکھے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو چہرے تک پہنچانے میں تو کامیاب نہ ہوسکا تاہم کھلی ہوئی آنکھوں سے اس نے مجھے اپنے سامنے دیکھ لیا۔

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''کون ہو تم؟''

''قہر کا فرشتہ......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔ ''مجھے قدرت نے تمہیں کڑی سزا دینے کے لیے زمین پر اتارا ہے۔''

اس نے اپنے ہاتھ پاؤں اور گردن کو ہلا کر یہ اندازہ تو لگالیا تھا کہ میں نے اس کی بے خبری میں اسے بری طرح جکڑ کر بے بس کردیا ہے۔ اسے اپنی برہنگی کا بھی پوری طرح احساس ہوچکا تھا۔ میری بات کے جواب میں اس نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں استفسار کیا۔

''آخر میرا قصور کیا ہے......تم میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کررہے ہو؟''

''میں تو تمہارے ساتھ ہمدردی کررہا ہوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے ریس کے میدان میں زخمی حالت میں بے ہوش پڑے ملے تھے۔ میں تمہاری مرہم پٹی کرنے تمہیں اٹھا کر اس کاٹیج میں لے آیا ہوں لیکن سچ کہتے ہیں، بھلائی کا زمانہ نہیں رہا۔ جس کی گردن دباؤ، وہی آنکھیں دکھاتا ہے۔ شاید میں نے تمہیں ہمدردی کے لائق سمجھ کر غلطی کی ہے......''

''اگر تمہاری بک بک ختم ہوگئی ہو تو بتاؤ، تم کون ہو۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میں تمہاری کسی بھی فضول بات پر یقین نہیں کرسکتا۔ اگر اپنی خیریت مطلوب ہے تو جلدی سے میرے ہاتھ اور گردن کو کھول دو۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ مجھے یہاں لاکر تم نے کتنی بڑی مصیبت کو دعوت دی ہے۔''

رسی جل چکی تھی مگر اس کے بل ہنوز موجود تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''میں خطروں کا کھلاڑی ہوں۔ مصیبتوں کی آمد پر میں شادیانے بجاتا ہوں۔ مجھے کبھی بھی اپنی خیریت کی طلب نہیں ہوتی اور جہاں تک تمہاری جکڑ بندیوں کا تعلق ہے تو میں نے تمہیں کھولنے کے لیے نہیں باندھا۔ جب تک میرا کام مکمل نہیں ہوجاتا، تم اسی طرح بے لباس اور بے یار و مددگار کاٹیج کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر پڑے اکڑتے رہو گے۔ بات آئی تمہاری سمجھ میں یا نہیں......؟''

''دیکھو......تم بہت غلط کررہے ہو۔'' وہ اپنے لہجے کو

نرم رکھتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں بولا۔ ''تم نہیں جانتے، میں کون ہوں؟''

''اچھی طرح جانتا ہوں رابرٹ.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''تم نے اپنی ولدیت کا خانہ بدلا ہے۔ تم نے ابلیس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کو اپنا باپ بنالیا ہے۔ تم شیطان کے پجاری ہو اور سوسائٹی میں تمہاری حیثیت سیئر بونز مین کی ہے۔ اتنا کافی ہے یا تمہارا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دوں؟''

وہ میرے منہ سے اپنا تعارف سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ چند لمحات تک وہ مجھے کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھتا رہا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''سچ سچ بتاؤ، تم کون ہو؟''

''ڈاکٹر رافیل!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم نے میری دکھتی رگ دبادی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میں ماہر نفسیات ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میری اپنی نفسیات میں بھی ایک ٹیڑھ ہے۔ اگر کوئی میرا تعاقب کرتا ہے تو پھر میں اپنے غصے کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ تب میں قہر کی طرح اس متعاقب شخص پر نازل ہو جاتا ہوں۔ تم نے بھی ریڈ آڈم اوپل میں میری پیلی فوکسی کا نہ صرف پیچھا کیا ہے بلکہ متعدد بار مجھ پر جان لیوا فائرنگ بھی کی ہے۔ تمہارا یہ قصور کسی بھی قیمت پر قابلِ معافی نہیں ہے۔''

جب میں نے ڈاکٹر رافیل کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک نمودار ہوئی تھی۔ اب جب میں نے ریڈ اوپل اور یلو فوکسی کا حوالہ دیا تو تعارف کی رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔

''تو تم وہی ڈاکٹر رافیل ہو جس نے پروفیسر فریڈرک کی لیبارٹری میں بڑی اعلیٰ درجے کی غنڈا گردی کی ہے۔'' وہ انتہائی لاچار ہونے کے باوجود بھی دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ساتھی ڈاکٹر برجت ہمارے ریسرچ سینٹر کی ایک لڑکی کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔''

''ٹھیک سمجھے!'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

وہ بدمعاش ان نازک لمحات میں بھی عیاری اور چالاکی سے باز نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر برجت کا ذکر کرتے ہوئے ریسرچ سینٹر کی ایک لڑکی کے اغوا کی بات کی تھی۔ وہ مغوی کا نام زبان پر لایا تھا اور نہ ہی یہ بتانے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ ڈاکٹر برجت اپنے ساتھ پروفیسر کی نہایت ہی اہم ریسرچ فائلز بھی اڑا لے گئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''میں ماہر نفسیات ڈاکٹر رافیل ہوں۔ تمہارا چہرہ اور آنکھیں مجھے بتا رہی ہیں کہ اس وقت تمہیں شدید بھوک لگ رہی ہے۔ ایم آئی رائٹ؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''ہیم برگر کھاؤ گے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تم پہلے مجھے آزاد کرو۔'' وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔

''سب سے پہلے میں اپنا لباس پہنوں گا، اس کے بعد کچھ کھانے کے بارے میں سوچوں گا۔''

''تمہاری جکڑ بندی اور بے لباسی میرے کام کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''جب تک میرا کام مکمل نہیں ہو جاتا، تم اسی حالت میں برہنہ اور بندھے پڑے رہو گے اور اگر تم نے ہیم برگر کھانے کا ارادہ کر لیا تو وہ بھی اسی پوزیشن میں کھانا ہو گا۔''

''میرے دونوں ہاتھوں کو تو تم نے پشت پر باندھ رکھا ہے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''کیا تم اپنے ہاتھ سے مجھے برگر کھلاؤ گے؟''

''میں اپنے ہاتھ سے تو تمہیں صرف ایک ہی چیز کھلا سکتا ہوں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کون سی چیز.....؟'' اس کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہو گئی۔

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پوٹاشیم سائنائیڈ!''

''پوٹاشیم سائنائیڈ.....'' اس نے بڑبڑانے والے انداز میں میرے الفاظ دہرائے۔ ''یہ تو دنیا کا خطرناک ترین زہر ہے..... کے سی این!''

''اگر تمہیں کے سی این سے ڈر لگ رہا ہے تو میں اس میں سے پوٹاشیم یعنی K کو الگ کر کے صرف سائنائیڈ کر دیتا ہوں یعنی محض CN۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ تو چلے گا نا؟''

''زہر تو ہر صورت میں زہر ہی ہوتا ہے۔'' وہ لرزتی

ہوئی آواز میں بولا۔ ''پوٹاشیم کو تم ہٹا دو یا ساتھ لگا رہنے دو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے......!''

سردی کی شدت نے اس کے بے لباس جسم پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ وہ اتنا بھی سخت جان نہیں تھا جتنا میں نے اسے سمجھ لیا تھا۔ ایک حیرت انگیز اور بات بھی سامنے آئی کہ وہ حد درجہ بے شرم بھی تھا۔ وہ میرے سامنے الف ننگا پڑا ہوا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں حیا کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ڈھٹائی اور بے غیرتی کی انتہا کو پہنچا ہوا ایک سینئر بونز مین تھا۔

''چلیں، اگر کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر پوٹاشیم کو بھی ساتھ لگا رہنے دیتے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں ضرورت پڑنے پر اس کی جگہ سنکھیا یعنی آرسینک استعمال کر لوں گا۔ آرسینک تو ویسے بھی تم لوگوں کے لیے ایک مقدس زہر ہے کیونکہ علم کیمیا کے پیریاڈک ٹیبل (دوری جدول) پر یہ عنصر نمبر تینتیس پر کھڑا نظر آتا ہے۔ نمبر تینتیس تم لوگوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تمہاری سوسائٹی کی تمام تر کارروائیاں تھرٹی تھری ڈگری پیرلل نارتھ پر ہوتی ہیں اور تھرٹی تھری ڈگری کو سوسائٹی کے اندر ماسٹر ڈگری تصور کیا جاتا ہے...... ہیں نا؟''

وہ ڈاکٹر رافیل کے منہ سے اپنی سوسائٹی کے بارے میں سن کر حیران و پریشان رہ گیا۔ سردی نے پہلے ہی اس کی مت مار رکھی تھی۔ میرے یعنی ڈاکٹر رافیل کے سنسنی خیز انکشافات نے اس کے دماغ کی ایسی کم تیسی کر دی۔ جھرجھراتی ہوئی آواز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''تمہیں...... یہ تمام باتیں...... کس نے...... بتائی ہیں......؟''

''میرے مینٹور نے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''مینٹور...... کون ہے تمہارا مینٹور......؟'' اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''تم اس وقت لباس سے عاری پڑے ہو اس لیے میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تم میرے گرو کا نام سن کر ڈر جاؤ گے اور تمہاری پتلون گیلی ہو جائے گی۔'' میں نے نفرت آمیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کے باوجود بھی میں اپنے در سے تمہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤں گا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میرے گرو...... میرے مینٹور کا نام ہے...... اسد علی!''

اس کے منحوس چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھورا پھر بے یقینی سے بولا۔

''کیا تم علی کو جانتے ہو......؟''

''علی کو تو پوری کائنات جانتی ہے او خچر الانچار......!'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''او بدبخت! کیا تمہیں اتنی بڑی حقیقت کا علم نہیں؟ تم یہودیوں کی، میرے مولا سے ازلی ابدی دشمنی آخر کس کروٹ بیٹھے گی......؟''

میرے مذمتی الفاظ نے اس کے دماغ کی آنکھیں اور کان یک بیک کھول دیے تھے۔ وہ تاریخ کے جھروکوں میں جھانکنے کے بعد قدرے خجالت بھرے انداز میں بولا۔

''میں اسد علی کی بات کر رہا ہوں......''

''پھر ٹھیک ہے!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''میں اسد علی کو ایسے ہی جانتا ہوں جیسے تم اپنے مینٹور شیطان کو جانتے ہو۔ میرے گرو نے مجھ جیسے اور ڈاکٹر برجت جیسے ہونہار افراد کی ایک ٹیم بنائی ہے جس کا مقصد قدم قدم پر سوسائٹی کو جوتے مارنا ہے۔ ڈاکٹر برجت پروفیسر کی اہم ریسرچ فائلز کے علاوہ میرے گرو کی دوست شارو کو بھی ساتھ لے گئی ہے اور میں یہاں پر صرف تمہاری خاطر رکا ہوا ہوں......''

''میری خاطر کیوں......'' اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔ ''آخر تمہیں مجھ سے کیا کام ہے......؟''

اسد علی کا نام سامنے آنے کے بعد اس کے رویے میں ڈرامائی تبدیلی آگئی تھی اور وہ ماحول میں رچی بسی ٹھنڈک کو پس پشت ڈال کر مجھے کریدنے کے عمل میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''مجھے تم سے جو بھی کام ہے وہ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی سرانجام دوں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تختۂ مشق بنانے سے پہلے میں تمہاری تھوڑی خاطر داری کر لوں۔ بتاؤ، ہیم برگر کھاؤ گے یا کلب سینڈوچ؟''

''تم جو بھی دو گے، کھا لوں گا کیونکہ اس وقت میں بہت زور کی بھوک محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کھاؤں گا کیسے۔ تم نے میرے دونوں ہاتھوں کو تو کس کر پشت پر باندھ رکھا ہے......''

''میں ابھی بتاتا ہوں کہ تم کس انداز میں پیٹ پوجا کرو گے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر فوڈ بیگز کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے خوب ڈٹ کر کھایا تھا اس کے باوجود بھی اچھا خاصا کھانا بچ گیا تھا۔ میں نے بچے کھچے کھانے کو رابرٹ

کے سامنے ڈال دیا۔ لفظ ''ڈال'' کی صحت پر شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کو جو بتایا ہے، بہ عین ایسا ہی کیا بھی تھا۔ میں نے مذکورہ کھانے کو رابرٹ کے چہرے کے نزدیک کمرے کے فرش پر اس طرح پھیلا کر رکھ دیا تھا جیسے جانوروں کو ان کا کھا جاڈالا جاتا ہے۔

''لو کھاؤ.....'' میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''شاباش..... ہری اپ!''

اس نے شاکی نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں کتے بلی کی طرح منہ مار مار کر کھاؤں.....؟''

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔ ''سوسائٹی کے اندر سرخروئی حاصل کرنے کے لیے تم جس قسم کی غلیظ حرکتیں کرتے ہو انہیں دیکھ کر تو کتے بلیاں بھی شرما جائیں گے۔ کیا تم لوگ اپنے بگ باس ابلیس کی خوشنودی پانے کے لیے مختلف ناپاک اور حرام جانوروں کی پوٹی نہیں کھاتے ہو؟ کیا تم لوگوں کو سوسائٹی کی تقریبات میں ریڈ وائن میں انسانی خون شامل کر کے نہیں پلایا جاتا؟ سوسائٹی میں نئے آنے والوں کے ضمیر، خمیر اور انا کو مردہ بنانے کے لیے ان کے ہاتھوں سے کیا کیا نہیں کرایا جاتا؟ تم لوگ اپنے گرو ابلیس کو خوش کرنے کے لیے تو جنسی بے راہ روی کے عالمی ریکارڈ توڑ ڈالتے ہو اور کسی کتے کی طرح زمین پر منہ مار کر کھانے میں تمہیں موت آرہی ہے۔ کھاؤ ورنہ.....!''

میں نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا اور کلاشنکوف AK56 کو اس کی جانب سیدھا کرتے ہوئے بے رحمی سے کہا۔

''اس وقت تم میرے پیٹ (PET) کا کردار ادا کر رہے ہو۔ پالتو جانور کبھی اپنے مالک کی نافرمانی نہیں کرتا اور اگر کبھی اس کے ذہن میں سرکشی کا کیڑا کلبلانے لگے تو مالک فوراً سے پیشتر اسے شوٹ کر دیتا ہے.....'' میں نے گن کی نال کو رابرٹ کی تشریف کے اوپر لگاتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔ ''شرافت سے شروع ہو جاؤ ورنہ میں اس گن کی تمام گولیاں تمہاری تشریف کے پاس امانت رکھوانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں اس وقت قطعاً مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میرے چہرے پر موجود تاثرات نے اسے باور کرا دیا تھا کہ میں جو کہہ رہا ہوں اسے کر بھی گزروں گا۔ کسی انسان کی طاقت اور اختیار کا صحیح معنوں میں اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ بے بسی اور بے کسی کی کیفیت سے دوچار ہو۔ جینوئن بہادر اور غیرت مند شخص اپنی جان دے دیتا ہے مگر اپنی عزت و آبرو پر کوئی حرف نہیں آنے دیتا۔ وہ کٹ جاتا ہے مگر جھکتا نہیں لیکن ایسے افراد کی تعداد ہزاروں میں ایک ہوتی ہے۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بے اختیار ہوتے ہی رابرٹ کی طرح گندی نالی کے کیڑے بن جاتے ہیں۔

ان لمحات میں، میں نے اپنی آنکھوں سے اس سینئر بونز مین کو کتوں کے مانند خوراک پر منہ مارتے اور شکم سیری کرتے دیکھا۔ اسے اپنی تشریف عزیز تھی۔ وہ میرے ہاتھوں اس کی چھلنی بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا زندہ رہنے کی خاطر اس نے کتا بننا قبول کر لیا تھا۔ گویا وہ اپنی اصل اوقات پر آ گیا تھا.....!

رابرٹ کو بے چارگی کے اس مقام پر دیکھ کر مجھے دلی مسرت کا احساس ہوا۔ یہ وہی فرعون حاضر زماں تھا جس کے ایک اشارے پر میری ساتھی کایا کو اسنائپر شوٹ کر کے موت کی وادی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ میری طرح اس وقت کایا کی روح بھی رابرٹ کے حشر سے یقیناً لطف اندوز ہو رہی ہوگی۔

کسی نجس جانور کی طرح منہ مار مار کر خوراک کی وافر مقدار اپنے پیٹ میں اتارنے کے بعد رابرٹ نے منت ریز لہجے میں کہا۔

''خدا کے لیے میرے جسم پر کوئی گرم کپڑا ہی ڈال دو۔ میرے وجود کا ایک ایک حصہ ٹھنڈ سے اکڑ چکا ہے۔''

''خدا کے لیے کیوں، شیطان کے لیے کیوں نہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''تم جس کے پجاری ہو، اس کا واسطہ کیوں نہیں دے رہے ہو.....؟''

رابرٹ نے میرے چبھتے ہوئے حقیقت پر مبنی سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے استفسار کیا۔ ''علی اس وقت کہاں ہے؟''

ہنگامی حالات سے گزرنے کے باوجود بھی وہ اپنے مطلب کی بات پوچھنے سے نہیں چوکا تھا۔ خوراک پیٹ میں جانے کے بعد اس کے حواس قدرے بجا ہو گئے تھے تاہم ماحولیاتی ٹھنڈک نے اس کی ہڈیوں کی بینڈ بجا رکھی تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے جسم پر طاری لرزے کو روک نہیں پا رہا تھا۔

''علی نے خود کو ٹرانسفارم کر لیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

''ٹرانسفارم (Transform).....'' وہ عجیب سی

نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بات تمہاری سمجھ میں بیٹھنے پر آمادگی ظاہر کردے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''بس، تمہاری آسانی کے لیے اتنا بتا دیتا ہوں کہ میرے مینٹور نے دنیا داری کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اب وہ صرف ڈوریاں ہلاتا ہے اور ہم سب اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ وہ خود نیک کاموں..... بلکہ نیک کام میں لگا ہوا ہے اور اس کام میں وہ ید طولیٰ رکھتا ہے۔''

''کون سا کام؟'' اس نے متعجب مگر پُراشتیاق نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''نکاح خوانی کا کام۔''

''کیا یہ کوئی مذاق ہے؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''نہیں، یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت بھی میرا مینٹور ایک بیوہ کا نکاح پڑھوا رہا ہے۔''

''کون سی بیوہ؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

میں نے بھی بتانے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیا۔ ''تمہاری والدہ محترمہ۔''

''کیا بک رہے ہو.....؟'' وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''میں تو سچائی بیان کر رہا ہوں۔'' میں نے بہ دستور سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رکھا۔ ''تم نے تو اپنی ولدیت کے خانے میں ابلیس کا نام لکھوا کر اپنی اماں جان کو بیوہ کر دیا ہے۔ اب اس بے چاری نے بھی تو کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کرنا ہے نا۔ میرا مینٹور اس پریشان حال خاتون کے کام نہیں آئے گا تو پھر کون اس کی مدد کرے گا؟''

رابرٹ نے اس بار میری بات کے جواب میں کسی جھنجلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں کسی بھی حال میں اس سے کوئی رورعایت کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''بس، اتنا بتا دو کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''کیا تمہارے پلے کچھ ہے جو میں چاہوں گا؟'' میں نے حقارت بھرے انداز میں پوچھا۔

''تم نے دو تین مرتبہ ذکر کیا ہے کہ تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے.....'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''ہاں بالکل، مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا پھر

''کک..... کیا.....؟'' وہ لکنت زدہ آواز میں بولا۔

''اس ''کیا'' کا میں تمہیں عملی جواب دوں گا۔'' میں نے سنگ دلانہ انداز میں کہا۔ ''میں کرتا جاتا ہوں اور تم دیکھتے جاؤ۔''

وہ متوحش انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے میرے سنگین ارادے کو تو بھانپ لیا تھا تاہم اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ کون سا ''یادگار سلوک'' کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے اسے اوندھا کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''میں اپنے کام کا آغاز ٹیٹو (Tattoo) سے کروں گا۔''

''ٹیٹو..... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس کی وحشت میں دہشت بھی شامل ہوگئی۔

''ٹیٹو کا مطلب ہے ٹیٹو۔'' میں نے گن کو ایک طرف رکھ کر تیز دھار چھری اٹھائی اور بے رحمی سے کہا۔ ''یعنی، پرماننٹ ڈیزائن آن اسکن!''

''آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' وہ روہانسا ہوگیا۔

میں نے اس کی ذہنی اور جسمانی حالت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس وقت تم میرے رحم وکرم پر ہو رابرٹ! میں چشم زدن میں تمہاری زندگی کا چراغ گل کر کے اس دھرتی کو تمہارے ناپاک وجود کے بوجھ سے آزاد کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ اگر میں نے اس کانچ میں تمہیں کتے کی موت مار ڈالا تو پھر میرا پیغام ایس این بی کے کرتا دھرتا افراد تک کون پہنچائے گا۔ میں تم سے پیغام رساں کا کام لینا چاہتا ہوں اس لیے تمہارا زندہ رہنا ضروری ہے۔ لوگ پہلے اپنا پیغام تحریر کرتے ہیں اور اس کے بعد تحریر شدہ کاغذ پر اپنی مہر لگاتے ہیں لیکن میں الٹے دماغ کا ہوں.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں پہلے مہر ثبت کروں گا۔ اس کے بعد اپنا پیغام تمہاری سماعت میں انڈیلوں گا۔ چونکہ یہ پیغام کسی کاغذ پر تحریر نہیں کیا جا رہا، ڈائریکٹ تمہارے اندر اتارا جا رہا ہے چنانچہ میری مہر بھی تمہارے بدن پر ہی لگے گی۔''

اپنی بات کے اختتام پر میں نے بڑی سفاکی کے ساتھ تیز دھار چھری کی نوک سے رابرٹ کی برہنہ پشت پر ڈبل اے گود ڈالا پھر جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''رابرٹ! میں نے تمہاری کمر پر AA کا ٹیٹو بنا دیا ہے جس کا مطلب ہے، اسد علی۔ تم جب تک زندہ رہو گے، یہ ٹیٹو تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔''

میری اس حرکت پر وہ تکلیف کی شدت سے چلانے لگا تھا لیکن مجھے اس کی کسی اذیت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں ان لمحات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا تھا جب کایا نے کربناک کیفیت میں میری بانہوں میں جان دی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ کایا کو آگ لینڈ اسٹریٹ پر اسنائپر شوٹ کیا گیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ کایا کی موت کے پیچھے اسی غلیظ رابرٹ کا ہاتھ تھا۔ بھلا میرے دل میں اس شیطان کے چیلے کے لیے ہمدردی کیسے پیدا ہوسکتی تھی۔

وہ کمر میں اٹھنے والی اذیت بھری ٹیسوں کے باعث چیخ رہا تھا اور میرے لیے اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان جاری ہوگیا تھا۔ میں نے اس کے دونوں پاؤں کو نائیلون کی ڈوری کی مدد سے خوب کس کر باندھ دیا پھر ایک بوسیدہ گرد آلود کمبل اس کے برہنہ جسم پر ڈالنے کے بعد کہا۔

''اس کمبل کو تم میری جانب سے چاکلیٹ کا تحفہ سمجھ لو۔ جب کسی بچے کو انجکشن لگوایا جاتا ہے تو انجکشن کی سوئی سے ہونے والی تکلیف اسے رونے پر مجبور کردیتی ہے۔ اس موقع پر بچے کو چپ کرانے کے لیے ٹافی یا چاکلیٹ دی جاتی ہے۔ میں نے ابھی تمہاری پشت پر AA کا جو انجکشن لگایا ہے اس سے ملنے والے درد نے تمہیں بے حال کردیا ہے لہٰذا ٹھنڈے ٹھار موسم میں گرم کمبل کا تحفہ تمہاری اشک شوئی کے لیے کافی مناسب رہے گا۔''

''لعنت ہو تم پر.....'' وہ نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ ''تم نے میری پیٹھ کو بری طرح زخمی کرڈالا ہے۔''

''تم نے کتے کے مانند شکم سیری کر کے میرے حکم کی تعمیل کی تھی چنانچہ میں بھی تمہاری تشریف میں ہوادان بنانے سے باز آگیا تھا۔'' میں نے اس کی گودی ہوئی پشت کے اوپر سوار ہوتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن ہر بار تو میں باز آنے سے رہا.....!''

وہ گالیاں بکنے کے دوران میں مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔

''میں تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں سے خوف زدہ ہونے والا نہیں ہوں۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''اس وقت میری پشت پر میرا مالک، میرا رب موجود ہے۔ تم اپنے گرو ابلیس کو مدد کے لیے پکارو یا تباہ کا استعمال کرو یا کسی نائٹ ٹیمپلر کی آمد کا انتظار کرو..... اس سے کوئی بھی فرق نہیں پڑنے والا۔ مجھے جو کرنا ہے، وہ ہر صورت کر کے رہوں گا۔''

''کیا ابھی کچھ اور کرنا بھی باقی ہے؟'' اس نے درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہر کہانی اور ڈرامے کا ایک ڈراپ سین بھی ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کاسٹ میں شوٹ ہونے والے اس ڈرامے کا ڈراپ سین ابھی باقی ہے جو اذیت سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس شوٹنگ کے دوران میں تم درد کو برداشت نہ کر کے بے ہوش بھی ہوسکتے ہو لہٰذا میں پہلے اس سین کی آڈیو ریکارڈنگ کروں گا یعنی اپنا پیغام تمہاری سماعت میں محفوظ کروں گا۔ اس کے بعد ڈراپ سین کی ویڈیو ریکارڈنگ کروں گا۔''

''تمہیں جو بھی کرنا ہے، جلدی کرو۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''یہ تکلیف اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی.....''

''تم نے آج تک صرف تکلیف کا نام سنا ہے، کبھی اس تجربے سے نہیں گزرے۔'' میں نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آج میں تمہیں اس عظیم تجربے کا اعزاز بخشوں گا۔''

وہ ایک مرتبہ پھر مجھے غلیظ گالیاں دینے لگا۔ میں نے اس کی بے ہودہ گوئی کی پروا نہ کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا پیغام نہایت ہی سادہ اور مختصر ہے۔ تم اپنی سوسائٹی کے ذمے دار افراد کو بتاؤ گے کہ اگر دشمنی کے اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کرنا ہے تو آئندہ دو روز کے اندر میری ساتھی بینا کو بخیر و عافیت اس کے اپارٹمنٹ واقع کراچی، پاکستان پہنچا دیا جائے۔ علاوہ ازیں سوسائٹی سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص کبھی بھول کر بھی میرا راستہ کاٹنے کی کوشش نہ کرے۔ میں بھی سوسائٹی اور اس کے اندرونی و بیرونی معاملات کو اپنے ذہن سے ڈیلیٹ کردوں گا۔ میرا یہ مطالبہ انتہائی معقول اور جائز ہے۔ اگر میری بات تمہاری سوسائٹی کی سمجھ میں آگئی تو ٹھیک..... بصورت دیگر سوسائٹی اپنی تباہی و بربادی کی خود ذمے دار ہوگی۔''

ایس این بی کے کرتا دھرتا خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ ان کے اشارۂ ابرو پر دنیا کا معاشی، سیاسی اور اخلاقی نظام درہم برہم ہوکر رہ جاتا تھا۔ میرے اس مطالبے کو وہ اپنے پاؤں کی ٹھوکر کے قابل بھی نہ سمجھتے۔ وہ تو مجھے محض اس لیے رعایت دے رہے تھے کہ انہیں میری ضرورت تھی۔ وہ مجھے اپنی سوسائٹی کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ میں ان کی طاقت اور اختیار سے بخوبی آگاہ تھا۔ میں نے اس رسّاکشی کو ختم کرنے کے لیے

ایک چانس لیا تھا اور مجھے ذرا سی بھی امید نہیں تھی کہ وہ لوگ میری دھمکی سے ڈر کر چپ سادھ لیں گے۔ بہرحال اتمام حجت کے طور پر میں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ آگے ان کی مرضی۔ اب بال ان کی کورٹ میں تھی۔ اگر میری بات ان کے پلے نہ پڑی تو پھر بھی ٹھیک ہے.... تنگ آمد، بجنگ آمد!

"اوکے.... میں تمہارا پیغام.... اپنے سینئرز تک پہنچا دوں گا۔" وہ دانتوں پر دانت جما کر جسمانی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے بولا۔ "اب تم مجھے یہاں سے جانے دو...."

"ایسے کیسے جانے دوں تمہیں....؟" میں نے دھتکارنے والے انداز میں کہا۔ "کیا میں تمہاری فرمائش پوری کرنے کے لیے اپنا کام ادھورا چھوڑ دوں؟"

"تم نے مجھے اذیت کی انتہا سے گزار دیا ہے۔" وہ کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا اب بھی کوئی کام باقی بچا ہے۔ تم انسان نہیں، درندہ ہو....!"

"سبحان اللہ میرے مالک....!" میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ "ایک وحشی بھیڑیا مجھے انسان ماننے کو تیار نہیں۔ تمہاری اس دنیا میں کیا کیا کھیل تماشے ہوتے ہیں...." لمحاتی توقف کر کے میں نے چھری کو ریڈالرٹ کیا پھر رابرٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"رابرٹ! یہ نہیں سمجھنا کہ میں نے تمہارے ہاتھ پاؤں اس لیے باندھے ہیں کہ میں تمہاری قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ہرگز نہیں! میرا مالک ایسی جانور کی قربانی قبول نہیں کرتا۔ میں تو ایس این بی کی نظر میں تمہیں نمونۂ عبرت بنانا چاہتا ہوں۔ جس طرح بلڈرز کسی رہائشی اسکیم میں سب سے پہلے ایک اپارٹمنٹ کا ماڈل تیار کر کے لوگوں کو گھیرنے کا آغاز کرتے ہیں بالکل اسی طرح میں تمہیں اپنی دشمنی کا ماڈل بنا کر سوسائٹی کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ کل کلاں اگر سوسائٹی سے وابستہ کسی شخص کے دل میں مجھ سے پنگا لینے کا درد اٹھے تو اس کے علم میں یہ بات ہو کہ اس دشمنی کے نتیجے میں اس کا کیا حشر نشر ہو سکتا ہے...." لمحاتی ٹھہراؤ کے بعد میں نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"تمہارے کانوں کے بالائی حصے کافی اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں اور مجھے خدشہ محسوس ہو رہا ہے کہ آگے چل کر یہ کان تمہارے گرو ابلیس کے کانوں کے مانند لمبوترے اور نوک دار بن جائیں لہٰذا ان کی مناسب چھنگائی بہت ضروری ہے...."

اپنی بات کے اختتام پر میں نے تیز دھار چھری کی مدد سے رابرٹ کے دونوں کانوں کے بالائی حصوں کو یکے بعد دیگرے لگ بھگ ایک ایک انچ کاٹ ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے دردناک آوازیں خارج ہونا شروع ہو گئیں۔ میں نے اس کی تکلیف کی پروا کیے بغیر سفاکی سے کہا۔

"تمہیں میرا شکرگزار ہونا چاہیے کہ میں تمہاری حجامت کر کے تمہیں انسان بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ قسم مالک کی.... اگر تمہارے مرشد کی طرح تمہارے سر پر دو سینگ اور تمہاری تشریف کے مقام پر کوئی ایروشیپ دم بھی نکلی ہوتی تو میں انہیں بھی جڑ سے اکھاڑنے میں کسی تردد سے کام نہیں لیتا۔"

وہ میرے گھٹنوں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ تکلیف کی شدت اس سے ماہیٔ بے آب کے مانند تڑپنے کا تقاضا کر رہی تھی لیکن وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور جسم کے دیگر حصوں کو آزادانہ حرکت دینے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے اپنے مشن کا آخری مرحلہ طے کرتے ہوئے اسے سیدھا کیا پھر اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر اس کی پرغرور منحوس ناک کی پھنگی کو کاٹ ڈالا۔

وہ ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند ڈکرانے لگا۔ یقیناً اس کی آہ و بکا اور چیخ و پکار کا میچ سے باہر بھی جا رہی ہوگی لیکن ان لمحات میں مجھے اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ میرے اس عمل کا کیا ردعمل سامنے آتا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا تھا اس سے میرے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔ کایا کی موت سے میرا دل مسلسل بوجھل رہنے لگا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جگر سے خون رس رہا ہو۔ رابرٹ کو نمونۂ عبرت بنانے کے بعد مجھے اپنے وجود کے اندر گہرا سکون اور اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس کے اوپر سے اتر گیا۔ اس کے ساتھ مزید کسی کارروائی کی ضرورت نہیں تھی۔

اس خونیں کھیل تماشے کے دوران میں، میں نے ڈاکٹر رائفل کی حیثیت میں رہتے ہوئے رابرٹ سے متعدد جھوٹ بولے تھے۔ اس دروغ گوئی کو دوام بخشتے ہوئے میں نے اس لوٹ پوٹ ہوتے شیطان کے چیلے سے کہا۔

"میں یوریرین ایلپس کے ہوٹل ایڈل وائس میں ٹھہرا ہوا ہوں اور مزید دو روز تک وہیں پر قیام پذیر رہوں گا، وہی ہوٹل ایڈل وائس جس میں گزشتہ رات ایک خوف ناک دھماکا ہوا تھا اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مذکورہ دھماکا پروفیسر فریڈرک کے کمرے میں ہوا تھا جس کی اطلاع پا کر تم پروفیسر کے ہمراہ ریسرچ سینٹر سے سیدھے ہوٹل ایڈل وائس (Edelweiss) پہنچے تھے۔ میں دو روز تک اس ہوٹل میں رک کر اپنی دوست بینا کے فون کا انتظار کروں گا۔ اگر تم لوگوں نے میری دوست کو بحفاظت پاکستان پہنچا دیا اور اس نے فون پر مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دے دی تو سمجھ لینا، ہماری دشمنی ختم ہو گئی۔ بصورتِ دیگر خوف ناک نتائج کی ذمے داری

تمہارے سر پر ہوگی اور اگر....." میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چٹانی لہجے میں کہا۔

"اگر تمہارے دل میں مجھ سے انتقام لینے کا کیڑا کلبلائے تو سیدھا ہوٹل ایڈل وائس آجانا۔ میں تمہیں لاحول پڑھ کر ویلکم کہوں گا....!"

کانوں اور ناک کی چھنکائی کے نتیجے میں جاری ہونے والے خون نے اس کے چہرے کو تر بتر کر کے کافی بھیانک بنا دیا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ میں اس کی گلوخلاصی کر کے کاٹیج سے رخصت ہونے والا ہوں تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے..... تم نے مجھے کہاں رکھا ہوا ہے.....؟"

"تم نے جرمنی کے مشہور و معروف جنگل "بلیک فاریسٹ" کا نام سنا ہے؟"

وہ خون آلود چہرے والی مندی کو مضحکہ خیز اثباتی جنبش دیتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "ہاں، ہاں..... کیا اس وقت ہم بلیک فاریسٹ میں ہیں؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "یہ وہائٹ فاریسٹ ہے۔"

"وہائٹ فاریسٹ.....!" اس کے لہجے سے حیرانی جھلکنے لگی۔ "پہلے کبھی سنا نہیں اس کے بارے میں.....؟"

"یہ ابھی ابھی وجود میں آیا ہے۔ یہ میرے ذہن کی تخلیق ہے۔ تم اسے بلیک فاریسٹ کا گورا چٹا کزن سمجھ لو۔ یہ پہاڑی سلسلہ تاحدِ نگاہ سفید برف سے ڈھکا ہوا ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے اس پر الوداعی نگاہ ڈالی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا آئی فون آن کر کے ادھر ہی چھوڑ دوں گا۔ فون کے آن ہوتے ہی سوسائٹی کے سسٹم پر تمہاری پن لوکیشن نمایاں ہوجائے گی پھر تمہارے چاچے ماموں تمہاری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے اور بہت جلد وہ تمہیں اس کاٹیج میں، مادر پدر آزاد حالت میں پالیں گے..... ورسٹ آف لک!"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

میری دلی تمنا تو یہی تھی کہ رابرٹ فلی چارجڈ حالت میں میرے ہتھے چڑھے تاکہ اس سے دو دو ہاتھ کرنے میں مجھے مزہ آئے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے بازوؤں میں کتنا دم خم ہے۔ میں اسے اٹھا کر جھٹکنا چاہتا تھا اور جھٹک کر پٹخنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر وہ مجھے پہلے سے جھٹکا اور پٹخا ہوا ملا تھا۔ ڈوجنگ کار ٹائپ کی اس ریس نے رابرٹ کی وہ درگت بنائی تھی کہ وہ کسی بیمار کچوے کی صورت میرے حصے میں آیا تھا لہٰذا میں نے اس کے میرٹ پر ٹریٹ کرتے ہوئے اس کے ساتھ کافی "شاندار" برتاؤ کیا۔ وہ میری خاطر داری کو زندگی بھر بھول نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر اپنے کارنامے کے ایسے نشانات ثبت کر دیے تھے جنہیں مٹانا شاید پلاسٹک سرجری کے بس کا کام بھی نہیں تھا اور اس کی پشت پر لگنے والا AA کا ٹھپا علاوہ ازیں تھا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت کس حال میں ہوگا۔ میں کاٹیج کے اندر اسے جس کسمپرسی کی حالت میں بے یارومددد چھوڑ آیا تھا اس میں اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ درد اور اذیت کی بالائی منازل سے گزر کر یا تو دوبارہ بے ہوش ہوگیا ہوگا اور یا پھر ہوش میں تھا تو مجھے مغلظات میں تول رہا ہوگا۔ حسبِ وعدہ میں اس کا سیل فون آن کر کے کاٹیج کے اندر ہی رکھ آیا تھا۔

میں نے رابرٹ کو بتایا تھا کہ آئندہ دو روز تک میں بویرین ایلپس کے ہوٹل ایڈل وائس میں قیام کروں گا لہٰذا کاٹیج سے نکل کر میں سیدھا مذکورہ ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ علی الصباح میں نے ریس میں استعمال ہونے والی اس کار کو ایڈل وائس کے نزدیک پارک کر دیا اور خود ایک پرائیویٹ کار پکڑ کر میونخ کی جانب روانہ ہوگیا۔

پروفیسر فریڈرک کے ریسرچ سینٹر پر جب ہم نے اپنے آپریشن کا آغاز کیا تھا تو میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر جیسیکا سے کہا تھا۔ "اگر خدانخواستہ کسی اپ سیٹ کے نتیجے میں ہم بچھڑ گئے تو تم میونخ کے ہوٹل ایڈن میں ایڈتھ کے نام سے قیام کرنا۔ میں تمہیں وہیں آکر ملوں گا۔"

بعض اوقات انسان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ دیکھتے ہی دیکھتے عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ اسی نوعیت کا معاملہ پیش آگیا تھا۔ پروفیسر کے ریسرچ سینٹر پر زبردست "اپ سیٹ" ہوگیا تھا اور جیسیکا ہنگامی حالات میں شارو کو لے کر مجھ سے پہلے بذریعہ ہیلی کاپٹر سینٹر سے اڑ گئی تھی۔ اگر جیسیکا کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی تو طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے ہوٹل ایڈن میں میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ جیسیکا مذکورہ ہوٹل کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی اسی لیے میں نے ہوٹل ایڈن کا رخ کیا تھا تاکہ جیسیکا اور شارو سے ملاقات کر سکوں۔

ہوٹل ایڈن (Eden) میونخ کے سینٹرل ریلوے اسٹیشن کے نزدیک واقع تھا۔ تین روز پہلے میں نے آنجہانی نکلس کی طرح دار بیوہ ایڈتھ کے ساتھ اس ہوٹل میں قیام کیا

تھا۔ ایک دن اور دو رات ایڈتھ کے ساتھ نشاط انگیز لمحات گزارنے کے بعد میں اپنے مشن پر ایلپین رینج کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ ایڈن ہوٹل میں، میں نے تین روزہ قیام کا کرایہ ادا کیا ہوا تھا۔ میرے جانے کے بعد ایڈتھ نے دو روز مزید وہاں رکنا تھا لیکن وہ اس پروگرام پر عمل کرنے کی پابند نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ اسی کے ہاتھ میں تھما دیا تھا کہ وہ چاہے تو مزید دو دن تک ہوٹل ایڈن کی میزبانی کا لطف اٹھالے اور اگر اس کا موڈ وہاں سے کوچ کرنے کا ہو تو وہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے آزاد تھی۔

ہوٹل کے ریسیپشن کی طرف بڑھتے ہوئے میں عجیب سی کشمکش کا شکار تھا۔ اصولاً اور واقعتاً تو مجھے خوش باش ہونا چاہیے تھا کہ میں اپنی متاع عزیز شارو کے پاس جارہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں، میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ میرے اندر ایک بے نام سی بے چینی اور بے کلی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اسٹرانگ فیل آرہی تھی کہ..... ہنوز دلی دور است!

میں نے ریسیپشنسٹ لڑکی کے ''گڈ مارننگ سر'' کا جواب دینے کے بعد شائستہ لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کے ہوٹل میں دو لیڈیز ٹھہری ہوئی ہیں جن میں سے ایک کا نام ایڈتھ ہے۔ کیا آپ مجھے ان کے کمرے کے بارے میں گائڈ کرسکتی ہیں؟''

اس وقت ہوٹل ایڈن کے ریسیپشن پر کُل تین لڑکیاں موجود تھیں جن میں سے ایک کی شکل مجھے شناسا سی لگی لیکن مجھے یاد نہیں آیا کہ اسے پہلے میں نے کہاں دیکھا ہے۔ میں نے جس ریسیپشنسٹ سے استفسار کیا تھا اس نے پوچھا۔

''سر! آپ کا نام؟''

مبینہ متوقع شناسا ریسیپشنسٹ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی مخاطب کو جواب دیا۔ ''رافیل..... ڈاکٹر رافیل۔''

''اوکے سر۔ میں ابھی چیک کرکے بتاتی ہوں۔'' وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے کمپیوٹر کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے یکبارگی اس حسینہ کی طرف دیکھا جو وقفے وقفے سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو وہ بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''سر! کہیں آپ اپنی ساتھی ایڈتھ کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے.....؟''

میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''میری ساتھی ایڈتھ..... کیا مطلب؟''

''سوری سر!'' پہلی والی نے اپنے کمپیوٹر سے نگاہ ہٹانے کے بعد بتایا۔ ''اس وقت ہمارے ہوٹل میں ایڈتھ نام کا کوئی مہمان قیام پذیر نہیں ہے۔''

''سر! آپ کی ساتھی ایڈتھ کل چیک آؤٹ کرگئی تھی۔'' دوسری والی نے انکشاف انگیز انداز میں مجھے بتایا۔ ''آپ دونوں تین روز پہلے رات کے آخری پہر ہمارے ہوٹل آئے تھے مگر آپ ایڈتھ سے پہلے ہی کہیں چلے گئے تھے۔ اس رات میں نے ہی آپ دونوں کے لیے ایک ڈبل بیڈروم بک کیا تھا۔''

اب مجھے یاد آگیا کہ اس ریسیپشنسٹ کی شکل مجھے دیکھی بھالی کیوں لگ رہی تھی۔ یقیناً اسی لڑکی نے ہمیں ڈبل بیڈروم الاٹ کیا تھا۔ ہماری باہمی گفتگو کے تناظر میں پہلی والی نے مجھ سے پوچھا۔

''سر! آپ کا مسئلہ حل ہوگیا.....؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اس وقت اس ایڈتھ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو کل ایک اور لڑکی کے ساتھ آپ کے ہوٹل میں آکر ٹھہری ہے۔''

''مطلب، دونوں ایڈتھ الگ الگ ہیں؟'' اس نے بھویں سکیڑتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

''ہاں، بالکل۔'' میں نے زور دے کر کہا پھر جیسیکا کا حلیہ بیان کرنے کے بعد اضافہ کیا۔ ''میں اس ایڈتھ کی بات کر رہا ہوں۔''

ایڈتھ اور جیسیکا کے قد کاٹھ اور نقش ونگار میں گہرا تفاوت پایا جاتا تھا۔ میری وضاحت پر دوسری والی نے کہا۔

''سر! اس خال وخط کی کوئی لیڈی ہمارے ہوٹل میں قیام پذیر نہیں ہے۔''

''اور میں نے آپ کو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کی لسٹ کو چیک کرکے بھی بتادیا ہے۔'' پہلی والی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر تیسری ریسیپشنسٹ لڑکی بھی بیچ میں کود پڑی۔ اس نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ نے اپنا نام کیا بتایا ہے؟''

''رافیل۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ڈاکٹر رافیل فرام اسپین۔''

ہماری گفتگو میں شامل ہونے والی اس تیسری ریسیپشنسٹ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اثبات میں

گردن ہلائی اور بولی۔ ''آپ کے لیے میرے پاس ایک لیٹر ہے۔''

''کیسا لیٹر؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوئی۔ ''سر! کیا آپ کسی ڈاکٹر برجت کو جانتے ہیں؟''

''یس..... آف کورس۔'' میں نے ترت جواب دیا۔ ''ڈاکٹر برجت کا تعلق برلن سے ہے۔ وہ میری سینئر فیلو ہیں۔ ہم نے کافی عرصہ ایک ساتھ ریسرچ ورک کیا ہے۔ ہماری فیلڈ جینیٹک انجینئرنگ ہے۔''

''ایسولیوٹیلی کریکٹ!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ ہی وہ ڈاکٹر رائیل ہیں جس کا مجھے انتظار تھا.....'' پھر اس نے جھک کر ریسپشن کے نیچے بنی ہوئی کسی دراز میں سے ایک لفافہ برآمد کیا اور مذکورہ لفافے کو میری سمت بڑھاتے ہوئے سادگی سے بولی۔

''کل شام میں ایک شخص یہ لیٹر مجھے دے گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کوئی ڈاکٹر رائیل اس ہوٹل میں آکر اپنی دو ساتھیوں ایڈتھ اور شارو کے بارے میں استفسار کرے گا۔ اس کی معلومات کے مطابق ایڈتھ کسی شارو نامی لڑکی کے ساتھ ہمارے ہوٹل میں اسٹے کرنے والی تھی لیکن ان دونوں کو یہاں بھیجنے والی ڈاکٹر برجت نے اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلی کردی ہے۔ لیٹر دینے والے شخص نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر رائیل اس تحریر کو پڑھ کر نئے پروگرام کے بارے میں بہ آسانی سمجھ جائے گا۔''

اس فربہ اندام خوش شکل ریسپشنسٹ نے مجھے جو تفصیل بتائی اس میں کام کی بات صرف ایک ہی تھی کہ جیسیکا، شارو کو لے کر اس ہوٹل میں نہیں آئی تھی۔ وہ کہاں چلی گئی تھی اس حوالے سے مذکورہ لیٹر کو پڑھنے کے بعد ہی معلومات حاصل کی جاسکتی تھیں۔ میرا یہ احساس بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ منزل ابھی مجھ سے دور تھی۔

میں نے تشکرانہ نظر سے اس گول مٹول پُرکشش حسینہ کو دیکھا اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مذکورہ لیٹر کو اپنے پاس رکھ لیا پھر جب میں جانے کے لیے مڑا تو اس جاذبِ نگاہ ریسپشنسٹ نے مجھ سے کہا۔

''سر! میرا نام ارنا (Erna) ہے۔ کیا میں آپ سے ایک سوال کرسکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا جینیٹک انجینئرنگ کے ذریعے انسان اپنی عمر کو روک سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' میں سب سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''شاید مجھے ڈھنگ سے سوال کرنا نہیں آیا۔'' وہ خجالت آمیز لہجے میں بولی۔ ''سر! آپ جینیٹک انجینئرنگ پر کام کر رہے ہیں۔ یہ بہت ہی اہم اور حساس سبجیکٹ ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کافی کچھ پڑھ رکھا ہے لیکن آپ چونکہ اس فیلڈ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے آپ کے جواب کو میں زیادہ مستند سمجھوں گی.....'' وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''سر! میں دراصل یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا جینیٹک انجینئرنگ کی مدد سے انسان اپنی جوانی، حسن اور صحت کو کسی ایک مقام پر ہمیشہ کے لیے روک کر رکھ سکتا ہے۔ یعنی وہ جس عمر میں اس سائنس سے استفادہ کرے پھر اس کی عمر وہیں پر رک جائے اور وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک ویسے کا ویسا ہی رہے؟''

''اب سمجھا!'' میں نے ارنا نامی اس حسینہ کی توقع پر پورا اترتے ہوئے کہا۔ ''بالکل، اس حوالے سے ہماری ریسرچ جاری ہے اور ہم اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل کرچکے ہیں۔ ہم نے اسے ''اسٹے ینگ'' کا نام دیا ہے۔ عنقریب، اس موضوع پر کوئی بڑی نیوز بریک ہونے والی ہے۔''

ارنا کے چہرے پر خوشی چمک اٹھی، جوش بھری آواز میں بولی۔ ''کیا مجھے آپ کا کانٹیکٹ نمبر مل سکتا ہے سر؟''

اس کے لہجے میں ایک خاص نوعیت کی التجا پائی جاتی تھی۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''سوری ارنا! میں سیل فون یوز نہیں کرتا۔''

''آپ سے رابطے کا کوئی اور ذریعہ؟'' وہ آس بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''آپ ڈاکٹر برجت کو گوگل کریں۔'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ''ہم سب لوگ اس وقت ڈاکٹر برجت کے انڈر کام کر رہے ہیں۔ اس سائٹ پر آپ کو اپنی مرضی کی معلومات حاصل ہوجائیں گی۔''

''تھینک یو سو مچ سر!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

میں ہوٹل ایڈن سے باہر نکل آیا۔

میں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ارنا سے جان چھڑالی

تھی تاہم میں نے نہ تو اس کے ساتھ کوئی غلط بیانی کی تھی اور نہ ہی اسے مس گائڈ کیا تھا۔ جیسیکا نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر برجت والی آئی ڈی کا پروفیسر فریڈرک کے ریسرچ سینٹر پر استعمال کرنے سے پہلے اس نے جینیٹک انجینئرنگ کے حوالے سے ایک ویب سائٹ بھی بنائی تھی جہاں اس کی تمام ''سوکالڈ'' ریسرچ کا ریکارڈ موجود تھا۔ اگر ارنا گوگل کرتی تو اس موضوع پر اس کی معلومات میں خاطر خواہ صحت مند اضافہ ہوسکتا تھا۔ ڈاکٹر برجت کی ویب سائٹ پر کوئی بھی چیز غلط نہیں تھی، یہ الگ بات کہ وہ تمام تر ریسرچ جیسیکا (ڈاکٹر برجت) نے بھی خواب وخیال میں کی تھی اور نہ ہی عملاً بھی اس کام میں حصہ لیا تھا۔

ارنا سے حاصل ہونے والے لیٹر نے میرے اندر کھلبلی مچادی تھی۔ جیسیکا نے ہوٹل ایڈن میں قیام کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا تو یقیناً اس کی کوئی بہت بڑی وجہ رہی ہوگی جس کی تفصیل اس لیٹر کے اندر ہونا چاہیے تھی۔ ویسے ایک بات تو ثابت ہوگئی تھی کہ جیسیکا میرے ساتھ مخلص تھی۔ اگر اس کی نیت میں میرے لیے کوئی کھوٹ ہوتی تو وہ ایک بار میری نظر سے اوجھل ہوجانے کے بعد پھر کبھی مجھ سے رابطہ نہ کرتی۔ ان لمحات میں مجھے شدید بھوک بھی محسوس ہورہی تھی اور یہ کم وبیش لنچ کا وقت بھی تھا لہٰذا میں ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی ایک معیاری ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔

ڈائننگ ہال میں، میں نے اپنے لیے ایک الگ تھلگ ٹیبل کا انتخاب کیا۔ مذکورہ ٹیبل ڈائننگ ہال کے ایک دور افتادہ کونے میں واقع تھی اور اس کے اریب قریب کی بیشتر میزیں خالی تھیں۔ ایک صحت مند لنچ کا آرڈر دینے کے بعد میں نے جیسیکا والے لیٹر کو کھول لیا۔ اس خط کے حوالے نے میرے دماغ میں اتھل پتھل برپا کررکھی تھی۔ جب تک میں اس تحریر کو پڑھ نہیں لیتا، مجھے قرار نہیں آسکتا تھا۔

کھانا پلیس ہونے میں تھوڑا وقت تھا لہٰذا میں اپنے دماغ کو سامانِ سکون مہیا کرنے کے لیے نیک کام میں مصروف ہوگیا۔ وہ طویل خط شستہ ہسپانوی زبان میں تھا۔ جیسیکا نے مجھے میری فرضی آئی ڈی سے مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''رافیل! ایک بات کا اطمینان رکھو کہ گنڈو کی طرح ارنا بھی ایجنسی کے لیے کام کرتی ہے۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کرکے یہ لیٹر تم تک پہنچایا ہے۔ اگر اس لیٹر کی ڈیلیوری کے وقت ریسپشن پر ارنا کے علاوہ ہوٹل اسٹاف کے دیگر افراد بھی موجود ہوئے تو ارنا تم سے ہلکی پھلکی گفتگو کرکے ماحول کو نارمل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس وقت جب کہ تم یہ خط پڑھ رہے ہو تو تمہیں ارنا کے بارے میں کہی گئی میری ہر بات کا یقین آگیا ہوگا۔

''آئی ایم رئیلی ویری سوری کہ میں تمہیں پروفیسر فریڈرک کے ریسرچ سینٹر پر چھوڑ کر نکل گئی۔ تمہیں یقین کرنا ہوگا کہ یہ میری مجبوری تھی۔ میں نے اس مشن میں ریسرچ سینٹر والے آپریشن کے لیے صرف پندرہ منٹ کا ٹائم رکھا تھا اور اس مدت میں ایک منٹ کیا، ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی مجھے گوارا نہیں تھی کیونکہ ایک سیکنڈ کی کمی بیشی سے اس مشن کے ساتھ جڑے ہوئے اگلے کئی مشن بری طرح متاثر ہوسکتے تھے جن کے بارے میں پہلے میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا مگر اب ضرور بتاؤں گی۔ میں اپنے اس مشن کو کسی بھی طور ناکام ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ میرے لیے زندگی اور موت ایسی اہمیت کا حامل تھا چنانچہ میں نے تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے وہاں رکنے کا خطرہ مول نہیں لیا پھر تم اس بات کے بھی چشم دید گواہ ہو کہ وہ حرام زادی ہیلگا کتنے خوف ناک انداز میں R22 ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کررہی تھی۔ اگر میں تمہیں لفٹ کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر کو نیچے لاتی تو اس بوڑھی گھوڑی، لال لگام کی فائرنگ سے R22 کی تباہی یقینی تھی اور تم اس تباہی کا مطلب بخوبی سمجھتے ہو..... میرے ساتھ ہی تمہاری دوست کے بھی پرخچے اڑ جاتے۔ اسی لیے میں تمہیں سینٹر پر چھوڑ کر چلی گئی تھی کیونکہ میں یہ بات اچھی طرح جان چکی ہوں کہ ''ایس این بی'' والے تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ وہ تمہیں کوئی گزند پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اگرچہ تم اس وقت ڈاکٹر رائفل کے گیٹ اپ میں ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہاری اصلیت تک پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ باقی جہاں تک تمہاری دوست کا معاملہ ہے تو تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک تم اس تک پہنچ نہیں جاتے، وہ تمہاری کسی قیمتی امانت کی طرح میرے پاس محفوظ ہے۔ تمہاری تسلی کے لیے تفصیلات بیان کردیتی ہوں۔

''اس وقت تمہاری دوست بذریعہ ٹرین محوِ سفر ہے۔ اسے بحفاظت منزل تک پہنچانے کے لیے چاق چوبند افراد نادیدہ محافظوں کے روپ میں اس کے آس پاس موجود ہیں۔ تمہاری دوست کی منزل روس کی ایک قدیم ریاست ''اومسک'' ہے۔ شارو کو اومسک (Omsk) تک پہنچانے میں تین سے چار دن لگ سکتے ہیں۔ تمہاری دوست کو باآسانی ائیر بھی اومسک پہنچایا جاسکتا تھا لیکن اس میں بہت رسک تھا۔ ''ایس این بی'' والے شکاری کتوں کے مانند ڈاکٹر برجت اور شارو کو تلاش کریں گے۔ تمہاری دوست اس وقت میرے نئے دوستوں کی تحویل

میں ہے لہٰذا تمہیں اس کے لیے فکرمند ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنے نئے دوستوں کا ذکر آخر میں کروں گی، پہلے تمہیں شارو کے حصول کا طریقہ کار بتادوں۔

"جیسا کہ میں تمہارے علم میں لاچکی ہوں کہ ہائی ٹرین سفر کے بعد شارو تین چار دن میں اومسک پہنچ جائے گی جہاں اسے ایک مہربان و مشفق لیڈی کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرایا جائے گا۔ مذکورہ لیڈی کا نام دینارا (Dinara) ہے۔ دینارا کا کانٹیکٹ نمبر میں اس خط کے اختتام پر لکھ دوں گی۔ چار روز کے بعد تم جب چاہو، اومسک پہنچ کر اپنی دوست سے ملاقات کرسکتے ہو۔ تم جتنے دن چاہو، دینارا کے اپارٹمنٹ پر قیام بھی کرسکتے ہو۔ دینارا رشین اور انگلش کے سوا اور کوئی زبان نہیں جانتی تاہم تمہاری خاطر اسے اسپینش کے چند الفاظ سکھا دیے جائیں گے۔ اسی طرح تمہیں بھی روسی زبان کے چند الفاظ اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہوں گے تاکہ تم دونوں کے بیچ کوڈورڈز کے مراحل بہ آسانی طے پاجائیں، یہ طریقہ رازداری کے پیش نظر اختیار کیا جارہا ہے۔ تمہارے حصے کے کوڈورڈز میں روسی زبان میں تمہیں بتارہی ہوں....."

اس کے بعد جیسیکا نے اس لیٹر میں دینارا کا فون نمبر، اپارٹمنٹ کا ایڈریس اور چند رشین جملے بھی تحریر کردیے تھے۔ وہ مجھ سے جو چاہ رہی تھی، میں اسے بخوبی سمجھ گیا تھا۔ یہ محفوظ اور محتاط طریقہ کار مجھے پسند آیا تھا۔ جیسیکا نے خط میں آگے لکھا تھا۔

"رافیل! تم اومسک پہنچنے کے بعد دینارا کے نمبر پر فون کرو گے۔ وہ فون اٹینڈ کرنے کے بعد اسپینش میں پوچھے گی "تم کون ہو؟" تم رشین میں جواب دو گے "سنہری عقاب!" وہ دوبارہ ہسپانوی میں سوال کرے گی۔ "تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟" تم بھی ایک بار پھر روسی زبان میں جواب دو گے "ہمالیہ!" وہ تمہاری جانب سے مطمئن ہونے کے بعد تمہیں اپارٹمنٹ پر آنے کا دن اور وقت بتادے گی۔ یہ بات وہ انگلش میں کرے گی۔ تم نے مقررہ دن اور وقت پر دینارا کے اپارٹمنٹ پر پہنچ جانا ہے۔ تم اس کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی تین بار بجاؤ گے تو ڈور بیل کے ساتھ لگے ہوئے اسپیکر پر، وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر تم سے رشین میں پوچھے گی "سرخ چڑیا؟" تمہارا جواب بھی رشین میں ہوگا "نہیں!" پھر وہ تصدیقی انداز میں سوال کرے گی "ہمالین دوست؟" تم رشین میں جواب دو گے "ہاں"۔ اس کے بعد وہ رشین میں "اوکے" کہہ کر تمہارے لیے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول دے گی۔ اگرچہ یہ طریقہ کار خاصا پیچیدہ ہے لیکن تمہارا جن لوگوں سے پالا پڑا ہوا ہے انہیں چکر دینے اور ان کی نظر سے بچنے کے لیے یہ سب کیا جارہا ہے۔ تمہیں اس خط میں تحریر ان رشین الفاظ کو اچھی طرح یاد کرلینا ہے جو دینارا کے ساتھ کوڈورڈز میں استعمال ہونے والے ہیں۔ اب میں اپنے نئے دوستوں کا ذکر کروں گی کیونکہ اس دنیا میں، فی الحال تمہارے سوا میرے لیے اور کوئی انسان قابلِ بھروسا نہیں ہے۔ میں دعوے سے نہیں بتا سکتی کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو لیکن میں دل سے تمہیں اپنا دوست مانتی ہوں اور پوری ایمان داری کے ساتھ میں خود بھی تمہاری دوست ہوں۔

"رافیل! نہایت ہی مختصر رفاقت کے دوران میں تم میرے اتنے قریب آگئے ہو کہ میں اپنی زندگی کا ایک اہم راز تم سے شیئر کرنا چاہتی ہوں لیکن اس خط میں نہیں۔ تم جب دینارا کے اپارٹمنٹ پر پہنچ جاؤ گے تو وہ تمہیں ایک لفافہ دے گی جس کے اندر میرے نئے دوستوں کے بارے میں تفصیلاً درج ہوگا۔ اسے میری مجبوری سمجھ لو کہ جب تک تم اپنی دوست تک نہیں پہنچ جاتے، میں تمہیں اس حوالے سے بریف نہیں کرسکتی۔ تب تلک تم مجھے اسنوڈن (Snowden) جیسا کوئی کردار سمجھ لو۔

"تم نے اس مشن میں جتنے خلوص اور اپنایت کے ساتھ میری مدد کی ہے اس کے لیے میں ہمیشہ تمہاری شکرگزار رہوں گی اور میرے نئے دوست بھی..... اگر تمہیں کبھی تمہاری دوست سے فرصت مل جائے تو میرے ان الفاظ پر بھی غور کرلینا۔"

اس کے بعد جیسیکا نے بڑے جذباتی انداز میں ایک طاقتور شاعرانہ بات کی تھی جس کا اردو میں مفہوم کچھ اس طرح بنتا تھا۔

"کبھی چاند اترے میری شام پر۔ میرا دل بھی دھڑکے تیرے نام پر۔"

ویٹر نے کھانا سرو کردیا تھا۔ میں نے جیسیکا کے طویل خط کو تہ کرکے اپنی جیب میں رکھ لیا اور مالک کی عطا کردہ انواع واقسام کی نعمتوں سے انصاف کرنے میں مصروف ہوگیا۔ میں اس دوران میں جیسیکا کے خط کے مندرجات پر بھی غور وفکر کرتا جارہا تھا۔ ویسے تو اس لیٹر میں بیان کردہ ایک ایک بات اپنی جگہ اہمیت کی حامل تھی لیکن خط کے اختتامی حصے نے کچھ زیادہ ہی مجھے تشویش میں مبتلا کردیا تھا خصوصاً اس کے کلوزنگ شاعرانہ انداز نے۔ اس کے وہ الفاظ اس امر کا بین ثبوت تھے کہ وہ ایک دل شکن سیلانی اسد علی سے دل لگا بیٹھی تھی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مستقبل قریب میں جیسیکا کی اس

دلداری کے کیا نتائج برآمد ہوں گے......

دوسری چونکا دینے والی بات جو اس نے کی تھی وہ خود کو اسنوڈن جیسے کردار سے تعبیر کرنا تھا۔ ایڈورڈ اسنوڈن کمپیوٹر کی دنیا کا چیتا سمجھا جاتا ہے۔ آئی ٹی کی نگری میں اسے امریکن کمپیوٹر پروفیشنل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنی اسی قابلیت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی بنا پر سی آئی اے نے اسے جاب آفر کر دی تھی پھر وہ لینگلی کے لیے کام کرنے لگا۔ اپنی انہی ذمے داریوں کو نبھانے کے دوران میں لینگلی اور "این ایس اے" کی کچھ ایسی چیزیں اس کی نظر سے گزریں کہ اسے ان دونوں حساس اداروں سے شدید نفرت ہوگئی چنانچہ اس نے بغاوت کا منصوبہ بنالیا پھر گزشتہ سال اس نے ان لوگوں کی انتہائی اہم معلومات کو منظر عام پر لانے کا فیصلہ کرلیا اور اس ٹاپ سیکرٹ بریچنگ کے بعد اس نے سی ایس سی (کمپیوٹر سیکورٹی کنسلٹنٹ) کے عہدے کو پوری قوت سے لات ماری اور رشیا پہنچ گیا۔ لینگلی، این ایس اے اور دیگر حساس امریکی ادارے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اسنوڈن نے ان کے کالے کرتوتوں کو منظر عام پر لاکر بقول کسے، ان کے منہ پر کالک مل دی تھی۔ آج کل اسنوڈن اسائیلم (Asylum) پر ماسکو (رشیا) میں مقیم ہے۔ امریکا بہادر کی نظر میں وہ گردن زدنی ہے جبکہ امریکا مخالف تمام قوتوں کی نگاہ میں وہ ایک ہیرو کی حیثیت کا حامل ہے۔

جیسیکا کی جتنی اسٹوری میرے علم میں تھی اس کے مطابق وہ اپنے امریکی آقاؤں سے متنفر ہوچکی تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ رشیا کی جانب ہاتھ بڑھانے کی خواہاں تھی۔ اس لیٹر میں جیسیکا نے خود کو "اسنوڈن" سے تشبیہ دے کر اس امر پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی کہ وہ اب رشیا کی گود میں جا بیٹھی تھی۔ اس پوائنٹ کو ذہن میں رکھ کر غور کرنے سے سب کچھ واضح ہوجاتا تھا۔ جیسیکا کا پروفیسر فریڈرک کی لیبارٹری سے وہ ریسرچ فائلز چرانا جو امریکا کے لیے بے حد اہمیت کی حامل تھیں، شارو کو اومسک پہنچانے کا بندوبست کرنا اور وہ بھی اپنے نئے دوستوں کی کڑی نگرانی میں...... یہ تمام اشارے اس بات کے تھے کہ وہ بھی اسنوڈن کی طرح رشیا کی سرخ پناہ میں جاچکی ہے۔ اس تناظر میں جیسیکا کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک بے ساختہ خیال پیدا ہوا اور میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

"آسمان سے گری، کھجور میں اٹکی!"

☆☆☆

لیفٹیننٹ جیسیکا کے خط میں سے میں نے وہ جملے اور الفاظ الگ کاغذ پر نوٹ کرلیے جن میں دینارا سے ہونے والی بات چیت کے کوڈورڈز تھے پھر مذکورہ خط کو میں نے نذر آتش کر دیا۔ جیسیکا نے مجھے تین چار روز بعد اومسک (رشیا) پہنچنے کو کہا تھا اور میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ ابھی ایک دو دن تک میں جرمنی سے باہر قدم نہ نکالوں کیونکہ میں نے یورپین ایلپین کے دامن میں واقع اس غیر استعمال شدہ، ویران اور اجاڑ کاٹیج میں رابرٹ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس واقعے کی گرد آسانی سے بیٹھنے والی نہیں تھی۔ رابرٹ کا سیل فون آن ہونے کے بعد سوسائٹی کے لوگوں کی اس تک رسائی میں کوئی دقت یا دشواری پیش نہیں آسکتی تھی پھر رابرٹ انہیں ڈاکٹر رائیل کے بارے میں جو کچھ بتاتا اس کی روشنی میں رائیل کی تلاش کا کام بڑی شدومد سے شروع ہوجاتا اور ظاہر ہے، اس سلسلے میں بری، بحری اور فضائی راستوں کی کڑی نگرانی کی جاتی اور جرمنی کا کوئی بھی ریلوے اسٹیشن، ائرپورٹ اور سی پورٹ ڈاکٹر رائیل کے لیے "سیف تھیچ" نہ رہتا لہٰذا عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ دو چار روز تک "تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو" کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ شارو کے حوالے سے جیسیکا نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اس سے میرا دل مطمئن ہوگیا تھا۔

میں نے اس کاٹیج میں جہاں رابرٹ سے متعدد غلط بیانیاں کی تھیں، وہیں بعض مقامات پر، اس سے مکالمے کے دوران میں مجھ سے غلطیاں بھی ہوئی تھیں۔ مثلاً میں نے خود کو ڈاکٹر رائیل کی حیثیت سے رابرٹ کے سامنے پیش کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ میں اسد علی کو اپنا گرو مانتا ہوں لیکن جب میں اسے تیز دھار چھری کی مدد سے سپرد عذاب کررہا تھا تو جوش انتقام میں، میں اسد علی کی حیثیت سے رابرٹ کے ساتھ ڈائریکٹ ہوگیا تھا۔ بینا کی رہائی کا مطالبہ ہو یا سوسائٹی کے کرتا دھرتا افراد کے نام میرا دھمکی آمیز پیغام...... ہر جگہ یہی نظر آتا تھا کہ اسد علی بنفس نفیس رابرٹ سے مخاطب ہے لیکن میرے لیے بچت کا پہلو یہ تھا کہ ان قہربار لمحات میں رابرٹ کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ایک پل کے لیے بھی اس کا دھیان میری کوتاہی کی طرف نہیں گیا تھا اور نہ وہ مجھ سے پوچھے بنا نہیں رہتا کہ...... "تم تو علی کو اپنا مینٹور کہہ رہے ہو، پھر علی کی حیثیت سے بات کیوں کررہے ہو؟"

انسان تقدیر کے ہاتھوں میں ایک کھلونے، ایک پتلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور یہ بیک وقت خاک اور خطا کا پتلا ہے۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس سے غلطی نہ ہوتی ہو لیکن اگر مالک مہربان ہو تو انسان کی خطاؤں کی پردہ پوشی کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ رابرٹ سے گفتگو کے دوران میں قدرت نے مجھ پر بھی خصوصی عنایت فرمائی تھی اور میری ہنگ مین مس ٹیکس، ہٹ مس ٹیکس میں بدل گئی تھیں اور مزے کی بات

یہ کہ ان سلی مس ٹیلس پر بھی رابرٹ کا دھیان نہیں گیا تھا۔

رابرٹ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا خون آلود زخم زخم چہرہ میری نگاہ میں گھوم گیا۔ میں نے تیز دھار چھری کی مدد سے گویا اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایسا ہی بے رحمانہ سلوک کچھ عرصہ پہلے میں نے اپنی ماں کے مشیرِ خاص اس نمک حرام مچھل نادر شاہ کے ساتھ بھی کیا تھا جب ایک رات ماں کے بنگلے پر میں نے نادر شاہ کی دونوں ایڑیوں کے نزدیک واقع فیبولا کے عقبی حصے کے اکیلیس ٹینڈن کاٹ کر اسے زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا تھا۔ وہ آخری سانس تک اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ نادر شاہ کے برعکس میں نے رابرٹ کو اپاہج تو نہیں بنایا تھا تاہم اس کا وہ حشر کیا تھا کہ زندگی بھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ ان دونوں شیطانوں نے حد درجہ میرا دل دکھایا تھا لہٰذا ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کر کے مجھے بہت سکون محسوس ہوا تھا۔ یہ دونوں انسان تھے ہی نہیں۔ یہ اسی قسم کے وحشیانہ اذیت ناک برتاؤ کے مستحق تھے......!

شکم سیری کے بعد میں ہوٹل سے باہر نکل آیا پھر میں نے میونخ کے سینٹرل ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ تین روز پہلے میں اور نکلس کی بیوہ ایڈتھ اسی ریلوے اسٹیشن پر اتر کر ہوٹل ایڈن کی طرف گئے تھے۔ ہم بارسلونا سے بذریعہ ٹرین میونخ آئے تھے اور پھر اگلے روز میں نے مذکورہ ریلوے اسٹیشن پر بنے ہوئے پبلک لاکرز میں سے ایک اپنے استعمال کے لیے حاصل کر لیا تھا۔ میرا ایک تیار شدہ ضروری بیگ مذکورہ لاکر میں رکھا تھا۔ یہ بیگ اسی روز میں نے میونخ کے ایک مال سے خریدا تھا اور اپنا ضروری سامان اس کے اندر بھر کر اسے لاکر میں محفوظ کر دیا تھا۔ میرا جو بیگ ایلپین روز گیسٹ ہاؤس میں رہ گیا تھا وہ ایڈتھ کا دیا ہوا تحفہ تھا اور اس کے اندر محض استعمال کے چند کپڑے اور پروفیسر کے فوٹوگرافس تھے۔ ان چیزوں کی اب مجھے کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کوئی پروا۔ پہننے والے کپڑے تو کبھی بھی اور کہیں سے بھی خریدے جا سکتے تھے اور جہاں تک پروفیسر کے فوٹوگرافس کا معاملہ تھا تو میرا وہ مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔

میں نے ریلوے اسٹیشن والے لاکر کو کھول کر اس میں سے اپنا بیگ باہر نکالا اور اسے کھول کر چیک کیا۔ میری تمام ضروری چیزیں اس کے اندر جوں کی توں محفوظ تھیں جن میں میرے جبرالٹر والے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے لیگل ڈاکیومینٹس بھی شامل تھے۔ پہلے میرا ارادہ یہی تھا کہ ایلپین رینج کے علاقے سے شارو کو نکالنے کے بعد میں سیدھا جبرالٹر کا رخ کروں گا لیکن جیسیکا نے شارو کو ہنگامی حالات میں جرمنی سے روس پہنچا دیا تھا لہٰذا مجھے بھی اپنے پروگرام میں چند تبدیلیاں کرنا پڑیں جن کے تحت میں نے بیگ میں سے اپنی فوری ضرورت کی چند چیزیں نکالیں اور مذکورہ بیگ ایک بار پھر لاکر کے اندر محفوظ ہو گیا۔ جبرالٹر والے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے کاغذات کو میں نے ساتھ ساتھ اٹھائے پھرنے کے بجائے بیگ کے اندر ہی رہنے دیا تھا۔

ریلوے اسٹیشن کے لاکرز روم سے نکل کر میں نے میونخ کے ایک بازار سے اگلے سفر کی مناسبت سے تھوڑی بہت شاپنگ کر کے ایک مختصر سا سفری بیگ تیار کر لیا۔ میں روس کے جس علاقے میں جانے والا تھا وہ سائبیریا کے جنوب مغربی حصے میں واقع تھا۔ ظاہر ہے، سائبیریا (Siberia) کا تمام تر علاقہ یورپ سے کہیں زیادہ ٹھنڈا تھا چنانچہ وہاں جانے کے لیے خصوصی انتظامات کی ضرورت تھی اور مجھے اس بات کا بھی بالکل کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اومسک میں مجھے کتنے دن قیام کرنا تھا۔ جیسیکا نے اپنے خط میں مجھے تین چار روز بعد اومسک پہنچنے کی ہدایت کی تھی لہٰذا مجھے جرمنی کی سیر کا اچھا خاصا موقع میسر آ گیا تھا۔ آئندہ دو روز میں، میں نے برلن، میونخ، ہمبرگ، فرینکفرٹ کولون اور ڈوسل ڈورف کے مرکزی حصے دیکھ ڈالے پھر میں نے برلن کے ایک ہوٹل میں قیام کر لیا۔

فرینکفرٹ میں قدم رکھتے ہی میرا دھیان آپوں آپ بینا کی طرف چلا گیا تھا۔ بینا کی ماں ایلس کا تعلق جرمنی کے اسی شہر سے تھا۔ میری تمام تر کوشش یہی تھی کہ کسی طرح اس بلونڈ حسینہ کو میں جرمنی میں سیٹ کر دوں مگر وہ مجھ سے دور جانے کو تیار نہیں تھی پھر وقت کی ایک سنگ دل کروٹ نے بینا کو مجھ سے ہزاروں کلومیٹرز کی دوری پر پھینک دیا تھا۔ وہ آج کل میری معلومات کے مطابق ایس این بی کی ''مہربانی'' سے اسرائیل میں تھی۔ میں نے رابرٹ کے ذریعے بینا کی بحفاظت رہائی کا مطالبہ تو کر دیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ سوسائٹی والوں کے فیصلے کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ میں نے کراچی میں قیام کے دوران میں بینا کے ساتھ بہت ہی رنگین اور نشاط انگیز وقت گزارا تھا۔ وہ میری یادداشت میں مستقل طور پر محفوظ تھی۔ اس کی ایک ایک ادا میرے ماضی کا دل بہار سرمایہ تھی۔ بینا کو بھی میری قربت کا بخار ہو گیا تھا اور میرے سینئر جی ایم سر نے کہا تھا کہ میں بینا کو اس کے حال پر چھوڑ کر صرف اور صرف شارو پر توجہ دوں۔ بینا ایک روز خود مجھے تلاش کر لے گی۔

ان لمحات میں جی ایم سر مجھے بہت یاد آئے۔ ہماری آخری ملاقات نیوزی لینڈ کے شہر ویلنگٹن میں ہوئی تھی جب

انہوں نے ڈاکٹر منگ کی مدد سے میرے پیٹ کے زیریں حصے میں چھپائی گئی ٹریکنگ ڈیوائس کو نکلوا کر ضائع کیا تھا۔ اس ڈیوائس کے ریموو ہو جانے سے میں سوسائٹی والوں کے ٹریکنگ سسٹم سے آف ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر منگ بلاشبہ ایک ماہر چینی سرجن تھا۔ اس نے حیرت انگیز ادویات کا لیپ کر کے میرے پیٹ کے زخم کو ایک ہی رات میں بھر دیا تھا اور...... منگ سے بھی زیادہ کرشمہ ساز شخصیت کے مالک جی ایم سر تھے۔ انہوں نے میری عملی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ آج میں جو کچھ بھی تھا انہی کی مناسب راہنمائی کے طفیل تھا مگر افسوس کہ میرا یہ عظیم مینٹور جسمانی طور پر ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو چکا تھا......!

میں نے برلن سے اومسک تک پہنچنے کے ممکنہ راستوں کا بغور جائزہ لیا پھر ٹرین کے آپشن کو کلک کر دیا۔ برلن کے ''الیگزینڈر پلاٹز'' ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہونے والی ٹرین تیس گھنٹے اکتیس منٹ میں ماسکو کے ریلوے اسٹیشن ''ماسکوا کھاجا'' پہنچتی تھی۔ اس ٹائم میں ایک گھنٹے کا ٹرانسفر بھی شامل تھا۔ الیگزینڈر پلاٹز (Alexanderplatz) اور ماسکوا... کھاجا (Moskva kaja) کے بیچ یہ تیز رفتار ٹرین پولینڈ کے شہر وارسا اور بیلا روس کے شہر منسک سے ہوتے ہوئے جاتی تھی۔ پھر ماسکو سے اومسک تک پہنچنے کے لیے بھی اگر ٹرین پکڑی جاتی تو چھتیس گھنٹے بائیس منٹ کا مزید سفر تھا۔ میں نے سردست برلن سے ماسکو تک جانے کے لیے ٹرین کا ٹکٹ ایک سو تیس ڈالرز میں خرید لیا۔

میں ان دنوں ڈاکٹر رافیل کی آئی ڈی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ میرے تمام تر ضروری کاغذات اسی شناخت کی مناسبت سے تھے۔ اسپین کا پاسپورٹ رکھنے کی وجہ سے میں اس دنیا کے دو سو اٹھارہ ممالک میں سے ایک سو پچھتر ممالک میں ویزا حاصل کیے بغیر ''آن ارائیول'' داخل ہو سکتا تھا اور روس بھی ان ایک سو پچھتر ممالک میں شامل تھا۔

اگلے روز میرے سفر کا آغاز ہو گیا۔ ٹرین نے الیگزینڈر پلاٹز چھوڑا تو میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ اب مجھے کافی حد تک سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اگر ڈاکٹر رافیل کی جرمنی میں ابھی تک تلاش جاری ہوتی تو پھر میں اتنی آسانی سے برلن کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ کمپیوٹر سسٹم نے دنیا کے ہر نظام میں بہت زیادہ تیزی اور آسانی پیدا کر دی ہے۔ اگر قانون کے رکھوالے آپ کی تلاش میں ہیں تو آپ کو بہت جلد ٹریس آؤٹ کر لیا جائے گا کیونکہ آپ کو پے منٹس کے لیے کریڈٹ کارڈ اور سفر کے لیے پاسپورٹ تو ہر حال میں استعمال کرنا ہی پڑتا ہے اور میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ پوری دنیا میں قانون کے رکھوالوں کو اپنی منشا کے مطابق ہینڈل کرنا سوسائٹی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

میرے سکون میں اس وقت گہرا اطمینان بھی شامل ہو گیا جب ریلوے کے ایک باوردی ملازم نے کمپارٹمنٹ میں آ کر معمول کی چیکنگ بھی کر لی۔ مذکورہ کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ صرف ایک اور مسافر موجود تھا اور وہ ایک خاتون تھی جو میرے سامنے والی سیٹ پر براجمان تھی۔ کمپارٹمنٹ کی باقی سیٹیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ اسٹاف کے آدمی نے باری باری ہم دونوں کے ٹکٹ اور پاسپورٹس چیک کیے پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے دوسرے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

جب ٹکٹ چیکر چلا گیا تو میری ساتھی مسافر نے بڑی دل آویز مسکراہٹ میری جانب اچھالتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

میرا نام کاتیا ہے' میں ماسکو جا رہی ہوں۔''

بات کے اختتام پر اس پری وش نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو...... میں کہاں جا رہا ہوں۔ اس نے بڑی شستہ انگریزی میں اپنا مختصر سا تعارف پیش کیا تھا اور میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔

میری ''سوچ'' کا سبب یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ اس نے مجھ سے کوئی مشکل سوال کر ڈالا تھا۔ اصل وجہ اس کا خود بخود متعارف ہونا تھی۔ مجھے خاموش پا کر اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ ''میں رشین ہوں اور رشین زبان کے علاوہ جرمن اور انگلش بھی بول اور سمجھ لیتی ہوں۔''

گرین آنکھوں اور شہد رنگ بالوں والی کاتیا کے حسن و جمال میں تو کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ ایک پُرکشش اور جاذب نظر رشین بلونڈ تھی مگر میں جن حالات سے گزر رہا تھا اس میں کاتیا کا فری ہونا مجھے شک میں ڈال رہا تھا۔ بہرحال اخلاق کا تقاضا تو یہی تھا کہ اسے جواب دیا جائے۔

''میرا نام رافیل ہے۔'' میں نے نپے تلے الفاظ میں اسے بتایا۔ ''میں اسپین سے ہوں اور میں بھی ماسکو ہی جا رہا ہوں۔ میں اسپینش اور انگلش جانتا ہوں۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی رافیل۔'' وہ آہستگی ایک قدم مزید آگے بڑھ آئی۔ ''میں جرمنی میں ایک ایجنسی کا کام کرتی ہوں۔'' بات کے اختتام پر اس نے بے تکلفی سے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھامنے میں کسی تردد یا ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ ایک پُرجوش مصافحے کے بعد میں نے اس کا ہاتھ

آزاد کرتے ہوئے کہا۔

"میں بارسلونا کے ایک اسپتال میں کام کرتا ہوں۔"

"اوہ..... تو تم ڈاکٹر ہو؟" اس نے پُراشتیاق نظر سے میری طرف دیکھا۔

ہمارے درمیان یہ تمام تر گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ "ہاں۔ میں ماہر نفسیات ہوں۔" پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "اور تم جرمنی میں کس ایمبیسی میں کیا کرتی ہو؟"

"میں جرمنی میں موجود رشین ایمبیسی میں ایک ٹرانسلیٹر کی حیثیت سے کام کرتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "ایمبیسی میں ایک کمرشل کونسلر کے ساتھ میری ڈیوٹی ہے۔ میں چونکہ تین زبانیں جانتی ہوں اس لیے ٹرانسلیٹر کی جاب بہت اچھی چل رہی ہے۔ آج میں ایک ہفتے کی چھٹی پر اپنے گھر ماسکو جا رہی ہوں۔"

کاتیا ایک دراز قامت لیڈی تھی۔ اس کے حسن اور دلکشی پر کچھ کہنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف تھا۔ رشین لڑکیوں کو تو پریاں کہا جاتا ہے۔ میں اس وقت کاتیا نامی ایک پری کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور میرا ذہن مسلسل اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ آیا کاتیا کا مجھ سے ملنا کوئی اتفاق تھا یا اس ملاقات کے پیچھے کوئی اور اسٹوری چل رہی تھی.....!

بہرحال، میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ "میں اپنے ایک دوست سے ملنے ماسکو جا رہا ہوں۔"

"کیا تمہارا وہ دوست رشین ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ ہسپانوی ہے۔" میں نے بتایا۔

ہمارے بیچ انگلش میں بات چیت ہو رہی تھی اور انگلش میں دوست یعنی فرینڈ، فرینڈ ہی ہوتا۔ جب تک وضاحت نہ کی جائے، یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ دوست لڑکا ہے یا لڑکی۔ اسی کھوج کے سلسلے میں کاتیا مجھ سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"گرل فرینڈ.....؟"

"نہیں۔" میں نے مصلحتاً دروغ گوئی سے کام لیا اور بتایا "بوائے فرینڈ۔"

"اوہ..... آئی سی!" وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔

میرے جواب میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ جس پر معنی خیزی کا انداز اپنایا جاتا۔ مغرب میں لوگ اتنی زیادہ ترقی معکوس کر چکے ہیں کہ کسی لڑکی کی گرل فرینڈ اور کسی لڑکے کے بوائے فرینڈ کا سنتے ہی ایک مخصوص انداز میں سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔

کاتیا کے شک آمیز "اوہ، آئی سی!" کے جواب میں، میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تھوڑی دیر ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ..... شیور۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی پھر برتھ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم خیند لینا چاہو گے؟"

"نہیں۔ میں بیٹھے بیٹھے ہی ریلیکس ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"اوکے۔ یو آر ایٹ یور لبرٹی۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں ذرا واش روم جا رہی ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کاؤچ کی آرام دہ پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور فی الفور کاتیا کے بارے میں سوچنے لگا۔

وہ جرمنی میں قائم رشین ایمبیسی کے اندر ایک مترجم کی حیثیت سے جاب کرتی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کا زیادہ تر واسطہ ڈپلومیٹس سے رہتا ہوگا۔ میں اس وقت جن نازک حالات سے گزر رہا تھا، اس کے پیش نظر کاتیا کا خوامخواہ مجھ سے فری ہونا مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ اس بات کا مجھے شک ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ میرے پیچھے تو نہیں.....!

میں نے بند آنکھوں کے پیچھے کاتیا کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور اپنی فیلنگز کا انٹینا شارو کی جانب موڑ لیا۔ جذب کی کیفیت میں گہرے استغراق کے بعد میں شارو کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ ایک آرام دہ بیڈ پر محو استراحت تھی۔ اسے سوتے دیکھ کر مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں اس کے لیے کافی مشکلات اٹھا رہا تھا۔ اس دوران میں شارو نے بھی میری خاطر بہت تکالیف اٹھائی تھیں لیکن مالک کا شکر کہ اب میرے بیچ کی تمام رکاوٹیں اٹھ چکی تھیں اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ملنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ میں اپنی فیلنگز کے زور پر شارو کے ماحول سے باہر نکل کر گرد و نواح کا جائزہ لینے لگا۔

جیسیکا نے مجھے بتایا تھا کہ شارو کو اوسک میں وینارا نامی ایک مہربان لیڈی کے اپارٹمنٹ پر رکھا جائے گا لیکن اس کے اردگرد کے ماحول سے مجھے کچھ اور ہی محسوس ہو رہا تھا۔ میری فیلنگز کے مطابق وہ اس وقت ایک ڈبل اسٹوری اولڈ فیشنڈ گھر کی بالائی منزل کے کسی بیڈروم میں گہری نیند سو رہی تھی۔ میں شارو کو جس طرز کی عمارت میں محسوس کر رہا تھا وہ ہرگز کوئی اپارٹمنٹ نہیں تھا۔ شارو کو پروفیسر فریڈرک کی ریسرچ

لیبارٹری سے نکلے اتنے دن گزر چکے تھے کہ اسے اب تک اوسک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ممکن ہے، جیسیکا نے غلطی سے اس پرانے طرزِ تعمیر کے مکان کو اپارٹمنٹ لکھ دیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شارو کے قیام کا مقام کسی ہنگامی ضرورت کے پیشِ نظر بدل دیا گیا ہو۔ بہرحال میں یہ دیکھ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ وہ صحیح سلامت اور بحفاظت سو رہی تھی۔ وہ اس وقت اوسک کے کس علاقے میں تھی، اس راز سے اسی وقت پردہ اٹھ سکتا تھا جب میں خود اس کے پاس پہنچ جاتا اور اس تک لے جانے والے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔

شارو کی جانب سے اطمینان حاصل ہونے کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری نظر سامنے والی سیٹ پر پڑی تو وہ مجھے خالی دکھائی دی۔ جب میں نے آرام کرنے کی غرض سے اپنی آنکھیں بند کی تھیں تو کاتیا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ واش روم جارہی ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ابھی تک واش روم سے واپس نہیں آئی تھی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرکے جیسیکا کی جانب چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔

''کوشش'' کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ مجھے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بار بار ٹرائی کرنے کے باوجود بھی میں جیسیکا تک رسائی پانے میں سرخرو نہیں ہوسکا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں میری ٹیلنگو نے پلک جھپکتے میں مجھے شارو تک پہنچا دیا تھا۔ ہوسکتا ہے، میری ٹیلنگو میں کوئی ایرر آگیا ہو۔ بہرحال میں اس وقت اور رکاوٹ کو سردست سمجھ نہیں پایا تھا۔

جب کوئی چیز سمجھ میں نہیں آرہی ہو تو اسے تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دینا چاہیے اور دوبارہ تازہ ذہن کے ساتھ اسے سمجھنے کی ازسرِنو کوشش کرنا چاہیے۔ میں نے بھی فی الحال جیسیکا تک رسائی کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھول کر ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں حاضر ہوگیا۔

اب کی بار کاتیا مجھے اپنی سیٹ پر بیٹھی نظر آگئی۔ مجھ سے نگاہیں چار ہوئیں تو اس نے زیرِلب مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

''تم نے آرام کرلیا.....؟''

''ٹرین کے سفر میں انسان آرام بھلا کیسے کرسکتا ہے۔'' میں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔ ''بہرحال تھوڑا ریلیکس کرلیا ہے۔''

''تھوڑا ریلیکس۔'' وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم تو جب سے اس ٹرین پر سوار ہوئے ہو، مسلسل سوئے جارہے ہو.....!''

اس کی باتوں کا انداز بتاتا تھا کہ وہ مجھ سے گپ شپ کے فل موڈ میں ہے لہٰذا میں نے اسے مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سفر ٹرین کا ہو، ہوائی جہاز کا ہو یا پھر کسی بھی اور نوعیت کا، اس میں آرام کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آنکھیں بند کرلینے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان گہری نیند سو رہا ہے۔ میں نے اس دوران میں کئی بار آنکھیں کھول کر دیکھا مگر تم اپنی سیٹ پر نظر نہیں آئیں.....!''

آخری جملہ میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''میں واش روم میں تھی اور تمہیں بتا کر گئی تھی۔''

''اتنی دیر واش روم میں.....'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''کیا چھٹیوں میں بھی تم جاب پر ہو؟''

وہ گڑبڑا گئی۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب..... رپورٹنگ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیسی رپورٹنگ.....'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں آفس سے ایک ہفتے کی چھٹی پر ہوں پھر میں کس کو رپورٹنگ کروں گی اور کیوں.....؟''

اس کے جواب کے دوران میں، میں مسلسل اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ''رپورٹنگ'' کے ذکر پر وہ کافی پریشان ہوگئی تھی۔ میں نے اس کی مشکل کو آسان کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''کسی ایمبیسی میں کام کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس جاب میں کوئی آن/آف نہیں ہوتا۔ انسان ڈیوٹی پر ہو یا چھٹی پر، ہر لمحے حاضر دماغ رہنا پڑتا ہے۔ کسی وقت، کوئی بھی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوسکتی ہے اور ظاہر ہے، اس سچویشن میں رپورٹنگ لازمی ہوجاتی ہے۔''

''میری جاب کے بارے میں تو تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' وہ شک زدہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے رپورٹنگ کا ذکر کیوں کیا، کیونکہ میں اس وقت واقعتاً چھٹی پر ہوں۔''

''تم جرمنی میں قائم رشین ایمبیسی کے اندر کام کرنے والے ایک کمرشل کونسلر کو اسسٹ کرتی ہو.....'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اسسٹ کرتی ہو نا؟''

''ہاں کرتی ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس کمرشل کونسلر کے ساتھ میں

ایک ٹرانسلیٹر کی حیثیت سے کام کررہی ہوں۔''

''ہوسکتا ہے، اس کمرشل کونسلر نے تمہاری ڈیوٹی لگا رکھی ہو کہ تمہیں برلن سے ماسکو تک کے سفر کی رپورٹنگ کرنا ہے۔'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''اور تم نے ابھی واش روم میں جاکر اپنے باس کو رپورٹ دی ہو کہ تمہارے ساتھ کمپارٹمنٹ میں ایک ہسپانوی مسافر بھی موجود ہے جس کا نام رافیل ہے۔ وہ بارسلونا کے کسی اسپتال میں ایک سائکا ٹرسٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر رافیل اپنے کسی ہسپانوی دوست سے ملنے ماسکو جارہا ہے.....''

اپنی بات کہنے کے دوران میں، میں مسلسل کاتیا کی آنکھوں میں بھی جھانک رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے یا آنکھوں میں ایسا کوئی تاثر ابھرتے نہیں دیکھا جس سے لگتا ہو کہ میں نے اس کی کوئی چوری پکڑلی ہو یا کسی حوالے سے میں نے اسے ایکسپوز کردیا ہو۔ میری توقع کے برعکس کاتیا نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔

''کیا تم نے مجھے کوئی جاسوس سمجھ رکھا ہے؟''

''میرے لیے یہی کافی ہے کہ تم رشین ہو.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

میں کاتیا کے ساتھ جو کچھ بھی کررہا تھا وہ میرے موجودہ حالات کا تقاضا تھا۔ میں معمول کے کسی سفر پر نہیں تھا۔ کاتیا کی طرف سے میرے لیے مطمئن ہونا بہت ضروری تھا۔ اگر واقعتاً وہ میرے پیچھے تھی تو پھر مجھے حددرجہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

وہ برہمی سے بولی۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا۔ اگر میں رشین ہوں تو.....؟''

اس کی ناراضی سے مجھے یہ تو اندازہ ہوگیا کہ میرے کریدنے والے شک زدہ اسٹائل کو اس نے مائنڈ کیا تھا۔ اس کے ردعمل سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو اس کا مجھ سے اور میرے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا اور یا پھر وہ کمال درجے کی اداکارہ تھی۔

''کاتیا.....!'' میں نے اس کی خفگی پر اپنے الفاظ کا مرہم لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم میری باتوں کا برا نہیں منانا۔ میں پہلی مرتبہ رشیا جارہا ہوں۔ میں نے تم سے وہی کہا جو میں نے تم لوگوں کے بارے میں سن رکھا ہے۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''تم ماسکو میں اپنے جس دوست سے ملنے جارہے ہو، اس کا نام کیا ہے؟'' میں نے فی الفور جواب دیا۔ ''رابرٹو۔''

یہ بھی میرا ایک جھوٹ ہی تھا جو نظریہ ضرورت کے تحت میں نے کاتیا سے بولا تھا۔ وہ اپنے بیگ میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ رکھ لو۔ اس کارڈ پر میرے ماسکو اور برلن دونوں جگہوں کے ایڈریس اور ٹیلی فون نمبرز موجود ہیں۔ اگر تمہیں رابرٹو سے فرصت مل جائے تو مجھ سے رابطہ کرنا۔ میں تمہیں ماسکو کی سیر کراؤں گی اور درجنوں رشین عورتوں اور مردوں سے ملواؤں گی پھر تمہیں یقین آجائے گا کہ رشیا میں کسی نے کسی پر نظر نہیں رکھی ہوئی.....!''

میں نے اس کے وزیٹنگ کارڈ کو اپنے والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''سوری کاتیا! میں اپنے کارڈز ساتھ لانا بھول گیا ہوں ورنہ تمہیں ضرور دیتا۔''

''کوئی بات نہیں.....'' وہ روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔ ''اٹس اوکے!''

''غصہ تھوک دو۔'' میں نے اس کی گرین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دل کش چہروں پر برہمی اچھی نہیں لگتی۔''

''کیا تم نے مجھے خوب صورت کہا؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''میں نے حقیقت بیان کی ہے۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''بلاشبہ تم ایک کھری، سچی اور حسین لڑکی ہو۔''

''سو ناکس۔'' اس کے چہرے پر چھائی ہوئی برہمی میرے تعریفی کلمات سے جاتی رہی، زور دے کر بولی۔ ''اب تو میں تمہارے ساتھ ماسکو میں کچھ وقت ضرور گزاروں گی۔''

''دراصل میرا دوست رابرٹو ماسکو میں نہیں رہتا۔'' میں نے بتایا۔ ''مجھے اس سے ملنے کے لیے اومسک جانا ہے۔ واپسی پر میں ماسکو میں تم سے ضرور ملاقات کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہیں جیسے آسانی ہو۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اومسک ماسکو سے کافی دور ہے۔ اگر ٹرین سے گئے تو تمہیں تین دن تو آنے جانے میں لگ جائیں گے۔ پھر مجھ سے ملنے کا وقت کہاں ملے گا۔''

''ہاں، میں جانتا ہو کہ اومسک، ماسکو سے دو ہزار، دو سو سینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں نے سب سے تیز رفتار ٹرین بھی پکڑی تو ایک طرف کے سفر کے لیے مجھے چھتیس گھنٹے، بائیس منٹ ٹرین میں بیٹھنا ہوگا۔''

''ٹرین کے بجائے اگر تم ہائی ائر سفر کرو گے تو تین سے چار گھنٹے میں تم ماسکو سے اومسک پہنچ جاؤ گے۔'' کاتیا نے بتایا۔

''ہائی ٹرین یا ہائی پلین کا فیصلہ میں ماسکو پہنچنے کے بعد کروں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ابھی تو ماسکو پہنچنے

میں بھی کافی وقت پڑا ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

کاتیا سے میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ وارسا تک ہم خوب گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ اس بات کا میں نے اطمینان کرلیا کہ وہ میرے تعاقب میں نہیں تھی۔ رشین ایمبیسی میں بہ طور مترجم کام کرتے ہوئے اسے بیرونی اور اندرونی سفارتی معاملات بہ خوبی علم ہوگیا تھا۔ اسی لیے ابتدا میں مجھے اس پر شک ہوا تھا۔

☆☆☆

الیگزینڈر پلاٹز (برلن) سے ماسکو کھاجا (ماسکو) تک ایک ہزار سات سو پچاسی کلو میٹرز کی اس ریلوے جرنی کے دوران میں آدھے، آدھے گھنٹے کے دو ٹرانسفرز بھی تھے۔ پہلا ٹرانسفر وارسا (پولینڈ) میں اور دوسرا ٹرانسفر منسک (بیلاروس) میں۔ ٹرانسفر سے مراد، ایک ٹرین سے دوسری ٹرین میں بیٹھنا ہے۔ وارسا کے ریلوے اسٹیشن سے جب ہم روانہ ہوئے تو اس وقت بھی ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں میرے اور کاتیا کے علاوہ اور کوئی مسافر موجود نہیں تھا چنانچہ ہمیں بات چیت کا خاطر خواہ موقع ملتا رہا لیکن دوسرے ٹرانسفر کے بعد منسک سے ماسکو کی جانب سفر کے دوران میں صورتِ حال بدل گئی تھی۔ منسک کے ریلوے اسٹیشن سے ماسکو جانے والے دو اور مسافر بھی ہمارے کمپارٹمنٹ میں آگئے تھے اور وہ دونوں مرد تھے۔ جب وہ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو کاتیا سامنے والی سیٹ سے اٹھ کر میرے برابر میں آبیٹھی جسے ان میں سے کسی مسافر نے مائنڈ نہیں کیا اور وہ چپ چاپ ہمارے سامنے والی سیٹوں پر براجمان ہوگئے۔ اصولاً ان میں سے ایک کی نشست میرے ساتھ اور دوسرے کی کاتیا کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں بھلے مانس مسافر پکی عمر کے تھے اور دونوں ہی مطالعے کے شوقین بھی تھے۔ انہوں نے کمپارٹمنٹ میں آتے ہی اپنا سامان سیٹ کرنے کے بعد اپنے شوق کا آغاز کردیا تھا۔ ایک نے کوئی روسی اخبار کھول لیا اور دوسرا ایک ضخیم ناول کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔

ذرا فرصت ملی تو میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔ اسی سوچ بچار کے دوران میں میرا دھیان آپوں آپ اپنے مینٹور جی ایم سر کی طرف چلا گیا۔ میں سر کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اہم نکتہ میرے ذہن میں ابھرا اور میں چونک اٹھا پتا نہیں، کیوں پہلے اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔

آخری مرتبہ جی ایم سر سے میری ملاقات بڑے اذیت ناک حالات میں ہوئی تھی۔ میں دو اگست دو ہزار چودہ، بہ روز ہفتہ آک لینڈ اسٹریٹ پر اپنی جاں نثار دوست کایا کی خون خون لاش کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے بیٹھا تھا کہ سر یکایک میرے پاس پہنچ گئے تھے پھر وہ مجھے اپنے ساتھ ویسٹ پیک (WEST PAC) اسٹیڈیم، ویلنگٹن میں ایک ون ڈے کرکٹ میچ دکھانے لے گئے تھے۔ میچ کے اختتام پر سر کی توجہ دلانے کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ اس روز اکیس جنوری، دو ہزار پندرہ کا دن تھا۔ وہ اپنے کسی علمی چمت کار سے مجھے کم و بیش چھ ماہ آگے یعنی فیوچر میں لے گئے تھے اور مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

میرے لیے حیرت انگیز اور نکتے کی بات یہ تھی کہ میں نے اکیس جنوری، دو ہزار پندرہ، بہ روز ہفتہ ویسٹ پیک اسٹیڈیم میں بیٹھ کر پاکستان اور نیوزی لینڈ کی ٹیموں کے بیچ ہونے والا ون ڈے کرکٹ میچ دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے ویلنگٹن کے ایک ساحلی کاٹیج پر لے گئے تھے جہاں میں تین دن تک رہا تھا۔ دو دن جی ایم سر کے ساتھ اور ایک دن یا اس دن کا کچھ حصہ اکیلے۔ کیونکہ جب میں طویل نیند سے بیدار ہوا تھا تو جی ایم سر مذکورہ کاٹیج میں موجود نہیں تھے۔ انہی تین دنوں میں وہ اشاروں کنایوں میں باور کرا چکے تھے کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ قابلِ غور اور انتہائی اہم بات یہ تھی کہ اگر واقعتاً ان کا وقت پورا ہو بھی چکا تھا تو وہ دو فروری، دو ہزار پندرہ کے بعد کا کوئی دن تھا۔ میں اس وقت اگست دو ہزار چودہ میں سانس لے رہا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ جی ایم سر ابھی بہ قیدِ حیات ہیں۔ اگر میں فروری، دو ہزار پندرہ میں نیوزی لینڈ جاؤں تو ویلنگٹن میں کہیں ان سے ملاقات ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اگر میں اکیس جنوری، دو ہزار پندرہ والا کرکٹ میچ دیکھنے ویلنگٹن کے ویسٹ پیک اسٹیڈیم پہنچوں تو جی ایم سر سے مل سکتا تھا۔

اس خیال نے مجھے بڑی تقویت دی۔ ٹائم کے ساتھ ٹریول کرنے کی تکنیک کے بارے میں جی ایم سر نے مجھے تفصیلاً بتایا تھا اور میرے لیے چند روحانی مشقیں بھی تجویز کی تھیں جنہیں میں پابندی سے جاری رکھے ہوئے تھا مگر میرے پل پل رنگ بدلتے حالات مجھے ان معاملات پر بھرپور توجہ دینے کا موقع فراہم نہیں کررہے تھے۔ بہرحال، میری کوشش کسی حد تک جاری و ساری تھی اور مجھے یقین تھا کہ ایک دن میں اس تکنیک میں مہارت حاصل کرلوں گا، پھر جی ایم سر کی طرح ماضی، حال اور مستقبل میں چھلانگیں لگانا میرے لیے بائیں

ہاتھ کا کھیل ہو جاتا۔

اس حوالے سے سوچتے ہوئے مجھے جیسیکا کا خیال بھی آیا۔ جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ رومانٹک تورسٹ تھی۔ ہم دونوں نے چار اور پانچ فروری دو ہزار پندرہ کو ویلنگٹن (نیوزی لینڈ) سے بارسلونا (اسپین) تک اکتیس گھنٹے اور پچیس منٹ کا سفر ایک ساتھ کیا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا میں مستقبل قریب میں دوبارہ اس تجربے سے گزروں گا؟ اگر اس سوال کا جواب "ہاں" میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کوشش کر کے جی ایم سر سے ملاقات کی کوئی سبیل نکال سکتا ہوں۔

مستقبل میں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ میرے ماضی، حال اور مستقبل کو مالک کے سوا اور کوئی صحیح معنوں میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے سردست اتنا معلوم تھا کہ میں اپنی پیاری دوست شارو سے ملنے اوسک جارہا تھا اس کے بعد کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں وقت آنے پر سوچ لیا جائے گا۔

میں وقت کے ساتھ سفر (ٹائم ٹریولنگ) کے بارے میں بڑے انہماک سے سوچ رہا تھا اور میری فیلنگز کی تمام تر توجہ بھی اسی موضوع پر لگی ہوئی تھی۔ اسی استغراق کے دوران میں مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ اس نوعیت کے تجربے سے میں ایک بار پہلے بھی گزر چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں فضا میں بلند ہو رہا ہوں جیسے کوئی راکٹ زمین سے خلا کی سمت جاتا ہے۔ لحہ بہ لحہ میری رفتار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم کا درجۂ حرارت بھی بڑھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نامعلوم تیز رفتاری کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتا جارہا ہوں۔ میرا وزن نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میں لحہ بہ لحہ گریوٹی (کشش ثقل) سے آزاد ہوتا چلا جارہا تھا۔ زمین ہر شے کو ایک مخصوص قوت سے اپنے مرکز کی جانب کھینچتی ہے جسے فزکس کی زبان میں کشش ثقل (GRAVITY) کہا جاتا ہے۔ اگر زمین سے باہر خلا میں یا کسی دوسرے سیارے پر جانا مقصود ہو تو اس گریوٹی کو توڑنا پڑتا ہے اور ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ کی رفتار بہت زیادہ ہو۔ گریوٹی کو زیرو کرنا ممکن نہیں تاہم اپنی رفتار کو انتہائی درجے تک پہنچا کر اس کشش کی گرفت سے آزادی حاصل کی جاسکتی ہے...... اور یہی ٹائم ٹریول کا بنیادی اصول ہے۔ اس سائنسی اصول کو روحانیت میں ذرا مختلف انداز میں سمجھا اور بتایا جاتا ہے۔ یہاں پر ماضی، حال اور مستقبل کے سفر کو روحانی پرواز کا نام دیا گیا ہے۔ انسان کی روح روشنی کی رفتار سے بھی کہیں زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرنے پر قادر ہے اور اگر کسی شخص کی روح توانا ہو اور اس نے اپنا ہاتھ بھی کسی کامل انسان کے ہاتھ میں دے رکھا ہو تو پھر وہ ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں کلومیٹرز کا فاصلہ پلک جھپکتے میں طے کر لیتا ہے۔

میں انہی سوچوں کے ساتھ ایک عجیب وغریب تجربے سے گزر رہا تھا کہ مجبوراً مجھے اپنے ماحول میں واپس آنا پڑا۔ کوئی ڈنڈوں سے میری پٹائی کر رہا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

کھلی آنکھوں سے میں نے جو کچھ دیکھا وہ فوری طور پر سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ جب میں نے دھیان گیان کے لیے اپنی آنکھیں بند کی تھیں تو میرے علاوہ اس کمپارٹمنٹ میں تین اور افراد موجود تھے یعنی کاتیا اور وہ دو معمر مسافر جو ٹمسک کے ریلوے اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے تھے لیکن اب مجھے اس کمپارٹمنٹ میں درجن بھر افراد دکھائی دے رہے تھے جن میں ریلوے کے دو باوردی ملازم بھی شامل تھے۔ وہ سب کے سب مجھے اس طرح متوحش نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں یا میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں......!

ریلوے کا ایک ملازم ڈنڈا تھامے ڈرے سہمے انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ "سر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"کیوں......؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "میری طبیعت کو کیا ہوا ہے......؟"

"آپ کے وجود میں سے آگ نکل رہی تھی۔" اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "آپ کی ساتھی گھبرا کر یہاں سے اٹھ گئی تھی۔ پھر ہمیں اس ناقابلِ یقین واقعے کی اطلاع دی گئی اور ہم فوراً یہاں پہنچ گئے۔ سچی بات تو یہ ہے سر......" لمحاتی توقف کر کے اس ریلوے ملازم نے اس انداز میں سانس لی جیسے اس کی جان میں جان آگئی ہو پھر وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مجھے آپ کی ساتھی کاتیا کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ ایک انسان کے جسم میں سے بھلا آگ کیسے نکل سکتی ہے۔ رشیا کے موسم نے تو انسان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو جما کر رکھ دیا ہے اور میں......"

"تو کیا آپ نے میرے جسم سے نکلنے والی آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا پھر اپنے بدن کے مختلف حصوں کو دیکھا اور چھو کر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "مجھے تو ایسا کچھ بھی دکھ رہا ہے اور نہ ہی محسوس ہو رہا ہے......!"

''سر! میں نے آپ کے اندر سے آگ نکلتے نہیں
دیکھا لیکن یہ ضرور ہے کہ آپ کی باڈی کا درجۂ حرارت خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جیسے ہی آپ کو کندھے سے ہلا کر بیدار کرنے کی کوشش کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کسی دہکتے ہوئے انگارے کو چھولیا ہو۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا تھا اسی لیے میں اپنے ڈنڈے کی مدد سے ٹھونک بجا کر آپ کو جگانے کی کوشش کررہا تھا کہ آپ نے آنکھیں کھول دیں۔''

میں نے نگاہ اٹھا کر کاتیا کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا واقعی تم نے میرے اندر سے آگ نکلتے دیکھی تھی؟''

کاتیا سکڑی سمٹی ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس واقعے نے اس خوب صورت رنگین بلونڈ کو بری طرح ڈرا دیا تھا، دہشت بھرے انداز میں اس نے جواب دیا۔

''ان فیکٹ، میں نے آگ کو تو نہیں دیکھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا تھا جیسے میں کسی آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھی ہوں اور اگر میں اسی طرح تمہارے برابر والی سیٹ پر بیٹھی رہی تو تمہارے اندر سے خارج ہونے والا لاوا مجھے جلا کر بھسم کر ڈالے گا۔ میں فوراً اپنی سیٹ سے اٹھی اور سامنے والے دونوں مسافروں کو تمہاری کیفیت کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد ہی میں ریلوے کے عملے کو اس واقعے سے آگاہ کرنے گئی تھی۔''

سامنے والی سیٹ کے بزرگ دونوں مسافروں نے کاتیا کے بیان کی تصدیق کردی۔ ایک نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جب میں نے اس لڑکی کی بات پر توجہ دی تو مجھے لگا کہ وہ غلط بیانی نہیں کررہی۔ تمہارے وجود سے خارج ہونے والی حرارت کی تپش میں نے بھی محسوس کی تھی۔''

''ہاں، یہ سچ ہے کہ تمہارے اندر سے بہت زیادہ انرجی نکل رہی تھی۔'' دوسرے نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ہی اس لڑکی کو مشورہ دیا تھا کہ ریلوے اسٹاف کے کسی آدمی کو بلا لائے۔''

کمپارٹمنٹ میں اس وقت ریلوے کے جو دو باوردی ملازم موجود تھے ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ ''سر! اگر آپ اچھا محسوس نہ کررہے ہوں تو میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ ہمارے پاس میڈیکل ایڈ کا بندوبست ہے!''

ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں جو کچھ بھی پیش آیا تھا، میں اسے اچھی طرح سمجھتا تھا مگر میری مجبوری اور احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں ان لوگوں کو اس حوالے سے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ میری اس بات پر قطعاً یقین نہ کرتے کہ میں ٹائم ٹریولنگ میں

حد درجہ بڑھ گیا تھا لیکن در جن بھر چہروں پر جو پریشانی چمک رہی تھی اسے رفع کرنا بھی ضروری تھا۔

''آفیسر!'' میں نے ریلوے کے ایک ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے چھو کر اچھی طرح اطمینان کرلیں کہ میں بالکل نارمل ہوں۔''

میرے لہجے کی سنجیدگی اور سنبھلی ہوئی حالت کے پیش نظر اس ریلوے ملازم نے اپنے اندرونی تجسس سے مجبور ہوکر ڈرتے ڈرتے میرے جسم کو چھوا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ریلوے ملازم کو بھی حوصلہ ہوا اور اس نے میرے بدن کے مختلف حصوں کو ٹٹول کر اپنی تسلی کرلی اور مطمئن ہوگیا۔

میں نے کاتیا کی جانب دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا تم مجھے چیک نہیں کروگی؟''

''نن...... نہیں!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''اٹس او کے......''

اس انوکھے واقعے نے گرین آئیز والی کاتیا کو بری طرح سہما کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے خوف جھلکتا تھا۔ ان لمحات میں، میں کاتیا کے ڈر کو بھگانے کے لیے سردست یہی کرسکتا تھا۔

''کاتیا!'' میں نے بڑے پیار سے اسے مخاطب کیا۔ ''اپنی سیٹ پر آجاؤ۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

میری دوستانہ پیش کش کا کاتیا پر تو کوئی اثر نہ ہوا تاہم ریلوے کے ایک ملازم نے مجھ سے استفسار کیا۔

''سر! آپ کو ہوا کیا تھا؟''

''میرے خیال میں تو مجھے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن اگر آپ بہ ضد ہیں کہ مجھے کچھ ہوگیا تھا تو پھر ہوگیا ہوگا......''

ریلوے آفیسر نے مجھ سے زیادہ بحث یا جرح نہیں کی اور صرف ایک سوال کرنے کے بعد وہ کمپارٹمنٹ سے رخصت ہوگئے۔

''اب آپ کیسا محسوس کررہے ہیں سر؟''

''فٹ اینڈ فائن!'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ریلوے ملازمین سمیت دوسرے لوگ بھی ہمارے کمپارٹمنٹ سے رخصت ہوگئے۔ بس، ہم چار مسافر باقی رہ گئے۔ کاتیا ڈرے سہمے انداز میں اپنی سیٹ پر تو آکر بیٹھ گئی تھی۔ تاہم اس نے ایک محفوظ فاصلہ قائم کرلیا تھا یعنی

وہ اس کاؤچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی جیسے ڈر رہی ہو کہ میرے اندر سے دوبارہ حرارت خارج ہونے لگے گی۔ میں نے بھی اس سلسلے میں مزید کوئی وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور ٹرین کی کھڑکی کے باہر برف پوش مناظر کو دیکھنے لگا۔

اگرچہ میں اس وقت ٹائم ٹریولنگ پر نہیں بیٹھا تھا۔ میں تو اپنے مینٹور جی ایم سر کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ گہرے استغراق نے مجھے اس پٹڑی پر ڈال دیا تھا۔ اس حالیہ تجربے سے چند باتیں میری سمجھ میں آئیں۔

نمبر ایک، ٹائم کے ساتھ ٹریول کرنے کے لیے حد درجہ انہماک کی ضرورت تھی۔ نمبر دو، اس نوعیت کے تجربات الگ تھلگ بیٹھ کر کرنا چاہیے تھے تاکہ آپ کے جسم کا درجہ حرارت آس پاس کے لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بنے۔ نمبر تین، اس حد درجہ خارج ہونے والی حرارت کو کنٹرول کرنے کا بھی کوئی طریقہ کار ہونا چاہیے جیسا کہ جی ایم سر کو ان معاملات پر قدرت حاصل تھی۔ میں بھی یقیناً اس سائنس میں مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا.....

ماسکو اکھا جا کے ریلوے اسٹیشن پر بہ وقتِ رخصت کاتیا نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کرنے کا تکلف بھی ضروری نہ سمجھا اور دور ہی سے ہاتھ ہلا کر ''بائے بائے'' کر دیا۔

کاتیا کے اس لاتعلقی کے انداز میں، میں اس رشین بلونڈ کو قصوروار نہیں سمجھتا تھا۔ وہ میری کیفیت سے بری طرح ڈر گئی تھی۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور بھی ہوتی اور اس تجربے سے گزرتی تو وہ بھی ایسے ہی ردعمل کا مظاہرہ کرتی۔

الیگزینڈر پلاٹز سے ماسکو اکھا جانے کے طویل سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا لہٰذا میں نے ماسکو سے اوسک تک ہائی ائر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ریلوے اسٹیشن سے ایک ٹیکسی پکڑی اور ائرپورٹ پہنچ گیا۔

معلومات حاصل کرنے پر پتا چلا کہ دو گھنٹے کے بعد یورل ائرلائنز کی ایک فلائٹ ماسکو سے اوسک جانے والی ہے۔ میں نے دو سو ڈالرز میں اپنے لیے مذکورہ فلائٹ کا ٹکٹ خرید لیا۔ یورل (URAL) ائرلائنز کی فلائٹ۔ تھری ایٹ سیون نے تین گھنٹے اور بیس منٹ میں مجھے اوسک پہنچا دیا۔

☆☆☆

اوسک کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے فرحت کا احساس ہوا تھا کیونکہ میں اپنی متاعِ عزیز شارو کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اپنے کے قرب کے بارے میں سوچ کر انسان ایک انجانی ناقابلِ بیان مسرت سے نہال ہو جاتا ہے۔ ان لمحات میں میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میں شارو کے روبرو کھڑا ہوتا، پھر ہمیں ایک دوسرے کا ہو جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اوسک، رشیا کی ایک قدیم ٹھنڈی ٹھار ریاست ہے جو سائبیریا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ رقبے کے لحاظ سے یہ ایک چھوٹی ریاست ہے جو کم و بیش پانچ سو تہتر مربع کلومیٹرز پر پھیلی ہوئی ہے جس میں زیادہ تر علاقہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ اوسک کی آبادی تقریباً بارہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ میں نے اوسک کے قلب میں واقع ہوٹل فورٹی ون میں چیک ان کیا۔

ہوٹل میں قیام کے بعد میں نے سب سے پہلا جو کام کیا، وہ دینارا سے رابطہ کرنا تھا۔ جیسیکا نے اپنے خط میں دینارا کا مکمل ایڈریس، فون نمبر اور تمام تر کوڈ ورڈز لکھ دیے تھے تاہم یہ ہدایت بھی کی تھی کہ مجھے پروسس کو فالو کرنا ہے۔ یہ نہیں کہ اوسک پہنچتے ہی میں منہ اٹھا کر دینارا کے اپارٹمنٹ کی جانب چل پڑتا۔ مجھے باقاعدہ دینارا کے کہے پر عمل کرنا تھا۔ اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ہوٹل میں عارضی قیام کر لیا تھا کہ دینارا جس وقت مجھے ملاقات کے لیے بلائے گی، میں ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے اس کے اپارٹمنٹ کی جانب روانہ ہو جاؤں گا۔

میں نے ہوٹل کے فون سے دینارا کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری جانب گھنٹی بجنے لگی پھر گھنٹی بجتی چلی گئی۔ میرے دل کی دھڑکن یک لخت تیز ہو گئی تھی۔ مجھے اس بات سے وحشت ہو رہی تھی کہ دینارا کال پک کیوں نہیں کر رہی تھی؟ میں لائن کو کاٹ کر دوبارہ فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دوسری جانب سے فون ریسیو کر لیا گیا پھر ایک ٹھہری ہوئی نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''کیفن ایریس تو؟''

دینارا نے ہسپانوی زبان میں مجھ سے پوچھا تھا۔ ''میں کون ہوں؟'' جیسیکا کی ہدایت کے مطابق، مجھے اس سوال کے جواب میں دینارا کو رشین میں بتانا تھا کہ میں ''سنہری عقاب'' ہوں۔

میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''زدلوتوئی اوریل!''

میں نے جیسیکا کے بتائے ہوئے روسی زبان کے الفاظ اچھی طرح رٹ لیے تھے لہٰذا دینارا سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے کوئی دقت یا دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جیسیکا کی ''پیش گوئی'' کے عین مطابق مجھ سے ہسپانوی میں اگلا سوال کیا۔

''دیز دے دوندے ایستا؟''

وہ پوچھ رہی تھی۔ ''میں کہاں سے آیا ہوں؟'' میں نے رشین میں اسے بتایا کہ میرا تعلق ہمالیہ سے ہے۔ میں نے جواب میں صرف ہمالیہ کا نام لیا تھا۔

''گمالائی!''

دینارا میری جانب سے مطمئن ہوگئی پھر اس نے شستہ انگریزی میں مجھ سے کہا۔

''مسٹر علی! تم آج شام پانچ بجے مجھ سے ملنے آسکتے ہو۔''

''اوکے..... گاٹ اٹ!'' میں نے بھی اس بار انگلش ہی میں جواب دیا۔

اسی لمحے دینارا نے دوسری جانب ریسیور کریڈل کر دیا۔ لائن بے جان ہوگئی۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

تعارف کا یہ طریقۂ کار اگرچہ کافی پیچیدہ تھا تاہم مجھے پسند آیا۔ شاید اس پسندیدگی کے پیچھے میری وہ خوشی کارفرما تھی کہ میں ان مراحل سے گزرنے کے بعد اپنی جانِ جگر سے ملنے والا تھا۔ کسی عزیز از جان سے ملن کا تصور ایسا ہی دل نشیں اور مسحور کن ہوتا ہے۔ میں اس وقت ایک نشاط انگیز کیفیت سے گزر رہا تھا۔ کسی شے کو پانے کا لطف وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس نے کبھی کچھ کھویا بھی ہو۔

دینارا نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑے سادہ الفاظ میں کہا تھا کہ میں آج شام پانچ بجے اس کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجا سکتا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی دیوار گیر گھڑی کی جانب نگاہ اٹھائی۔ پانچ بجنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں اس وقت اوسک کے سٹی سینٹر میں واقع ہوٹل - 41 میں بیٹھا تھا۔ یہاں سے دینارا کے اپارٹمنٹ کا سفر زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا تھا۔ میں نے باقی کا وقت ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

میں اوسک میں پہلی مرتبہ آیا تھا اور وہ بھی اس مجبوری کے تحت کہ جیسیکا نے شارو کو یہاں پہنچا دیا تھا۔ عام حالات میں، میں اس برف خانے کا رخ کرنے کے بارے میں غلطی سے بھی نہیں سوچتا۔

میں ہوٹل کے کمرے میں اس لیے بھی بیٹھ گیا تھا کہ اوسک میں بالکل اجنبی تھا اور پھر میں اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا اس میں جتنی بھی احتیاط کی جاتی، وہ کم تھی۔ اوسک کی ناشناسا سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اب تک سب کچھ ٹھیک رہا تھا اور مالک سے یہی دعا تھی کہ آگے بھی سب ٹھیک ہی رہے۔ میں اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد کسی اپ سیٹ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے احتیاطاً ہوٹل - 41 کو چیک آؤٹ نہیں کیا اور ٹہلتے ہوئے باہر نکل آیا۔ اس وقت میرا بیگ بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ٹھیک پانچ بجے دینارا کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔

میں نے اپنے محسوسات کی مدد سے شارو کو جس گھر میں محوِ استراحت دیکھا تھا وہ واقعتاً ایک دو منزلہ مکان تھا۔ عین ممکن ہے، رشیا میں ایسے گھروں کو بھی اپارٹمنٹ ہی کہا جاتا ہو۔ بہرحال میں نے وقتِ مقررہ پر دینارا کے گھر کی گھنٹی تین بار بجائی۔

ادھر میرے اس عمل کی تکمیل ہوئی، ادھر ڈور بیل کے ساتھ نصب اسپیکر آن ہوگیا پھر دینارا کی مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''کریسنی وورابی؟''

اس نے رشین میں پوچھا تھا۔ ''کیا میں سرخ چڑیا ہوں؟'' میں نے جیسیکا کی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔ ''نہیں!'' میرا یہ جواب بھی رشین میں تھا۔ میں نے کہا تھا۔

''نیت!''

دینارا نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔ ''درگ گمالیان؟'' اس نے رشین میں استفسار کیا تھا۔ ''کیا میں ہمالین دوست ہوں؟'' میں نے رشین ہی میں اسے ''ہاں'' میں جواب دیا۔

''داہ!''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''خراشو!''

دینارا نے ''خراشو'' یعنی اوکے کہتے ہوئے میرے لیے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے یہ سارا عمل کسی خودکار نظام کی مدد سے کیا تھا کیونکہ دروازے کا لاک کھلنے کی آواز کے بعد مجھے وہاں کسی کا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ لاک گرانے کا یہی مقصد تھا کہ میں دروازہ کھول کر اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو جاؤں۔

میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی پھر مالک کا نام لے کر دینارا کے گھر میں قدم رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میں سناٹے میں آگیا۔

کسی خوف ناک گن کی سرد نال میری کھوپڑی سے آ لگی تھی!

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے ہیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

Urdu Novels

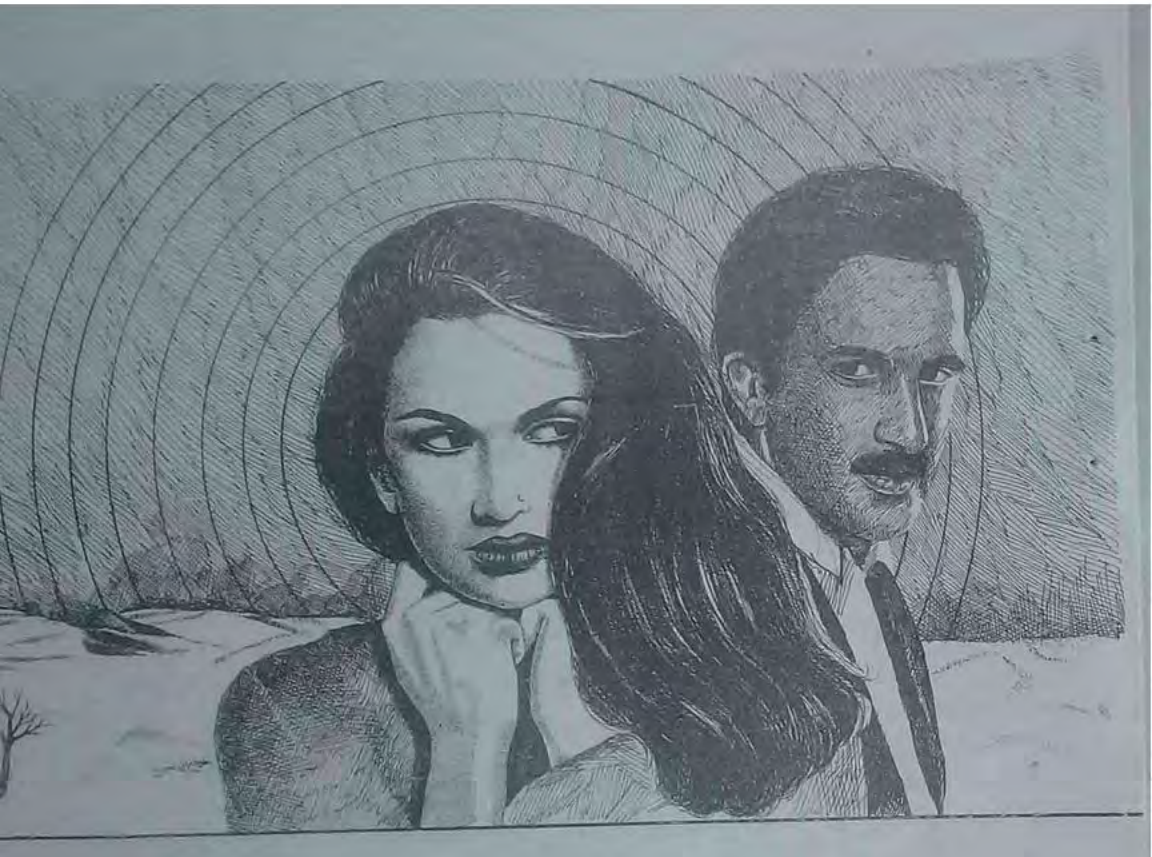

احمق

ماہ رخ ارباب

جب کبھی کوئی کمزور انسان ظلم و زیادتی کا شکار ہوتا ہے تو اس کے دل میں اپنے دوسرے رشتوں کے لیے بھی ایک نادیدہ خوف جگہ بنالیتا ہے... اسے بھی اپنی جان سے زیادہ عزیز مگر بے وقوف بہن کا خیال ہمیشہ بے چین رکھتا تھا اور پھر یہی بے چینی ایک دن اس خوف میں ڈھل گئی جو ہمیشہ سے اس کے تعاقب میں رہتا تھا پھر کیسے وہ اس کی حفاظت میں جان نہ گنواتی۔

دو بہنوں کی ضدی طبیعت اور محبت کا عجیب سنگم

ویسے تو میری چھٹی حس ہمیشہ مجھے بروقت تمام خطرات سے آگاہ کردیا کرتی تھی لیکن جب بُرا وقت آتا ہے تو انسان کی چھٹی کے ساتھ ساتھ باقی کی پانچوں حسیں بھی کام کرنا بند کردیتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ اس دن میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں اس وقت گھر کی صفائی کے بعد دوپہر کا کھانا بنانے کی تیاری کررہی تھی اور کھانا بنانے میں آپ کی ناک ایک اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن چونکہ میری تمام حسیات اس دن کچھ گڑبڑا چکی تھیں، اس لیے شوربے میں خراب ٹماٹر کی بو مجھے اس وقت محسوس ہوئی

جب وہ پکنے کے قریب تھا۔

اس شوربے کو ماما کے سوپ میں شامل کردیا جائے یا پھینک دیا جائے؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ باہر پورچ میں کسی ہیوی انجن گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے کچن کی لان میں کھلنے والی کھڑکی سے باہر جھانکا وہ ایک جیپ تھی جس کا سوار بظاہر تو خوش لباس اور وجیہہ شخص تھا مگر بغور دیکھنے سے اس کے چہرے پر جھلکتی حماقت صاف نظر آتی تھی۔ اگر وہ احمق نہ ہوتا تو اتنے خراب موسم میں اس جانب نکلنے کی حماقت ہرگز نہ کرتا جبکہ کچھ ہی دنوں میں برف باری کے سبب یہ علاقہ مکمل طور پر ملک کے باقی حصوں سے کٹ جاتا۔ چہرے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ پچیس سے تیس تک کی درمیانی عمر کا ہوسکتا تھا۔ مجھے ایسے لوگ بالکل نہیں پسند جن کے متعلق میں کوئی حتمی رائے نہ قائم کرسکوں۔ اس سے پہلے کہ میں اس ریزورٹ کے منتظم کی حیثیت سے اسے ویلکم کرتی، وہی ہوا جس کا خدشہ ہمیشہ رہتا ہے۔ اصطبل میں ہمارے اکلوتے گھوڑے کی چاکری کرتی ہانیہ نے یقیناً گاڑی کی آواز سن لی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب پہنچی اور سفری بیگ اس کے ہاتھ سے یوں جھپٹا کہ ایک پل کو وہ لڑکھڑا سا گیا۔

ہانیہ ہمیشہ کی طرح موسم سے بے نیاز ایک مختصر سے اشتعال انگیز لباس میں تھی۔ اس نے گہرے گریبان کی مختصر سی شرٹ کے ساتھ گھٹنوں تک کسی ہوئی ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے۔ اونچی سی پونی کو لہراتی ہوئی وہ یقیناً بہت خوبصورت لگ رہی تھی مگر اسے دیکھ کر میرے دانت بجنے لگے تھے۔ جانے ماما اسے ایسا لباس پہننے سے روکتی کیوں نہیں؟

میں نے جھنجلا کر ہاتھ میں تھامی بڑی سی چھری سے کٹنگ بورڈ پر رکھی مچھلی کا نشانہ لیا۔ اس کا سر ایک جھٹکے سے علیحدہ ہوا اور اڑتا ہوا چولہے پر بیٹھے کے لیے پکتے دودھ میں جا گرا۔

☆☆☆

ہمارا یہ ریزورٹ جسے یہ نام دینا ابھی ریزورٹ کی توہین ہے، دراصل بڑی شاہراہوں سے ہٹ کر تقریباً جنگل کے اندر بنا ہوا ایک بڑا سا مکان تھا جس کے پاس ایک چھوٹی سی جھیل بھی تھی، دو اطراف اونچے اونچے پہاڑ اور تیسری طرف قدرتی جھیل۔

پاپا نے اسے شہر میں اپنی تمام پراپرٹی فروخت کرکے جب خریدا تو ان کا ارادہ اسے ایک تفریحی مقام میں بدلنے کا تھا۔ دیکھا جاتا تو یہ ایک بہت خوبصورت مقام تھا مکان سے متصل جھیل میں کشتی رانی کی سہولت موجود تھی لیکن وسائل کی کمی اور مناسب تشہیر نہ ہونے کے سبب وہ لوگوں کو خاطر خواہ اس طرف متوجہ نہ کرپائے۔ وہ ایک محنتی اور اولوالعزم انسان تھے۔ شاید وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو بھی جاتے اگر زندگی وفا کرتی۔ شہر سے گھر آتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران دل کا اچانک پڑنے والا دورہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی گاڑی ایک گہرے کھڈے میں جا گری۔ جس سے گاڑی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی اور گاڑی کو کاٹ کر پاپا کی لاش کو نکالا گیا۔ میں اس وقت بیس سالہ طالبہ تھی مگر گھر، ماما، اور آٹھ سالہ ہانیہ کو سنبھالنے جیسی مشکلات نے مجھے وقت سے پہلے ہی سمجھدار کردیا تھا۔ پاپا کی موت کے بعد ماما کی زندگی میں دو ہی شوق تھے۔ جیولری جمع کرنا اور ٹی وی دیکھنا۔ ارے ہاں انہیں ایک اور شوق بھی تھا۔

ہانیہ کا بس ایک ہی شوق تھا شادی کرنا اور اس مقصد کے لیے وہ یہاں آنے والے ہر تنہا مرد کو گھیرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی تھی مگر اس کوشش میں تاحال وہ ناکام تھی کیونکہ جن سے وہ شادی کرنا چاہتی وہ اس سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور جو اس سے شادی کرنا چاہتا، ایسا کوئی اسے ملا ہی نہیں تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ خوبصورت نہیں تھی مگر اس کے حد درجہ حاکمانہ رویے سے لوگ خوفزدہ ہوجاتے تھے۔ وہ زندگی میں معمولی سے کمپرومائز کی بھی قائل نہیں تھی۔ پاپا کی وصیت کے مطابق جائداد کے وارث ہم تینوں ہی تھے، اس کے باوجود اس کی منتقلی میں جو مشکلات درپیش ہوئیں انہوں نے مجھے مردم بیزار سا کردیا تھا بلکہ شاید ہم سب کی نفسیات پر کچھ نہ کچھ اثرات ضرور چھوڑے تھے۔

☆☆☆

نووارد مسافر کا نام اسحٰق تھا۔

میں نے اسے بغور دیکھا۔ یہ نام اس کی شخصیت پر بالکل نہیں جچتا تھا اس کا تو کوئی شاہانہ سا نام ہونا چاہیے تھا جیسے..... تیمور یا سکندر۔ میں نے رجسٹر میں تیزی سے اس کی آمد کا اندراج کرتے ہوئے سوچا۔

ہانیہ اس کا سامان کمرے تک پہنچانے کے بعد اب کاؤنٹر سے کہنی ٹکائے بہت دلچسپی کے ساتھ سر تا پیر اس کا مشاہدہ کررہی تھی اور وہ بھی ابتدائی بدحواسی کے بعد منہ کھولے احمقانہ انداز میں اپنی دانست میں میری نظر بچا کر کن انکھیوں سے اسے دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

خانساماں، ریسپشنسٹ اور پورٹر کی غیر موجودگی میں یہ تمام کام بھی ہمارے ذمے تھے، ہاں ماما یا ہانیہ کبھی کبھار میرا ہاتھ ضرور بٹا دیا کرتیں۔ یا ایک کام تھا جو ہانیہ بہت شوق سے کرتی تھی۔

مسافروں کو کشتی میں بٹھا کر نہر کا چکر لگانا اور انہیں دوسرے سرے پر موجود جنگل میں لے جانا۔ جنگل کی خوبصورتی اور پُراسرار اندھیرے وہاں جانے والوں کو مسحور کردیا کرتے تھے۔ وہ کئی کئی گھنٹے وہیں رہ جاتی اور یہاں میں مختلف اندیشوں اور واہموں کا شکار ہوتی رہتی، اس لیے میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ مسافروں کو کشتی کی طرف متوجہ نہ کرسکے۔ کم از جب مسافر اپنی فیملی کے ساتھ نہ ہوں۔ ویسے بھی اس وسیع علاقے میں کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ فشنگ اور ہائیکنگ کے علاوہ گھڑسواری گھر کے عقبی حصے میں بنے ٹینس کورٹ میں اور ہانیہ اکثر پریکٹس کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اب چالیس سال کی عمر میں ٹینس جیسا تیز رفتار گیم کھیلنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔

''جناب اسحٰق بوٹا صاحب! جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں یہ جگہ عام شاہراہ سے ہٹ کر ہے اور جس سڑک پر سفر کرکے آپ یہاں تک پہنچے ہیں، وہ دراصل ہم نے ہی تعمیر کروائی ہے۔ نزدیکی قصبے اور اس جگہ کے درمیان میں کوئی آبادی موجود نہیں..... تو میں ہر آنے والے سے یہ سوال ضرور کرتی ہوں کہ وہ کس کے حوالے سے یہاں تک پہنچے؟'' میں نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

''اوہ ہاں، میں نیٹ پر شمالی علاقہ جات میں موجود تفریحی مقامات سرچ کررہا تھا جب مجھے آپ کا اشتہار نظر آیا تو میں نے بس کلک کردیا۔ یہ جگہ تو جنت کا ٹکڑا ہے۔ بس یا کچھ مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟''

اس نے خوشگوار انداز میں تفصیلی جواب دیا اور آخر میں گھر پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ میرا منہ اس کی بات سن کر حیرت سے کھل گیا۔

''نیٹ پر کیسے؟''

میں نے ہانیہ کی طرف دیکھا۔ اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کاندھے اچکادیے۔ یہ بات بہت پہلے سے ہمارے درمیان طے ہوچکی تھی کہ ہم اس جگہ کی تشہیر نہیں کریں گے بلکہ جیسا چل رہا ہے اسی پر اکتفا کریں گے۔ اسحٰق نے بغور میرا ردِعمل نوٹ کیا۔ وہ اس وقت بالکل بھی احمق نہیں لگا۔

''ہاں، یہ ایک اچھا طریقہ ہے تشہیر کا۔ میں خود اپنے کاروباری اشتہارات دیتا رہتا ہوں۔ شاید آپ نے بھی دیکھا ہو..... زمرد ڈائمنڈز اینڈ جیولری؟''

''اوہ نہیں جناب! یہاں انٹرنیٹ کی سروس اتنی اچھی نہیں ہے۔ امید ہے آپ کا وقت یہاں دوسری ایکٹیویٹیز میں اچھا گزرے گا۔''

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجا کر جلدی جلدی اسے نمٹا کر رجسٹر بند کردیا۔ ماما سے فوراً بات کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ میں ڈرتے ہوئے ان کے پاس گئی اور مطلوبہ معلومات لینے کی کوشش کی مگر ماما نے انکار کردیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔

☆☆☆

ہانیہ کا اجنبی کے ساتھ زیادہ میل جول مجھے تشویش میں مبتلا کرنے لگا تھا لیکن اس سلسلے میں وہ اب کسی کی نصیحت سننے کی روادار نہیں تھی۔ رات ہونے والی بارش کے بعد موسم زیادہ سرد اور نم ہونے لگا تھا۔

تہ خانے میں رکھے گرد سری کے سامان کا جائزہ لینے کے دوران مجھے لان کی سمت کھلنے والے روشندان سے کسی کے قدموں کی آہٹ سی سنائی دی اور ایک جھلک بھی وہ ہانیہ نہیں تھی۔ وہ اس دن سیاہ لباس میں ملبوس تھی جبکہ جو گرز میں مقید پیروں کے اوپر موجود جینز کا رنگ نیلا تھا۔ میں خاموشی سے کارٹن یونہی کھلے چھوڑ کر روشندان کے بالکل نزدیک کھڑی ہوئی۔ نیچے رکھے بھاری صندوق پر چڑھ کر دیکھنے سے اب پورے لان کا منظر واضح تھا۔

اسحٰق کی بے ربط حرکات وسکنات سے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین پر کچھ تلاش کررہا ہو۔ کیاریاں اس کی توجہ کا خاص مرکز تھیں۔ اس نے بعض پودوں کو باقاعدہ ہلا کر کسی ماہر نباتات کی طرح ان کی جڑوں کا جائزہ لیا۔

مکان کے سامنے کا پورا حصہ لان اور پارکنگ کے لیے مخصوص تھا۔ یوں اسے ایک چکر مکمل کرکے واپس آنے میں کافی وقت لگ جاتا۔ آخر کار اس نے یونہی ٹہلتے ٹہلتے کافی سارے پھول توڑ کر جمع کرلیے اور میں ایک گہری سانس لیتی ہوئی صندوق سے نیچے اتر گئی، وہ بے وقوف اس پراسرار انداز میں پھول توڑ رہا تھا۔

☆☆☆

حالانکہ وہ دن خریداری کے لیے نکلنے کے لیے بالکل مناسب نہیں تھا، سورج پھر سے دبیز بادلوں کی اوٹ میں چھپ چکا تھا۔ بارش کسی بھی وقت متوقع تھی اگر برف باری ہوجاتی تو نکلنا اور بھی مشکل ہوجاتا۔ اشیا خورونوش کے ساتھ جنریٹرز کو اسٹینڈ بائی رکھنے کے لیے پٹرول کی فراہمی ضروری تھی اور وہ سب قریب اختتم تھا لیکن گاڑی نکالتے وقت ایک ایسا منظر نظر آیا جس نے مجھے آتش فشاں کے دہانے پر لا بٹھایا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے خریداری ترک کرنے کے بارے میں سوچا۔

ہانیہ عرصے سے بند پڑی موٹر بوٹ سے ترپال ہٹا رہی تھی اور اسحٰق اس سے انتہائی قریب کھڑا اس کا ہاتھ بٹانے کی

ایکٹنگ کر رہا تھا۔ مکان کے داہنی طرف کے تمام کمروں کی کھڑکیاں جھیل کی طرف کھلتی تھیں۔ مکان کے بیرونی دروازے سے شروع ہونے والا پختہ راستہ جھیل کے ساتھ چلتا ہوا کافی طویل چکر کاٹ کر مکان کے بیرونی گیٹ تک پہنچتا تھا۔ راستے کو محفوظ بنانے کے لیے لوہے کا ایک جنگلا نصب کیا گیا تھا جو راستے اور پانی کے درمیان حد بندی کا کام کرتا تھا۔ مین گیٹ اور جنگلے کے اختتام پر ایک مختصر سا لکڑی کا پلیٹ فارم جھیل کے اندر تک چلا گیا تھا۔ جس کے داہنے کونے اور جنگلے سے جڑا ہوا ایک لکڑی کا بڑا سا کیبن پانی کے اندر گڑے لکڑی کے ستونوں پر تعمیر کیا گیا تھا اسی کیبن کے اندر ایک موٹر بوٹ اور لکڑی کی چپوؤں والی کشتی بھی موجود رہتی۔ کبھی کبھار ہانیہ کو خیال آجاتا تو وہ اس کو بھی چیک کر لیتی ورنہ عموماً وہ ہماری بے توجہی کا شکار ہی رہتی۔ میں نے اپنی پک اپ نکالی اور جھٹکے سے آگے بڑھائی۔ اس کی رفتار میں میرا تمام غصہ بھر گیا تھا۔ گاڑی ایک زناٹے سے آگے بڑھی اور پلک جھپکتے میں چوبی پلیٹ فارم کے نزدیک جا ٹھہری۔ اسحٰق چونک کر ہانیہ سے دور ہوگیا۔ وہ اس وقت بوٹ سے بندھی ہوئی زنجیریں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرخ و سفید چہرہ مشقت سے تمتما رہا تھا۔

''یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟''

میں نے دانستہ اپنا لہجہ سخت رکھنے کی کوشش کی۔

''اسحٰق جھیل کی سیر کرنا چاہتا ہے۔'' ہانیہ مسکرائی۔

''ارے نہیں۔ یہ تو مس ہانیہ کی خواہش تھی۔'' وہ یکدم گھبرا سا گیا۔

''کیا تمہارا دماغ خراب ہے، اتنے سرد موسم میں تم گھر سے نکلنے کے متعلق سوچ بھی کیسے سکتی ہو، وہ بھی جھیل میں؟''

میں نے ایک نظر پانی پر ڈالی گاڑھے کہرے میں دوسری جانب موجود جنگل بھی سیاہ ہیولے کے مانند نظر آرہا تھا۔ ہانیہ کو اس کے ارادے سے باز رکھنے میں کافی مشکل پیش آئی مگر بہرحال وہ اندر چلی گئی۔ ہمیں خریداری کے لیے پندرہ منٹ کی ڈرائیو کر کے نزدیکی قصبے تک جانا پڑتا تھا جہاں کے لوگ اب ہم سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ سامان پک اپ میں رکھوانے تک بارش شروع ہوگئی اور میں گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی لگی تھی جب دکان میں موجود ملازم لڑکے نے ایک عجیب بات بتائی۔

''بی بی جی، ایک صاحب ادھر آپ کے واسطے پوچھ رہا تھا۔''

اس نے ایک بڑا سا کارٹن گاڑی میں رکھتے ہوئے اچانک میری سماعتوں پر دھماکا کیا۔

اپنے متعلق معلومات لینے والے کا حلیہ سن کر میں ایک پل کو سوچ میں پڑ گئی۔ یہ کوئی انجان شخص تھا۔ میں نے اگلی بار اسے اپنے متعلق پوچھنے والوں کو ٹالنے کی ہدایت کی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

سردی سے کپکپاتے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ سنبھالنا بھی مشکل ہونے لگا تھا۔ تمام راستہ گہری دھند اور اندھیرے کی زد میں تھا حالانکہ دوپہر کا وقت تھا مگر گہرے بادلوں اور گھنے درختوں سے گھرے پتھریلے ڈھلوان راستے پر گاڑی چلانا مشکل ہو رہا تھا۔

ہمارا مکان بھی آس پاس کے ماحول کے اثرات قبول کیے ہوئے خاموشی کے حصار میں تھا۔ میں نے ٹھٹھرتے ہاتھوں سے ضروری سامان اندر پہنچایا اور باقی پر ترپال ڈال کر ڈھانپ دیا۔ اندر ایک جاں فزا حرارت نے میرا استقبال کیا۔ آتش دان میں آگ روشن تھی اور ماما اس کے نزدیک آرام دہ کرسی پر براجمان ایک فیشن میگزین دیکھنے میں محو تھیں۔ وہ دونوں شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے تھے جبکہ میرے علم کے مطابق میرے باہر نکلنے سے پہلے تک ہانیہ شطرنج سے بالکل نابلد تھی اور اس وقت وہ نہایت انہماک سے مہروں پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔

وہ ایک پرسکون دوپہر تھی۔ بارش تو کچھ دیر برس کر رک گئی تھی۔ اس دن رات کا کھانا بنانے میں ماما نے بھی مدد کی۔ بلاشبہ وہ بہت اچھی شیف تھیں۔ ان کی فرمائش کی ہوئی مچھلی سب نے بہت شوق سے کھائی۔ اسحٰق کو وہ اصرار کر کر کے کھلاتی رہیں۔ شاید انہوں نے بھی اس میں ہانیہ کی دلچسپی محسوس کر لی تھی۔ بے چاری میری ماما۔

☆☆☆

دوسرے دن ہانیہ صبح ہی صبح نک سک سے تیار میرا دماغ چاٹنے پہنچ گئی جب میں گارڈن میں اجڑے ہوئے پودوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

''تانیہ! تمہیں یقیناً اپنے کھانا پکانے کے طریقوں کا ازسرِنو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔''

''تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے؟'' میں نے کچھ حیرت سے اس کی شکایت کے پیچھے چھپی وجہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''تمہارا بنایا کھانا کھا کر اسحٰق کا پیٹ خراب ہو چکا ہے۔ وہ صبح سے واش روم میں گھسا ہوا ہے اور میں بور ہو رہی ہوں۔'' اس نے بہت خراب موڈ کے ساتھ بات مکمل کی۔

''ہوسکتا ہے وہ تمہاری دست برد سے محفوظ رہنے کے لیے اندر چھپ کر بیٹھا ہو۔'' میں نے اطمینان سے کہتے ہوئے سر اس کا مذاق اڑایا۔ اس نے غصے سے مجھے گھورا اور تن فن کرتی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔ میں ہنسی دباتی دوبارہ

خراب پودوں کی تراش خراش میں لگ گئی۔
تھوڑی ہی دیر میں دونوں احمق پھر سے میرے سر پر سوار تھے۔ آج ان کا ارادہ پورے علاقے کی خاک چھاننے کا تھا کیونکہ موسم خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں نکھرا نکھرا آسمان اور دھلے ہوئے پیڑ پودے طبیعت میں تراوٹ پیدا کر رہے تھے۔ اسحٰق کو کمپنی دینا حالانکہ ہماری ذمے داری نہیں تھی مگر ہانیہ نے از خود یہ ذمہ اٹھالیا تھا۔ وہ تین دن سے یہاں براجمان تھا اور ابھی اس کا ارادہ مزید ٹھہرنے کا تھا۔ جبکہ میں اب اس کی موجودگی سے بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔ مسلسل تناؤ کی کیفیت اعصاب کو تھکانے لگی تھی۔
ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے مجھے گھر میں چھائی غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ ماما اس وقت اپنے کمرے میں اٹھا پٹخ میں مصروف ہوتی تھیں یا ہلکے میوزک سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی تھیں۔
”اوہ نو۔“ اچانک آنے والے ایک خوفناک خیال نے مجھ میں بجلی سی بھر دی۔ تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتی میں اوپر پہنچی تھی۔ اسحٰق اپنا کمرا لاک کر کے باہر جاتا تھا لیکن اس وقت وہ نہ صرف کھلا ہوا تھا بلکہ اس کے بیگ میں بھرا ہوا سامان بیڈ پر بکھرا ہوا تھا۔ کپڑے، خوشبوئیں اور ایک چھوٹا سا سیاہ بیگ جس کی کھلی زپ کے اندر سے ایک سفید رنگ کی گن جھلک دکھلا رہی تھی اور یہی ماما کا تیسرا نہایت خطرناک شوق تھا۔ یعنی مہمانوں کی غیر موجودگی میں ان کے سامان کی تلاشی لینا اور بعض اوقات موقع پا کر کوئی کم قیمت یا مہمانوں کی نظر میں بے وقعت چیز اڑا لینا جس کی گمشدگی کا اکثر تو انہیں علم ہی نہ ہو پاتا اور اگر علم ہو بھی جاتا تو وہ اسے اپنی ہی کوتاہی سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ یہ عادت ان میں پہلے سے موجود تھی یا پاپا کی بے وقت موت سے پیدا ہونے والے احساس عدم تحفظ نے اور بہت سی عجیب عادتوں کے ساتھ ان میں یہ عادت بھی پروان چڑھائی، یہ میں کبھی نہیں جان سکی۔
جلدی جلدی سامان سمیٹ کر بیگ میں ڈالتے ہوئے میں نے ایک پل کو اسحٰق کے کردار کے متعلق سوچا۔ وہ شروع سے اب تک جس طرح کے کردار کا مالک نظر آیا تھا، اس کے سامان میں گن کی موجودگی اس کی یکسر نفی کرتی تھی۔
ماما کا بازو تھام کر میں انہیں باہر لے آئی۔ ”تانیہ! تم نے دیکھا، اس کے پاس گن تھی؟“
میں نے اسحٰق کے متعلق منفی انداز سے سوچنے کی کوشش کی۔ کیا وہ کوئی مجرم ہو سکتا ہے جو پناہ کی تلاش میں یہاں آیا ہو؟ میرے ذہن میں اس شخص کا خیال آیا جو گروسری اسٹور سے میرے متعلق پوچھ رہا تھا۔ کیا وہ اس کا دشمن ہو سکتا ہے؟ مگر میرے متعلق پوچھنا چہ معنی دارد؟ میں سوچتی رہی پھر خود ہی اپنے خیال کی نفی کی۔
”ماما! وہ ایک دور دراز علاقے میں سفر پر نکلا ہے، احتیاطاً رکھ لی ہوگی۔ یہ کوئی اتنی اچنبھے کی بات تو نہیں ہمارے ملک میں۔ ویسے بھی وہ تین دن سے یہاں ہے اگر کچھ غلط کرنا چاہتا تو اب تک کر چکا ہوتا۔“
میں نے حتی الامکان ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
”ہمیں ہانیہ کو اس سے دور رکھنا چاہیے۔ وہ اسے کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔“ وہ مضطرب ہو کر ہاتھ ملتی ہوئی بولیں۔
میں نے چونک کر ماما کو دیکھا۔ ذہن میں متضاد خیالات گردش کرنے لگے تو نگاہ خود بخود کھڑکی سے جھلک دکھاتی دھوپ میں جگمگاتی جھیل کی طرف اٹھ گئی۔

☆☆☆

طبیعت یکدم ہی ہر چیز سے بیزار ہوئی تو میں سویٹر کی لمبی آستینیں ہتھیلیوں تک کھینچتی ہوئی کافی کا مگ لیے جھیل کے کنارے آ کھڑی ہوئی۔ جھیل کا پھیلاؤ درحقیقت بیضوی شکل لیے ہوئے تھا۔ ہمارا مکان اور جنگل اس بیضوی شکل کے نزدیکی سروں پر واقع تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جھیل کے جنگل سے متصل کنارے پر ہونے والی ایکٹیوٹی یہاں سے دیکھی جا سکتی تھی۔ اور اس وقت وہاں ہونے والی رنگوں کی تیز نقل و حرکت نے مجھے یکدم بے چین کر دیا۔
وہاں درختوں کے درمیان واضح طور پر کوئی موجود تھا اور لباس کی رہ رہ کر نظر آتی جھلکیاں میرے شبے کو تقویت دے رہی تھیں۔ ہانیہ صبح سیاہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس تھی جس کا رنگ گہرا نیلا تھا، اسحٰق نے سرخ رنگ کی پینٹ پر سرخ ہی جیکٹ چڑھائی ہوئی تھی جس کے اندر سے سفید شرٹ جھلک دکھا رہی تھی اور ایسا بیر بہوٹی لباس یہاں کا کوئی مقامی باشندہ ہرگز نہیں پہن سکتا تھا۔ وہ یقیناً ہانیہ اور اسحٰق تھے۔ وہ جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے۔ خون میری رگوں میں یکدم ہی منجمد ہونے لگا میں نے غیر ارادی طور پر قدم آگے بڑھایا تو ٹھنڈی ہونے والی کافی چھلک کر زمین پر آ رہی۔ جلد ہی وہ جنگل میں غائب ہو گئے اور میں جلے پیر کی بلی کی طرح وہیں ٹہلنے لگی مگر انتظار طویل ہونے لگا۔ گھور سیاہ گھٹائیں از سر نو آسمان کو گھیرنے لگیں تو مجھے حرکت میں آنا ہی پڑا۔ ماما میری پریشانی سے خود بھی پریشان ہونے لگیں۔ ان کے سوالات سے بچتے ہوئے میں خاموشی سے بوٹ کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر ہر بار اس کا انجن ایک زوردار آواز کے ساتھ چنگھاڑ کر

خاموش ہوجاتا۔ یہ بوٹ بھی پہلے یہاں موجود نہیں تھی۔ پاپا کی ملنے والی انشورنس کی رقم سے جہاں اس جگہ اور بہت سی تبدیلیاں لائی گئیں، وہیں ایک عدد اسپیڈ بوٹ بھی ضروری سمجھی گئی۔ تیزی سے گہرے ہوتے بادلوں نے دن میں ہی رات کا سماں پیدا کردیا تھا اور بوٹ اسٹارٹ ہونے سے مسلسل انکاری تھی۔ یہ ٹیکنالوجی کبھی بھی دھوکا دے جاتی ہے۔ میں نے چپوؤں والی کشتی نکالی۔ اس سرد موسم میں ٹھٹھرتے ہاتھوں کے ساتھ بھاری بھرکم چپو کھینا از حد دشوار ثابت ہورہا تھا۔

درجۂ حرارت تیزی سے کم ہوا تھا۔ دستانے پہننا حسبِ معمول میں بھول چکی تھی۔ گھنے صنوبر اور سدا بہار درخت جو تھوڑی دیر پہلے تک چمکتی ہوئی دھوپ میں آنکھوں کو سکون بخش رہے تھے، اب سیاہ و سرمئی ہیولوں میں تبدیل ہوکر دیو ہیکل بلاؤں کے مانند جیسے دبوچنے کو تیار بیٹھے تھے۔ جھیل کا دوسرا کنارہ عرصہ دراز سے ٹوٹ کر جمع ہوتی شاخوں اور پتوں کے گلنے سڑنے سے چھوٹی موٹی دلدل میں تبدیل ہوچکا تھا۔ کنارے سے کافی دور ہی چپو کیچڑ میں دھنسنے لگے تو میں نے ایک نظر سردی سے بھاپ چھوڑتے پانی کو دیکھا، آنکھیں میچیں اور نیچے چھلانگ لگادی۔ ٹھنڈا یخ پانی یکدم کمر تک پہنچا اور نچلا دھڑ جیسے سن سا ہوگیا۔ دبیز کیچڑ پنڈلیوں تک سرسرانے لگی۔ کیچڑ میں موجود آبی کیڑوں مکوڑوں کی موجودگی جنوں بھوتوں کے خوف پر حاوی آنے لگی۔ یکدم ہی کراہیت کا احساس ہوا اور میں نے ہانیہ کو کوستے ہوئے جلدی جلدی وہاں سے نکلنے کی کوشش کی۔ بھیگے ہوئے لباس کے ساتھ ذہن نے یکدم ہی کئی برس پیچھے چھلانگ لگائی تھی۔ بیس برس پہلے کی وہ شام جب جھیل کا یہ کنارہ میرے لیے کسی بھیانک خواب میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔

بابا کے اچانک انتقال کے بعد پیدا ہونے والی قانونی پیچیدگیوں نے ہمیں ہراساں کردیا تھا جب انکل عبید جو پاپا کے قانونی مشیر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے دوست بھی تھے، مسیحا بن کر ہماری زندگیوں میں آئے۔ کم از کم اس وقت تک میں یہی سمجھتی تھی۔ وہ وراثت کی منتقلی کے سلسلے میں اکثر و بیشتر یہیں پائے جاتے۔ ماما کی تباہ شدہ ذہنی کیفیت کے نتیجے میں تمام مسائل سے الجھنے کے لیے میں تنہا رہ گئی تھی۔ میری طرف دیکھتی انکل عبید کی نظر نے کس وقت رنگ بدلا، میں نہیں جانتی لیکن وہ میری زندگی کا سیاہ ترین دن ثابت ہوا جب میں ایک مرد کے غلیظ فعل کے نتیجے میں تمام مردوں سے متنفر ہوگئی تھی۔ انہوں نے مجھے ڈرا دھمکا کر کسی کو کچھ بتانے سے منع کردیا تھا مگر میری دگرگوں ذہنی کیفیت نے ماما کو سب کچھ سمجھا دیا اور وہ مجھ سے اگلوا کر رہیں۔ پھر جانے کیا ہوا جو انکل عبید نے ہمارے گھر آنا یکدم ترک کردیا۔

اچانک میرے منہ سے سسکاری سی نکلی، شاید کسی ٹوٹی ہوئی شاخ نے پنڈلی پر خراش ڈال دی تھی۔ کنارے پر موجود چھدرے درختوں کے درمیان سے وہ جگہ کافی روشن تھی مگر چند گز آگے گھور اندھیرے میں بڑھنے کے لیے مجھے باقاعدہ ہمت مجتمع کرنا پڑی۔

ہانیہ کا خیال نہ ہوتا تو میں شاید کبھی اس طرف آنے کی ہمت نہ کرتی۔

میری حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا، اسی لیے اس بوڑھے گدھ کا آسان شکار ثابت ہوئی مگر ہانیہ پر ہر لمحہ کڑی نگاہ رکھی تھی۔ بچپن میں باپ کی شفقت سے محروم لڑکیوں کی طرح صنفِ مخالف میں اس کی حد درجہ دلچسپی ہمیشہ شدید رہی تھی۔

میں اندر جانے یا نہ جانے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی جب اچانک ایک زوردار کڑاکے کے ساتھ بجلی چمکی اور مجھے دور اندھیرے میں ایک متحرک وجود نظر آیا۔ میں نے تیزی سے دوڑ لگائی اور بے خیالی میں ایک موٹی سی شاخ سے الجھ کر منہ کے بل گری، تب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ مٹی بے ذائقہ ہوتی ہے اگر اس میں گلے سڑے پتے شامل نہ ہوں۔

میری مرجھائی ہوئی حسیات اس دن خوب ایکٹو تھیں شاید جو کان، ناک اور منہ میں بھرے ہوئے سیاہ کیچڑ کے باوجود کسی کی موجودگی کے شدید احساس نے فوراً اٹھنے پر مجبور کردیا اگر یونہی اوندھے منہ پڑی رہتی تو تیزی سے نیچے آتی، وہ لاٹھی میرا سر دولخت کرچکی ہوتی۔ اس سے پہلے کہ وہ بیر بہوٹی نما انسان مجھ پر دوبارہ وار کرتا، میں نے تیزی سے ٹانگ گھمائی جو اس کے گھٹنے پر لگی۔ موٹی شاخ جسے وہ لٹھ کی طرح گھما گھما کر مجھ پر وار کررہا تھا یکدم اس کے ہاتھ سے چھوٹی اور وہ پیر پکڑ کر دوسرے پیر پر اچھلنے لگا۔ شاخ اسی کے پاؤں پر گری تھی۔ میں نے جلدی سے وہ شاخ اٹھا کر اس پر تان لی۔ وہ اب گھٹنوں کے بل بیٹھا دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

''کیا تم پاگل ہوگئے ہو مسٹر اسحٰق اور ہانیہ کہاں ہے؟'' اس نے مجھ پر حملہ کرکے تکلف کی تمام دیواریں گرادی تھیں اور اب اس کو آپ جناب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''تم جنونی عورت! مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم پاگل ہو اور اب یقین ہوچکا ہے مگر یہ جان لو کہ اگر تم نے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچایا تو بچو گی تم بھی نہیں۔''

''میری بہن کہاں ہے؟ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟'' میں پھر غرائی۔

''تمہاری بہن بالکل ٹھیک کہتی ہے تم سائیکو ہو۔ اس کی حفاظت کے نام پر تم نے اسے قید کر رکھا ہے۔ اب بھی اس کی حفاظت کا بہانہ۔''

میں نے بے اختیار اس کے سر پر ڈنڈا بجایا، وہ زہر اگلنے سے باز آنے والا نہیں تھا۔

''گدھے الو پاجی..... میں اسے نہیں تمہیں بچانے آئی ہوں..... خطرے میں دراصل وہ نہیں تم ہو۔''

میں یکدم چلائی۔

اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان کو جیسے بریک لگ گیا۔ وہ یک ٹک میرے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں کا سائز بڑھتے دیکھ کر میں نے پلٹنا چاہا تب ہی سر کے پیچھے لگنے والی ایک زوردار ضرب نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

☆☆☆

سردی اور درد کا شدید احساس مجھے جلد ہی حواسوں میں واپس لے آیا۔ ہاتھ بے اختیار سر کے پیچھے لے جانے کی کوشش ناکام رہی تب اندازہ ہوا کہ وہ کسی گندے سے کپڑے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ میں نے آس پاس نظر گھمائی، یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں ہانیہ نے مجھے زخمی کیا تھا۔ یہ کسی گرے ہوئے درخت کا کائی زدہ تنا تھا جو ایک دوسرے درخت سے جڑا ہوا رکھا تھا۔ وہاں ایک کونا سا بن گیا تھا جہاں وہ مجھے گھسیٹ کر چھوڑ گئی تھی تاکہ بارش سے محفوظ رہ سکوں۔

میرا گلابی سویٹر سیاہ دلدلی مٹی میں رنگ بدل چکا تھا۔ بمشکل اکڑی ہوئی گردن کو گھما کر پیچھے دیکھنے کی کوشش میں گردن جیسے چٹخنے لگی۔ اسی وقت داہنی طرف موجود جھاڑیوں سے آتی مبہم سی آوازوں نے میری راہنمائی کی اور میں بندھے ہوئے ہاتھوں سمیت لڑکھڑاتی ہوئی اس طرف بڑھی۔ ہانیہ اسحٰق بوٹا کے سینے پر سوار کسی تیز دھار آلے سے اسے شدید زخمی کر چکی تھی، وہ زمین پر پڑا بمشکل ہاتھوں اور بازوؤں کی مدد سے چہرے کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اسے اپنے چہرے کی فکر تھی حالانکہ زیادہ خطرہ اس کے نرخرے کو تھا۔

پھر اچانک ہانیہ نے چھری ایک جانب پھینکی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبانے لگی۔ وہ ایک فضول محنت کر رہی تھی اسحٰق کے جسم پر اتنے زخم تھے اگر اسے بروقت طبی امداد نہ ملتی تو وہ یونہی مر جاتا۔

بجلی ایک بار پھر کڑکی اور مجھے یاد آیا کہ ایسا ہی ایک منظر میں کچھ عرصہ پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ چیختی چنگھاڑتی بارش، روتی لرزتی ہانیہ اور اس کے قدموں میں پڑا وہ نوجوان۔ اس معاملے میں ہم دونوں بہنوں کے ساتھ تقدیر نے یکساں سلوک کیا تھا مگر دونوں نے ردِعمل الگ دیا تھا۔ سرور نامی وہ نوجوان بھی ہمارے ریزورٹ کا مہمان تھا۔ جانے کہاں سے اس کی موت اسے وہاں کھینچ لائی تھی اس کی آوارہ فطرت کو ہانیہ کی حرکات نے مہمیز کیا اور دونوں کی قربت رنگ لائی لیکن شاید کچھ گڑبڑ ہوئی اور جس وقت میں یہاں پہنچی وہ شدید زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا اور ہانیہ ایک سکتے کی کیفیت میں اس کے قریب براجمان تھی۔ اس کے بعد گڑھا کھودنے سے لے کر اس میں سرور کو دفنانے تک وہ چپ ہی رہی اور یہ چپ اس وقت ٹوٹی جب اس نے خود کو مارنے کی کوشش کی اور پھر چیختی چلاتی ہانیہ کو گھر کس طرح پہنچایا گیا، وہ ایک الگ ہی قصہ تھا۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ جنگل میں اس کے اور سرور کے درمیان کیا ہوا تھا مگر پھر اس کا غصہ اکیلے اور فلرٹ کرنے کے شوقینوں پر قہر بن کر ٹوٹنے لگا۔

نوازش علی بھی ایسا ہی ایک مرد تھا۔

وہ ایک کاروباری آدمی تھا جو پہلی بار اپنی فیملی جس میں بیوی اور دو نوعمر بیٹا، بیٹی شامل تھے، کو شمالی علاقہ جات کی سیر کروانے کے لیے لایا تھا۔ مقامی آبادی کی راہنمائی نے اسے ہمارے ریزورٹ تک پہنچا دیا تھا۔ ان دنوں سیزن میں یہاں لوگوں کی خوب چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ سرور کا غیاب تو پوشیدہ رہ گیا مگر نوازش علی کی شامتِ اعمال اسے دوسری بار یہاں لائی تو اس کی فیملی نے بہت زور لگایا تھا اسے ڈھونڈنے کے لیے۔ پولیس بہت عرصے ہمیں پریشان کرتی رہی مگر اس کے دوبارہ یہاں آنے کا کوئی ثبوت نہ مل پایا۔ اسے غائب کرنے کے لیے ہانیہ نے میری ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ وہ قتل کر کے لاشوں کو ٹھکانے لگانے میں ایکسپرٹ ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے سر جھٹک کر پرانی یادوں کو ذہن سے جھٹکا، وہ آج پھر اسی جنونی کیفیت میں ایک بے گناہ کی جان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ ہانیہ کے سر پر ضرب لگائی، وہ لڑکھڑاتی ہوئی نیچے جا گری۔ پلٹ کر مجھے خونخوار نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس نے آنکھوں میں جاتا ہوا بارش کا پانی صاف کیا اور اٹھ کر کسی مرکھنے بیل کی طرح میری طرف لپکی اور میرے بچتے بچتے بھی ایک شدید قسم کی ٹکر میرے پیٹ میں مارنے میں کامیاب رہی۔ اوغ کی عجیب سی آواز برآمد ہوئی اور میری سانس میرے اندر سے آزاد ہو کر دھند کی صورت میری آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگی۔ میں نے حیرت سے اس بھاپ کے بگولے کو دیکھا جو میرے منہ سے خارج ہوا تھا لیکن ہانیہ کی ٹکر نے زیادہ مہلت نہ دی اور میں جیسے اڑتی ہوئی

پیچھے جا گری۔ کچھ دیر یونہی زمین پر پڑی آنکھیں پٹپٹاتی رہی پھر چہرے پر پڑنے والی بارش کی بوندوں نے دماغ کو جگایا۔ اس تمام اٹھا پٹخ میں ہاتھوں کی بندش کھل چکی تھی۔

ہانیہ اب میری مدد کی محتاج نہیں رہی تھی۔ اس نے قبر کھودنے کی مشقت میں پڑنے کے بجائے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ پہلے تو اسحٰق کی رسیلی جیکٹ کی مدد سے اس کے پیروں میں وزن باندھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ناکام ہونے کے بعد وہ کشتی کی طرف لپکی۔ یقیناً وہاں سے وہ لنگر کے لیے استعمال ہونے والی رسی نکالنا چاہتی تھی۔ اگر رسی ہٹا دی جاتی تو کشتی پانی میں پیچھے چلی جاتی اور ہمیں گھر تک پہنچنے کے لیے اس بارش میں ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ میں نے اتنی دیر میں اٹھ کر اسحٰق کی سانسیں چیک کیں۔ وہ بالکل ہموار تھیں۔ اس کے گھاؤ گہرے نہیں تھے، ظاہر ہے سبزی کاٹنے کی چھری سے بازوؤں پر پڑنے والی خراشیں کیسے کسی کو بے ہوش کر سکتی ہیں مگر وہ یقیناً انتہائی نازک اندام تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ ہانیہ پانی میں بمشکل قدم اٹھاتی کشتی تک پہنچ چکی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ واپس پلٹتی، جنگل کا اندھیرا روشنیوں اور سیٹیوں سے گونجنے لگا۔ وہ بے ہنگم شور کچھ ہی دیر میں بہت سارے سپاہیوں کی صورت میں ہمارے سامنے مجسم ہو چکا تھا۔

فوراً ہی مجھے حراست میں لے کر اسحٰق کو مجھ سے چھڑایا گیا۔ البتہ ہانیہ اس وقت بھی مزاحمت کر رہی تھی جب اسے یخ بستہ پانی سے باہر لایا گیا۔ وہ پولیس کو دیکھ کر کشتی میں چڑھ گئی اور پھر چپو کو ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہوئے کتنی ہی دیر پولیس والوں کو خود سے دور رکھنے میں کامیاب رہی۔ آخر چپو چھین کر اسے قابو کیا گیا۔ اس کے بعد کی کہانی بہت سادہ تھی۔ غصے میں بھری ہانیہ نے بہت فخر سے تمام جرائم کا اعتراف کر لیا۔ سرور کی باقیات میری نشاندہی پر جنگل سے برآمد کر لی گئیں، تو سیٹھ نوازش کی لاش نکالنے کے لیے جھیل کو کھنگالا گیا تب ہی ہماری گرفتاری پر شور مچاتی ماما اچانک لہرا کر گرنے لگیں۔ جھیل سے ایک کے ساتھ دوسرا ڈھانچا فری ملا۔ نوازش سیٹھ کو تو اس کے ڈینٹل ریکارڈ سے بہ آسانی پہچان لیا گیا مگر دوسری لاش کی شناخت پورے دو دن کی خاموشی کے بعد ماما نے کروائی جب پولیس حقائق معلوم کر چکی۔ میرے ساتھ ہوئے جبر پر میں تو خاموش رہی مگر ماما ہم سے اتنی بھی بے پروا نہیں تھیں۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی انکل عبید نے ہمارے گھر آنا کیوں ترک کر دیا تھا۔

یہ تو انہوں نے فخریہ انداز میں بتایا۔

''صرف دو قطرے کافی تھے اس منحوس کے لیے زہر کے، یوں پھڑک کر مر گیا۔'' انہوں نے ہاتھ سے پھڑکنے کا اشارہ کر کے بتایا۔

عبید انکل کو زہر کافی میں ملا کر دیا گیا تھا جو انہوں نے کسی سپیرے سے قیمت دے کر خریدا تھا۔ اس کے بعد انہیں جھیل میں ڈبونا کچھ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اس معاملے میں ہانیہ کی سوچ بالکل ماما جیسی تھی۔

☆☆☆

جیل میں میرے پاس کافی وقت ہوتا ہے کہ میں ان تمام چیزوں کے متعلق سوچ سکوں۔ یہاں چہار اطراف چور اور قاتل عورتیں موجود ہیں مگر خدا کا شکر ہے، اب مجھے کسی کی نگرانی نہیں کرنا پڑتی میں مکمل اطمینان کے ساتھ اپنا کھانا مکمل کرتی ہوں اور وہ تمام ایکٹیویٹیز جن کا وقت مجھے گھر میں نہیں ملتا تھا اور ہاں اسحٰق جسے میں ایک ہونق سمجھتی رہی، وہ میرے اندازے سے زیادہ چالاک نکلا۔ جنگل میں پولیس کا آنا میرے لیے باعثِ حیرت تھا۔ تب میں نے یہ بات اسحٰق سے ہی پوچھ لی۔ اس وقت پولیس ہمیں گھسیٹ کر گاڑی میں ڈال رہی تھی۔ اس نے بھرپور مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور پھر یکلخت اس کے چہرے کے تاثرات میں گمبھیرتا در آئی۔

''نوازش انکل میرے والد کی طرح تھے۔ بچپن سے ان کا دستِ شفقت میرے سر پر رہا۔ میرے تمام تعلیمی اخراجات وہ اٹھا رہے تھے اور پھر ایک دن، اچانک ہی وہ غائب ہو گئے بالکل ایسے جیسے زمین نگل گئی ہو۔ تب ہی میں نے طے کر لیا کہ ان کو ڈھونڈ کر ہی رہوں گا اور جب تمہیں دیکھا' تم لوگوں کے متعلق معلومات لیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔'' وہ پھر سے مسکرایا۔

''میں باتھ روم میں چھپائے فون سے مسلسل اپنے دوست انسپکٹر انعام سے رابطے میں تھا اور وہ تمہارے علاقے کے لوگوں سے۔ اگر تم سامان کی تلاشی لینے کے ساتھ ساتھ کمرے بھی کھنگال لیتیں تو فلیش ٹینک کے اوپر چھپایا گیا سیٹلائٹ فون ضرور نظر آ جاتا اور ہاں.....'' وہ جاتے جاتے پلٹا۔

''میرا نام اسحٰق نہیں سکندر ہے۔''

اس نے پھر سے مکار مسکراہٹ کی نمائش کی اور زخمی ٹانگ کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ میں تھامی لاٹھی ٹیکتا ہوا دور نکل گیا۔

رپورٹ میں ایک دن میں تین لاشیں دریافت ہوئیں اور چوتھا فرد مرتے مرتے بچا تھا۔ ہم راتوں رات مشہور ہو گئے تھے۔

میں رسل رچرڈ نیویارک کے ایک بڑے اور مشہور اخبار کے لیے فوٹوگرافی کرتا ہوں۔ صبح کے گیارہ بجے میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا گزشتہ روز کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ میری توجہ چھوٹی سی خبر کی جانب مبذول ہوگئی خبر یہ تھی کہ شکاگو میں چاقوؤں کی نمائش شروع ہونے والی تھی جس میں مختلف قسم کے چاقو پیش کیے جانے تھے۔ مجھے نمائش سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ میری پوری توجہ ''چاقو'' پر مرکوز ہوگئی جس کی وجہ سے میرے ذہن میں تقریباً بیس سال

آخری جرم کر کے جرائم کی دنیا سے نکلنے والے ایک مجرم کی روداد

زہر کو زہر سے مارنے کا طریقہ اگرچہ پرانا ہے مگر بہت موثر ہے بالکل اسی طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس نے بھی برائی کو برائی کے ذریعے ختم کر دیا اور اس طرح اس نے نہ صرف خود کو بلکہ نہ جانے کتنے ہی معصوم انسانوں کو اس دلدل میں گرنے سے بچا لیا لہٰذا اس کے نزدیک یہ سودا زیادہ برا نہیں تھا۔

حقیقت

نادیہ نور

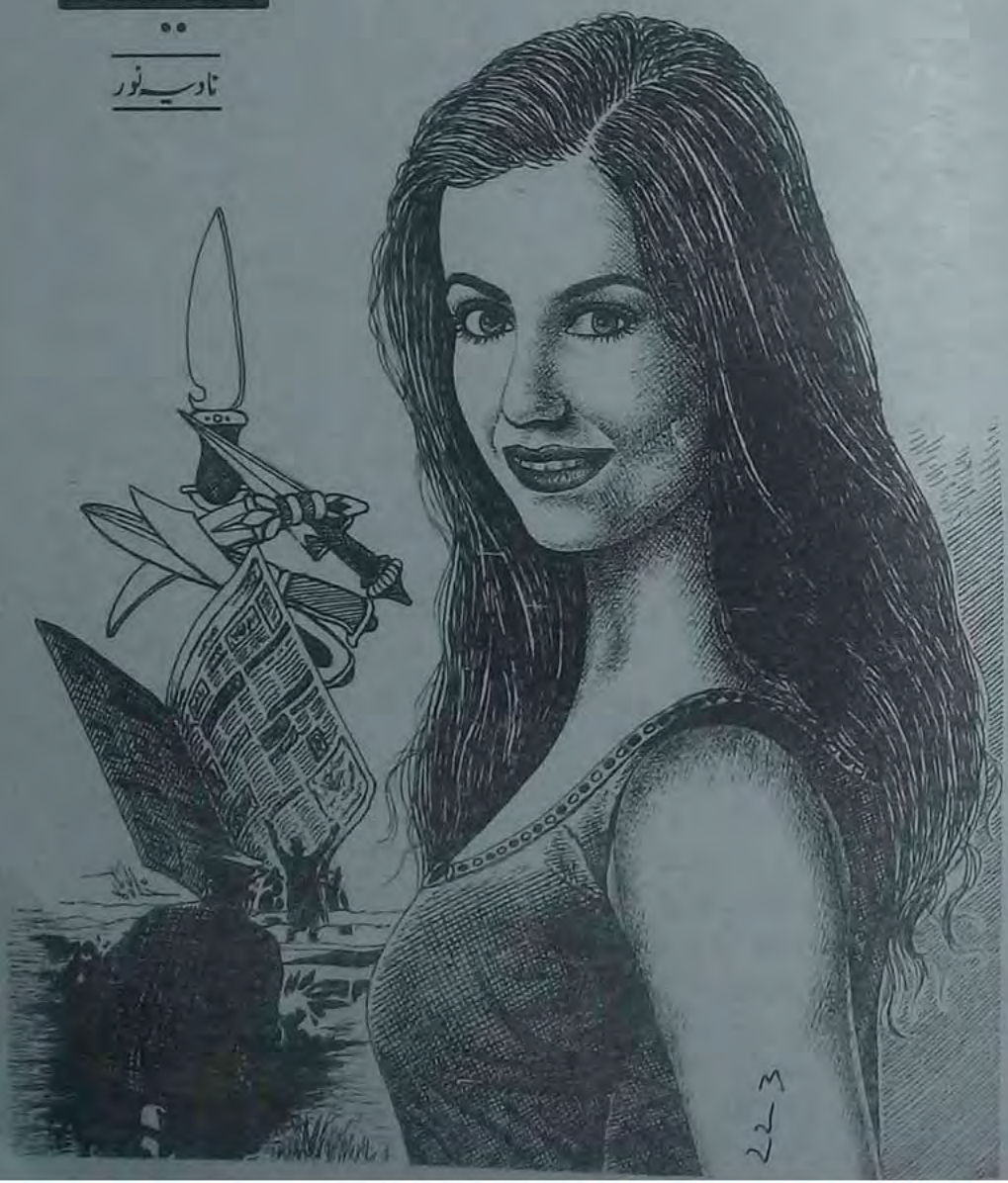

پرانے واقعات گردش کرنے لگے۔

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ چاقو ہمارے گروہ کا پسندیدہ اور مشترکہ ہتھیار ہوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چاقو کو اپنے پاس رکھنا اور بہ وقتِ ضرورت برآمد کر کے استعمال کرنا دیگر ہتھیاروں، مثلاً لوہے کی زنجیر، سائیکل کی چین یا چمڑے کی بیلٹ وغیرہ کے مقابلے میں نہایت آسان تھا۔ ہمارے گروہ کا لیڈر مارکرم جون تھا۔ مارکرم کا کہنا تھا کہ چاقو کو اپنے ساتھ رکھنا مشکل نہیں ہوتا۔ یہ بہت آسانی سے ہمارے لباس میں کہیں بھی چھپ جاتا ہے اور کسی مخالف گروپ سے ٹکراؤ کی صورت میں فوراً ہمارے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔

مارکرم کی دلیل اور بے شمار خوبیوں کی بنا پر چاقو ہمارے لیے بہتر بلکہ..... بہترین تھا استعمال میں آسان، موثر اور نہایت مہلک..... مگر ایسی تمام خوبیوں کے باوجود ہمارے ہاتھوں کبھی کسی بھی عام انسان یا ہمارے کسی مخالف کو کوئی کاری زخم لگنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جب کبھی ہمارا مقابلہ کسی مخالف پارٹی سے ہونے لگتا، ہم ان کی طرف سے زنجیر یا چین کی برآمدگی سے پہلے ہی اپنے چاقوؤں کی مدد سے ان کے ہاتھوں پر چند خراشیں ڈال دیتے اور وہ خوف زدہ ہو کر راہِ فرار اختیار کر لیتے مگر چار فروری کی رات.....

جی ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے، چار فروری کی رات ہمارے گروہ کی بدقسمتی شروع ہوئی۔ اس روز مارکرم کے ساتھ ہمارا پلان طے تھا کہ کل اتوار کے دن چھٹی ہے اور ہم ہفتے کی رات بار میں جی بھر کر عیاشی کریں گے۔ ہفتے کی رات عموماً لوگ گھر سے باہر کہیں تفریح کرنے نکل جاتے ہیں یا پھر ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس رات ہمارا گروپ ایک بار سے نکلا تھا اور نشے کے باعث کچھ زیادہ ہی ترنگ میں تھا۔ میرے ساتھیوں کی آنکھیں کانچ کی گولیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں اور گال، بدن میں دوڑتی شراب کی تمازت سے تمتما رہے تھے۔ میرا حال بھی یقیناً ان سب سے مختلف نہیں تھا۔

اسی کیفیت میں جوں ہی ہم بار سے باہر آئے تو ہمیں سڑک کے کنارے ایک لڑکی نظر آئی۔ لڑکی نے کچھ نامناسب کپڑے پہنے ہوئے تھے اور گہرا میک کر رکھا تھا۔ صاف طور پر اس کے انداز و اطوار کال گرل جیسے تھے۔ مارکرم کی آنکھوں میں چمک آگئی اور وہ لڑکی کی طرف بڑھا۔ ہم سب بھی نشے کے باعث ذرا بہکے ہوئے تھے اور جھومتے جھامتے اس کال گرل نائپ لڑکی تک جا پہنچے۔ مارکرم نے لڑکی کو بازو سے پکڑا ہی تھا کہ لڑکی اس طرح چیخ اٹھی، جیسے اسے اس سے پہلے کسی دوسرے نے چھوا تک نہ ہو.....

نشے کے سرور کے باعث ہم نے ایسی چیخ کی پروا نہیں کی اور خاص طور پر ہمارے گروپ کے لیڈر مارکرم نے تو توجہ ہی نہیں دی اور معاملہ چند لمحوں میں ہی دست درازی تک جا پہنچا مگر اس رات ہماری بدقسمتی عروج پر تھی کہ قریب سے گزرتا ہوا ایک راہ گیر اس کال گرل کی چیخ کو سن کر فوراً اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس دبلے پتلے شخص نے ہم پر چلانگ لگائی اور اس طرح لاتیں چلانے لگا، جیسے وہ اکیلا نہیں بلکہ نصف درجن مددگاروں سمیت آیا ہو۔ پہلے دھکے میں تو اس نے ہم میں سے ایک دو کو زمین پر گرا دیا۔ گرنے والوں میں وہ لڑکی بھی شامل تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو ہم سب بھی گھبرائے مگر دوسرا لمحہ اس شخص کے لیے بھاری رہا۔ پورا گروپ سنبھلا اور جونکوں کی طرح اس سے چمٹ گیا۔ وہ اکیلا اور ہمارا پورا گروپ..... واضح طور پر ہمارا پلڑا بھاری تھا۔ ہم سب نے اسے زمین پر گرا دیا۔ وہ اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کر رہا تھا، اچانک مارکرم کی آواز گونجی۔

''اسے مارو بڑا آیا لڑکی کی پکار پر ہیرو بننے..... مارو۔'' مارکرم کی آواز نے سب کی ہمتوں کو بڑھا دیا اور میں تو کچھ زیادہ ہی پُرجوش تھا۔ مجھ سمیت میرے دیگر ساتھیوں نے اس شخص کی اچھی طرح مرمت کر ڈالی۔ اسے بھی شاید ایسی توقع نہیں تھی۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی اور اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ یہ اچھی علامت نہیں تھی۔ ہم سب تیزی سے اس سے الگ ہوئے۔ ہمیں احساس ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اسی وقت بار کا دروازہ کھلا اور تیز روشنی سے سڑک کا وہ حصہ پوری طرح منور ہو گیا۔ اس روشنی میں ہم نے دیکھا کہ وہ شخص مڑا تڑا زمین پر پڑا تھا۔ یہ منظر صرف ہم نے ہی نہیں دیکھا بلکہ دروازے سے آنے والے آدمی نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک پل باہر رکے بغیر دوبارہ دروازے سے اندر غائب ہو گیا۔

''بھاگو! احمق کے بچو بھاگو۔'' مارکرم کی تیز سرگوشی ہمارے کانوں میں پڑی۔ ''اور اپنے چاقوؤں سے فوراً نجات حاصل کر لو۔''

لڑکی سمیت سب کے سب مختلف سمتوں میں بھاگ گئے۔ میرا اور مارکرم کا گھر ایک ہی سمت میں تھا اور مجھے مارکرم کے ساتھ ہی بھاگنا چاہیے تھا، مگر میں بالکل مخالف سمت میں دوڑا۔ میرا رخ دریا کی طرف تھا۔

مارکرم اکثر کہتا تھا کہ سڑک کے کنارے تاریک گوشے چاقوؤں کو پھینکنے کے لیے بہترین جگہیں تھیں لیکن

میں اس کے خیال سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ میری رائے تھی کہ وہ گوشے رات کو تو تاریک ہو سکتے ہیں مگر دن کی روشنی میں ان سے نمایاں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ میں دریا کے پانی کو چاقو سے چھنکارے کے لیے بہترین سمجھتا تھا، اس لیے میرا رخ دریا پر بنے پل کی طرف تھا۔ پل کے عین وسط میں پہنچ کر میں نے اپنا پھولا ہوا سانس ذرا بحال کیا اور ارد گرد سے محتاط ہو کر اپنا چاقو دریا میں پھینک دیا۔ دریا کا بہاؤ کافی تیز اور گہرائی بہت زیادہ تھی۔ مجھے پوری امید تھی کہ میرا چاقو کبھی کسی کے ہاتھ نہیں آسکے گا۔

چاقو سے نجات پا کر میں ذرا کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے مارکرم کی آخری سرگوشی پر خاصی حیرت ہوئی کہ آخر اس شخص کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہوگا، جو مارکرم نے ہمیں راہِ فرار اختیار کرنے کو کہا اور وہ خود بھی بدحواسی سے بھاگ گیا۔ شاید وہ شخص بری طرح زخمی ہو گیا تھا یا پھر..... اس سے آگے مجھ میں سوچنے کا حوصلہ نہیں تھا پھر مجھے اپنے گروہ کے دیگر ساتھیوں کا خیال آیا۔ وہ بھی میری طرح مارکرم کی ہدایت پر ادھر ادھر دوڑ گئے تھے۔ ''کیا وہ بھی خیریت اور عافیت کے ساتھ اپنے پسندیدہ ہتھیار سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے؟ اگر بدقسمتی کی وجہ سے کوئی ایک لڑکا بھی سستی دکھا گیا تو کیا ہوگا؟'' میں ایسے ہی سوالوں پر غور کرتا ہوا گھر کی جانب چل پڑا۔ میرا گھر تک کا پیدل سفر کسی سے سامنا ہوئے بغیر گزر گیا میں گھر پہنچا تو اس وقت رات بہت زیادہ نہیں گزری تھی اور حسبِ معمول مما اور ڈیڈ ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ میرے ڈیڈ تو بری طرح ٹی وی میں منہمک رہتے تھے۔ اس وقت بھی ڈیڈ نے تو میری آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا لیکن مما نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور پھر دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ''اوہ! تو یہ تم ہو رسل..... بالآخر تمہیں گھر واپس لوٹنے کا خیال آ ہی گیا۔''

''جی مما! شاید کچھ دیر ہو گئی ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

مما نے برا منہ بنا کر ڈیڈ سے کہا۔ ''ذرا ایک نظر اپنے اکلوتے صاحب زادے کو بھی دیکھ لو، یہ بھی ٹی وی پر نظر آنے والے مہم جو نوجوانوں جیسا ہی ہے جن کو تم بہت پسند کرتے ہو اور جو دراصل آوارہ اور لفنگے ہوتے ہیں۔'' ڈیڈ نے حسبِ توقع مما کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور بدستور ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ڈیڈ نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میرے لیے اس رات ایک ہی مہم کافی تھی۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آیا اور سونے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

اتوار کی صبح ہم بھی اکثر لوگوں کی طرح دیر سے اٹھتے ہیں لیکن اتوار کی صبح تقریباً سات بجے ہی میری کھڑکی پر ایک پتھر آ کر لگا۔ میں نے بستر چھوڑ کر نیچے جھانکا، تو مارکرم کھڑا نظر آیا۔ وہ مجھے باہر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اتنی صبح اور وہ بھی اتوار کے دن باہر نکلنا میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ پہلے تو میرے دل میں آئی کہ مارکرم کو اندر ہی بلا لوں مگر اس کے ساتھ ہی مجھے ڈیڈ کی ناراضی کا خیال آ گیا۔ وہ مارکرم کو کسی قیمت پر گھر میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے..... چار و ناچار میں تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ مارکرم کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پچھلی رات وہ بھی میری طرح ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا تھا جن کی جھلک اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ میرے قریب پہنچتے ہی وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''رسل! وہ مر گیا۔''

میرا ذہن ایسی ہی خبر کے لیے پہلے سے تیار تھا لہٰذا میں نے پوچھا۔ ''تمہیں یہ اطلاع کیسے ملی کہ رات ہمارے ہاتھوں پٹنے والا شخص مر گیا ہے؟''

''میں نے ریڈیو پر سنا ہے۔'' مارکرم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

اس کے بعد میں اس کے ہمراہ اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مارکرم کا گھر میرے گھر سے صرف دو گلی کے فاصلے پر تھا مگر وہ علاقہ میرے علاقے کے مقابلے میں زیادہ تنگ و تاریک اور گندا تھا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے اس کے گھر کے باہر ایک صحن نما میدان میں جہاں روکھی سوکھی گھاس تھی، جا کر بیٹھ گئے۔ اس مقام پر اکثر و بیشتر ہماری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ مارکرم نے دو سگریٹ سلگا لیے اور ان کے کش لے کر ہم دونوں اپنے اعصاب کو قدرے سکون پہنچانے کی کوشش کرنے لگے۔ چند گہرے کش لے کر میں نے دھیرے سے کہا۔ ''یہ تو بہت گڑبڑ ہو گئی۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں ہے رسل۔'' مارکرم نے میری تائید کی پھر پوچھا۔ ''مگر اب مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیونکہ بہت بڑی مصیبت ہمارے گلے پڑنے والی ہے۔''

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے ہمیں نہ پہچانا ہو۔'' میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''ایسے واقعات تو عموماً ہوتے رہتے ہیں اور اکثر اس قسم کا جرم کرنے والوں میں سے کوئی پکڑا نہیں جاتا۔'' میں

اس بارے میں خود بھی زیادہ پُریقین نہیں تھا مگر مجھے امید کی کرن اب بھی نظر آرہی تھی۔ جہاں واقعہ پیش آیا تھا ہمارا وہاں آنا جانا بہت ہی کم ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ بار میں بھی ہم سب، کچھ جارحانہ موڈ میں آگئے تھے لیکن وہاں ہم نے کسی سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا اس شخص سے جھگڑے کا آغاز بار سے باہر نکلنے کے بعد ہوا تھا۔ میں تو خاصا پُرامید ہوگیا مگر مارکرم نے میری امیدوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کی۔ ''ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست ہو مگر تم اس لڑکی کو بھول رہے ہو جس کی وجہ سے یہ سارا فساد کھڑا ہوا تھا۔''

''مارکرم! تم کیسی فضول باتیں کرنے لگے ہو؟'' میں نے اس کے خدشے کو ذرہ برابر اہمیت دیے بغیر کہا۔ ''وہ جتنی دلکش اور حسین نظر آرہی تھی، اس سے کہیں زیادہ احمق معلوم ہوتی تھی..... اس کے دماغ میں وہ خانہ ہی نہیں تھا جس میں وہ ہم سب کی..... شکلوں کو محفوظ رکھ سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس اب تک ہمیں پکڑ چکی ہوتی اور میں تم سے یوں گفتگو نہیں کررہا ہوتا۔''

''اب تم احمقوں والی باتیں کررہے ہو۔'' مارکرم نے میری بات کاٹ دی۔ ''یہ درست ہے کہ وہ ہمیں نہیں جانتی مگر ہم میں سے کسی ایک کی شکل تو اسے یاد رہ گئی ہوگی۔ میں اسے اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا کہ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا ہوگا اور مجھے تو وہ دیکھتے ہی پہچان لے گی کیونکہ سب سے پہلے میں ہی اس کے قریب پہنچا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہماری مصیبت کا وقت شروع ہوچکا ہے۔''

''پریشان مت ہو مارکرم۔'' میں نے اسے تسلی دی اور اس کے سامنے تجویز پیش کی۔ ''تم اور میں چل کر باری باری دوسرے لڑکوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ کس حال میں ہیں۔ اگر ابھی تک ان کے ساتھ کچھ نہیں ہوا ہے تو کم از کم انہیں آنے والے خطرے سے تو آگاہ کردیں گے اور یہ بھی کہہ دیں گے کہ وہ رات والے واقعے کے بارے میں اپنی زبانیں بند رکھیں۔''

''ہاں دوست! تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔'' مارکرم بولا۔ ''مجھے بھی یہی امید ہے کہ جب تک ہم میں سے کوئی لڑکا بھی حماقت نہیں کرے گا، ہم سب محفوظ رہیں گے۔ ورنہ ہمارے ساتھ بہت برا ہوگا۔'' مارکرم کی اس آخری بات نے میرے معدے میں گرہیں ڈال دیں اور میرا حلق خشک ہونے لگا۔

''خدا سے بہتری کی امید رکھو مارکرم۔'' میں نے خشک گلے کے ساتھ پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''اگر میرے ڈیڈ کو علم ہوگیا تو کیا ہوگا۔''

''جو بھی ہوگا، بہت برا ہوگا۔ اب یہی مناسب ہے کہ خاموش رہو اور انتظار کرو کہ آئندہ کیا ہوتا ہے۔'' مارکرم نے گہری سانس لی اور سر جھکالیا۔ ہم سب کے ساتھ تو جو بھی ہوتا، وہ بہرحال ہوتا مگر یہ طے تھا کہ مارکرم کے ساتھ کچھ زیادہ ہی برا ہونا تھا۔ ایک تو ہمارے گروپ میں سب سے بڑا وہی تھا اور گروپ لیڈر تھا اور ماضی میں اس کے پولیس والوں سے بھی اچھے خاصے تعلقات رہ چکے تھے۔ تعلقات سے میرا مطلب ہے کہ وہ پہلے بھی پولیس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوچکا تھا۔ اس حقیقت سے وہ خود بھی اچھی طرح باخبر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا چہرہ بے رونق تھا اور آنے والے وقت کے احساس نے اس کی آنکھوں کی زردی میں کچھ اور اضافہ کردیا تھا۔

وہ کچھ دیر پُرتفکر انداز میں سگریٹ کے گہرے کش لیتا رہا پھر میرا بازو تھام کر نہایت سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''رسل! خدا کے لیے تم اپنی زبان بند رکھنا، چاہے کچھ بھی ہوجائے تم کسی سے کچھ نہ کہنا۔'' پھر اس کا لہجہ ذرا سا ملتجیانہ ہوگیا۔ ''تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اپنی زبان ہر قیمت پر بند رکھو گے۔'' مجھے وعدہ کرنا پڑا۔ مارکرم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جس کام کا ارادہ کرلے، اس کام کو کرکے چھوڑتا ہے اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

میں نے مارکرم سے وعدہ کیا کہ اس کی ہدایت پر پوری طرح عمل کروں گا۔ جب مارکرم مطمئن ہوگیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیا تم نے اوپجی آواز میں کہا تھا کہ اس شخص کو مار دیا جائے؟'' میری توقع کے عین مطابق میرا سوال سنتے ہی اس کے تیور بگڑ گئے۔

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ حرکت کس نے کی تھی۔'' مارکرم سخت لہجے میں بولا۔ ''اور تم اس معاملے میں بھی کسی سے کچھ نہیں کہو گے اور نہ ہی کچھ پوچھو گے۔'' میں اس کی ناراضی کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اسی لیے اس کی ہدایت پر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایسی ہی گفتگو کرتے ہوئے ہم دونوں علیحدہ ہوگئے۔ وہ کہیں اور نکل گیا اور میں نے اپنے گھر کی راہ لی۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو مما اپنے اور ڈیڈ کے لیے چائے تیار کررہی تھیں، مجھ پر نظر پڑی تو وہ بولیں۔

''یہ تم اتنی صبح صبح کہاں نکل گئے تھے؟ میں نے چائے تیار کرلی ہے اگر تمہارا ناشتے کا ارادہ ہے تو انڈے

فرائی کرلینا اور ڈبل روٹی فریج میں موجود ہے۔'' میں نے بے دھیانی میں سر ہلایا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ موجودہ حالات میں مجھے انڈے ٹوسٹ یا پھر ناشتے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میرا دھیان تو اپنی اور مارکرم کی گفتگو میں الجھا ہوا تھا اور دل بہت سارے انجانے خدشات سے دھڑک رہا تھا۔ دوپہر تک کچھ نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہا۔ دوپہر کچھ ڈھلنے لگی تو دو پولیس افسر گھر میں داخل ہوئے۔ ڈیڈ لان میں ہی تھے، وہیں ان افسران کی ڈیڈ سے گفتگو ہوئی۔ میں دبے پاؤں اوپر سے نیچے آیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ خاموشی سے پچھلے دروازے سے نکل جاؤں مگر پھر ڈیڈ کے غصے کا خیال آتے ہی میرے قدم رک گئے۔ میں ابھی انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک ڈیڈ کی چنگھاڑتی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔ وہ مجھے ہی پکار رہے تھے۔ ''رسل! کہاں ہو تم؟''

''جی ڈیڈ.....'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''فوراً یہاں آؤ۔'' میں ڈرتے ڈرتے ڈیڈ کے سامنے گیا۔ ڈیڈ نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی اور پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا۔

''میری بات کان کھول کر پوری توجہ سے سنو اور یہ یاد رکھنا کہ جو کچھ بھی پوچھوں، اس کا بالکل درست جواب دینا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے جھوٹ بولنے اور جھوٹ سننے دونوں سے شدید نفرت ہے۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے اپنی نگاہ میرے چہرے پر جما دی۔ اس طرح وہ میرے تاثرات دیکھنا چاہتے تھے۔ ''یہ دونوں پولیس افسران ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ تم پچھلی رات لڑکوں کے ایک ایسے گروپ کے ساتھ تھے، جس نے ایک شخص کو مار ڈالا ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ ان کا کہنا درست ہے یا غلط؟''

ڈیڈ کے خطرناک انداز نے میری قوتِ گویائی سلب کرلی تھی۔ ان کے الفاظ کسی پستول کی گولیوں کی طرح میرے کانوں سے ٹکرا رہے تھے۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا پھر آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

ڈیڈ کو شاید میرے جواب پر یقین نہیں آیا۔ وہ تھوڑی دیر بے یقینی کے عالم میں مجھے دیکھتے رہے پھر اچانک ان کے حلق سے غراہٹ نما آواز برآمد ہوئی۔ ''رسل! میں تمہیں قتل کردوں گا..... تم جانتے ہو کہ کیا کر آئے ہو؟'' ڈیڈ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور خوف ناک انداز میں میری طرف بڑھنا شروع کردیا۔

''خود پر قابو پائیے مسٹر رچرڈ!'' دونوں پولیس افسران میں سے ایک نے میرے ڈیڈ کو مخاطب کرکے کہا۔ ''ہمیں ابھی تک پوری کہانی کا علم نہیں ہوسکا ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ معاملہ قانون کا ہے۔ ہم کسی شخص کو اس میں مداخلت کا حق نہیں دے سکتے۔ پلیز ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کو نوٹ بک نکال کر نوٹس لینے کا اشارہ کیا اور میری طرف متوجہ ہوکر بولا۔ ''میرا نام سارجنٹ البرٹ ہے اور یہ میرا ساتھی مائیکل ہے۔'' سارجنٹ البرٹ نے تعارف کرایا اور پھر اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''ہم تم سے رات والے واقعے کی ساری تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری عمر کتنی ہے۔''

''انیس سال کا ہونے والا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اٹھارہ سال اور تین مہینے۔'' ڈیڈ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اسکول چھوڑنے کے بعد سے اب تک کتنی ملازمتیں کرچکے ہو؟'' سارجنٹ البرٹ نے پوچھا۔

''صرف ایک۔'' میں نے بتایا۔

''کیا کام کرتے تھے؟''

''میں ایک کمپنی میں پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔''

''یہ تو تم جیسے ذہین لڑکے کے لیے کوئی اچھی ملازمت نہیں تھی۔''

''یہ احمق اتنا بھی ذہین اور ہوشیار نہیں ہے۔'' ڈیڈ غصے سے بولے۔ ''میں نے صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کچھ کر بھی سکتا ہے یا نہیں، اسے ملازمت دلوا دی تھی۔ وہ بھی شریف لوگ تھے جو اسے اس کے کام سے زیادہ پیسے دیا کرتے تھے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ آپ ہی اس کی آوارہ گردیوں کے ذمے دار ہیں۔'' سارجنٹ البرٹ نے ڈیڈ سے کہا۔ ''آپ نے ہی اسے بگاڑا ہے۔ اگر یہ کسی اچھی جگہ ملازمت کرتا تو آوارہ لڑکوں کے گروپ میں شامل ہوکر ایسی حرکات نہ کرتا پھرتا۔''

''کیا..... میں؟'' ڈیڈ نے حیرت اور صدمے سے کہا۔ ''میں تو اسے ہمیشہ مارکرم اور رچی جیسے لڑکوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہوں۔''

''اب ایسی باتوں کا ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں مسٹر رچرڈ۔'' سارجنٹ البرٹ نے نرم لہجے میں ڈیڈ کو مخاطب کیا اور مجھ سے پوچھا۔

''تم ہمیں رات ہونے والی تمام باتیں شروع سے

آخر تک بتاؤ۔'' میرے پاس راہِ فرار نہیں تھی اسی لیے میں نے گزشتہ رات کے واقعات دہرانے شروع کردیے۔ جیسے جیسے میں ساری بات بتا رہا تھا، میرے ڈیڈ کا چہرہ طیش سے سرخ ہوتا چلا جارہا تھا۔ میں نے شروع سے بتایا کہ ہم کس طرح بار میں شراب پی کر باہر نکلے اور اس کال گرل ٹائپ لڑکی کو دیکھ کر ہم نے کس طرح پیش قدمی کی..... پھر اس کی صدا پر اس دبلے پتلے شخص کا آنا، مار پٹائی وغیرہ۔ میں نے ساری باتیں سارجنٹ البرٹ کو بتادیں۔

سارجنٹ البرٹ خاموشی سے میری کہانی سنتا رہا اور اس کا ساتھی افسر مسلسل نوٹس لیتا رہا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ میری کتھا سے ڈیڈ کا پارہ چڑھتا جارہا ہوگا اسی لیے میں نے ان کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ میرا بیان ختم ہوا تو سارجنٹ البرٹ نے طویل سانس لی اور پوچھا۔ ''تم اپنے پاس چاقو، چھری یا خنجر رکھتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ سارجنٹ یہ سوال دوسروں سے بھی کرے گا یا ممکن ہے کہ اب تک کرچکا ہو۔ میں اس سے لاعلم نہیں تھا کہ باقی لڑکوں نے کیا جواب دیا ہوگا۔

''تمہارے گروپ کا کوئی اور لڑکا جس کے پاس چاقو ہوتا ہو؟'' سارجنٹ نے میرے جواب کے بعد گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلادی۔ سارجنٹ البرٹ نے پُرسوچ انداز میں اپنے ساتھی کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ معاملہ تو خاصا الجھ گیا ہے۔ ہم نے اب تک تقریباً سارے ہی لڑکوں سے پوچھ گچھ کرلی ہے مگر کسی نے بھی چاقو رکھنے یا پاس موجود ہونے کا اقرار نہیں کیا ہے۔'' سارجنٹ کی اس بات سے مجھے معلوم ہوگیا کہ میرا اندازہ کتنا درست تھا۔

''اور جانتے ہیں مسٹر رچرڈ کہ اس شخص کی موت کا سبب چاقو کا ایک ہی وار ہے جس نے اس کا کام تمام کردیا تھا۔'' سارجنٹ البرٹ نے ڈیڈ کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس وار کے علاوہ اس شخص کے جسم پر کوئی گہرا زخم نہیں تھا۔''

''آپ لوگوں نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ صرف ایک ایسے لڑکے کو تلاش کرنا چاہتے ہیں جس نے اس شخص پر چاقو سے وار کیا تھا۔'' ڈیڈ نے بلند آواز میں قدرے بدمزگی سے کہا۔

''قتل کے سلسلے میں تو ہمیں ایک لڑکا ہی درکار ہے مگر اس کے علاوہ اور بھی کئی معاملات ہیں، جن کے سلسلے میں ہمیں باقی لڑکوں کی بھی ضرورت ہے۔''

''مگر کیوں؟'' ڈیڈ نے پوچھا۔ ''باقیوں کا کیا قصور ہے؟ وہ تو آس پاس کھڑے ہوئے تھے۔''

''ایک لڑکا لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کررہا تھا پھر وہ شخص وہاں آیا اور ان سب کو مارنا پیٹنا شروع کردیا جس کے دوران میں کسی نے اسے چاقو مار دیا۔ تو اب صرف وہی لڑکا اصل مجرم ہے اور وہ ان میں سے ہی ہوسکتا ہے۔''

ڈیڈ نے مجھے گھورا اور مٹھی بند کرکے سارجنٹ سے کہا۔ ''آپ اسے صرف دس منٹ کے لیے میرے پاس تنہا چھوڑ دیں، میں اس احمق سے ساری حقیقت اگلوالوں گا۔''

''ہم اس طرح سے کام نہیں کیا کرتے مسٹر رچرڈ!'' سارجنٹ نے تحمل سے جواب دیا۔

''یہ تو آپ نہ ہی کہیے تو اچھا ہے۔'' ڈیڈ نے تردید کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے، اس طریقے پر عمل کیے بغیر، آپ لوگ بڑی کامیابیاں کبھی حاصل نہیں کرسکتے، میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ اپنا قیمتی وقت بچائیں اور جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسے اس پر عمل کریں۔''

سارجنٹ البرٹ نے ڈیڈ کو کڑی نظروں سے دیکھا اور میری توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔ ''رسل! میری بات غور سے سنو..... اگر تم نے کوئی بات پوشیدہ رکھی ہے تو بہتر ہوگا کہ اسے بیان کردو۔ میرے بچے! یہ تمہاری اخلاقی اور قانونی ذمے داری ہے کہ تم پولیس سے تعاون کرو۔ یہ تمہارا اسکول نہیں ہے، جہاں تم اپنے دوستوں کی خاطر جھوٹ بولنے پر آمادہ ہوجاتے ہو۔ دوستی نبھانا اور دوستوں کے کیے وعدے پورے کرنا یقیناً اچھی چیز ہے مگر اس وقت ایسا نہیں کیا جاسکتا۔''

''وفاداری۔'' ڈیڈ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''یہ اتنا بھی وفادار نہیں ہے سارجنٹ، اسے تو صرف اس بدمعاش مارکرم کا خوف ہے کہ کچھ بولنے کی صورت میں وہ اس کا برا حشر کردے گا۔''

''تمہیں کسی سے خوف زدہ یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈیڈ کی بات سن کر سارجنٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔ ''ہم تمہاری پوری طرح حفاظت کریں گے۔ میں اب تم سے بالکل واضح اور سیدھا سوال کررہا ہوں، میرے بچے کہ کیا تم کوئی ایسی حقیقت جانتے ہو جس سے ہم لاعلم ہیں؟ اگر جانتے ہو تو وہ کیا ہے؟''

میں نے پھر نفی میں گردن ہلادی۔ سارجنٹ البرٹ

چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے بالکل ہی مختلف سوال کیا۔
''تم نے رات کیا پہنا ہوا تھا؟''
''وہی جو میں نے اب پہنا ہوا ہے۔'' میں نے تلخ داری سے جواب دیا۔
سارجنٹ نے ڈیڈ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا یہ صحیح کہہ رہا ہے؟''
ڈیڈ نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور کہا۔ ''اس بارے میں اس کی ماں زیادہ بہتر جانتی ہے، وہی اس کی چیزوں کا خیال رکھتی ہے۔''
''گزشتہ رات تو اچھی خاصی سردی تھی، کیا تم نے کوٹ یا جیکٹ جیسی کوئی چیز پہنی ہوئی تھی؟'' سارجنٹ نے مجھ سے پوچھا۔
''ہاں، میں نے جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔
میری بات سن کر سارجنٹ البرٹ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔
''مائیکل! تم ذرا اس کی ماں کے پاس جاؤ اور اس کے کچھ کپڑے لے آؤ اور اس کی ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں بھی لے لینا، یہ آج رات ہمارے ساتھ رہے گا۔''
اس کے جانے کے بعد سارجنٹ نے ڈیڈ سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے مگر یہ ہمارے کام ..... کا حصہ ہے۔ ہمیں گزشتہ رات ہونے والے قتل کے معمے کو حل کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے مسٹر رچرڈ کہ آپ نے کبھی بھی اس طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کا نہیں سوچا ہوگا جو آپ کے بیٹے کی وجہ سے پیش آرہی ہے۔''
''یہ سب کچھ اس کی بری صحبت کا نتیجہ ہے۔''
''جی نہیں، اس کی تھوڑی بہت ذمے داری آپ پر بھی عائد ہوتی ہے۔'' سارجنٹ بولا۔
''مگر میں نے تو اپنے طور پر اس پر کڑی نظر رکھنے کی کوشش کی تھی۔'' ڈیڈ نے سارجنٹ کی بات پر احتجاج کیا۔
''صرف کڑی نظر رکھنے سے ہی ذمے داری پوری نہیں ہوجاتی مسٹر رچرڈ۔'' سارجنٹ البرٹ نے کہا۔ ''اس کے ساتھ ساتھ آپ کو رسل کے مسائل، مشاغل اور دلچسپیوں سے بھی باخبر رہنے کی ضرورت تھی۔ اسے خود سے دور کرکے نہیں بلکہ اسے خود سے قریب کرکے ہی آپ اس کی بہتر تربیت کرسکتے تھے۔'' ڈیڈ خاموش تھے، انہیں سارجنٹ کی بات نے لاجواب کردیا تھا۔
کچھ دیر بعد دوسرا پولیس افسر میرا سامان اٹھائے اندر آیا تو سارجنٹ البرٹ نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔
''کیا میں اپنی ماں سے مل کر آجاؤں؟'' میں نے سارجنٹ سے اجازت لی تو سارجنٹ نے اجازت دے دی۔ میں اندر گیا اور مما کے گلے لگا تو مما رونے لگیں۔
وہ غمگین لہجے میں بولیں۔ ''رسل، میرے بیٹے! تم نے کچھ غلط تو نہیں کیا نا؟''
''نہیں مما! آپ فکر مت کریں۔'' میں نے مما کو تسلی دی اور سارجنٹ البرٹ کے ساتھ پولیس اسٹیشن روانہ ہوگیا، جہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے حوالات میں بند کردیا۔ کچھ دیر بعد ایک پولیس والے نے مجھے ناشتا لاکر دیا جو دو

سواسیر

ایک لڑکے نے کالج میں پہلے دن ایک لڑکی سے پوچھا۔ ''آپ کی تعریف؟''
''مجھے سب بہن کہتے ہیں۔'' لڑکی نے شرارت سے کہا۔
''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' لڑکے نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سب بہنوئی کہتے ہیں۔''

محمد مبین اجن کھوڑا

''میٹھا ٹھیک ہے''

ایک دیہاتی نے فائیو اسٹار ہوٹل میں چائے کا آرڈر دیا۔
ویٹر نے ایک چھوٹے سے کپ میں چائے دی۔
دیہاتی ایک ہی سانس میں پی کر بولا۔
''بابو میٹھا ٹھیک ہے اب چائے لے آؤ۔''

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا

ہم سے پوچھیے!

☆ شادی شدہ سے حسد کرنا چاہیے؟''
○ بالکل نہیں اس کی خوشیاں عارضی ہوتی ہیں۔
☆ کیا محبت ایک ساز ہے جو دلوں کے دھڑکنے سے بجتا ہے؟
○ درست کہا آپ نے مگر شادی کے بعد اس کی آواز پھٹ جاتی ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

سینڈوچز اور کافی کے ایک مگ پر مشتمل تھا۔ میں نے کافی کا مگ اٹھالیا اور اس کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ پتا نہیں، باقی لڑکوں نے پولیس والوں کو کیا بتایا ہوگا؟ میں جانتا تھا کہ وہ سب مارکرم سے ڈرتے تھے اور اسے اپنا لیڈر مانتے تھے، اس لیے اس بات کا امکان نہیں تھا کہ انہوں نے مارکرم کے متعلق کچھ کہا ہو..... دراصل ہمارا گروپ مارکرم نے ہی تشکیل دیا تھا اور اسی نے ہمیں مار دھاڑ کی تربیت دی تھی۔

میرے ذہن میں یہ خیال بھی گردش کر رہا تھا کہ پولیس نے مجھ سے رات کے واقعے کی تفصیلات پوچھتے ہوئے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ وقوعہ کے وقت کسی لڑکے نے بلند آواز میں مداخلت کرنے والے شخص کو اچھی طرح سبق سکھانے کی ہدایت دی تھی اور اس آواز کے بعد ہی ہم سب نے جوش میں آکر اس شخص کو بری طرح مارنا شروع کیا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر سارجنٹ البرٹ نے اس بارے میں کوئی سوال کیوں نہیں کیا؟ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ آواز شاید اس لڑکی نے سنی ہی نہیں تھی جس نے بعد میں پولیس والوں کو ہمارے حلیے وغیرہ بتائے ہوں گے۔ یقیناً پولیس ہم تک اس لڑکی کے ذریعے ہی پہنچی ہوگی۔ میں ایسی ہی سوچوں میں گم تھا، مجھے اس شخص کا خیال بھی آیا جو اپنی بے وقوفی کے باعث لڑکی کی پکار پر لپک پڑا تھا اور بے قصور ہی مارا گیا۔ ہم سب مسلح تھے اور اس شخص کی اچھی طرح تواضع کرنے پر بھی تلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اس شخص کو صرف ایک زخم آیا تھا، گہرا اور جان لیوا زخم.....! اس کا مطلب یہی تھا کہ ہمارے پورے گروپ میں صرف ایک ہی لڑکا خطرناک تھا اور ایسا خطرناک جو قتل کرنے کی حد تک جاسکتا ہے۔ ایسے کسی لڑکے کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے مارکرم کا خیال آگیا۔ وہ اچھا تھا یا برا مجھے اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر یہ بات بالکل سچ تھی کہ اسی نے مجھے اس برائی کی راہ پر لگایا تھا، میری اس سے دوستی تو بچپن سے تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے سات سال بڑا تھا۔ اسکول کے بعد جب ڈیڈ نے مجھے مارکرم کے ساتھ آوارہ گردی کرتے دیکھا تو انہوں نے اپنے کسی جاننے والے کے ہاں ملازمت دلوادی، تو مارکرم نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے دوسروں سے مختلف ہونا چاہیے۔ اس کے خیال میں بھلا یہ بھی کوئی زندگی تھی کہ انسان صبح گھر سے نکلے، سارا دن کولھو کے بیل کی طرح کام میں جتا رہے اور شام کو گھر آکر سوجائے۔ جب تک زندگی میں کوئی ہنگامہ اور تھرل نہ ہو..... اس وقت تک زندگی کا مزہ نہیں آتا۔ وہ اکثر ایسے سبق مجھے پڑھایا کرتا تھا اور میں عمر اور تجربے میں اس سے چھوٹا ہونے کے باعث اس سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ وہ میرے اعصاب پر چھا چکا تھا..... میں اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس کی باتوں پر یقین کرنے لگا اور..... اب میں اس کی وجہ سے اکیلا جیل میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے پورا یقین ہوگیا کہ مارکرم ہی مجھے اس مقام تک پہنچانے کا ذمے دار ہے۔ میں اپنے خیالوں میں غرق تھا کہ ناشتا لانے والا آدمی ٹرے لینے کے لیے واپس آیا۔ جب وہ ٹرے لے کر جانے لگا تو میں نے اس سے سارجنٹ البرٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ ''وہ یہیں موجود ہیں۔'' اس نے مجھے مطلع کیا۔

''تو پھر انہیں بتاؤ کہ میں فوری طور پر ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں انہیں اطلاع کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور باہر نکل گیا..... اچانک فون کی بیل بجی تو میں ماضی سے نکل آیا۔ چاقو سے متعلق خبر پڑھ کر میں اپنے ماضی کے واقعات میں بری طرح سے منہمک ہوگیا تھا۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف ہمارے اخبار کے مالک اور میرے باس مسٹر ولیم براؤن تھے۔ کچھ دیر ہماری بات چیت جاری رہی پھر میں نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں ابھی تک اخبار موجود تھا، جس میں چاقوؤں سے متعلق خبر دیکھ کر میں اپنی نوعمری کے واقعے میں پہنچ گیا تھا۔ تب مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ پولیس والے ہماری جان اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے، جب تک انہیں ان کا مطلوب قاتل لڑکا نہیں مل جائے گا۔ وہ لڑکا کون تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ میں مارکرم کا نام لے کر اپنی اور باقی لڑکوں کی گلوخلاصی کرالیتا ہوں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے بعد مارکرم ایسی مصیبت میں پھنس جائے گا، جس سے چھٹکارا پانا اس کے لیے ناممکن ہوگا۔ اس طرح بہت سے لڑکے آئندہ اس کی راہ پر چلنے سے بچ جائیں گے اور اگر وہ کبھی جیل سے باہر آیا تو میں اپنے اس جھوٹ پر اس سے معافی مانگ لوں گا۔

جی ہاں جھوٹ..... بالکل جھوٹ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس شخص کو مارکرم نے قتل نہیں کیا تھا بلکہ اس سارے ہنگامے اور دھینگا مشتی میں اس شخص کے پہلو میں چاقو گھونپنے والا میں تھا۔ جی ہاں میں..... رسل رچرڈ.....!

بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ قدیم سے چلا آرہا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے جو یہودیوں کو راہِ راست پر لائے گا۔ ان میں ایک تو حضرت الیاس علیہ السلام تھے جو اچانک غائب ہو گئے تھے۔ لوگوں میں یہ مشہور ہونے لگا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ہی حضرت الیاس ہیں۔

لوگوں کا یہ عقیدہ دیکھ کر علمائے یہود میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ سوچنے لگے کہ اگر یہ عقیدہ عام ہو گیا تو یحییٰ کی مقبولیت آسمان کی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بے شک کائنات کا نظام اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے... جو اسی کے حکم سے رواں دواں ہے۔ لیکن... اس روانی کو درست طریقے سے برقرار رکھنے کے لیے اللہ پاک نے انبیا کو مبعوث فرمایا اور انہیں انسانوں میں سے ہی منتخب کیا۔ اسی سلسلے کو بڑھاتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی جو بذاتِ خود ایک معجزہ اور بنی نوع انسان کے لیے ایک بہترین ہدایت ہے۔

اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر کے حالاتِ زندگی

دوسرا حصہ

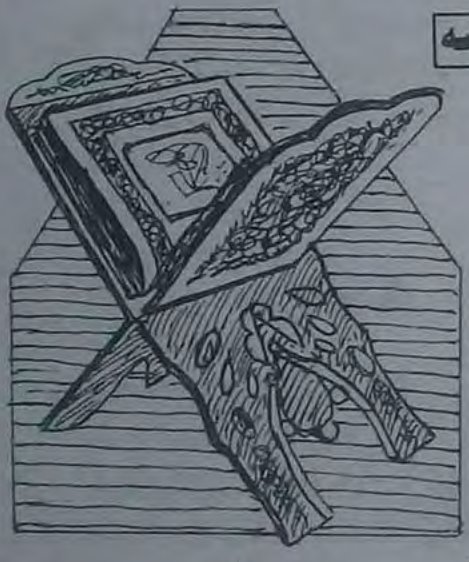

بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ قدیم سے چلا آرہا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے جو یہودیوں کو راہِ راست پر لائے گا۔ ان میں ایک تو حضرت الیاس علیہ السلام تھے جو اچانک غائب ہو گئے تھے۔ لوگوں میں یہ مشہور ہونے لگا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ہی حضرت الیاس ہیں۔

لوگوں کا یہ عقیدہ دیکھ کر علمائے یہود میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ سوچنے لگے کہ اگر یہ عقیدہ عام ہو گیا تو یحییٰ کی مقبولیت آسمان کی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بے شک کائنات کا نظام اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے... جو اسی کے حکم سے رواں دواں ہے۔ لیکن... اس روانی کو درست طریقے سے برقرار رکھنے کے لیے اللہ پاک نے انبیا کو مبعوث فرمایا اور انہیں انسانوں میں سے ہی منتخب کیا۔ اسی سلسلے کو بڑھاتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی جو بذاتِ خود ایک معجزہ اور بنی نوع انسان کے لیے ایک بہترین ہدایت ہے۔

اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر کے حالاتِ زندگی

دوسرا حصہ

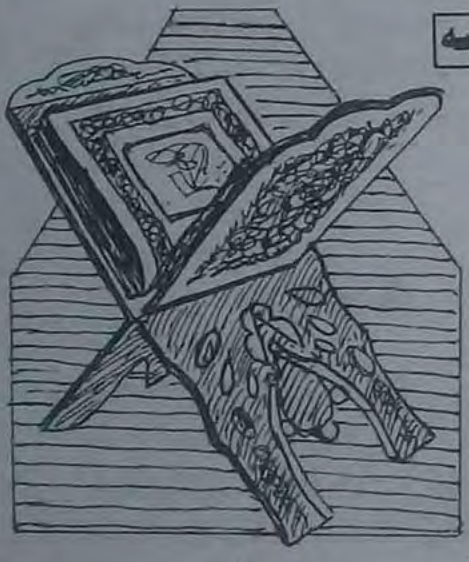

بلندیوں کو چھونے لگے گی۔ ہماری دکانیں بند ہو جائیں گی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس عقیدے پر کاری ضرب لگائی جائے۔ انہوں نے ایک وفد ترتیب دیا اور حضرت یحییٰ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

''اے یحییٰ! تو کون ہے؟ ہم تیری شناخت چاہتے ہیں۔''

''کیا تم نہیں جانتے کہ میں یحییٰ بن زکریا ہوں۔''

''وہ تو ہمیں بھی معلوم ہے۔ ہمیں تو یہ بتا کہ کیا تو مسیح ہے؟''

''میں وہ نہیں ہوں۔''

''کیا تو ایلیا ہے؟''

''میں ایلیا بھی نہیں ہوں۔''

''کیا تو وہ نبی ہے جس کا ہمیں انتظار ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تو کون ہے؟ جلدی بتا تاکہ ہم قوم کو تیری حقیقت سے آگاہ کریں۔''

''میں اللہ کا رسول ہوں اور تمہاری ہدایت کے لیے آیا ہوں۔''

''تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے جان لیا ہے کہ تجھے وعظ کہنے کا حق نہیں۔''

''میں وعظ کب کہتا ہوں۔ میں تو صحرا میں منادی کرنے والا ہوں۔ وہ جسے آنا ہے، وہ آ کر رہے گا۔''

علمائے یہود کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بھرپور مخالفت کر سکتے تھے۔ انہوں نے قوم کو جا کر بتا دیا کہ وہ ایلیا نہیں ہے۔ جو کچھ کہہ رہا ہے اپنی مقبولیت کے لیے کہہ رہا ہے۔ اس روایت سے فائدہ اٹھا رہا ہے کہ کوئی نبی آنے والا ہے۔

روایت کے مطابق آپ مشرقی اردن کے علاقے میں دعوتِ حق دیتے رہے۔

بنی اسرائیل کے ایک نبی یسعیاہ کی کہی ہوئی بات پوری ہو رہی تھی۔

بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ

خداوند کی راہ تیار کرو

اس کے راستے سیدھے بناؤ

ہر ایک گھاٹی بھر دی جائے گی

اور ہر ایک پہاڑ اور ٹیلا نیچا کیا جائے گا

اور جو ٹیڑھا ہے سیدھا

اور جو اونچا نیچا ہے، ہموار راستہ بنے گا

اور ہر بشر خدا کی نجات دیکھے گا

ویرانوں میں یہ آواز گونج رہی تھی۔ ''میں بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں۔ اس آواز کے جواب میں جو آنے والا ہے میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں۔''

پھر اس آواز میں تبدیلی آئی۔

''تم سب میرے پاس آؤ تاکہ میں تمہیں بپتسمہ (گناہوں سے چھٹکارا) دوں۔ تم آؤ اور خود کو گناہوں سے پاک کر لو۔''

اس آواز میں ایسا اثر تھا کہ لوگ دور دور سے کھنچے چلے آ رہے تھے۔ دریائے اردن کے کنارے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک ایک آدمی آپ کے پاس آتا اور آپ اس سے وعدے لیتے۔ وہ توبہ کرتا اور آپ پانی کے چند چھینٹے اس پر ڈالتے۔

یہ عجیب و غریب منظر تھا۔ قافلے کے قافلے دریائے اردن کی طرف جا رہے تھے۔ علمائے یہود سخت تشویش میں مبتلا تھے۔ یہ قافلے اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ وہ انہیں روک بھی نہیں سکتے تھے۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ بادشاہ کو ان کے خلاف بھڑکایا جائے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے، فقراء زندگی گزار رہے تھے اور خود کو

طرح طرح کی آزمائشوں سے گزار رہے تھے۔ جہاں رات پڑتی سو جاتے، جہاں راستہ ملتا چل پڑتے۔

☆☆☆

مختلف آزمائشوں سے گزرنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ناصرہ یا ناصرت میں آئے جہاں آپ نے پرورش پائی تھی۔ سبت کا دن آیا تو وہ عبادت خانے میں گئے اور پڑھنے کو کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے یسعیاہ نبی کی کتاب کا وہ مقام نکالا جہاں لکھا تھا۔

"خداوند کا روح مجھ پر ہے۔
اس لیے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کے لیے مسح کیا
اس نے مجھے بھیجا ہے کہ قیدیوں کو رہائی دوں اور اندھوں کو بینائی پانے کی خبر سناؤں
کچلے ہوؤں کو آزاد کر دوں
اور خداوند کے سال مقبول کی منادی کر دوں۔"

اس کے بعد آپ نے کچھ ایسی تشبیہیں بیان کیں جن سے حکمت و دانائی جھلکتی تھی اور جو سب کی سب ان لوگوں کی نصیحت و بھلائی کے لیے تھیں۔ وہ احسان مند ہونے کے بجائے اس پر برس پڑے۔

"اے کہنے والے کیا تو یوسف بڑھئی کا بیٹا نہیں؟" (یوسف وہ نام تھا یہودیوں نے جس کی تہمت حضرت مریم پر لگائی تھی)

"ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس نے کہیں سے شعبدے سیکھ لیے ہیں جنہیں دکھا کر لوگوں کو برگزیدہ کرتا رہتا ہے اور اب ناصرہ میں دوبارہ آ گیا ہے کہ ہم پر اپنا جادو چلائے۔"

پھر وہ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ان سب کو حیرت اس بات پر تھی کہ انہوں نے حکمت و دانائی کی باتیں کہاں سے سیکھ لیں۔ وہ اسے بھی کوئی جادو کی کارنامہ کہہ رہے تھے۔ قائل ہونے کے بجائے اس پر مشتعل ہونے کہ اگر یہ یہاں رہے تو سب کو ہمارے خلاف کر دیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ ان سب نے انہیں پکڑا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے تاکہ انہیں پہاڑ سے نیچے پھینک کر ہلاک کر دیا جائے لیکن آپ کسی نہ کسی طرح ان کے ہاتھوں سے بچ نکلے۔

آپ کی دربدری کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ گاؤں گاؤں گھومتے رہے۔ پھر آپ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کا خیال آیا۔ یہ شہرت آپ تک پہنچ چکی تھی کہ وہ دریائے اردن کے کنارے لوگوں کو بپتسمہ دیتے ہیں۔ قدرت کی کارروائی آپ کو قدم بقدم منزل سے قریب تر کرتی جا رہی تھی۔ آپ اسی طرف چل دیے۔

قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ آپ بھی قطار میں شامل ہو گئے۔ قطار آگے بڑھتی گئی۔ آپ بھی آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بالکل سامنے پہنچ گئے۔

میانہ قد، سرخ و سپید رنگ، بدن ایسا صاف شفاف جیسے ابھی ابھی حمام سے نہا کر آئے ہوں۔ کاندھوں تک بال لٹکے ہوئے۔ جلد صباحت و ملاحت کا مرقع۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ آپ انہیں پہچانتے نہیں تھے لیکن اللہ نے انہیں بتا دیا کہ یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

"تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"تم سے بپتسمہ لینے۔"

"میں تو خود تمہارا محتاج ہوں، تمہیں کیا دے سکتا ہوں۔"

"اب جو ہو رہا ہے، وہی مناسب ہے۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی بپتسمہ دے۔"

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے پانی کے چھینٹے آپ پر مارے اور آپ پانی سے باہر نکل آئے۔

انجیل میں ہے کہ حضرت یحییٰ نے روح کو کبوتر کی طرح آسمان سے اترتے دیکھا۔ وہ روح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آ کر ٹھہر گئی۔ ایک آواز آئی جو حضرت یحییٰ علیہ السلام سے مخاطب تھی۔

"جس پر تو روح کو اترتے اور ٹھہرتے دیکھے وہی روح القدس سے بپتسمہ دینے والا ہے۔"

شیطان بھی دور کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنا عہد ابھی تک یاد تھا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے اور شیطان ان کی تلاش میں نکلا تھا۔ فرشتوں نے اسے آپ تک نہیں جانے دیا تھا۔ اس وقت شیطان نے عہد کیا تھا کہ وہ آپ کو

کبھی نہ کبھی بہکا کر چھوڑے گا۔ لوٹنے کا مزہ تو اسی کو آتا ہے جس کے پاس دولت ہو۔

ہے۔ بہکانے کا مزہ تو اب آئے گا۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سخت بھوکے تھے۔ نقاہت سے ان کا چلنا دوبھر تھا۔ وہ ایک پتھر کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ابلیس انسانی شکل میں ظاہر ہوا اور ان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''اس جنگل سے تو جو بھی گزرتا ہے، جلد سے جلد گزرنا چاہتا ہے اور تم یہاں پتھروں پر آرام کر رہے ہو۔ کیا چلنے کی طاقت نہیں رہی؟''

''گزرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن نقاہت نے قدم پکڑ لیے ہیں۔ یہ نقاہت بھوک کی ہے۔''

''کمال ہے خدا کا بیٹا ہو کر یہ کہتا ہے۔ ان پتھروں کو کہہ کہ روٹیاں بن جائیں۔''

''آدمی صرف روٹی سے جیتا نہ رہے گا۔'' حضرت عیسیٰ نے جواب دیا۔ ''ہاں، اگر خدا خود فرمائے تو دوسری بات ہے۔'' ابلیس کا یہ داؤ بھی بے کار گیا۔ اب ابلیس انہیں ایک بلند پہاڑ پر لے گیا اور چوٹی پر کھڑے ہو کر ان سے کہا۔

''اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرا دے۔ وہ اپنے فرشتوں کو حکم دے گا اور وہ تجھے ہاتھوں پر اٹھا لیں گے۔ تجھے ٹھیس بھی نہیں لگے گی۔''

''کس بندے کی یہ مجال ہے کہ وہ خدا کی آزمائش کرے۔''

''تو بندہ کہاں، تو تو اس کا بیٹا ہے۔''

''اے کہنے والے تو بار بار یہ کفر کیوں منہ سے نکالتا ہے۔ خدا کی ذات ایسی نہیں کہ اسے کسی نے پیدا کیا ہو یا اس نے کسی کو پیدا کیا ہو۔ میں نے تو ماں کی گود میں کہہ دیا تھا کہ میں اس کا بندہ ہوں۔''

ابلیس پھر بھی باز نہیں آیا۔ ایک اور جال پھینکا۔

''اگر تو مجھے سجدہ کرے تو میں دنیا کی تمام سلطنتیں اور شان و شوکت تجھے دے دوں گا۔ تو پوری دنیا کا بادشاہ ہو گا۔ یوں روٹی کے لیے مارا مارا نہیں پھرے گا۔''

''شیطان مردود دور ہو جا۔ میں صرف اپنے خدا کو سجدہ کرتا ہوں اور اسی کی عبادت کرتا ہوں۔''

شیطان یہ دوٹوک جواب سن کر ان سے الگ ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ اس آزمائش کے بعد جس طرف منہ تھا، اس طرف چل دیے۔ خدا نے انہیں یہودیہ کے ملک میں پہنچا دیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں حضرت یحییٰ بپتسمہ دے رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ بھی ان سے کچھ فاصلے پر پانی میں کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو بپتسمہ دینے لگے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب یحییٰ رخصت ہونے والے ہیں۔ منادی کرنے والے کا کام ختم ہوا اور بہ حیثیت نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہونے والا ہے۔

دونوں کو قریب قریب کھڑے دیکھ کر یہودیوں کو موقع مل گیا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر اپنی سازش مکمل کریں اور یہ ثابت کر سکیں کہ دونوں اپنی ذاتی مقبولیت کے لیے یہ ڈھونگ رچا رہے ہیں۔ یہودیوں کا ایک وفد بظاہر حضرت یحییٰ کا ہمدرد بن کر ان کے پاس آیا۔

''اے ربی! جو شخص یردن کے پار تیرے ساتھ تھا، جس کی تو نے گواہی دی ہے، وہ تو تیرے مقابلے پر آ کر لوگوں کو بپتسمہ دے رہا ہے اور لوگ تیرے بجائے اس کے پاس جا رہے ہیں۔''

حضرت یحییٰ نے بھڑکنے کے بجائے نہایت متانت سے جواب دیا۔

''انسان کچھ نہیں پا سکتا جب تک اسے آسمان سے نہ دیا جائے۔''

''وہ شخص تمہاری حکومت میں دخل دے رہا ہے اور تم ذرا بھی اس پر خفا نہیں ہوتے۔ تعجب ہی تو ہے۔''

''تم خود میرے گواہ ہو کہ میں نے کہا تھا میں مسیح نہیں ہوں مگر اس کے آگے بھیجا گیا ہوں۔ دُلہا تو وہ ہے جس کی دُلہن ہے مگر دُلہا کا دوست دُلہا کی آواز سے بہت خوش ہوتا ہے۔ پس میری یہ خوشی پوری ہوئی۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ وہ بڑھے اور میں گھٹوں۔''

یہودیوں نے یہ غیر معمولی اور خلافِ توقع جواب سنا تو غصے کا الاؤ ان کے سینے میں بھڑکنے لگا۔ حضرت یحییٰ کی مقبولیت اب اتنی ہو گئی تھی کہ ان پر آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اب انہیں ایک اور سازش کے ذریعے راستے سے ہٹانا تھا۔

کبھی نہ کبھی بہکا کر چھوڑے گا۔ لوٹنے کا مزہ تو اسی کو آتا ہے جس کے پاس دولت ہو۔ [illegible]
ہے۔ بہکانے کا مزہ تو اب آئے گا۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سخت بھوکے تھے۔ نقاہت سے ان کا چلنا دوبھر تھا۔ وہ ایک پتھر کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ابلیس انسانی شکل میں ظاہر ہوا اور ان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

''اس جنگل سے تو جو بھی گزرتا ہے، جلد سے جلد گزرنا چاہتا ہے اور تم یہاں پتھروں پر آرام کر رہے ہو۔ کیا چلنے کی طاقت نہیں رہی؟''

''گزرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن نقاہت نے قدم پکڑ لیے ہیں۔ یہ نقاہت بھوک کی ہے۔''

''کمال ہے! خدا کا بیٹا ہو کر یہ کہتا ہے۔ ان پتھروں کو کہہ کہ روٹیاں بن جائیں۔''

''آدمی صرف روٹی سے جیتا نہ رہے گا۔'' حضرت عیسیٰ نے جواب دیا۔ ''ہاں، اگر خدا خود فرمائے تو دوسری بات ہے۔'' ابلیس کا یہ داؤ بھی بے کار گیا۔ اب ابلیس انہیں ایک بلند پہاڑ پر لے گیا اور چوٹی پر کھڑے ہو کر ان سے کہا۔

''اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرا دے۔ وہ اپنے فرشتوں کو حکم دے گا اور وہ تجھے ہاتھوں پر اٹھا لیں گے۔ تجھے ٹھیس بھی نہیں لگے گی۔''

''کس بندے کی یہ مجال ہے کہ وہ خدا کی آزمائش کرے۔''

''تو بندہ کہاں، تو تو اس کا بیٹا ہے۔''

''اے کہنے والے تو بار بار یہ کفر کیوں منہ سے نکالتا ہے۔ خدا کی ذات ایسی نہیں کہ اسے کسی نے پیدا کیا ہو یا اس نے کسی کو پیدا کیا ہو۔ میں نے تو ماں کی گود میں کہہ دیا تھا کہ میں اس کا بندہ ہوں۔''

ابلیس پھر بھی باز نہیں آیا۔ ایک اور جال پھینکا۔

''اگر تو مجھے سجدہ کرے تو میں دنیا کی تمام سلطنتیں اور شان و شوکت تجھے دے دوں گا۔ تو پوری دنیا کا بادشاہ ہوگا۔ یوں روٹی کے لیے مارا مارا نہیں پھرے گا۔''

''شیطان مردود دور ہو جا۔ میں صرف اپنے خدا کو سجدہ کرتا ہوں اور اسی کی عبادت کرتا ہوں۔''

شیطان یہ دو ٹوک جواب سن کر ان سے الگ ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ اس آزمائش کے بعد جس طرف منہ تھا، اس طرف چل دیے۔ خدا نے انہیں یہودیہ کے ملک میں پہنچا دیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں حضرت یحییٰ بپتسمہ دے رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ بھی ان سے کچھ فاصلے پر پانی میں کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو بپتسمہ دینے لگے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب یحییٰ رخصت ہونے والے ہیں۔ منادی کرنے والے کا کام ختم ہوا اور بہ حیثیت نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہونے والا ہے۔

دونوں کو قریب قریب کھڑے دیکھ کر یہودیوں کو موقع مل گیا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر اپنی سازش مکمل کریں اور یہ ثابت کر سکیں کہ دونوں اپنی ذاتی مقبولیت کے لیے یہ ڈھونگ رچا رہے ہیں۔ یہودیوں کا ایک وفد بظاہر حضرت یحییٰ کا ہمدرد بن کر ان کے پاس آیا۔

''اے ربی! جو شخص یردن کے پار تیرے ساتھ تھا، جس کی تو نے گواہی دی ہے، وہ تو تیرے مقابلے پر آکر لوگوں کو بپتسمہ دے رہا ہے اور لوگ تیرے بجائے اس کے پاس جا رہے ہیں۔''

حضرت یحییٰ نے بھڑکنے کے بجائے نہایت متانت سے جواب دیا۔

''انسان کچھ نہیں پا سکتا جب تک اسے آسمان سے نہ دیا جائے۔''

''وہ شخص تمہاری حکومت میں دخل دے رہا ہے اور تم ذرا بھی اس پر خفا نہیں ہوتے۔ تعجب ہی تو ہے۔''

''تم خود میرے گواہ ہو کہ میں نے کہا تھا میں مسیح نہیں ہوں مگر اس کے آگے بھیجا گیا ہوں۔ دُلہا تو وہ ہے جس کی دُلہن ہے مگر دُلہا کا دوست دُلہا کی آواز سے بہت خوش ہوتا ہے۔ پس میری یہ خوشی پوری ہوئی۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ وہ بڑھے اور میں گھٹوں۔''

یہودیوں نے یہ غیر معمولی اور خلاف توقع جواب سنا تو غصے کا الاؤ ان کے سینے میں بھڑکنے لگا۔ حضرت یحییٰ کی مقبولیت اب اتنی ہو گئی تھی کہ ان پر آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اب انہیں ایک اور سازش کے ذریعے راستے سے ہٹانا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے اس لیے ان پر کوئی ذمے داری بھی عائد نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ حضرت یحییٰؑ ان کی وجہ سے مشکل میں آگئے ہیں تو آپ نے یہی بہتر سمجھا کہ یہاں سے چلے جائیں۔ انہوں نے ایک مقام "گلیل" کی طرف جانے کا ارادہ کرلیا۔ یہ مقام یہودیوں کے نزدیک نہایت گرا پڑا مقام تھا۔

گلیل تک جانے کے لیے وہ سامریہ کے ایک شہر تک آئے جو "سوخار" کہلاتا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا بنوایا ہوا ایک کنواں بھی وہاں تھا۔ وہ تھکے ماندے تو تھے ہی۔ اس کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ سامریہ کی ایک عورت وہاں پانی بھرنے آئی۔ آپ نے اس عورت سے کہا، مجھے تھوڑا پانی پلا دے۔

اس سوال پر اس عورت کو سخت تعجب ہوا کیونکہ یہودی لوگ سامریوں سے کسی قسم کا لین دین نہیں رکھتے تھے۔ انہیں گرا پڑا سمجھتے تھے۔

"تو یہودی ہو کر مجھ سے پانی کیوں مانگتا ہے جبکہ یہودی تو سامریوں سے کسی قسم کا برتاؤ رکھتے ہی نہیں۔"

حضرت عیسیٰؑ نے جواب میں اس سے کہا۔ "اگر تو خدا کی بخشش کو جانتی اور یہ بھی جانتی کہ وہ کون ہے جو تجھ سے پانی مانگتا ہے تو تُو اس سے مانگتی اور وہ تجھے زندگی کا پانی دیتا۔"

"تیرے پاس پانی بھرنے کو تو کچھ ہے نہیں اور کنواں گہرا ہے۔ پھر وہ زندگی کا پانی تیرے پاس کہاں سے آیا؟ کیا تو ہمارے باپ یعقوبؑ سے بڑا ہے جس نے ہم کو یہ کنواں دیا اور خود اس نے اور اس کے بیٹوں نے اور اس کے مویشیوں نے اس میں سے پیا۔"

"جو کوئی اس پانی میں سے پیا وہ پھر پیاسا ہوگا مگر جو کوئی اس پانی میں سے پیے جو میں اسے دوں گا، وہ ابد تک پیاسا نہیں ہوگا بلکہ جو پانی میں اسے دوں گا، اس میں ایک چشمہ جاری ہو جائے گا جو ہمیشہ زندگی کے لیے جاری ہو جائے گا۔"

"پھر تو وہ پانی مجھے جلدی پلا تاکہ میں کبھی پیاسی نہ ہوں اور بار بار اس کنوئیں پر پانی بھرنے نہ آؤں۔"

"جا اپنے شوہر کو یہاں بلا لا۔"

"میں بے شوہر ہوں۔" عورت نے کہا۔

"یہ تو نے خوب کہا۔" حضرت عیسیٰؑ نے کہا۔ "تو پانچ شوہر کر چکی ہے البتہ یہ تو نے سچ کہا کہ جس کے ساتھ تو اب ہے، وہ تیرا شوہر نہیں۔"

یہ سنتے ہی وہ عورت اپنا گھڑا چھوڑ کر شہر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی اور لوگوں سے کہنے لگی۔ "آؤ اور اس آدمی کو دیکھو۔ اس نے میری وہ سب باتیں بتا دیں جو کوئی نہیں جانتا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے وہ کوئی نبی ہے بلکہ جس مسیح کا ہم ذکر سنتے ہیں، وہ یہی ہے۔" شہر کے تمام مرد حضرت عیسیٰؑ کے پاس آئے اور ان سے درخواست کرنے لگے کہ وہ کچھ عرصہ ان کے شہر میں قیام کریں اور انہیں برکت دیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان کی درخواست قبول کرلی اور ان سے خطاب کیا۔

"میری بات کا یقین کرو کہ وہ وقت آتا ہے کہ تم نہ تو اس پہاڑ پر باپ کی پرستش کرو گے اور نہ یروشلم میں کیونکہ تم جسے نہیں جانتے اس کی پرستش کرتے ہو۔ ہم جسے جانتے ہیں اس کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ نجات اسی ... میں سے ہے کیونکہ وہ وقت آتا ہے بلکہ اب ہی ہے کہ سچے پرستار، باپ کی پرستش روح اور سچائی سے کریں گے کیونکہ باپ اپنے لیے ایسے ہی پرستار ڈھونڈتا ہے۔ خدا سچا ہے اور ضروری ہے کہ اس کے پرستار روح اور سچائی سے پرستش کریں۔"

وہ ان پرستاروں کے درمیان دو دن ٹھہرے اور پھر گلیل کی طرف چل دیے۔ یہی وہ وقت تھا جب انہوں نے منادی کرنا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام گلیل جھیل کے کنارے چلے جا رہے تھے کہ دو بھائیوں شمعون (پطرس) اور اندریاس کو جھیل میں جال ڈالتے ہوئے دیکھا کیونکہ وہ ماہی گیر تھے۔

"اے لڑکے! تم کون ہو اور کیا کرتے ہو؟"

"دیکھتے نہیں، ہم دریا میں جال ڈال رہے ہیں کیونکہ ہم ماہی گیر ہیں۔"

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ تاکہ میں تمہیں ماہی گیر سے آدم گیر بنا دوں۔"

اس پکار میں ایسی تاثیر تھی کہ وہ دونوں بھائی جال چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ ذرا اور آگے بڑھے تو انہوں نے تین آدمیوں کو "جال" کی مرمت کرتے ہوئے دیکھا۔ ان میں ایک باپ تھا اور وہ اس کے بیٹے۔ باپ کا نام زیدی تھا اور

بیٹوں کا نام یعقوب اور یوحنا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے زیدی کے دونوں بیٹوں کی پریشانی پر کچھ پڑھ لیا تھا۔ انہیں بھی آپ نے اعزاز بخشا اور اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ دونوں بھی جال اور باپ کو چھوڑ کر آپ کے پیچھے چل دیے۔

آگے چل کر ان سب کو آپ کے حواریوں میں شامل ہونا تھا۔ وہ ایسے لوگوں کو چن رہے تھے جو آپ کے بعد آپ کی تعلیمات کو جاری رکھ سکیں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام پر جو گزر رہی تھی، آپ اس سے بے خبر گلیل کے عبادت خانوں میں تعلیم دینے اور بادشاہی کی خوشخبری کی منادی کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اس دوران آپ سے معجزے بھی ہوتے رہے۔ لوگوں کی ہر طرح کی بیماری اور ہر طرح کی کمزوری کو دور کرتے رہے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل رہی تھی۔ مریضوں کو ان کے پاس لایا جاتا تھا اور وہ ان کو اچھا کر دیتے تھے۔ لوگ چارپائیوں پر آتے تھے اور اپنے پیروں پر چل کر جاتے تھے۔ یروشلم سے اتنے لوگ آنے لگے کہ ہر وقت بھیڑ جمع رہنے لگی۔ ایک روز اتنی بھیڑ ہو گئی کہ ان کا زمین پر کھڑے رہنا دوبھر ہو گیا۔ وہ پہاڑ پر چلے گئے اور وہاں سے خطاب کیا۔

"مبارک ہیں وہ دل جو غریب ہیں
کیونکہ آسمان کی بادشاہی ان کی ہے
مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں
کیونکہ وہ تسلی پائیں گے
مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں
کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے
مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے بھوکے ہیں
کیونکہ وہ آسودہ ہوں گے
مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں
کیونکہ ان پر رحم کیا جائے گا
مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں
کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے
مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں"

☆☆☆

علمائے یہود اس صورت حال کو دیکھ کر سخت پریشان تھے۔ وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے خلاف تو تھے ہی اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی سامنے آ گئے تھے۔ وہ گلیل کی طرف نکل گئے تھے گویا ان کی دسترس سے دور تھے لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام تو جیسے ان کے گھر کے دروازے پر ہی بیٹھے تھے۔ ایسے علاقے میں تھے جہاں ہیرودیس بادشاہ کی بادشاہت کا سکہ چلتا تھا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ بادشاہ کو ان کے خلاف کر دیا جائے۔ بادشاہوں کے لیے یہ خبر سب سے بری ہوتی ہے کہ کوئی ان کی بادشاہت میں دخیل ہو رہا ہے۔ اسی ہیرودیس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ بھی کر لیا تھا جب وہ شیر خوار تھے۔ اس وقت بھی علماء نے یہی کہا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اس کی بادشاہت کے لیے خطرہ بنے گا۔ انہیں تو اللہ نے بچا لیا لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام ان کے سامنے تھے۔ ان کے لیے بھی اسی خطرے کا احساس دلا کر بادشاہ کو بدظن کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے اس کے سامنے جا کر نہایت دلنشین انداز میں اس خطرے کا احساس دلایا۔

"آپ کو یاد ہو گا کہ بیت اللحم میں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اس کی خبر آپ کو ملک فارس سے آنے والے ایک وفد نے دی تھی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ لڑکا روحانیت کا بادشاہ ہو گا۔ آپ کے مجوسیوں نے آپ کو خبر دی تھی کہ اس کی مقبولیت سے آپ کی شاہی کو خطرہ ہو گا۔ پھر اس مجوسی وفد نے آپ کو دھوکا دیا تھا۔ آپ کو اس لڑکے کا نشان نہیں دیا تھا اور آپ نے بیت اللحم کے اردگرد کے بہت سے لڑکوں کو قتل کرا دیا تھا۔"

"ہاں، مجھے یاد تو آیا لیکن اس وقت اس کا ذکر کیوں نکل آیا؟"

''ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یحییٰ جو یردن کے کنارے لوگوں کو بپتسمہ دیتا ہے اسی لڑکے (مسیح) کا بھائی ہے۔''

''اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی کسی کا بھائی ہوا کرے، مجھے کیا۔''

''فرق یہ پڑتا ہے کہ وہ لڑکا گلیل میں ہے اور لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکا رہا ہے اور یحییٰ یہاں لوگوں کو اپنا عقیدت مند بنا رہا ہے۔ کسی دن یہ دونوں مل کر آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ ایسا ہو، آپ یحییٰ کو قید کر لیں یا قتل ہی کر دیں۔ یہ کام آپ کے لیے آسان ہوگا کیونکہ وہ آپ کی حدودِ مملکت میں ہے۔''

بادشاہ اس وقت نہ جانے کس عالم میں تھا کہ حضرت یحییٰ کے حق میں بول اٹھا۔

''مجھے یحییٰ سے کیا لینا۔ جب وہ میرے کاموں میں دخل نہیں دے رہا ہے تو میں اس کے کام میں دخل اندازی کیوں کروں اور تم بھی باز آجاؤ کیونکہ وہ بھلائی کا کام کر رہا ہے۔''

ان علماء نے بادشاہ کے تیور بدلتے ہوئے دیکھے تو خاموشی سے اٹھ گئے۔ باہر نکل کر ان میں سے بعض نے یہ رائے دی کہ ہمیں یحییٰ کی مخالفت سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے کیونکہ بادشاہ ان کا عقیدت مند ہے۔ ہوسکتا ہے خدا یحییٰ کے ساتھ ہو اور اس نے بادشاہ کے دل میں یہ بات ڈالی ہو لیکن اکثریت کو یہ رائے پسند نہیں آئی۔

''ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انتظار کرنا چاہیے۔ شاید کوئی صورت سامنے آجائے۔''

یہ صورت جلد ہی سامنے بھی آگئی۔ ہیرودیس شامی علاقے کے شمال مغرب میں حکومت کر رہا تھا اور اس کا بھائی فلپ جنوب کا حکمران تھا۔ ایک مرتبہ ہیرودیس اپنے بھائی سے ملنے گیا۔ وہاں اس نے اپنی بھتیجی یعنی فلپ کی بیٹی سلوم کو دیکھا اور دل و جان سے اس پر عاشق ہوگیا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ اس کی بھتیجی ہے۔ شریعت موسوی کے مطابق بھی بھتیجی سے نکاح نہیں ہوسکتا تھا۔

اس نے سلوم کے خیال سے باز آنا چاہا لیکن بدبختی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی طاقت کے گھمنڈ نے اس کے ارادے کو مضبوط کر دیا۔ ''میں بادشاہ ہوں۔ کچھ بھی کر لوں کوئی مجھے نہیں روک سکے گا۔ جو مجھے روکنے کی کوشش کرے گا اس کا سر اتار کر اس کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ میرے خوف سے علمائے وقت بھی میرے حق میں فتویٰ دیں گے۔'' البتہ یہ بات اس کے لیے مشکل تھی کہ اپنے بھائی فلپ کو اس نکاح کے لیے تیار کر لے۔ جب سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑتی ہیں۔ اس نے بھی یہی کیا۔ بے قصور فلپ پر بلاجواز حملہ کر دیا۔ فلپ بے چارہ کمزور تھا۔ زیادہ دیر اپنا دفاع نہ کر سکا اور فرار ہونے پر مجبور ہوگیا۔ ہیرودیس نے اصولِ جنگ کا بھی خیال نہیں کیا اور فلپ کی بیوی اور اس کی بیٹی کو اٹھا کر لے آیا۔

فلپ کی بیوی کی حیرت اپنی جگہ تھی کہ اس جنگ سے ہم عورتوں کو کیا سروکار۔ وہ ہمیں کیوں اٹھا کر لے آیا ہے جبکہ میں اس کی بھاوج اور سلوم اس کی بھتیجی ہے۔ یہ عقدہ تو اس وقت حل ہوا جب ہیرودیس نے اسے اپنے پاس بلایا۔

''تم جانتی ہو میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟''

''بادشاہ کی باتیں بادشاہ ہی جانے۔''

''تم نے پوچھا بھی نہیں۔''

''میں نے ایک بادشاہ کی بیوی کی حیثیت سے یہی سیکھا ہے کہ جب تک بادشاہ خود نہ بتائے اس سے کچھ نہ پوچھو۔''

''میں تمہاری بیٹی سلوم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بھتیجی سے شادی نہیں ہوسکتی۔''

''اگر میں علماء سے فتویٰ لے لوں؟''

''یہ فتویٰ کوئی بھی نہیں دے گا۔''

''یہ میرا مسئلہ ہے۔ مجھے تو تمہاری اجازت کی ضرورت ہے۔ ویسے مجھے تمہاری اجازت کی بھی ضرورت نہیں۔ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ بس چاہتا ہوں کہ کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو۔ جو ہو تمہاری اجازت سے ہو۔''

''یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت دیا جائے۔''

بادشاہ کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس نے کچھ وقت دے دیا۔

فلپ کی بیوی کو خود تو کیا سوچنا تھا، وہ تو یہ چاہتی تھی کہ علماء کو اپنے پاس بلائے اور انہیں اس معاملے سے آگاہ کر کے ان

سے درخواست کرے کہ وہ کسی دباؤ میں نہ آئیں اور شریعت کے مطابق فیصلہ کریں۔ بس یہی موقع تھا کہ علماء کی امید بر آئی۔ انہوں نے سوچا یہی وہ معاملہ ہے جس میں بادشاہ اور یحییٰ کا ٹکراؤ کیا جا سکتا ہے۔

''ہم تو آپ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ بادشاہ کو یحییٰ کے پاس بھیجیں اور شادی کا فتویٰ ان سے لیں۔''

''بھلا یہ کیا بات ہوئی۔''

''ہم نے اگر بادشاہ کے خلاف بھی فیصلہ دیا تو وہ نہیں مانے گا لیکن یحییٰ کا فتویٰ خلاف آیا تو وہ اسے ٹال نہیں سکے گا اور اس شادی سے باز آجائے گا کیونکہ وہ ان سے عقیدت رکھتا ہے۔''

''اگر یحییٰ نے بادشاہ کا خیال کرتے ہوئے فتویٰ دے دیا کہ شادی جائز ہے؟''

''وہ ایسا فتویٰ کبھی نہیں دے سکتے۔ بادشاہ کو اپنی ضد چھوڑنا پڑے گی۔''

''بادشاہ ان کے پاس جانے کے لیے تیار ہو جائے گا؟''

''یہ آپ کا کام ہے کہ بادشاہ کو کس طرح تیار کرتی ہیں۔''

فلپ کی بیوی آخر ملکہ تھی۔ کئی سرد و گرم دیکھ چکی تھی۔ باتیں کرنا بھی خوب جانتی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس تجویز پر اچھی طرح غور کیا اور بادشاہ کے پاس پہنچ گئی۔

''میں اس شادی کے لیے تیار ہوں۔'' فلپ کی بیوی نے کہا۔ ''میں نے سلوم سے بھی بات کی تھی۔ اس کا خیال بھی یہی ہے کہ اگر کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ لوگ باتیں نہ بنائیں تو وہ شادی کر لے گی۔''

''کس کی مجال ہے جو میرے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کرے۔''

''یہی علماء جو اس وقت آپ کے خوف سے آپ کے حق میں فتویٰ دیں گے، کچھ عرصے بعد اپنے قول سے پھر جائیں گے۔ عوام میں ان کی اتنی مقبولیت بھی نہیں ہے کہ لوگ ان کے فرمان کو من و عن قبول کر لیں۔ میری بیٹی بدنام ہو کر رہ جائے گی۔ میں تو کہتی ہوں کوئی ایسی ہستی شادی کی اجازت دے جس کے سامنے علماء بھی دم نہ مار سکیں۔''

''تیرے خیال میں ایسی ہستی کون ہو سکتی ہے؟''

''میں نے سنا ہے یحییٰ بن زکریا کی عوام میں بہت مقبولیت ہے۔''

''ہاں ہے تو.....''

''اگر ان سے فتویٰ لے لیا جائے تو سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔''

''چالاک عورت، کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میری شادی کبھی نہ ہو۔ تو کیا سمجھتی ہے میں ان سے اپنی مرضی کا فتویٰ لے سکتا ہوں؟''

''آپ بادشاہ ہیں، کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کی بات وہ نہیں ٹالیں گے۔ اگر انکار کریں گے تو آپ کے پاس بہت سے طریقے ہیں۔ جان کسے عزیز نہیں ہوتی۔ انہیں جان کا خوف دلائیں۔''

''وہ کسی خوف میں آنے والے نہیں۔''

''تو پھر اس شادی سے بھی باز آجائیں۔ اگر آپ نے انہیں نظر انداز کر کے شادی کر لی تو ان کے عقیدت مند ضرور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ انہیں آپ لالچ دیں یا جان کا خوف دلائیں۔ ان کی اجازت کے بغیر آپ کا شادی کرنا ٹھیک نہیں۔ اس وقت علماء کا نہیں عام لوگوں پر ان کا حکم چلتا ہے۔''

یہ بات بادشاہ کے دل میں اتر گئی اور وہ حضرت یحییٰ سے ملاقات کے لیے چل دیا۔ سرکاری سپاہی، خدمات گار اور خوشامدی خود بھی اس کے ساتھ تھے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسے دیکھتے ہی فرمایا۔ ''پہلے اپنے ناجائز ارادے سے توبہ کر اس کے بعد میرے پاس آنا۔''

''اگر تمہارا اشارہ میری شادی کی طرف ہے تو میں اس سے باز نہیں آسکتا۔''

''پھر میرے پاس کیوں آیا ہے؟ جو تیرے جی میں آئے کرتا رہ۔''

''تم میرے لیے اس شادی کو جائز قرار دے دو۔''

''میں حرام کو حلال کیسے کر سکتا ہوں۔''

''تمہارے کہنے کے بعد کوئی کچھ نہ کہہ سکے گا۔''

''مجھے لوگوں کا نہیں، اپنے خدا کا خیال ہے۔ تم مجھ سے یہ بات نہیں منوا سکتے۔ میں تمہاری خوشی کے لیے خداوند کو

ناراض نہیں کرسکتا۔"

"میں بادشاہ ہوں۔ اتنی طاقت رکھتا ہوں کہ حکم عدولی کے جرم میں تمہیں گرفتار کرلوں۔"

"اے بادشاہ! تو یہ شوق بھی پورا کرلے لیکن میں حرام کو حلال نہیں کرسکتا۔"

حضرت یحییٰؑ کے عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد وہاں جمع تھی اور جس طرح حضرت یحییٰؑ بادشاہ سے گفتگو کررہے تھے، وہ بادشاہ کے لیے ناقابلِ برداشت بھی تھی اور توہین آمیز بھی۔ اس نے بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔ اب اسے حضرت یحییٰؑ کے خلاف قدم اٹھانا لازمی ہوگیا تھا ورنہ لوگوں پر اس کی کمزوری ظاہر ہوتی۔ اس نے حضرت یحییٰؑ کے چند عقیدت مندوں کو اپنے پاس بلایا اور ان کے ذریعے حضرت یحییٰؑ کو پیغام بھجوایا کہ وہ اگر حسبِ منشا فتویٰ دے دیں تو وہ انہیں آدھی سلطنت دینے کو تیار ہے۔ یہ اس کی دوسری غلطی تھی۔ اسے جان لینا چاہیے تھا کہ وہ دنیاوی دولت کے خواہاں نہیں۔ جب جواب آیا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

"جو خود محتاج ہو وہ کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ یہ طے کرلے کہ جو کچھ تیرے پاس ہے، کیا وہ واقعی تیرا ہے۔ فقیر ہو کر بادشاہوں کو خریدنے کی باتیں کرتا ہے۔ تو تو اتنا غریب ہے کہ میری اجازت کے بغیر شادی بھی نہیں کرسکتا اور میں اجازت دے نہیں سکتا کیونکہ یہ شریعت کے خلاف ہے۔ اب بھی وقت ہے، تجھے توبہ کرلینی چاہیے۔"

حضرت یحییٰؑ کے عقیدت مند ان باتوں کے گواہ بن چکے تھے۔ علمائے یہود نے ان باتوں کو بڑھا چڑھا کر دور تک پھیلایا تھا۔ بادشاہ نے سوچا اگر اس نے حضرت یحییٰؑ کو گرفتار نہ کیا تو میرا رعب ختم ہوجائے گا۔ جس کا جب منہ کھلے گا، میری حکم عدولی میں زبان چلانے لگے گا۔ میں حضرت یحییٰؑ کو گرفتار کرلوں تاکہ آئندہ میری حکم عدولی کی کسی کو ہمت نہ ہو۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں گرفتار کر کے قید خانے میں ڈالنا پڑا۔ اس کے پیچھے یہ جذبہ بھی پوشیدہ تھا کہ شاید جیل کی سختیاں دیکھ کر وہ اپنا فیصلہ تبدیل کردیں۔ اس کام کو آسان بنانے کے لیے اس نے چند عقیدت مندوں کو بھی اجازت دے دی کہ وہ قید خانے میں ان کے پاس آ، جاسکتے ہیں۔ اس رعایت کا مقصد یہ تھا کہ حضرت یحییٰؑ سے رابطہ برقرار رہے۔

بادشاہ نے ان عقیدت مندوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا اور ان پر زور دیا کہ وہ حضرت یحییٰؑ کو سمجھائیں۔ یہ بے چارے غریب لوگ تھے، ڈر گئے۔ انہوں نے حضرت یحییٰؑ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بادشاہ کی بات مان لیں لیکن آپ یہی کہتے رہے کہ میں خدا کی مانوں یا بادشاہ کی..... میں اپنی جان بچانے کے لیے خدا سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔ شریعت کی نظر میں امیر، غریب سب برابر ہیں۔ پھر میں کون ہوتا ہوں اس قانون میں تبدیلی کرنے والا۔

بادشاہ نے بھی تھک ہار کر ان سے کہلوا دیا کہ اب وہ ہمیشہ قید خانے میں رہیں گے۔ اب انہیں رہائی نہ ہونے کے بعد کی صورتِ حال کا انتظام فرمانا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مسیح علیہ السلام آچکے ہیں۔ مجھے جو کرنا تھا، میں کرچکا۔ اب سب انتظام مسیح علیہ السلام کریں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میرے شاگرد اور شاگردوں کے ذریعے دوسرے لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ آنے والا آچکا ہے۔ انہوں نے چاہا کہ شاگرد خود مشاہدہ کرلیں اور جان لیں کہ مسیح آچکے۔ انہوں نے اپنے دو شاگردوں کو بلایا۔

"تم دونوں مسیح (علیہ السلام) کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کیا تم وہی شخص ہو جس کا ہم انتظار کررہے ہیں۔"

وہ دونوں شاگرد روانہ ہوئے اور گلیل کی طرف چلے۔ حضرت عیسیٰؑ کا کسی ایک جگہ ٹھکانا نہیں تھا۔ ہمیشہ سفر میں رہتے تھے۔ آج ایک شہر میں ہیں تو کل دوسرے شہر میں نظر آرہے ہیں۔ یہ دونوں بھی شہر بہ شہر گھومتے رہے۔ ایک جگہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان دنوں شہر نائین میں ہیں۔ وہ دونوں بھی وہاں پہنچ گئے۔ شہر کے پھاٹک کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کوئی شخص مرگیا ہے اور لوگ مردے کو اٹھا کر لے جارہے ہیں۔ جنازے کے ساتھ ایک عورت بھی گریہ وزاری کرتی چلی جارہی تھی۔ معلوم ہوا مرنے والا اس عورت کا اکلوتا بیٹا تھا اور یہ عورت بیوہ تھی۔ اتنے میں دیکھا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ اس بھیڑ میں داخل ہوئے اور اس عورت کے قریب گئے۔

"مت رو، تیرا بیٹا ابھی زندہ ہوا جاتا ہے۔"

"تمہارا شکریہ کہ دوسروں کی طرح تم بھی مجھے تسلی دے رہے ہو ورنہ بھلا کوئی مر کر بھی زندہ ہوا ہے۔" وہ عورت اسی طرح روتی پیٹتی رہی۔

آپ آگے بڑھے اور جنازے کو ہاتھ لگا کر فرمایا۔ "اے جوان! میں تجھ سے کہتا ہوں اللہ کے حکم سے اٹھ جا۔" مردہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ اہلِ شہر پر یہ دیکھ کر دہشت چھا گئی۔ یہ دونوں بھی اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اب یہ سوچنے

کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ یہی مسیح علیہ السلام ہیں۔ جو سوال کرنا تھا وہ یہاں کیا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ بھیڑ بہت تھی۔ یہ دونوں حضرت عیسیٰؑ کے پیچھے پیچھے چلتے رہے کہ جہاں یہ ٹھہریں گے وہاں اطمینان سے بات کی جائے گی۔ حضرت عیسیٰؑ ایک عبادت خانے میں داخل ہوئے۔ یہ دونوں بھی چلے گئے۔ عبادت خانے کے سامنے ایک بھیڑ جمع تھی۔ کسی کو تپ چڑھی ہوئی تھی، کوئی اندھا تھا، کوئی جذام کا مریض تھا، کوئی بدروح کے قبضے میں تھا۔ حضرت یحییٰؑ کے شاگردوں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ مریض اندر آنا شروع ہوں، ہمیں جو پوچھنا ہے پوچھ لیں۔

انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم وہ ہیں جنہیں یحییٰؑ نے آپ کے پاس یہ پوچھنے کے لیے بھیجا ہے کہ آنے والا تو ہی ہے یا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں۔''

''اپنے مالک (یحییٰؑ) سے جا کر وہ سب کہہ دینا جو تم نے یہاں دیکھا۔ ان سے کہنا اندھے دیکھتے ہیں، لنگڑے چلتے پھرتے ہیں۔ کوڑھی پاک صاف کیے جاتے، بہرے سنتے ہیں۔ مردے، زندہ کیے جاتے ہیں۔ غریبوں کو خوشخبری سنائی جاتی ہے اور مبارک ہے وہ جو میرے سبب سے ٹھوکر نہ کھائے۔''

حضرت یحییٰؑ کے قاصد حیران ہو رہے تھے کہ یہ کیا جواب ہوا لیکن انہیں تو حکم ماننا تھا۔ وہ واپس آئے اور یہ جواب حضرت یحییٰؑ تک پہنچا دیا۔ شاگرد نہیں سمجھے تھے لیکن حضرت یحییٰؑ علیہ السلام سمجھ گئے۔ بے اختیار پکار اٹھے۔

''اب شاید میری ضرورت نہ رہے کیونکہ آنے والا آ چکا۔ دیکھو میں جس کی منادی کرتا رہا وہ آ گیا۔ مبارک ہو، انتظار ختم ہوا۔ خدا کی بادشاہی میں جو چھوٹا ہے وہی بڑا ہے۔'' (یہ اس طرف اشارہ تھا کہ حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ سے چھ ماہ بڑے تھے لیکن اعزاز و مرتبے کے اعتبار سے حضرت عیسیٰؑ بڑے تھے)

آپ کے منہ سے نکل گیا تھا کہ شاید اب میری ضرورت نہیں رہی۔ یہ منجانب اللہ تھا یا جو زبان سے نکلا اسے قبول ہونا تھا کہ حالات اسی طرف چل نکلے۔

یہودی علماء کا وہ فرقہ جو حضرت یحییٰؑ کے خلاف تھا اس صورتِ حال پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھا۔ حضرت یحییٰؑ کی گرفتاری کے بعد ان کا کام بہت آسان ہو گیا تھا۔ اب وہ بادشاہ کو حضرت یحییٰؑ کے قتل پر آمادہ کر سکتے تھے کیونکہ بادشاہ کو شادی کی جلدی تھی اور حضرت یحییٰؑ زبان کھولنے کو تیار نہیں تھے۔

اب بادشاہ نے اپنے شاہی اختیارات استعمال کرتے ہوئے سلوم کی ماں سے کہہ دیا کہ میں نے تیری بات مان کر یحییٰؑ کو قید کر دیا۔ اب تو میری بات مان اور سلوم سے میری شادی کرا دے ورنہ میں تجھے بھی قید کر سکتا ہوں۔

وہ عورت سمجھ رہی تھی کہ حضرت یحییٰؑ قید کی صعوبتیں برداشت نہیں کر سکیں گے اور بادشاہ کے حق میں فتویٰ دے دیں گے لیکن ہوا اس کے برعکس تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر علمائے یہود کو بلا بھیجا۔

''تم نے یہ کیسا مشورہ دے دیا۔ یحییٰؑ قید کر دیے گئے۔ اب بادشاہ کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی بھی نہیں رہا۔ اب بادشاہ چاہتا ہے وہ جو چاہے کرے۔ تم لوگ بھی زبانیں بند کر کے بیٹھے ہوئے ہو۔''

''ہماری زبانیں بند ہیں لیکن ہمارے ذہن کام کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے ہماری بات مان لی تو یہ شادی ہمیشہ کے لیے رک جائے گی۔''

''اب کیا منصوبہ لے کر میرے پاس آئے ہو؟''

''تم اپنی بیٹی سے کہو وہ اپنی شادی کے لیے یحییٰؑ کے قتل کی شرط رکھ دے۔''

''اس کے قتل سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ بادشاہ تو اور بے فکر ہو جائے گا۔ اس کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی رہے گا ہی نہیں۔ یحییٰؑ نہ رہے تو حرام کو حرام کون کہے گا۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ بادشاہ نے آپ کو دکھانے کے لیے یحییٰؑ کو قید میں تو ڈال دیا ہے لیکن اس کے قتل کے احکام صادر نہیں کرے گا۔ وہ یہ شرط کبھی پوری نہیں کرے گا۔ اس طرح تیری بیٹی سے شادی بھی نہیں کر سکے گا۔''

فلپ کی بیوی کو یہ مشورہ پسند آیا اور اس نے بیٹی سے کہہ دیا کہ کوئی موقع دیکھ کر شادی کے لیے یہ شرط رکھ دے۔ نہ یہ شرط پوری ہوگی نہ شادی ہوگی۔

ہیرود لیس کی سالگرہ کا دن قریب آ رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ سالگرہ سے قبل شادی ہو جائے۔ اب وہ درخواست نہیں کر رہا تھا بلکہ حکم دے رہا تھا کہ سلوم کو میرے ساتھ شادی کرنی ہوگی۔

''یہ شادی سالگرہ کے بعد ہوگی۔'' سلوم نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''میں آپ کی سالگرہ میں رقص کروں گی۔ آپ خوش ہو کر مجھے انعام دینے کا وعدہ کریں گے۔ میں انعام میں جو کچھ مانگوں گی آپ وہ عطا کریں گے اور میں شادی کے لیے سر جھکا لوں گی۔''

''سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ میں انعام میں آدھی سلطنت بھی تمہیں دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ تم اور کیا مانگ لوگی لیکن اس کے بعد تم شادی سے انکار نہیں کروگی ورنہ میری محبت کو غضب میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔''

''آپ میری شرط پوری کردیں گے تو پھر میں اپنا وعدہ بھی ضرور پورا کروں گی۔''

اس مرتبہ فلپ کی ماں درمیان میں نہیں تھی لہٰذا بادشاہ کو پورا یقین تھا کہ سلوم خود اس سے شادی کی خواہاں ہے۔ اس نے زور و شور سے سالگرہ بلکہ یہ کہیے شادی کی تیاریاں شروع کردیں۔

سالگرہ کی تقریب میں بادشاہ کے مقربین اور مہمان جمع تھے کہ سلوم ہوشربا لباس میں ناچنے کے لیے کھڑی ہوئی۔ بادشاہ نے اس کا یہ روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ مسحور ہوگیا۔

جب رقص ختم ہوا تو وہ بے اختیار پکار اٹھا۔

''سلوم! مانگو کیا مانگتی ہو۔ آدھی سلطنت بھی مانگو گی تو دینے کو تیار ہوں۔''

''سلطنت مانگ کر میں کیا کروں گی۔ مجھے تو یحییٰ کا سر چاہیے جو ہماری شادی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔''

''میں اس کی اجازت کے بغیر بھی تم سے شادی کروں گا۔ وہ زندگی بھر میری قید میں رہے گا۔''

''آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جو میں مانگوں گی آپ مجھے دیں گے۔ بادشاہوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے وعدے سے پھر جائیں۔''

''میں اپنے وعدے سے پھرا نہیں ہوں۔ تو کچھ اور مانگ لے۔ میں تجھے دینے کو تیار ہوں۔''

سلوم برابر اپنی ضد پر جمی ہوئی تھی۔ بادشاہ کے درباری گواہ تھے کہ بادشاہ نے کہا تھا، تو جو مانگے گی تجھے دوں گا۔ وہ اپنے درباریوں کے سامنے اپنے قول سے پھر نہیں سکتا تھا۔ وہ سلوم کو جتنا سمجھا سکتا تھا اس نے سمجھایا۔ پھر سپاہیوں کو حکم دیا کہ یحییٰ کا سر کاٹ کر شہزادی کے سامنے پیش کیا جائے۔

ہیرودیس اپنی بھتیجی سے شادی کر کے جس گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا میں اسے اس سے بھی بڑے گناہ میں ملوث کردیا۔ وہ ایک نبی کے قتل کا مجرم بن گیا۔

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت یحییٰ کا سر ایک طشت میں رکھ کر شہزادی سلوم کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اس منظر کی تاب نہ لاسکی اور اسی وقت مرگئی۔

حضرت یحییٰ کے قتل کے بارے میں کئی اور قول بھی مشہور ہیں۔ واقعہ کوئی بھی ہو اور کسی طرح بھی پیش آیا ہو، اس پر سب متفق ہیں کہ ہیرودیس نے حضرت یحییٰ کو قتل کرادیا تھا۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خبر پہنچی تو وہ ایک شہر میں جا بسے جو جھیل کے کنارے زبولون اور نفتالی کی سرحد پر واقع تھا کہ جو یسعیاہ نبی کی معرفت کیا گیا تھا، وہ پورا ہو۔

زبولون کا علاقہ اور نفتالی کا علاقہ
دریا کی راہ یردن کے پار غیر قوموں کی گلیل
یعنی جو لوگ اندھیروں میں بیٹھے تھے
انہوں نے بڑی روشنی دیکھی
اور جو موت کے ملک اور سائے میں بیٹھے تھے
ان پر روشنی چمکی

اس دن کے بعد سے ان کی تبلیغ کا انداز ہی بدل گیا۔ اب ان کی آواز گونج رہی تھی۔ ''توبہ کرو۔ توبہ کرو۔ آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے۔''

اب یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی آنے والے وقت کی تیاری کر رہے ہوں۔ اب معجزات سے زیادہ تعلیمات پر زور دے

رہے تھے۔ جو عبادت خانہ دکھائی دیتا، وہاں پہنچ جاتے اور لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتے۔

''تم زمین کے نمک ہو لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا۔ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوائے اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں تلے روندا جائے۔

''تم دنیا کے نور ہو۔ جو شہر پہاڑ پر بسا ہے وہ چھپ نہیں سکتا اور چراغ جلا کر پیمانے کے نیچے نہیں بلکہ چراغ دان پر رکھتے ہیں تو اس سے سب گھر کے لوگوں کو روشنی پہنچتی ہے۔ اسی طرح تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے مالک کی جو آسمان پر ہے، تمجید کریں۔''

''تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کرنا اور جو کوئی خون کرے گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصہ ہوگا، وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو اس کو احمق کہے گا وہ آتش جہنم کا سزاوار ہوگا۔ پس اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گزرانتا ہو اور تجھے یاد آجائے کہ میرے بھائی کو مجھ سے شکایت ہے تو اپنی نذر چھوڑ دے اور جا کر پہلے اپنے بھائی سے ملاپ کر۔''

''پھر تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ جھوٹی قسم نہ کھانا بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے لیے پوری کرنا لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ بالکل قسم نہ کھانا نہ تو آسمان کی کیونکہ وہ خدا کا تخت ہے نہ زمین کی کیونکہ وہ اس کے پاؤں کی چوکی ہے۔ نہ یروشلم کی کیونکہ وہ بزرگ بادشاہ کا شہر ہے۔ نہ اپنے سر کی قسم کھانا کیونکہ تو ایک بال کو بھی سفید یا کالا نہیں کر سکتا۔''

''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی ناکش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بے گار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی تجھ سے مانگے، اسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔''

عبادت خانوں کے در و بام ان کی آواز سے گونج رہے تھے۔ گلیل کے جتنے شہر تھے، وہاں کے لوگ جوق در جوق کھنچے چلے آرہے تھے۔ بیماروں کو شفا مل رہی تھی۔ دور دور تک آوازوں نے شور مچایا ہوا تھا کہ مسیح آچکا ہے۔ یحییٰ جس کی منادی کرتا تھا، یہ وہی ہے۔

ہیرودیس سخت حیران تھا کہ میں نے تو یحییٰ کا سر کاٹ دیا، اب یہ کون ہے جو میری سلطنت میں دراڑیں ڈالنے آن پہنچا ہے۔ کیا مردہ زندہ ہو گیا؟

یروشلم کے یہود علماء خاص طور پر ''فریسی گروہ'' جو مذہب کا قائل ہی نہیں تھا، اس آواز کو دبانے کے لیے کوشاں ہو گئے تھے۔ وہ بس یہ شگوفہ چھوڑ رہے تھے کہ اس طوفان کا رخ ابھی یروشلم کی طرف نہیں۔ ابھی وہ حضرت یحییٰؑ کے قتلِ ناحق کے الزام سے بری نہیں ہوئے تھے کہ یہ طوفان شور مچانے لگا تھا۔

حضرت زکریا علیہ السلام بہت ضعیف ہو چکے تھے لیکن اس عالم میں بھی ہدایت کا چراغ روشن رکھے ہوئے تھے۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آوازیں یروشلم تک آنے لگیں تو یہودیوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ انہیں زکریاؑ کی طرف سے خطرہ بڑھنے لگا۔ ان کی سازشیں انہیں باور کرانے لگیں کہ کہیں حضرت زکریاؑ اپنی تقریروں میں حضرت یحییٰؑ کے قتل کا تذکرہ کر کے لوگوں کو بھڑکانے نہ لگیں اور اپنے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کو بھی ملا لیں۔ اگر ایسا ہوا تو رائے عامہ ہمارے خلاف ہو جائے گی کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے عقیدت مندوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ یہودیوں کی شیطانی ذہنیت نے یہی سوچا کہ اس طاقت کو توڑ دیا جائے۔ وہ اس طرح کہ حضرت زکریاؑ کو قتل کر دیں۔

یہ ایسی بھیانک سوچ تھی جو بنی اسرائیل ہی سوچ سکتے تھے۔ وہ حضرت یحییٰؑ کا خون بہا چکے تھے اس لیے ان کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں۔ وہ کھلے عام کہنے لگے کہ حضرت یحییٰؑ کے قتل نے کون سی قیامت کھڑی کر دی جو زکریاؑ کے خون سے قیامت آجائے گی۔

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ ..... انجیل مقدس (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) سوعظیم آدمی۔ ترجمان القرآن

روایت

اعتزاز سلیم وصلی

عجیب لوگ ہیں جو جرائم کے معاملات میں ایمانداری اور اصول پرستی کے بڑی شدت سے نہ صرف قائل ہوتے ہیں بلکہ ان پر قائم بھی رہتے ہیں۔ ان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ واردات کوئی بھی ہو وہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے تھے مگر یہ ضروری تو نہیں کہ ہر بار قسمت ان کا ساتھ ہی دے... لہٰذا اس بار وہ اپنی روایت پر قائم نہ رہ سکے۔

قاتل و مقتول کے درمیان ہونے والی رسا کشی کا دلچسپ احوال

ان میں سے دو کے ہاتھ میں پیسوں سے بھرے بیگ تھے جبکہ تیسرا اپنے شکنجے میں منیجر کی گردن جکڑے باہر نکل رہا تھا۔ سیکیورٹی گارڈز کے پاس مزاحمت کا چانس نہ تھا۔ اگر وہ گولی چلاتے تو منیجر کی جان جا سکتی تھی۔ انہوں نے چپ چاپ ہتھیار نیچے پھینک دیے۔ پرائیویٹ بینک کی یہ مین برانچ اپنے کمپیوٹرز کی مدد سے کنٹرول ہونے والے پورے سیکیورٹی سسٹم کی وجہ سے مشہور تھی مگر اس کے کمپیوٹر روم میں اس وقت ایک لڑکی اور مرد بے ہوش پڑے

پستول کے دستے سے وار کیے گئے تھے۔ ان کے سر پر جنگل کے دستے سے وار کیے گئے تھے۔ بینک میں ایک سیکیورٹی گارڈ کی لاش پڑی تھی جس کی گردن سے گولی پار ہو گئی تھی۔ ڈاکو ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے باہر نکلے۔ اپنی گاڑی میں بیٹھے، منیجر کو بھی ساتھ ہی دھکیل دیا۔ کوئی ایک دو کلومیٹر دور جانے کے بعد انہوں نے منیجر کو باہر پھینک دیا۔ شہر سے باہر ایک جنگل میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد انہوں نے لباس تبدیل کیے۔ پرانے کپڑوں کو آگ لگا دی۔ ہتھیار زمین کھود کر نیچے دبا دیے۔ کچھ دیر بعد تینوں الگ الگ راستوں پر رواں اپنے اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

☆☆☆

بس کی چھت پر بیٹھے افراد شدید سردی کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے سویٹر اور جیکٹس پہن رکھی تھیں جبکہ کچھ ایسے بھی تھے جو صرف سادہ لباس میں تھے۔ شاید انہیں اندازہ نہ تھا کہ شہر سے واپسی کا سفر بس کی چھت پر کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی یہ لوکل بس تھی جو ہر اسٹاپ پر پانچ دس منٹ کے لیے رک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کنڈیکٹر اور ڈرائیور ہر مسافر کو اپنی بس میں سوار کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اب بس میں قدم رکھنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ چھت پر بھی پندرہ بیس لوگ بیٹھے ٹھنڈی ہوا اور اپنی قسمت کو کوس رہے تھے کہ اس بس کو سفر کے لیے کیوں چنا۔ عماد کے لیے بھی یہ نیا تجربہ تھا۔ پچھلے ہفتے بائیک بیچتے وقت اسے قطعی اندازہ نہ تھا کہ وہ لوکل بسوں میں اس قدر ذلیل ہو گا۔ اگر اسے پتا ہوتا تو وہ کبھی بائیک نہ بیچتا۔ خدا خدا کر کے یہ سفر اختتام کو پہنچا اور اس نے چھت سے سیڑھیوں کے ذریعے زمین پر لینڈ کیا۔ سکون کا سانس لینے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے محلے کی جانب بڑھ گیا۔ عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ ابھی وہ اپنے گھر سے کوئی آدھا کلومیٹر دور تھا کہ گڈو بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ گڈو، ان کی پڑوسن خالہ نسیم کا بیٹا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عماد کے دماغ نے خطرے کی گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ ''خیر تو ہے گڈو! آج پھر کہیں خالہ کے پیسے تو چوری نہیں کر لیے؟'' ... گڈو اکثر ماں کے پرس سے پیسے چرا کر مار کھاتا تھا۔

''عماد بھائی! وہ سراج انکل آئے ہیں۔'' یہ سنتے ہی عماد نے بھی بھاگنا شروع کر دیا۔ گڈو نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ عماد نے اس دوڑ کے دوران تیز سانسیں لیتے ہوئے پوچھا۔

''کیا کر رہا ہے وہ بڈھا؟''

''آپ لوگوں کا سامان اٹھوا رہا ہے گھر سے۔ اپنے ساتھ دو بندے بھی لایا ہے۔'' یہ سنتے ہی اس نے رفتار تیز کر دی۔ سراج اس مکان کا مالک تھا جسے آج سے تین سال پہلے انہوں نے کرائے پر لیا تھا۔ آدھا کلومیٹر کا سفر دو سے تین منٹ میں طے کرنے کے بعد وہ جب اپنے گھر پہنچا تو اماں کے جہیز والا پرانا بیڈ اس چھوٹے سے گیٹ سے باہر نکلنے سے انکار کر رہا تھا اور سراج اپنے بغیر دانتوں والے منہ کو عجیب انداز میں ہلاتے ہوئے پان تھوکنے کے بعد بیڈ کے ٹکڑے کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ اس لمحے وہ گڈو کو بالکل اس قصائی کی طرح معلوم ہوا جو ہر بقرا عید پر ان کے لاڈ پیار سے پالے گئے بکرے کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا تھا۔ عماد سیدھا سراج کی طرف بڑھا۔

''انکل! یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ پچھلے ہفتے تو میں نے آپ سے وقت لیا تھا؟''

''میاں! وقت تو ہم تمہیں تین ماہ سے دے رہے ہیں۔ کب تک لیتے رہو گے؟ اب قصہ ختم کرو۔ شریف لوگوں کی طرح اپنا سامان اٹھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' عماد کا دل چاہا اس کے پان زدہ ہونٹوں پر ایک عدد مکا رسید کر دے مگر ان حالات میں یہ حرکت بالکل مناسب نہ تھی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا جو اس کی دو چھوٹی بہنوں کو لیے ایک کونے میں سخت بے بسی سے سراج کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر سراج کی منتیں کیں مگر وہ نہ مانا۔ آخر اس نے تھک کر گہرا سانس لیا۔

''اچھا، میں کرایہ دیتا ہوں آپ کو۔'' یہ کہتا ہوا وہ گھر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں پیسے تھے۔ سراج نے تین بار تھوک لگا کر پیسے گنے اور نوٹوں کو سونگھ کر جعلی ہونے کا شک دور کیا پھر بولا۔

''یہ تو دو ماہ کا کرایہ ہے۔ اس ماہ کا کہاں گیا؟''

''تو یہ ماہ ختم کب ہوا ہے؟'' اس نے گھور کر سراج کی طرف دیکھا۔ ''اب ہمارا سامان واپس رکھوائیں ان سے۔'' سراج کے ساتھ آنے والے دونوں ملازموں نے فریادی نظروں سے اپنے مالک کی طرف دیکھا مگر وہ ان سے کام لینا جانتا تھا۔

''شاباش جوانو ... عماد بھائی کا سامان واپس پہنچا دو پھر ہم مزدوری بھی دیں گے اور چائے بھی پلائیں گے۔'' یہ سنتے ہی انہوں نے مرے مرے قدموں سے بیڈ کو واپس کمرے کی طرف لے جانا شروع کیا جس کو دروازے سے بمشکل باہر نکالا تھا۔ بیڈ اپنی اس بے عزتی پر چیخ چیخ کر

احتجاج میں مصروف تھا۔

☆☆☆

سورج نے زمین کا ساتھ چھوڑ کر مغرب میں پناہ لی تو چاند اپنی روشنی بکھیرنے چلا آیا۔ یہ ابتدائی تاریخوں کا چاند تھا جس کی روشنی بہت کم تھی۔ سامان واپس رکھا جا چکا تھا۔ سراج اپنے ملازموں سمیت گھر چلا گیا۔ عماد اور اس کے گھر والے سکھ کا سانس لیتے ہوئے واپس اپنے گھر میں آ گئے۔ وہ اپنے کمرے میں آیا تو شہناز چائے کا کپ لے کر پیچھے آ گئی۔

''ارے واہ اماں، بڑی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس کی۔'' اس نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا۔ شہناز البتہ مشکوک نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے اماں! یہ سی آئی ڈی والوں کی طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟''

''کرائے کے پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس؟ کہیں ڈکیتی کر کے آیا ہے کیا؟'' انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ وہ ہنس پڑا۔

''اف — ایک تو یہ آپ نے شاید جرم و سزا پر مشتمل کہانیاں پڑھنا شروع کر دی ہیں جو اپنے بیٹے پر بھی شک کر رہی ہیں۔ ارے اماں بائیک بیچی تھی، وہی پیسے دے دیے سراج کو اور جان چھڑا لی۔'' شہناز نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''پر وہ تو تیری یونیورسٹی کی فیس کے تھے؟''

''کوئی ضرورت نہیں اب۔ گریجویشن ہو گیا۔ اب نہیں پڑھنا مجھے۔ جاب ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہیں مل جاتی ہے تو حالات بہتر ہو جائیں گے۔'' انہوں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ وقت سے پہلے ذمے داریوں کا بھاری بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ وہ حساس دل کا مالک، سنجیدگی سے دور رہنے والا جوان تھا جس کو اب دو چھوٹی بہنوں اور ایک ماں کو سنبھالنا تھا۔

حالات ہمیشہ سے ایسے نہ تھے۔ پانچ افراد کا یہ گھرانا جب اس محلے میں آیا تھا تب وہ زندگی سے بھرپور ہنستے کھیلتے لوگ تھے۔ عماد کا باپ شہزاد احمد، ایک پرائیویٹ فرم میں کمپیوٹر آپریٹر تھا۔ مناسب تنخواہ اور دیگر سہولتیں میسر تھیں۔ ویسے بھی جس زمانے میں شہزاد احمد نے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کی، اس زمانے میں کمپیوٹر آپریٹر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے تھے۔ اس لیے اب وہ فرم میں سینئر ملازم تھا۔ عماد خود کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس سے چھوٹی حنا سیکنڈ ائیر جبکہ سب سے چھوٹی حرا میٹرک کی طالبہ تھی جب ایک حادثے نے اس گھر کی درست سمت میں جاتی زندگی کو غلط راستے پر ڈال دیا۔

ایک شام عماد اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ آن کیے بیٹھا کچھ پڑھنے میں مصروف تھا جب موبائل کی گھنٹی بجی۔ انجان نمبر تھا۔ کال ریسیو کرتے ہی ''ہیلو'' کے جواب میں ایک مشینی آواز سنائی دی۔

''عماد صاحب! آپ کے باپ شہزاد احمد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے..... ان کی حالت بہت نازک ہے۔'' عماد کو کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ بائیک پوری رفتار سے بھگا کر جب اسپتال پہنچا تو وہاں ان کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ کال کرنے والا شہزاد کا جاننے والا تھا جو اسپتال میں جاب کرتا تھا۔ اسی کی زبانی معلوم ہوا کہ شہزاد احمد کی بائیک ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ انہیں زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا جہاں وہ بس چند سانسیں لے سکے۔ باپ کے مرنے کے بعد عماد کو محسوس ہوا کہ وہ درخت جس کا سایہ انہیں ٹھنڈک پہنچاتا تھا، اب نہیں رہا۔ اکلوتا اور بڑا بیٹا ہونے کے ناتے سب اسے ہی سنبھالنا تھا۔

ایک ہفتے بعد جب انہیں کچھ صبر آیا تو عماد اپنے باپ کے آفس چلا آیا۔ یہاں اسے امید تھی کہ شاید باپ کی جگہ اسے نوکری پر رکھ لیا جائے۔ فرم کے مالک اکبر علی نے اسے اپنے آفس میں بلایا اور شہزاد کی موت پر تعزیت کا اظہار کیا۔ ''بہت اچھا انسان تھا تمہارا باپ۔ ایماندار اور باصلاحیت..... پر افسوس تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔''

''جی —'' عماد نے سر جھکایا اور کچھ لمحوں بعد اس نے اپنے ڈاکیومنٹس اکبر علی کے سامنے رکھ دیے۔ ''اگر ابو کی جگہ مجھے نوکری دی جائے تو میں بھی ایمانداری سے کام کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ میرے ڈاکیومنٹس ہیں۔ میں نے بھی گریجویشن کیا ہے اور میرا مضمون بھی کمپیوٹر سائنس ہے۔'' اکبر نے سر ہلا کر ڈاکیومنٹس دیکھے اور بولا۔

''میں کوشش کروں گا انشاء اللہ۔ ایک ہفتے بعد آنا۔'' عماد کو امید ہو چلی تھی کہ اس کی نوکری یہاں لگ جائے گی۔ باپ جتنی تنخواہ نہ سہی مگر وہ کم تنخواہ میں بھی کام کرنے پر راضی تھا۔ ایک ہفتے بعد جب وہ اکبر علی کے دفتر پہنچا تو اس سے پہلے اس نے جھانک کر باپ کے کمرے میں دیکھا۔ یہاں ایک کلین شیو شخص کرسی پر بیٹھا، کمپیوٹر کے کی

بورڈ پر ''ٹھک ٹھک'' کرنے میں مصروف تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ دیر بعد جب وہ اکبر علی کے سامنے بیٹھا تو اس نے چائے کا پوچھا مگر عماد نے انکار کر دیا۔

''عماد بیٹا، میں نے کوشش کی تھی مگر اب شہزاد احمد کی جگہ ایک تجربہ کار اور ماہر بندہ رکھ لیا گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے اور کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔'' عماد کو جھٹکا لگا۔ اس کا انتظار بیکار گیا تھا مگر اب کیا حاصل..... ایک دن بعد ہی اسے پتا چل گیا کہ وہ..... ''تجربہ کار'' اور ''ماہر'' بندہ دراصل اکبر علی کا بھانجا ہے اور اس کی تعلیم بھی عماد سے کم ہے۔ یہ معلومات شہزاد احمد کے کولیگ نے دی تھی۔ اسے افسوس ہوا مگر وہ افسوس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ باپ کی جمع پونجی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ویسے بھی شہزاد اور شہناز دونوں کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کے عادی تھے اس لیے انہوں نے بہت کم بچا رکھا تھا۔ اس رقم سے ان کا گزارہ دو ڈھائی ماہ ہی ہوا۔ عماد نوکری کے لیے دھکے کھا رہا تھا مگر اتنی آسانی سے نوکری ملتی تو شاید کوئی بھوکا نہ مرتا۔ ہر روز ناکام گھر واپس آنے کے بعد حنا اور حرا جب امید بھری نظروں سے بھائی کی طرف دیکھتیں تو اس کا دل کٹ جاتا۔ شہناز روز حوصلہ بڑھاتی مگر کب تک؟ حنا نے کالج اور حرا نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ فیس اور دیگر اخراجات نہیں تھے اس لیے عماد اور شہناز نے اعتراض نہ کیا۔ وہ اچھے وقت کی امید میں برا وقت کاٹ رہے تھے۔

☆☆☆

''میرے ساتھ حصہ ڈال لو کہیں سے قرض لے کر۔ بیکری بنا رہا ہوں۔ محلے میں کوئی بیکری نہیں، کام چل گیا تو نہ صرف قرض اتار لو گے بلکہ گھر کے حالات بھی بدل جائیں گے۔'' یہ عماد کا کلاس فیلو اور قریبی دوست احسان تھا جو اس کی پریشانی سے واقف تھا۔ احسان محلے سے باہر آباد ہونے والی ایک چھوٹی سی آبادی کا رہائشی تھا۔ اس نے مشورہ دیا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''مگر یار! پیسے کہاں سے لاؤں..... قرض کون دے گا؟''

''کسی سے بھی لے لو۔ سود پر پکڑ لو۔ بعد میں قسطوں میں واپس کر دینا۔ بیکری تیار ہے، بس سامان ڈالنا ہے اس میں۔ دو لاکھ کی ضرورت ہے۔'' اس نے اسے مزید تفصیل بتائی۔ عماد نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' گھر آ کر اس نے شہناز سے مشورہ کیا۔ اس نے سود پر قرض لینے سے صاف انکار کر دیا۔

''برکت نہیں ہو گی۔ بلاوجہ پھنس جاؤ گے۔'' مگر عماد ضد پر اڑ گیا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اندر گئی اور اپنے کمرے سے کاغذات اٹھا کر لائی۔ یہ ایک پلاٹ کی ملکیت کے کاغذات تھے جو شہناز کے نام تھا۔ یہ پلاٹ آسانی سے دو ڈھائی لاکھ میں بک سکتا تھا۔ عماد نے حیرانی سے ماں کی طرف دیکھا۔

''یہ کس نے اور کب خریدا؟''

''تیرے ابو نے خریدا تھا۔ حنا کی شادی کے دنوں میں بیچنے کا سوچ کر میرے نام کر دیا تھا۔ میں اس لیے سنبھال رہی تھی کہ حنا کا جہیز وغیرہ بنائیں گے مگر اب ان چیزوں سے زیادہ ضروری گھر کے حالات بدلنا ہے۔ یہ سب بعد میں ہو جائے گا۔'' عماد نے سر ہلایا۔ ایک دو دن بھاگ دوڑ کرنے کے بعد یہ پلاٹ پورے دو لاکھ میں بک گیا۔ اس نے یہ پیسے احسان کو دے دیے اور بیکری میں حصہ ڈال لیا۔ احسان نے دو دن میں سب کام مکمل کرنے کا وعدہ کیا۔ اسے بیکری بھی دکھا دی۔ لوکیشن اچھی تھی اگر قسمت ساتھ دیتی تو وہ واقعی گھر کے حالات بدل سکتا تھا مگر قسمت نے شاید عماد کا ساتھ نہ دینے کا سوچ لیا تھا۔ احسان ایک ہفتہ اسے دکھائی نہ دیا۔ عماد کو پریشانی ہوئی۔ اس نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کا نمبر بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔ اس شام وہ بیکری پر گیا تو وہاں سامان کا ٹرک دیکھ کر خوش ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا تو وہاں ایک اجنبی شخص کھڑا پورے سامان کو اپنی نگرانی میں بیکری کے اندر رکھوا رہا تھا۔ عماد نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔

''بھائی، احسان کہاں ہے؟''

''کون احسان؟'' اس نے حیرت سے عماد کی طرف دیکھا۔

''جس کی یہ بیکری ہے۔'' عماد کی بات سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

''ابے یہ بیکری میری ہے..... اور مجھے لگتا ہے تم اس احسان کی بات کر رہے ہو جو اس میں میرا پارٹنر بننا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ لاکھوں کے کاروبار میں ایسے کیسے حصہ ڈال دوں اس کا۔'' عماد کا سر گھوم گیا۔ اسے لگا زمین گول گول چکر کھا رہی ہے۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی؟'' اجنبی نے عماد کو سنبھال کر کرسی پر بٹھایا۔ پانی کا گلاس پینے کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ رکشا لے کر محلے سے باہر احسان کے گھر پر چلا گیا۔ یہاں احسان کے والد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں

نے عماد کی خیریت دریافت کی اور آمد کی وجہ پوچھی۔

''انکل! احسان کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس نالائق کا نام نہ لو ہمارے سامنے۔'' وہ خفگی سے کہتے ہوئے اندر بڑھے اور اخبار اٹھا لائے۔ یہاں ایک عاق نامہ موجود تھا جس پر احسان ولد خرم علی کا نام درج تھا۔ عماد نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ ''بیٹا! تمہیں دھوکا دیا ہوگا اس نالائق نے۔ اس کی انہی شکایتوں سے تنگ آکر عاق کردیا ہم نے۔ سنا ہے اب باہر جانے کی تیاری میں تھا۔ پیسے اکٹھے کررہا تھا۔'' خرم علی نے وضاحت کی کہ جب بھی احسان کی کہیں خبر ملی وہ اسے ضرور اطلاع دیں گے۔ وہ مرے مرے قدموں سے گھر لوٹ آیا۔ چند دن بعد خبر ملی، احسان دبئی جا چکا تھا۔ نہ جانے عماد جیسے کتنے اس کی سیڑھی بنے تھے جو اس نے منزل پر پہنچنے کے لیے استعمال کیے۔ شہناز نے یہ خبر حوصلے سے سنی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اللہ مالک ہے۔'' وہ روکھی سوکھی کھا کر زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے مگر اس واقعے نے عماد کی سوچ تبدیل کردی تھی۔

☆☆☆

اس بات کو دو ہفتے گزر گئے۔ اس شام کوئی پانچ بجے انٹرویو دینے کے بعد عماد ایک گھٹیا قسم کے ہوٹل میں بیٹھا ہوٹل کے معیار ہی کی چائے پی رہا تھا جب اس کے سامنے والی کرسی پر دھپ سے کوئی آ بیٹھا۔ اس کی آمد نے ٹیبل پر بیٹھی مکھیوں کی نیند میں خلل ڈالا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گیا۔ ''ارے نقاش! تم۔'' دونوں گلے ملے۔ نقاش ہائی اسکول میں اس کا دوست بنا تھا اور آئی سی ایس تک ساتھ رہا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر ماں باپ کی سختی کی وجہ سے وہ کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کررہا تھا جسے کالج میں ہی نامکمل چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ عماد اسے تین سال بعد دیکھ رہا تھا۔ اس کے رنگ ڈھنگ بدل چکے تھے۔ بہترین کپڑوں میں ملبوس اس کی شخصیت الگ ہی رنگ دکھا رہی تھی۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ گھڑی نے رات کے آٹھ بجا دیے۔ عماد ''اوہ'' کہتے ہوئے کھڑا ہوا اور بولا۔ ''یار! پھر ملتے ہیں۔ دیر ہو گئی، امی پریشان ہوں گی۔''

''آج کل کر کیا رہے ہو تم؟''

''دھکے کھا رہا ہوں جاب کے سلسلے میں۔ کہیں جاب

ماں

☆ اگر مجھے سب سے زیادہ بلند چوٹی پر پھانسی دی جائے تو مجھے معلوم ہے کہ میری جان سے پیاری ماں وہاں تک میرا تعاقب کرے گی (کپلنگ)

☆ آسمان کا بہترین اور قیمتی تحفہ ماں ہے۔ اس کی دل سے قدر کرو (ملٹن)

☆ ماں کی محبت حقیقت کی آئینہ دار ہے (مولانا حالی)

☆ ماں..... ان تین مختصر لفظوں میں کتنی وسیع دنیا پوشیدہ ہے (کہاوت)

☆ ماں کی زندگی میں محبت اور مہربانی کا خمیر داخل کردیا گیا ہے (امیرسن)

☆ ماں کی محبت میں کتنی مٹھاس اور تسکین ہے (چارلس ڈکنز)

☆ لڑکا اپنی مرحوم ماں کو جب روتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ میں وہ درخت بن گیا ہوں جسے کوئی اب پانی نہیں دیتا (منشی پریم چند)

☆ ماں کے بغیر گھر قبرستان لگتا ہے (اورنگ زیب عالمگیر)

دنیا کا سب سے مہنگا زہر

دنیا کا سب سے مہنگا زہر بچھوؤں کی ایک خاص قسم میں پایا جاتا ہے۔ اسے جان لینے والا بچھو کہتے ہیں۔ اس کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر شمالی افریقا اور وسطی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔ یہ بچھو اپنے قیمتی زہر کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی مشہور ہے کہ جسے یہ بچھو ڈس لے اس کی زندگی بچانا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق مذکورہ بچھو کے زہر کی ایک لیٹر کی قیمت ایک ارب 10 کروڑ 63 لاکھ روپے پاکستانی روپے ہے تاہم خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ اس بچھو کا زہر کارآمد بھی ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس بچھو کا زہر کینسر والے خلیوں کو بننے سے روکتا ہے۔ سائنسدانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ زہر جسمانی اعضا کی محفوظ منتقلی میں بھی معاون ہوتا ہے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

مل جائے تو حالات بہتر ہوں ورنہ بڑی مشکل سے گزارہ ہو رہا ہے۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ارے، میں نے بھی تیری طرح بہت دھکے کھائے ہیں۔ کچھ نہیں ملتا ان نوکریوں سے۔ ویسے بھی ایک نوکری کیا کرسکتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ تیرے گھر کے حالات بدل دے گی، تمہاری کلاس تو نہیں بدلے گی نا؟ رہو گے تو لوئر مڈل کلاس ہی۔ جہاں ہر ماہ کے آخر میں قرض لینا پڑتا ہے اور اگلے ماہ آدھی تنخواہ اس میں چلی جاتی ہے۔'' نقاش کے لہجے میں تلخی تھی۔

''واہ یار! تم تو پورے فلسفی ہو۔''

''فلسفی نہیں — حالات نے سکھایا ہے سب۔ تم ایسا کرو کل شام کو مجھے ملو۔ میرے پاس ایک آفر ہے اگر منظور ہو تو وہیں بتا دینا اگر نہ ہو تو تم اپنے راستے، میں اپنے —'' اس نے عماد کو پورا پتا سمجھایا اور کہا۔ ''اس پتے پر آجانا کل شام۔'' یہ کہتا ہوا وہ چل دیا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ عماد کا کہیں انٹرویو نہ تھا اس لیے اس نے نقاش کو آزمانے کا فیصلہ کیا اور اس کے سمجھائے ہوئے پتے پر جا پہنچا۔ گیٹ نقاش نے ہی کھولا اور اسے لے کر اندر آگیا۔ چائے تیار تھی۔ چائے کے کپ ہاتھ میں لینے کے بعد نقاش نے بات کا آغاز کیا۔

''دیکھو میں جانتا ہوں تم شریف آدمی ہو مگر آج کل شریف آدمیوں کی دال گلی ہوئی ہے۔ میں نے بھی دھکے کھائے ہیں تیری طرح۔ شاید کئی دن اور دھکے کھاتا رہتا اگر مجھے ناصر بھائی نہ ملتے۔ کیا شاندار دماغ ہے ان کے پاس یقین مان ان کے ساتھ رہ کر میں ہر ماہ کا لاکھ کماتا ہوں۔ کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ —'' وہ حیران ہوا۔

''ایک لاکھ — مگر کیسے؟''

''ہم بڑے کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ گاڑیاں بائیکس چھینتے ہیں، بنگلوں میں گھس جاتے ہیں۔ ایک مہینے میں دو وارداتیں بھی کریں تو آسانی سے ایک لاکھ بن جاتا ہے۔'' وہ ساکت رہ گیا۔ اسے خبر تھی کہ حق چھینے سے ملتا ہے مگر نقاش اس سے بھی اوپر کی چیز تھا۔

''مگر یار! اس میں تو خطرہ ہے جان جانے کا اور پکڑے جانے کا۔''

''میری جان، خطرے کے بغیر کوئی کھیل نہیں کھیلا جاتا۔ ویسے بھی زیادہ تر ہمارے جیسے لوگ اس لیے پکڑے جاتے ہیں کہ پولیس کو مخبری ہو جاتی ہے یا کوئی ساتھی غداری کر جاتا ہے لیکن مزے کی بات سن۔ ناصر بھائی خود پولیس میں ہیں۔ پہلے ہم صرف دو تھے مگر اب ہر واردات میں وہ ایک ایسا بندہ ضرور رکھتے ہیں جو اپنے کام میں ماہر ہو۔ جیسے پچھلی مرتبہ ہمارے ساتھ تجوریوں کا لاک توڑنے والا ایک ماہر تھا۔''

''تو ایسا ایک بندہ پکا پکا کیوں نہیں رکھ رہے؟''

''یہ ہمارے گروپ کی روایت ہے کہ ایک بندہ صرف ایک واردات میں ساتھ دیتا ہے۔ اب کی بار کھیل بڑا ہے اس لیے بھروسے کا آدمی درکار ہے۔ ہمیں ایک کمپیوٹر کے ماہر کی ضرورت ہے۔ تم ساتھ مل جاؤ تین چار کروڑ کا کھیل ہے۔ کامیاب رہے تو پچاس لاکھ تیرے، پچاس لاکھ میرے اور باقی ناصر بھائی کے۔ اگر منظور ہے تو بتا۔'' پچاس لاکھ کا سن کر عماد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اگر وہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر بھی لیتا تو شاید اتنے پیسے اکٹھے نہ کرسکتا۔

''مجھے سوچنے کے لیے وقت دو۔''

''ہاں، وقت ہی وقت ہے۔ ایک ماہ بعد یہ کام کرنا ہے اور یہ پکڑ پیسے۔'' اس نے جیب سے کوئی دس پندرہ ہزار نکال کر عماد کی جیب میں ٹھونس دیے۔ ''آرام سے سوچ۔ پیسوں کی پریشانی سے دور رہ لیکن بات باہر نہ جائے۔'' وہ اس کے لہجے میں چھپی دھمکی سمجھ گیا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد ڈھیروں سوچوں کو دماغ میں جگہ دے کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

کافی دنوں بعد گھر میں گوشت کی خوشبو پھیلی تو وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ حرا اور حنا بھی شاید اس مہک کو حالات بدل جانے کی نوید سمجھ رہی تھیں اس لیے ان کے چہرے پر چھائی مایوسی کے بادل چھٹنے لگے تھے۔ اپنے گھر میں پیسوں کی مدد سے پھیلی یہ خوشی عماد کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ نقاش کا بتایا گیا راستہ آسان نہ تھا مگر ان مشکل حالات میں وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے شہناز کو یہی بتایا تھا کہ وہ پارٹ ٹائم کچھ کام کر رہا ہے جس سے آمدنی ہوگی۔ تین دن سوچنے کے بعد اس نے ہامی بھر لی۔ نقاش خوش ہو گیا۔ اگلے دن ناصر اس سے اسی گھر میں ملنے آیا۔ وہ روایتی پولیس والوں جیسا ہی تھا۔ چہرے پر رعب کا نشان اور مجیب سی سختی پائی جاتی تھی مگر بات کرنے کا انداز نرم تھا۔ اس کی باتوں نے عماد کے اندر کا خوف تقریباً ختم کر دیا۔ اس

نے پوری پلاننگ اس کے سامنے رکھی۔

''شہر کے مین روڈ پر پرائیویٹ بینک کی مین برانچ ہے۔ یہ برانچ اس لیے زیادہ اہم ہے کہ یہاں کم از کم تین شوگر ملز کی پے منٹ جمع ہوتی ہے۔ مطلب کماد کے سیزن میں یہاں ہر ماہ تین سے پانچ کروڑ جمع ہوتے ہیں۔ رقم کے لحاظ سے یہاں سیکیورٹی بھی سخت ہے۔ شہر کی ایک ایجنسی سیکیورٹی فراہم کررہی ہے۔ ٹوٹل تین سیکیورٹی گارڈز بینک میں ہوتے ہیں۔ دو باہر اور ایک اندر۔ ان پر قابو پانا مشکل نہیں۔ اصل مسئلہ ہے اس ایجنسی کے سیکیورٹی کیمرے اور الارم سسٹم۔ انہوں نے باقاعدہ بینک کے ایک کمرے کو اپنا کمپیوٹر روم بنا رکھا ہے جہاں ایجنسی ہی کی ملازم ایک لڑکی کام کرتی ہے۔ میں نے اسے خرید لیا ہے۔'' ناصر نے فخریہ لہجے میں بتایا اور آواز دی۔ ''شیزا۔'' تھوڑی دیر بعد کمرے کے باہر موجود ایک ماڈرن لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس نے جینز کے اوپر اس سرد موسم میں ہلکی سی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کے جسم کی قیامت بمشکل قید نظر آتی تھی۔ عماد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے نقاش اور اس سے ہاتھ ملایا۔ جیسے ہی اس نے سیٹ سنبھالی، عماد نے پوچھا۔

''ناصر بھائی! میرا ایک سوال ہے۔ جب آپ کے پاس شیزا موجود ہے تو پھر مجھے ساتھ ملانے کی کیا ضرورت ہے؟ کام تو میرا بھی وہی ہے جو شیزا کرے گی۔'' ناصر اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

''یار! تمہیں ہمارے گروپ کی روایت بتائی تو ہوگی نقاش نے۔ ہمارے ساتھ ہر مرتبہ اپنے کام کا ماہر بندہ ضرور ہوتا ہے اور رہی بات شیزا کی تو وہ صرف تمہاری مدد کرے گی۔ اصل کام تو تم ہی کرو گے یعنی پورے سیکیورٹی سسٹم کو ناکارہ بنانا۔ اگر شیزا یہ کام کرتی ہے تو ظاہر ہے پولیس والے سب سے پہلے اسی پر ہاتھ ڈالیں گے۔ اس نے کون سا ہمارے ساتھ فرار ہو جانا ہے۔ اس لیے یہ تمہاری مدد کرے گی۔ تم لوگ ساری ریکارڈنگ غائب کرو گے اور الارم سسٹم ناکارہ بناؤ گے۔ باقی سیکیورٹی گارڈز کے لیے میرے پاس ایک پلان ہے۔'' اس کی بات مکمل کرنے سے پہلے نقاش بول پڑا۔

''مگر بھائی! ہم نقاب پہن کر جائیں گے پھر سیکیورٹی کیمروں کا کیا مسئلہ؟''

''یار! یاد ہے پچھلی واردات میں تمہارا نقاب ایک شخص نے کھینچ لیا تھا؟ اس کے علاوہ دو تین وارداتوں میں چال ڈھال بھی ریکارڈ کی ہے ہماری سیکیورٹی کیمروں نے۔ سو یہ کام کرنا پڑے گا۔ شیزا تم بتاؤ تمہاری سیکیورٹی ایجنسی اپنے گارڈز کو کتنی تنخواہ دیتی ہے؟'' تفصیل بتانے کے بعد اس نے شیزا کی طرف اپنا چہرہ گھمایا۔

''زیادہ سے زیادہ بیس یا بائیس ہزار۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''ہوں..... مطلب انہیں آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔''

''بالکل..... باہر والے دونوں خریدے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ اس نوکری سے تنگ ہیں۔ ہاں جو اندر ہوتا ہے وہ ذرا ایماندار ٹائپ بندہ ہے۔ اسے خریدنا مشکل ہے۔'' شیزا کے پاس پوری معلومات تھی۔

''اس پر ہم قابو پالیں گے۔'' یہ گفتگو تقریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ انہوں نے پلان کی جزئیات پر غور کیا۔ دو گھنٹے بعد وہ اس وعدے پر الگ ہو گئے کہ وہ بیس دن تک اس پلان کی مکمل تیاری اور ریہرسل کریں گے۔

اگلے بیس دن شیزا، عماد، ناصر اور نقاش اس گھر میں اکٹھے ہو کر روزانہ ایک گھنٹا اپنے کام میں مصروف رہتے۔ اس دوران ناصر نے سیکیورٹی گارڈز کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ وہ پولیس والا تھا، اپنا کام نکلوانا خوب جانتا تھا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد آخر وہ دن آ پہنچا جس کی تیاری ہو رہی تھی۔

☆☆☆

منگل کے دن سردیوں کا سورج اپنی نرم دھوپ لیے چمک رہا تھا۔ پرائیویٹ بینک کی اس مین برانچ میں دوپہر کے کھانے کا وقفہ تھا۔ خلافِ معمول آج ایک سیکیورٹی گارڈ بھی گیٹ پر نہ تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ایک گارڈ کھانا لینے چلا گیا تھا جبکہ دوسرا واش روم میں تھا۔ ٹھیک انہی لمحات میں ایک سوزوکی بینک کے گیٹ پر آ کر رکی۔ اس میں سوار تین افراد نے چہروں پر نقاب چڑھا رکھے تھا اور ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے اندر بڑھے۔ بینک کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے گیٹ بند کر لیا۔ اندر موجود سیکیورٹی گارڈ نے مزاحمت کی کوشش کی مگر ناصر کی چلائی گئی گولی اس کی گردن میں سوراخ کر گئی۔ وہ منیجر کے آفس کی جانب بڑھا۔ جبکہ نقاش کیشیئر کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ عماد بھاگتا ہوا کمپیوٹر روم کی طرف بڑھا۔ شیزا کے ساتھ ایک اور شخص بیٹھا تھا جس کے سر پر بھی اس نے پسٹل کے دستے کا وار کر کے بے ہوش کر دیا۔ کچھ دیر بعد شیزا اور اس نے تمام سیکیورٹی کیمرے اور الارم ناکارہ بنا دیے تھے بلکہ ان کی ریکارڈنگ بھی غائب کر دی گئی تھی۔ عماد نے شیزا کے

سر پر وار کیا۔ وہ بھی بے ہوش ہو کر کرسی پر جھول گئی۔ ٹھیک دس منٹ بعد جب تینوں ڈاکو کامیاب ڈکیتی کے بعد باہر نکل رہے تھے تو ان میں سے ایک کے شکنجے میں منیجر کی گردن تھی اور پسٹل کی نال اس کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ سیکیورٹی گارڈز نے انہیں دیکھتے ہی ہتھیار نیچے گرا دیے۔ عماد کے ہاتھ میں پیسوں سے بھرا بیگ تھا جبکہ ایک ایسا ہی بیگ نقاش کے ہاتھ میں بھی تھا۔ تینوں ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے باہر نکلے۔ منیجر کو گاڑی میں بٹھا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ ایک دو کلومیٹر آگے آنے کے بعد انہوں نے منیجر کو باہر دھکا دے دیا اور اپنی منزل کی طرف بڑھ گئے۔ گاڑی ظاہر ہے چوری کی تھی جسے شہر سے باہر آ کر ایک جنگل میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس سے آگے کا سفر تینوں نے الگ الگ طریقے سے کیا جبکہ پیسوں سے بھرے دونوں بیگز ناصر بھائی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

☆☆☆

بینک میں ہونے والی ڈکیتی کا معاملہ دو ہفتوں بعد ٹھنڈا پڑ گیا۔ ڈاکوؤں نے کوئی نشان نہ چھوڑا تھا البتہ تفتیشی آفیسر نے سیکیورٹی گارڈز پر شک کا اظہار کیا۔ کئی دن تک تفتیش کے بعد جب کچھ نہ اگلوایا جا سکا تو آخر یہ کیس بھی معما بن گیا اور کبھی نہ حل ہو سکا۔

ہفتے کی ایک سرد شام کو جب بارش نے موسم کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا تب سر پر چھتری تانے بارش سے بچتا ہوا عماد کرائے کے اس گھر میں اپنا حصہ لینے پہنچا جہاں وہ کئی دنوں سے ناصر اور نقاش سے مل رہا تھا۔ وہ دونوں اندر موجود تھے۔ انہوں نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ان کے ہاتھ میں بیئر کی بوتلیں تھیں۔ کامیابی کا جشن منانے کے ساتھ ساتھ دونوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ عماد کو بھی انہوں نے پینے کی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا۔

''اچھا عماد! تمہیں جلدی گھر جانا ہوگا۔ نقاش! ذرا اندر سے بیگ اٹھا لاؤ۔'' ناصر کے کہنے پر نقاش کمرے کی جانب بڑھ گیا اور وہ دوبارہ عماد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ٹوٹل دو کروڑ پچھتر لاکھ ہاتھ میں آئے ہیں۔ گارڈز کا حصہ پانچ لاکھ ان تک پہنچا دیا گیا ہے۔ پچیس شیزا کے اور پچاس تمہارے ہیں۔ باقی میرا اور نقاش کا اپنا حساب ہے۔'' عماد نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پسٹل کی نال اس کے سر سے آ ٹکرائی۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟'' اس نے حیرت سے ناصر اور نقاش کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔

''ہمارے گروپ کی روایت ہے کہ ہم ہر واردات میں اپنا ساتھی بدل لیتے ہیں۔ تجوریوں کے ماہر کی لاش سمندر میں ڈبوئی تھی اور اس سے پہلے ایک واردات میں گاڑیوں کا سامان چرانے والا ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی لاش اسی مکان کے صحن میں دفن ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ تمہاری لاش کا کیا کیا جائے؟ خیر ہم مشورہ کر لیں گے کیونکہ اس بار لاشیں دو ہوں گی۔ شیزا تو میرا خیال ہے ایک رات ہمیں داد عیش دے گی پھر سوچیں گے کیا کرنا ہے۔'' ناصر کی بات سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے رحم طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا مگر ناصر نے نقاش کو اشارہ کر دیا۔ ''دھائیں'' کی آواز کے ساتھ گولی چلی۔ عماد نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ اسے درد کا احساس نہ ہوا البتہ اس کے پیچھے موجود نقاش کے سر میں سوراخ ہو گیا اور فرش رنگین ہونے لگا۔ ناصر نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہاں ریوالور تھامے شیزا مسکرا رہی تھی۔

''تم ٹھیک ہو نا... عماد، سوری مجھے دیر ہو گئی۔''

''ہاں ہاں۔'' عماد مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور شیزا کے گلے لگ گیا۔ ''گریجویشن کے بعد تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی تھی۔'' ناصر حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''ہاں بس حالات نے یہاں پہنچا دیا ورنہ کہاں یہ خون خرابا اور کہاں میرے جیسی نازک لڑکی۔'' شیزا اپنی کلاس کے اس لڑکے سے بات کر رہی تھی جسے وہ سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس کے ریوالور کی اگلی گولی ناصر کا کندھا چیر گئی جو کھسک کر نقاش کا پسٹل اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''گندے بچے..... ایسی حرکت مت کرو۔'' عماد نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

''مجھے اندازہ تھا نقاش پلانگ کے ساتھ مجھ سے ٹکرایا ہے اور تم لوگ مجھے استعمال کرو گے۔ شکر ہے تم نے شیزا کو ساتھ ملایا تھا ورنہ میں تمہارے ہاتھوں مارا جاتا۔ اتفاق سے ہم کلاس فیلو ہیں اور شیزا میری گرل فرینڈ بھی رہی ہے کالج میں۔ مجھے اندازہ تھا تم لوگ دھوکا دو گے۔ اس لیے میں نے اسے ساتھ ملا لیا اور بازی پلٹ گئی۔'' شیزا کی چلائی گئی اگلی گولی نے ناصر کی کھوپڑی رنگین کر دی تھی۔

آسمان سے گرا

بابر نسیم

کہتے ہیں کہ نقل کے لیے عقل اور جرم کے لیے حوصلہ چاہیے ہوتا ہے... اگرچہ اس ڈکیتی کے لیے ان کا منصوبہ بہت صاف اور مضبوط تھا مگر کچھ عقل کی اور کچھ حوصلے کی کمی نے انہیں کامیابی کے دروازے سے ناکام لوٹا دیا... اور دامن کو الگ داغدار کر دیا۔ پھر وہ آسمان سے گرا... کھجور میں اٹکا کی عملی تفسیر بن کر رہ گئے۔

محنت سے جی چرانے مگر دولت مند بننے کے خواب دیکھنے والوں کا انجام.....

''پیٹر! اٹھ جاؤ۔ باہر برفباری ہو رہی ہے۔''

پیٹر نے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گیا۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا پھر وہ موسم کی پروا کیوں کرتا۔ وہ کوئی اسکول کا طالب علم بھی نہیں تھا کہ موسم کی خرابی کا بہانہ بنا کر چھٹی کر لیتا۔ بے روزگار ہونے میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ اس میں چھٹی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی روز وہ بھی.....

وہ اچانک اٹھ گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

ممکن ہے کہ وہ آج کا ہی دن ہو۔

پیٹر موبائل ہوم کے بڑے کمرے کی طرف گیا جہاں اس کا بھائی کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ ''یہ دیکھو، پیٹی! کتنا خوب صورت منظر ہے۔''

پیٹر دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً ہے.....'' سفید برف نے ان کے صحن میں رکھے ہوئے تمام بیئر کے ڈبوں اور پرانے ٹائروں کو ڈھانپ دیا تھا۔ اس وقت تک کم از کم ایک فٹ برف پڑ چکی تھی۔ ''کیا وقت ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''سات بج رہے ہیں۔ میں باتھ روم جانے کے لیے اٹھا تو دیکھا برف پڑ رہی تھی پھر میں نے تمہیں آواز دی۔ کیا آج ہمیں کام پر جانا چاہیے؟''

بڑے بھائی نے تدبر سے سر ہلا دیا۔ ''میرا یہی خیال ہے پالی۔ لباس تبدیل کرلو۔ ہم امیر ہونے والے ہیں۔''

☆☆☆

''آج بچوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا؟'' سونی فونک نے پوچھا لیکن ڈیوڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ محض ایک جذباتی سوال ہے۔

''جب میں بچہ تھا۔'' سونی نے پرانے ٹرک کو گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''جب اسکول میں چھٹی ہوتی تھی تو ہم برف باری سے لطف اندوز ہوتے تھے لیکن آج کل کے بچے کمرا بند کیے پڑے رہتے ہیں۔ انہیں باہر نکل کر برف میں کھیلنا چاہیے۔''

ڈیوڈ اسے بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ برف میں نہیں کھیل سکتا کیونکہ اس کی ماں کے بوائے فرینڈ انکل سونی نے فون کر کے اسے اپنے ساتھ برف صاف کرنے کے لیے بلا لیا تھا۔

''آج میرا الجبرا کا ٹیسٹ ہونے والا تھا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''اسی وجہ سے تمہارا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ آج کل کون خوشی سے ٹیسٹ دیتا ہے؟''

''میں نے رات دیر تک پڑھا تھا۔ اب مجھے دوبارہ تیاری کرنا ہوگی۔''

''تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ الجبرا پڑھنے کا کیا فائدہ ہے۔ میں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔'' اس نے دوبارہ گیئر بدلتے ہوئے کہا۔ ''لعنت ہو اس برف پر۔''

''ہم تیزی سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''اگر تم اپنے سامنے والی سڑک صاف کرلو۔''

''مجھے اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔ میں کسی عام شاہراہ پر سڑک صاف کرنے نہیں جا رہا جبکہ میں سڑک کی صفائی کے لیے ٹیکس ادا کرتا ہوں۔''

جہاں تک ڈیوڈ کے علم میں تھا، سونی نے سیلز ٹیکس کے سوا کبھی کوئی ٹیکس ادا نہیں کیا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ سیلز ٹیکس ادا کرنا اس کی مجبوری تھی لیکن یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ حساب میں محنت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے کسی اچھے کالج میں داخلہ مل جائے اور وہ اپنی خودغرض ماں اور سونی سے بہت دور چلا جائے۔

☆☆☆

یہ بات پیٹر کے ذہن میں گزشتہ موسم بہار میں آئی۔ وہ ایک سرد دن تھا۔ وہ اور پال اپنی کار سے اتر کر دفتر روزگار جا رہے تھے۔ اس نے باہر لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور بولا۔ ''ہم بالکل ڈاکو لگ رہے ہیں۔'' اور یہ بالکل سچ تھا۔ انہوں نے اپنا چہرہ ماسک سے ڈھانپا ہوا تھا اور گلے میں پڑے اسکارف نے ٹھوڑی کے نیچے کا حصہ چھپا رکھا تھا۔ دروازے پر ایک بڑے بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ ''اپنی اور ہماری حفاظت کے لیے اپنے ہیٹ اور ماسک اتار دیں۔''

انہیں ایک بار پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہاں پر موجود آفیسر نے بڑی شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ ابھی تک ان کی منفرد مہارت کے اعتبار سے کوئی جگہ تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ سن کر پیٹر نے پال کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر برون کاؤنٹی فرسٹ نیشنل بینک آ گیا۔

''ہم یہاں کیوں رک گئے پیٹی؟ کیا میری سے ملنے جا رہے ہیں؟''

''آج نہیں پالی۔ بہتر ہے کہ ہم اندر نہ جائیں۔''

''کیوں نہیں۔ کیا وہ ہمیں دیکھ کر ناراض ہوگی؟''

''نہیں، یہ بات نہیں۔'' وہ عمارت میں لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنے چہرے سردی کی وجہ سے ماسک سے ڈھانپ رکھے تھے۔ ''میں نہیں جانتا کہ بینک کے اندر کوئی یاد رکھے کہ ہم کیسے لگ رہے تھے۔''

پال منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ اگلی بار جب بہت زیادہ برفباری ہوگی تو ہم ایک بڑی کارروائی کر سکیں گے۔''

آفیسر کائیٹ کے لیے وہ ایک بُرا دن تھا۔ باہر ایک فٹ سے زیادہ برف پڑ چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی پرانی کار اس موسم میں ساتھ نہ دے سکے گی چنانچہ اس نے اپنے پڑوسی سے لفٹ مانگی۔ بدقسمتی سے اسے اپنی بیوی کو کام پر

چھوڑنا اور بچوں کو دوست کے گھر سے لینا تھا۔ اس لیے کائیٹ کو کام پر پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارجنٹ شیفرڈ نے ایک پرانی خستہ حال پیٹرول کار اس کے حوالے کی اور کہا کہ وہ راستے میں برف ہٹانے کا کام خود کرے۔ وہ بمشکل تمام فیروویل پہنچا جہاں سے ایک بوڑھی عورت مسز کیسی نے شکایت کی تھی کہ کچھ بچے اس کے کھیتوں میں پھر رہے ہیں۔ وہ اسے کیا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ کیا انہوں نے وہاں کوئی برف کا آدمی بنایا؟ خوش قسمتی سے اس کے پاس کوئی جانور بھی نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے اس کی کوئی فصل خراب کی تھی۔

لیکن اس کے علاوہ ایک اور بات قابل غور تھی جو ڈسپیچر نے اسے یاد دلائی۔ مسز کیسی کی پراپرٹی مس لارگن کی اسٹیٹ سے ملی ہوئی تھی۔ وہ ایک کروڑپتی عورت تھی اور برون کاؤنٹی میں شفٹ ہوگئی تھی لیکن جب بھی وہ اور اس کا شوہر وہاں کا چکر لگاتے تو اپنی غیر موجودگی میں ہونے والے نقصان کی شکایت ضرور کرتے۔ مسز کیسی پہلے تو اس کے دیر سے آنے پر ناراض ہوئی پھر اسے ہال میں لے گئی اور بسکٹوں سے اس کی خاطر تواضع کی۔

''شاید وہ اب تک جا چکے ہوں۔'' مسز کیسی نے شکایتاً کہا۔ ''ان سب نے بڈ سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ کسی گینگ سے تعلق رکھتے ہوں۔''

اس نے تائید میں سر ہلایا اور کہا۔ ''وہ تعداد میں کتنے تھے؟''

''میں انہیں گننے کے لیے نہیں رکی۔ اس کے علاوہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے دیکھیں۔ خدا جانے وہ کیا کر گزرتے۔ اسی لیے میں نے تمہیں فون کر دیا۔ کیا تم اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کرو گے؟''

''وہ کس طرف جا رہے تھے؟''

''لارگن ہاؤس کی طرف۔ کیا تم کبھی ان سے ملے ہو؟ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھے پراپرٹی کا خیال رکھنے کا کہا ہے اور ہمیشہ میرے لیے تحفے لاتے ہیں۔''

آفیسر کائیٹ نے سوچا کہ آج کل چوکیدار کو کتنی تنخواہ ملتی ہوگی پھر اس نے بوڑھی عورت کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کام پر چل دیا۔

☆☆☆

''ان لوگوں نے تمہیں ڈرائیوے صاف کرنے کے کتنے پیسے دیے؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

سوئی نے زور سے ٹرک کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے بینکر نہیں ہو اور نہ ہی میں تمہاری ماں کو جواب دہ ہوں۔ لہٰذا اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے پرس میں کتنے پیسے ہیں۔''

''بہتر جناب۔''

''ہماری فہرست میں اگلا مکان کون سا ہے؟''

''ایلس لین پر پائپرز اور فیروویل میں گیرزوف۔''

سوئی اپنے پیلے دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''فیروویل والوں کے پاس بہت پیسا ہے۔ ہم ان سے منہ مانگا معاوضہ وصول کر سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تم انہیں پہلے ہی اپنا معاوضہ بتا چکے ہو۔''

''چپ ہو جاؤ۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔''

آفیسر کائیٹ کبھی بھی ایک اچھا کھوجی نہیں رہا اس کے باوجود وہ بتا سکتا تھا کہ وہ گینگ دو افراد پر مشتمل تھا۔ ان کے قدموں کے نشان جنگل سے اس کے کھیتوں میں مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے باڑھ پار کی اور دوسری طرف جا نکلے۔ ان میں سے ایک برفانی آدمی بنانے کے لیے رک گیا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھے اور صرف برف باری سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر نکلے تھے۔

مسز کیسی اپنی کھڑکی سے اس کی نقل و حرکت دیکھ رہی تھی۔ آفیسر قدموں کے نشان دیکھتا ہوا لارگن کی پراپرٹی تک گیا۔ اس نے باڑھ پر سے چھلانگ لگائی اور دیکھا کہ وہ قدموں کے نشان سیدھے ایک ملحقہ مکان کی طرف جا رہے تھے۔ شاید وہ لڑکے جانتے تھے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ ایک ٹین کی چھت سے بنا ہوا جھونپڑی نما کمرا تھا جس میں باغبانی کا سامان رکھا جاتا تھا۔

آفیسر نے اپنا سروس ریوالور نکال لیا اور اس کمرے کی جانب بڑھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور قدموں کے نشان بتا رہے تھے کہ یہاں سے کوئی بھاری چیز لے جائی گئی ہے۔ اس نے محتاط انداز میں وہاں کا معائنہ کیا اور ریوالور واپس ہولسٹر میں رکھ کر اپنی کار کی جانب چل دیا۔ اس نے ریڈیو پر اطلاع دی کہ یہاں سے دو برف پر چلنے والی گاڑیاں چوری ہوگئی ہیں۔

پال کو برف گاڑی چلانے میں بہت مزہ آ رہا تھا۔ وہ بہت عرصے سے موقع کی تلاش میں تھا۔ جب وہ وہاں برف صاف کرنے لگے تو انہوں نے یہ برف گاڑیاں وہاں دیکھی تھیں۔ وہ تو اسی وقت اس پر سواری کرنا چاہ رہا تھا لیکن پیٹر نے اسے منع کر دیا کہ وہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے جب تک ان

کے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کافی برفباری نہ ہو جائے۔

انہوں نے اس کی تیاری شروع کر دی تھی۔ وہ ایک دوسرے قصبے میں پرانے کپڑوں کی دکان پر گئے اور وہاں سے کوٹ، دستانے، ہیٹ اور اسکارف خرید کر ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیے تاکہ کوئی ان کپڑوں کو پہچان کر نہ کہہ سکے کہ یہ ان دونوں بھائیوں کے ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے اس منصوبے کو قابلِ عمل بنانا چاہتے تھے تاکہ میری بھی حیران رہ جائے۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ اس کے بڑے بھائی کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔

برون کاؤنٹی نیشنل بینک کی برانچ میں ہمیشہ کی طرح خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میری سیور لیٹ اکثر سوچا کرتی کہ اردیل گینی کو تین کیشیئر رکھنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ آج کل زیادہ تر لوگ اے ٹی ایم استعمال کرتے ہیں لیکن سب سے جونیئر ہونے کی وجہ سے وہ یہ بات کسی سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

''یہ جگہ بالکل مردہ خانے کے مانند ہے۔'' ویلما نے کہا۔ وہ میری سے سینئر تھی اور بے خوف و خطر اپنی رائے کا اظہار کرتی تھی۔

''شاید سڑکیں صاف ہونے کے بعد یہاں لوگوں کی آمد و رفت بڑھ جائے۔'' میری نے کہا۔

کاؤنٹر کے آخر میں بیٹھے ٹیلر نے انہیں گھورا۔ وہ سینئر کیشیئر تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ اب اسے ریٹائر ہو جانا چاہیے کیونکہ کساد بازاری کی وجہ سے لوگوں نے بینکوں میں پیسا رکھنا چھوڑ دیا ہے اور اس کا الزام وہ غیر ذمے دار بینکرز کو دیتا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں شیشے کی دیوار کے پار بیٹھے ہوئے بینک منیجر اردیل گینی کی طرف اٹھ جاتیں جیسے وہ ہی اس صورتِ حال کا ذمے دار ہو۔

''آج مجھے بیماری کا بہانہ کر کے چھٹی کر لینی چاہیے تھی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہ مجھے دیکھنے آجاتا۔ ایسا وہ پہلے بھی کر چکا ہے۔''

''وہ یہ دیکھنے نہیں آیا تھا کہ تم واقعی بیمار ہو۔'' میری نے کہا۔ ''اسے تمہاری صحت کی فکر تھی۔ تمہاری عمر کا آدمی۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی مگر دیر ہو چکی تھی۔

ٹیلر نے اسے گھورا۔ ''میری عمر۔ وہ میری عمر کے بارے میں ایسی فضول باتیں کیوں کر رہا تھا؟''

''آرام سے۔۔۔'' ویلما نے کہا۔ ''وہ سن لے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہیں دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔''

بوڑھے ٹیلر کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا۔ ''میرا دل اب بھی جوان ہے۔''

''اچھا۔ تم نے اسے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟'' ویلما بناوٹی انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اب ہمیں پتا چلا کہ تم لوگوں سے ملنا کیوں نہیں پسند کرتے۔''

دروازہ کھلا اور دو کسٹمر اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو ڈھانپ رکھا تھا اور اپنے ماسک پر سے برف جھاڑ رہے تھے۔

میری چونک گئی۔ اس نے کبھی یہ کپڑے نہیں دیکھے تھے لیکن ان دونوں میں کوئی بات جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

''اوہ نہیں۔'' وہ بے اختیار بولی لیکن وہ یہاں پہنچ چکے تھے۔

''خبردار۔۔۔ کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔''

اردیل گینی اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر اس کی برانچ میں ڈاکا پڑا تو وہ کیا کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس بارے میں پالیسی کیا ہے اور ایک وفادار ملازم کے طور پر وہ اسے صحیح اور مناسب سمجھتا تھا یعنی ان بے وقوفوں کو رقم لوٹ کر جانے دو کیونکہ وہ بیمہ شدہ تھی۔ اس کے مقابلے میں مقدمے کے اخراجات کہیں زیادہ ہوتے اگر ڈاکوؤں میں سے کوئی مر جاتا۔

لیکن اسے میری کے بارے میں بھی سوچنا تھا۔ گو کہ اس نے اسے اپنے دفتر سے کافی فاصلے پر بٹھایا تھا لیکن جب وہ کسی کام کے لیے مڑتی یا کسی وجہ سے اسے جھکنا پڑتا تو گینی کے لیے اپنے دل کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ چھوٹے قد کا بھاری بھرکم اور میری سے عمر میں زیادہ تھا اور جانتا تھا کہ میری اس کی پہنچ سے باہر ہے۔

لیکن ایک سمجھدار آدمی بھی خیالی صورت بنا سکتا ہے۔ گینی کے لیے ہیرو بننے کا یہ ایک اچھا موقع تھا کہ وہ سب لوگوں بالخصوص میری کو ڈاکوؤں سے بچا لے۔

پال کو یاد نہیں تھا کہ کبھی اسے اتنا مزہ آیا ہو۔ برف گاڑی میں سوار ہو کر شہر کے وسط سے گزرنا ایک پُرلطف تجربہ تھا اور اب وہ بینک میں ڈاکا مارنے آئے تھے البتہ اسے یہ مایوسی ضرور ہوئی کہ انہیں سراہنے کے لیے بینک میں کوئی گاہک نہیں تھا۔ پیٹر نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ میری پر یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ اسے جانتے ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

وہ خوفزدہ اور برف کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ پال نے اسے آنکھ ماری لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اسی وقت بوڑھے کیشیئر نے اپنا سینہ پکڑا اور کراہنے لگا پھر وہ زمین پر گر گیا۔

''ٹیلر!'' میری چلائی۔ وہ ٹیلر کی طرف جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھی۔

''سب لوگ اپنی جگہ پر رہیں۔'' پیٹر چلایا۔

''جہنم میں جاؤ۔'' میری نے کہا اور آہستہ سے کیشیئر کو سیدھا کیا۔ گینی بھی کمرے سے باہر آ گیا اور بولا۔

''وہ ٹھیک تو ہے؟''

''ہاں، سانس لے رہا ہے۔''

پیٹر چلایا۔ ''میرے پاس گن ہے۔ دادی اماں! سب دراز یں خالی کر کے سارے نوٹ اس تھیلے میں ڈال دو۔'' اس نے ایک تکیے کا غلاف اسے پکڑا دیا۔

''میں تمہاری دادی جتنی بوڑھی نہیں ہوں۔'' ویلما نے کہا اور اس سے بیگ لے کر دراز یں خالی کرنے لگی۔

گینی نے جھکنا شروع کیا تو پیٹر بولا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میں اس آدمی کی دیکھ بھال میں سیوریلیٹ کی مدد کر رہا ہوں۔ تم نہیں چاہو گے کہ تمہارے ہاتھوں ایک قتل ہو جائے۔''

ٹیلر نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

ویلما بڑبڑائی۔ ''اور کیا چاہیے۔''

''مجھے سیف تک لے چلو..... جلدی۔'' پیٹر نے کہا۔

''وہ پیچھے ہے۔''

وہ اسے ایک چھوٹے کمرے میں لے گیا جہاں صرف لوہے کی ایک الماری رکھی تھی۔

''یہ چھوٹی سی برانچ ہے۔ ہمارے پاس زیادہ کیش نہیں ہوتا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''سیف ڈیپازٹ لاکرز کہاں ہیں؟''

''دوسرے کمرے میں لیکن میں کسٹمر کی چابی کے بغیر انہیں نہیں کھول سکتا۔''

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے موٹے۔''

گینی خاموش رہا۔ پیٹر نے اسے دوسرا تھیلا دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے بھی بھر دو۔''

☆☆☆

''تم نے اسے لوٹ لیا۔'' ڈیوڈ نے ٹرک میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

سونی آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔ ''کیا کہا؟''

''تم نے مسز گیرزوف سے مسٹر بوڈیل کے مقابلے میں دگنا معاوضہ لیا جبکہ اس کا ڈرائیو وے بوڈیل سے آدھا ہے۔''

''اس کے پاس بوڈیل سے کہیں زیادہ پیسا ہے۔''

''تم واقعی بہت موقع پرست ہو۔''

''تمہیں اسکول میں یہی بکواس پڑھائی جاتی ہے۔''

''وہ مجھے یہ نہیں پڑھاتے کہ کسی گاہک سے دوسرے کے مقابلے میں چار سو فیصد زیادہ معاوضہ لیا جائے۔''

''سو فیصد..... ہا ہا ہا۔'' سونی بناوٹی ہنسی ہنسا۔ ''یہ اندازہ تم نے اپنے الجبرا سے لگایا؟''

''اس کے لیے کسی لمبے چوڑے حساب کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

☆☆☆

''کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟'' ویلما نے پال سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' پال نے کہا۔

''بینک لوٹنے والوں کو ہمیشہ جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ اس لیے میں حیران ہوں کہ تم نے اس بارے میں کیوں نہیں سوچا۔''

''میں جیل نہیں جاؤں گا۔'' وہ اس پر گن سیدھی کرتے ہوئے بولا۔

''شاید ایسا نہ ہو لیکن تقریباً اسی فیصد ڈاکو جیل جاتے ہیں۔''

''ہم باقی بیس فیصد میں سے ہیں۔'' پال فخریہ انداز میں بولا۔

''باقی بیس فیصد پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں۔ اب یہ تمہارے اوپر منحصر ہے کہ کس راستے کا انتخاب کرتے ہو۔''

''ہش.....'' میری نے کہا۔ وہ ابھی تک ٹیلر کے پاس فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ''تم معاملے کو اور خراب کر رہی ہو۔''

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ''پیٹر کہاں ہے؟'' وہ گینی کے ساتھ منیجر کے کمرے میں گیا تھا اور اس کی دراز میں گوند تلاش کر رہا تھا۔

وہ گینی کے ساتھ واپس آیا اور پال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے بیگ تیار ہیں؟''

''ہاں۔'' پال نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' پھر وہ بینک کے عملے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''دوستو! تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ دس منٹ تک باہر نکلنے یا پولیس کو بلانے کی کوشش نہ کرنا۔''

''پولیس کو فون کرو۔'' ان کے جانے کے بعد ویلما نے کہا۔

''جیسے ہی وہ اندر آئے تھے، میں نے الارم بجا دیا تھا۔'' گینی نے کہا۔ ''ٹیلر کیسا ہے؟''

میری کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ

جیسے ہی اس کے بے وقوف بھائی باہر نکلیں گے تو فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں گی لیکن اس نے صرف کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سنیں جیسے گھاس کاٹنے کی مشین چل رہی ہو۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ٹیلر نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''مس! تم نے میڈیکل کی ڈگری کہاں سے لی تھی؟''

''یہ پولیس والے کہاں رہ گئے؟'' ویلما بڑبڑائی۔

☆☆☆

پال کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ پوری رفتار سے برف گاڑی چلا رہا تھا۔ پیٹر نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بھی آج کی کارروائی سے مطمئن تھا۔ اس بوڑھے ٹیلر کے ڈرامے کے علاوہ سب کچھ ٹھیک رہا۔ اب ان کے پاس رقم سے بھرے ہوئے دو بیگ تھے اور اس سے پہلے کہ کوئی ان کا تعاقب کرتا، وہ اپنی منزل پر پہنچ سکتے تھے۔

''پولیس!'' پال چلایا۔

آگے سڑک بند تھی۔ پیٹر کو یقین نہیں آیا۔ اتنی جلدی پولیس فیروہل تک کیسے پہنچ سکتی ہے؟ یہ ضرور کسی دوسری طرف سے آئی ہوگی۔ پولیس کار سڑک پر اس طرح کھڑی ہوئی تھی کہ اس نے ان کا راستہ مکمل طور پر بلاک کر دیا تھا۔

''بائیں طرف مڑ جاؤ۔'' وہ چلایا۔ ''میرے پیچھے آؤ۔''

اس نے بائیں جانب موڑ کاٹا۔ پال اس کے پیچھے تھا لیکن وہ اپنے آپ کو ان دیکھے گڑھے میں گرنے سے نہ بچا سکے۔ آفیسر کائیٹ نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان برف گاڑی والوں سے یہ پوچھنے والا تھا کہ کیا وہ قدموں کے نشان تلاش کرنے میں اس کی کچھ مدد کر سکتے ہیں لیکن شاید وہ اس کی گاڑی دیکھ کر کسی وجہ سے خوفزدہ ہو گئے اور بروقت برف گاڑیاں نہ روک سکے۔ انہوں نے گھبراہٹ میں موڑ کاٹا اور گڑھے میں جا گرے۔ آفیسر کائیٹ جانتا تھا کہ یہ الزام بھی اسی کے سر آئے گا۔

وہ پیر پٹختا ہوا کار تک گیا اور ریڈیو پر اس واقعے کی اطلاع دی۔

''تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ اندرون شہر کیا واقعہ پیش آیا ہے؟'' سوپچ بورڈ آپریٹر سیلینا اس پر برس پڑی۔ وہ بیک وقت کئی لوگوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ کائیٹ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اسے نو گیارہ پر کوشش کرنی چاہیے، وہاں بھی ایک سیلینا تھی لیکن شاید وہ اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

پھر اسے خیال آیا کہ ... شاید ان دونوں کو ایمبولینس کی ضرورت ہو۔ وہ سڑک سے اتر کر اس گڑھے تک پہنچا لیکن وہ دونوں وہاں سے جا چکے تھے البتہ انہوں نے اپنی برف گاڑیاں وہیں چھوڑ دی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ خود بھی چوری ہونے والی برف گاڑیوں کی تلاش میں آیا تھا۔ یہ وہی گاڑیاں تھیں جو بہت ہی بری حالت میں گڑھے میں پڑی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان کا مالک انہیں اس حال میں دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔

اس نے ایک بار پھر سیلینا سے رابطہ کیا۔ ''میں فیروہل میں ہوں۔ یہاں ایک حادثہ ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں دو ڈرائیور...''

''معمولی باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔'' سیلینا نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''یہاں ایک بینک لوٹ لیا گیا ہے۔''

''بینک ڈکیتی... برون کاؤنٹی میں؟'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے اسے کیوں شک ہو رہا تھا کہ وہی دونوں مجرم تھے جو اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

گینی اپنے کمرے میں بیٹھا دانت پیس رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ اس کے بینک میں ڈکیتی ہوئی اور اس کے ایک ملازم کو دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میری کے سامنے ایک بے وقوف لگ رہا تھا۔ وہ کسی ایسے شخص کی کیوں عزت کرے گی جو گن پوائنٹ پر ایک ڈاکو کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا اور اب پولیس والے بینک میں یوں پھر رہے تھے جیسے وہی اس جگہ کے مالک ہوں۔

وہ کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا۔ ہیڈ آفس سے کہا گیا تھا کہ وہ سیکیورٹی والوں کے آنے سے پہلے اپنی رپورٹ تیار کرے۔ وہ تمام واقعات کو ترتیب وار لکھنے لگا۔ وہ اس پوائنٹ پر پہنچ کر رک گیا جب ڈاکوؤں کے سرغنہ نے اس کی دراز کھول کر یوں تلاشی لی جیسے گینی نے اسٹیشنری کے ساتھ نوٹوں کی گڈی بھی وہاں چھپا رکھی ہوں۔

اسی وقت میری دروازہ کھول کر اندر آئی۔ ''ایکسکیوزمی مسٹر گینی! پولیس ویلما سے پوچھ گچھ کر چکی ہے۔ اب وہ...''

''اندر آجاؤ۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''دروازہ بند کر دو۔''

میری کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر وہ یہی سمجھا کہ وہ ابھی تک دہشت میں مبتلا ہے۔

''میری! مجھے ابھی ایک بات یاد آئی۔ وہ ڈاکو جب میرے کمرے میں آیا تو اس نے میری میز کی دراز کھولی تھی۔''

''اچھا...'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"اس نے گن پکڑنے کے لیے اپنا دستانہ اتار دیا تھا۔ اس کی انگلیوں کے نشانات ضرور اس دراز پر ہوں گے۔ ان کی مدد سے پولیس انہیں پکڑ لے گی۔"

اسے رونا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

☆☆☆

"اوہ میرے خدا۔" پال نے کہا۔ "کیا وہ ہمارے پیچھے آرہا ہے؟"

پیٹر نے محتاط انداز میں درخت کی آڑ سے دیکھا۔ "میرا یہی خیال ہے۔ میں برف پر اس کے قدموں کے نشانات دیکھ رہا ہوں لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔ لگتا ہے کہ وہ منہ کے بل گر گیا ہے۔"

پال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پولیس والے کبھی نہیں گرتے۔ غالباً دور بیٹھا ہوا آرہا ہے تاکہ ہم اسے نہ دیکھ سکیں۔"

"چلو۔ اگر وہ جنگل کا رکھوالا ہے تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ وہ ان جنگلوں میں ہمیں تلاش نہیں کر سکتا۔ برف نے پورے علاقے کو ڈھک لیا ہے۔"

انہوں نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ پال نے کہا۔ "تم نے میری کا چہرہ دیکھا تھا؟"

"وہ بہت حیران ہوگی جب اسے پتا چلے گا کہ وہ ہم تھے۔"

"ہاں اور جب ہم اسے رقم سے بھرے ہوئے تھیلے دکھائیں گے تو وہ....."

پیٹر نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "وہ رقم تمہارے پاس ہی ہے نا؟"

☆☆☆

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" سونی نے پوچھا۔ "پولیس کار نے راستہ کیوں روک رکھا ہے؟"

"ممکن ہے کہ پولیس کسی برف گاڑی والے کی مدد کے لیے گئی ہو۔"

"کون سے گاڑی والے؟" سونی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

ڈیوڈ اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ان نشانات کو دیکھو جو برف گاڑی چلنے سے بنے ہیں اور سڑک سے نیچے جا رہے ہیں کیونکہ آگے کوئی ٹریک نہیں ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ گاڑیاں تباہ ہو گئی ہیں۔"

سونی ٹرک کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "تم آئن اسٹائن سے کم نہیں ہو۔ ممکن ہے کہ انہیں گڑھے سے نکالنا پڑے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ایسے لوگ بہت امیر

روزی دینے والا

حضرت حاتم ایک مرتبہ سفر پر جانے لگے تو اپنی بیوی سے بولے۔

"میں چار مہینے تک باہر رہوں گا، تمہارے واسطے کس قدر خرچہ مہیا کروں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "جس قدر آپ کو میری زندگی منظور ہے۔" حضرت حاتم نے فرمایا۔

"تمہاری زندگی میرے ہاتھ میں نہیں۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "میری روزی بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

زندگی

زندگی ایک ایسی خوبصورت تتلی ہے جو اپنے خوبصورت رنگین پر دکھا کر ہر انسان کو ورغلاتی ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے پھولوں سے لدی کیاری میں گم ہو جاتی ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

اَن پڑھ

جنگل میں گیدڑوں کے سردار کو کاغذ کا ٹکڑا ملا۔ اس نے تمام گیدڑوں کو جمع کیا اور بولا۔ "دوستو! یہ ہمارے گاؤں میں داخل ہونے کا پرمٹ ہے، اب تم سب بے دھڑک آجا سکتے ہو۔"

سب گیدڑ گاؤں میں داخل ہوئے تو راستے میں انہیں کتوں نے آلیا اور سب دم دبا کر بھاگ نکلے۔ ایک گیدڑ نے چلا کر کہا۔ "سردار! یہ پرمٹ انہیں کیوں نہیں دکھاتے ہو۔"

سردار بولا۔ "بھاگ لو بے وقوفو..... یہ سارے کتے ان پڑھ ہیں۔"

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا

زخمی

ایک شاعر کا تخلص زخمی تھا۔ وہ کسی کام سے اپنے دوست کے یہاں گیا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے؟"

شاعر صاحب نے کہا۔ "جی زخمی....."

اندر سے دوبارہ کہا گیا۔ "بھائی اسپتال آگے ہے۔"

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ہوتے ہیں۔"

☆☆☆

"تم مجھے سچ سچ بتاؤ۔" گیبی نے کہا۔ "کیا تم جانتی تھیں کہ تمہارے بھائی یہاں لوٹنے آرہے ہیں؟"

"بالکل نہیں اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ کوئی ایسی احمقانہ حرکت کرنے والے ہیں تو میں پہلے تمہیں بتاتی اور بعد میں انہیں روکنے کی کوشش کرتی۔"

"لیکن تم نے اس وقت انہیں کیوں شناخت نہیں کیا جب وہ بینک میں داخل ہوئے تھے؟"

"ان کے پاس ہتھیار تھے۔ اگر میں کچھ بولتی تو وہ ہم سب کو گولی مار دیتے۔"

"ٹھیک ہے میری۔ میں تمہاری بات کا یقین کرلیتا ہوں۔"

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "شکریہ لیکن کوئی اور یقین نہیں کرے گا۔ اگر وہ پکڑے گئے تو میں بھی جیل جاؤں گی۔"

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"پھر بھی میں نوکری سے تو نکال دی جاؤں گی۔"

"ایسا نہیں ہے۔" وہ کہتے کہتے رک گیا پھر اس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ "یہ دیکھو۔۔۔"

اس نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا اور جھک کر دراز صاف کرنے لگا۔ "تم نے دیکھا اب کوئی بھی کبھی۔۔۔"

وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور روتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم نے یہ سب میرے لیے کیا ہے۔"

کسی کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ پولیس انچارج کیپٹن ونگر دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔

"مسز گیبی! اگر تم چاہو تو اپنے اسٹاف کو گھر بھیج سکتے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ کافی پریشان ہیں۔"

"اوہ کیپٹن شکریہ۔ پھر بھی میں یہیں موجود رہوں گا۔"

اس کے جانے کے بعد اس نے میری کی طرف دیکھا جو ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میری۔۔۔"

اس نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "یس مسز گیبی؟"

"کیا تمہیں اوپیرا پسند ہے؟"

☆☆☆

"سنو۔" سونی نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری ماں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔"

ڈیوڈ نے پہلے بھی کسی کو اس سرد موسم میں پسینے میں شرابور نہیں دیکھا تھا۔ سونی اپنے ٹرک کے اسٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا تھا لیکن کافی بے چین لگ رہا تھا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میں اس کے لیے ایک بڑا تحفہ لینے والا ہوں۔"

اس نے بیگ کو اس طرح پکڑا جیسے وہ ٹرک سے کود کر ہوا میں اڑ جائے گا۔

"بہت خوب۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "کیا خریدنے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے سوچنے دو۔"

"غالباً کوئی کار؟"

"ہاں، وہ بھی ٹھیک رہے گی۔"

"یا ایک بڑے اسکرین کا ٹی وی۔۔۔ اسے شدت سے اس کی خواہش ہے۔"

"یقیناً۔"

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں سونی۔ یہ اس تحفے سے زیادہ اہم ہے جو تم میری ماں کے لیے خریدو گے۔"

"کہو، کیا بات ہے؟"

"یہ چوری کی رقم ہے اور تم جانتے ہو کہ ان لوگوں نے کوئی بینک ڈکیتی کی ہوگی یا کہیں اور ڈاکا ڈالا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ پولیس تمہیں پکڑ لے، یہ رقم واپس کردو۔"

سونی نے ونڈ شیلڈ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا بس اتنا معلوم ہے کہ مجھے کہیں سے یہ رقم ملی ہے۔"

"ہاں مگر کسی دوسرے کی برف گاڑی سے۔ جب جمی کارلو نے تمہارے ٹرک سے ایک چھ بیئر کا کارٹن اٹھایا تھا تو تم نے اس کی ناک توڑ دی تھی۔"

"وہ ایک الگ بات تھی۔" اس نے ڈیوڈ کو دیکھا۔

ڈیوڈ نے کہا۔ "اگر پولیس کو اس رقم کے بارے میں معلوم ہوگیا تو ہم مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ کیا تم جیل جانا چاہتے ہو؟"

"اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ رقم واپس کردی جائے۔"

"لیکن اگر یہ بینک سے لوٹی گئی ہے تو ہم بری طرح پھنس جائیں گے۔ شاید وہ لوگ تمہاری ماں کو بھی تنگ کریں۔"

ڈیوڈ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان کی برف گاڑیاں تباہ ہوگئیں اور وہ نوٹ کا مال چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے ان کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

سونی نے رقم کا تھیلا سیٹ کے پیچھے رکھا اور ٹرک کو گیئر میں ڈال دیا پھر اس نے برف ہٹانے کے اوزار نیچے کیے اور سڑک کی صفائی شروع کردی تاکہ وہ تیز رفتاری سے سفر کرسکے۔ ڈیوڈ اس سے کہنے والا تھا کہ اس طرح وہ اپنے پیچھے ایک واضح سراغ چھوڑے جارہا ہے کہ رقم کون لے گیا۔ پھر اس نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

آفیسر کاسیٹ نے ان برف گاڑی والوں کا پیچھا کرنے کی کوشش کی لیکن جنگل کے قریب پہنچ کر ان کے قدموں کے نشانات صاف ہوگئے۔ وہ مایوس ہوکر پلٹا اور لنگڑاتا ہوا اپنی کار تک آگیا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کسی نیک دل انسان نے قصبے کو جانے والی سڑک صاف کردی تھی۔ وہ کار میں بیٹھا اور ریڈیو آن کردیا۔

''تم کہاں تھے؟'' سیلیا اسے کاٹ کھانے کو دوڑی۔ ''ہر ایک کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ بینک میں ڈاکا ڈالنے والوں کو پکڑے۔''

''وہ ابھی تک نہیں پکڑے گئے؟ اس موسم میں وہ کتنی دور جاسکتے ہیں؟''

چند لمحوں بعد اس کے انچارج کیپٹن ونٹر کی آواز گونجی۔ ''وہ دونوں لڑکے برف گاڑی پر آئے تھے اور تم نے انہیں جانے دیا۔''

''میں نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے بینک ڈکیتی کی ہے اور نہ ہی میں نے اس کے بارے میں سنا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ انہوں نے صرف برف گاڑیاں چرائی ہیں۔''

''پھر تم نے ان کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟ تمہارے خیال میں ان گاڑیوں کی چوری کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟''

''میرے ٹائر کی چین ٹوٹ گئی تھی اور میں برف میں پھنسا رہا۔''

''تم پورے کیریئر کے دوران برف میں پھنسے رہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہورہی ہے کہ یہ فطری طور پر اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہا ہے۔ فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچو۔''

''سر! کیا مجھے برف گاڑیوں کے پاس نہیں رہنا چاہیے؟ شاید ہمیں کوئی ثبوت۔۔۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اس بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ایک فارنسک ٹیم روانہ ہوچکی ہے۔ تم واپس آجاؤ۔''

اس نے دل میں سوچا کہ وہ پہاڑیوں کی طرف ضرور جائے گا اگر وہاں تک پہنچ سکا۔

سونی کا خیال تھا کہ پہاڑی پر موجود پولیس آفیسر دو اور دو چار کی طرح یہ سوچ سکتا ہے کہ برف گاڑی سے رقم کس نے اٹھائی۔ چنانچہ اس نے اپنی گاڑی میونسپل پارکنگ لاٹ میں اس جگہ کھڑی کی جہاں اس نے اپنا پرانا ٹرک چھپا رکھا تھا۔

''میں اسے دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' سونی نے کہا۔ اس کی آواز جوش سے کپکپا رہی تھی۔ ''بیگ مجھے دو۔''

''تم چاہتے ہو کہ سب اسے دیکھ لیں؟''

''نہیں نہیں۔'' سونی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ رقم اس کے دماغ کو چڑھ گئی تھی۔ ''صرف ایک بنڈل دے دو۔''

ڈیوڈ نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک پولیس کار آرہی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ وہی ہے جسے ہم نے پہاڑی پر دیکھا تھا۔''

''دفع کرو۔'' سونی نے رقم پر ہاتھ پھیرنا بند کیا اور اس کی جانب پھینکتے ہوئے بولا۔

''اسے تھیلے میں ڈال دو۔''

ڈیوڈ نے ایسا ہی کیا لیکن پھر رک گیا۔ اگلے بنڈل میں کوئی فالتو چیز تھی جو نوٹوں کے درمیان ابھری ہوئی تھی۔ پولیس کار تقریباً ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''اٹکل سونی۔ اس میں کیا ہے؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

سونی نے ہاتھ بڑھا کر پچاس کے نوٹوں کا صاف بنڈل پکڑ لیا اور اسے زور زور سے جھٹکنے لگا۔ اس وقت پولیس کار ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ ڈیوڈ نے اپنا چہرہ کھڑکی کی جانب کرلیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جب ڈائی پیک پھٹے تو اس کی آنکھوں میں رنگ چلا جائے، وہ جانتا تھا کہ پیک والے ڈکیتی کو ناکام بنانے کے لیے اسے نوٹوں کے درمیان رکھ دیتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں اصلی نوٹ کی طرح لگتا ہے۔ یہ ڈائی پیک ایک مقررہ وقت کے بعد پھٹ جاتا ہے جس سے نہ صرف چرائی ہوئی رقم ضائع ہوجاتی ہے بلکہ ڈاکو کے جسم پر سرخ دھبے بھی پڑجاتے ہیں۔ ڈیوڈ نے آنے والے وقت کا تصور کرکے آنکھیں بند کرلیں اور ڈائی پیک کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔

شکستِ پا

اسما قادری

حاسد کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ کی
تقسیم پر راضی نہیں ہوتا... چاہے بظاہر کتنا ہی
متقی و پرہیزگار شخصیت کا روپ دھارے زندگی گزار
دے... وہ بھی تمام عمر اسی بے چینی کا شکار رہی...
اور یہ بھول گئی کہ قدرت بھی اپنے تماشے خوب دکھاتی ہے
اپنوں کے روپ میں دشمنوں کو گلے کا ہار بنا کر دور کھڑی
انسان کی بے خبری اور بے بسی پر مسکراتی ہے۔ جیسے
چودھری کا چولا پہنے قسمت اسے اپنی انگلیوں پر نچاتی رہی اور
اس کی نصف بہتر اپنے گھمنڈ میں مبتلا اپنے ہی خونی رشتوں کو
نفرت کے ڈنک مار مار کر احساسِ برتری میں گم رہی لیکن... محبت نے
جب کروٹ لی تو نفرت کو بہت حقارت کے ساتھ پیروں تلے روند ڈالا کہ
طاقت اور فتح تو ہمیشہ خلوص و پیار کے حصے میں لکھی جاتی رہی ہے چاہے
زمانہ کتنی ہی چالیں چلے اور یہ بات اسے بہت آخر میں سمجھ آئی تھی... گویا
دیر آید درست آید کے مصداق اسے اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا تھا۔

جلتے انگاروں پر چلنے والے چند مجبور و بے کس لوگوں کی آبلہ پائی کا انجام..... ایک اذیت بھری روداد

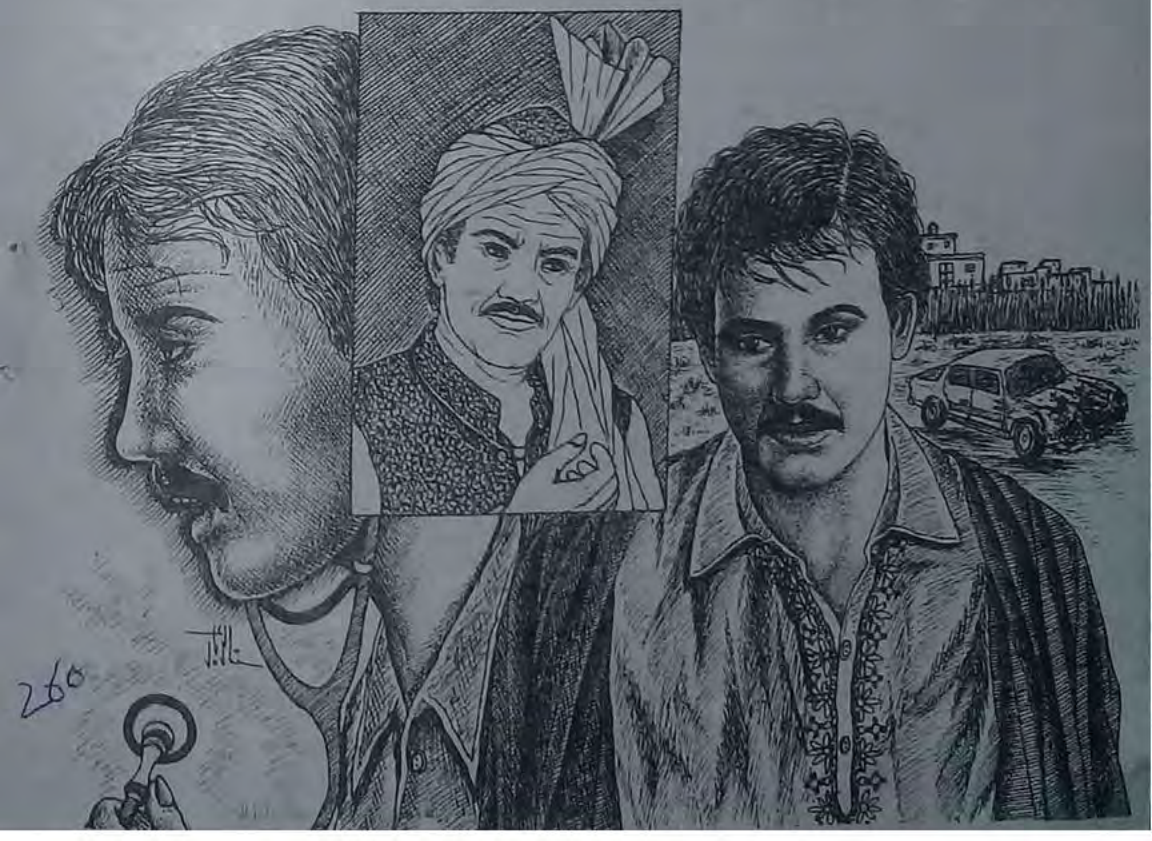

سروقامت دلداز جسامت والی مکھن ملائی سی سترہ سالہ بلقیس اپنے گھنے بھورے بالوں والی موٹی اور لمبی چوٹیوں کو حسب عادت دونوں ہاتھوں سے جھلتی وجھلاتی ہر طرف سے بے خبر لاابالی پن سے سیڑھیاں پھلانگتی کوٹھے سے نیچے آرہی تھی۔ برآمدے میں میز کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر براجمان اخبار بینی کرتے چودھری دلاور کی نظر اس کی طرف اٹھی تو اٹھی ہی رہ گئی اور ہر طرف سے بے خبر وہ اس کی موہنی صورت میں کھو سے گئے۔ ان کا یہ انداز ساتھ کی کرسی پر بیٹھی چودھرائن سے برداشت نہ ہوا تو پہلے دھیرے سی کھنکھاریں کہ شاید میاں کی محویت ٹوٹ جائے لیکن جب کوئی اثر نہ ہوتے دیکھا تو ماتھے پر بل پڑ گئے اور آنکھیں معمول سے زیادہ حلقوم سے باہر نکل آئیں۔

''اے بلو! تجھے کوئی کام نہیں ہے جو یوں بھری دوپہر میں کوٹھے پھلانگتی پھر رہی ہے۔ یہ لوٹھا کی لوٹھا ہوگئی ہے لیکن کڑیوں کی طرح رہنا نہیں آیا، جب دیکھو منڈوں کی طرح کدکڑے لگاتی پھرتی ہے۔'' چودھرائن کے الفاظ سے بھی زیادہ اس کا لہجہ سخت تھا۔ اپنے آپ میں مگن بلقیس ان کی آواز پر ٹھنک کر رکی تو پل بھر کے لیے کسی مجسمے کی ہی طرح سانس روکے ایستادہ ہوگئی لیکن پھر اس مجسمے نے بہت آہستہ سے سانس لی اور گھنیری پلکوں کو معصومیت سے جھپکتی اپنی مدھری آواز میں وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

''میں تو چھت پر کچی امبیاں پھیلانے گئی تھی۔ ماسی رحمتے نے یہ ڈھیر امبیاں نمک ہلدی لگا کر دی تھیں اور کہا تھا چھت پر چادر بچھا کر امبیوں کو دھوپ میں پھیلا دو، ان کا پانی سوکھ جائے گا تو اچار ڈالوں گی۔ امبیاں پھیلاتے پھیلاتے میں خود دھوپ میں جلنے والی ہوگئی اور آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں منڈوں کی طرح ایویں کوٹھے پھلانگتی پھر رہی ہوں۔'' امبیوں کی مقدار کا تعین کروانے کے لیے اس نے دونوں بازوؤں کو حتی الامکان پھیلا دیا تھا اور ہنوز بازو پھیلائے اپنی فطری بے ساختگی سے بولنا شروع ہوئی تھی تو بولتی چلی گئی تھی۔ چودھری دلاور اس کی اس بے ساختگی پر اپنے ہونٹوں پر بے ساختہ آجانے والی مسکراہٹ کو روک نہ سکے اور پہلے سے بھی زیادہ دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اس کی دودھیا رنگت دھوپ میں رہنے کے باعث قدرے سرخ ہو رہی تھی اور سرخ وسفید رخساروں پر ماتھے سے بہہ کر آٹھہرنے والی پسینے کی بوندیں گلاب پر شبنم کے مانند محسوس ہو رہی تھیں لیکن وہ بے خبر تھے کہ ان کی اس محویت ودلچسپی نے چودھرائن کی آنکھوں میں شعلے سے بھڑکا دیے ہیں اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان نظروں کی حدت سے کھڑے کھڑے ہی بلقیس کو بھسم کر ڈالیں۔

''گز بھر لمبی زبان چلانے میں مہارت ہے تمہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ یہ جو چار انگل کا دوپٹا رسی کی طرح گلے میں ڈال رکھا ہے اسے ہی ذرا ڈھنگ سے اوڑھ لو۔ جوان تو جوان بوڑھوں کی نظروں میں بھی حیا نہیں ہے آج کل۔ جہاں کوئی جوان کڑی دکھائی دی وہیں گھورنے بیٹھ جاتے ہیں۔'' اس بار انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تو جہاں بلقیس گھبرائی وہیں چودھری دلاور بھی سٹپٹا کر رہ گئے لیکن فوراً ہی انہوں نے خود کو سنبھال لیا اور نرم لہجے میں بلقیس سے بولے۔

''جا دھیے تو جا کر اپنا کام دھندا دیکھ۔ تیری مامی کا موڈ آج ٹھیک نہیں لگ رہا جب ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔'' بلقیس تو اجازت پاتے ہی وہاں سے ہوا ہوگئی لیکن چودھرائن کے ماتھے کے بل دور نہیں ہوئے اور چودھری دلاور کو گھورتے ہوئے بولی۔

''نظریں تمہاری بہک رہی تھیں جوان کڑی کو دیکھ کر اور الزام مجھ پر لگاتے ہو کہ میں بہکی بہکی باتیں کرتی ہوں۔''

''خدا کا خوف کر بھلیے لوگ! بلقیس اپنے قاسم کی عمر کی ہے اور میرے لیے دھی جیسی ہی ہے۔'' اس کا الزام سن کر چودھری کی رنگت تو ضرور غصے سے سرخ پڑی لیکن انہوں نے اپنے لہجے کو بگڑنے نہیں دیا اور دھیرے سے بیوی کو ٹوکا۔

''چودھریوں کا خون ہے میری رگوں میں اور رگ رگ سے واقف ہوں میں چودھریوں کی۔ مجھے سب خبر ہے کہ چودھری اپنے خون کے سوا نہ کسی کو دھی مانتے ہیں، نہ پتر تو پھر یہ بلقیس کہاں سے تمہاری دھی ہوگئی۔'' چودھرائن نے اس کی وضاحت کو ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں دی اور تمسخر اڑانے والے لہجے میں بولی۔

''بلقیس میرا اپنا خون ہے۔ بلقیس کی ماں میری چچیری بہن تھی اور بلقیس مجھے ماموں پکارتی ہے۔'' چودھری دلاور کے لہجے میں تو بے شک تپش تھی لیکن انہوں نے اپنی آواز کو بلند نہیں ہونے دیا تھا کہ مبادا ادھر ادھر کاموں میں مصروف ملازمین میں سے کسی کے کان میں بات پڑ جائے۔

''چچیری بہن نہیں سابقہ منگ بولو چودھری صاحب! اگر جو اس کی ماں تم سے بے وفائی کر کے ڈاکٹر سے جی نہ لگا لیتی تو پھر کہانی اور ہوتی پر کہانی تو الٹ گئی اور میں ڈرتی ہوں کہ یہاں کوئی نئی کہانی نہ شروع ہو جائے۔ میں نے ایک عرصے تمہیں اس کی سانولی سلونی ماں کے لیے آہیں بھرتے دیکھا ہے۔ یہ تو رج کر سوہنی ہے، اس پر تمہارا دل آ گیا تو میں

کدھر جاؤں گی۔'' چودھرائن کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ چودھری دلاور نے اس کے الفاظ سن کر اتنی سرخ نگاہوں سے اسے دیکھا کہ ایک پل کو چودھرائن بھی ڈر گئی کہ وہ غصے میں اسے تھپڑ ہی نہ دے مارے لیکن حسبِ معمول چودھری نے اپنے غصے کو ضبط کر لیا اور بھنچی بھنچی آواز میں بولے۔

''اگر مجھے قاسم کا خیال نہ ہوتا تو اس بے ہودگی پر تمہیں مزہ چکھا دیتا۔ یہ صرف قاسم ہے جس کی وجہ سے تم اس ساری بکواس کے باوجود بھی میری بیوی ہو۔'' اپنی بات کہہ کر وہ اپنی جگہ سے ایک جھٹکے سے اٹھے اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے دور ہوتے چلے گئے۔ پل بھر کے لیے گم صم ہو جانے والی چودھرائن نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی پشت پر نظر ڈالی اور زیرِ لب بڑبڑائی۔

''صرف قاسم کا ذکر کیا چودھری دلاور نے ان مربعوں کی بات نہیں کی جو تمہارے میرے رشتے کی بنیاد ہیں۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی لیکن زہر موجود رہا کہ وہ صرف ہونٹوں پر نہیں تھا بلکہ روح میں گھل گیا تھا اور اس کی رگ رگ میں دوڑتا پھرتا تھا۔

☆☆☆

چودھری دلاور اور اس کی بیوی سکینہ آپس میں کزن تھے۔ چودھری دلاور کی ماں، سکینہ کی پھپھی تھی۔ کسی زمانے میں دونوں خاندان ہم پلہ ہوتے تھے اسی لیے آپس میں رشتے ناتے طے پاجاتے تھے۔ چودھری دلاور کی ماں زہرہ بیاہ کر آئی تو شروع شروع میں تو حالات بہت اچھے رہے لیکن پھر زوال شروع ہو گیا۔ زوال کی وجہ دلاور کا چاچا چودھری نیاز تھا۔ وہ نوجوانی میں ہی بری صحبت میں پڑ گیا تھا اور بری صحبت کی ساری برائیاں اپنا چکا تھا۔ باپ کو اس کی حرکتوں کا علم ہوا تب تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا پھر بھی اس نے اپنے طور پر بند باندھنے کی کوشش کی اور اپنے سے کہیں نیچے کے خاندان کی لڑکی کو اس کی بیوی بنا کر لے آئے۔ بہت سوں کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ بیوی کے آنے سے چودھری نیاز کو لگام ڈل جائے گی۔ خود وہ بھی بیاہ کے بعد بیٹے کی کڑی نگرانی کر رہے تھے لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ چودھری نیاز کے بیاہ کے پانچویں مہینے ہی راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ باپ مر گیا تو پھر کون تھا جو اس اتھرے گھوڑے کو لگام ڈال سکتا۔ بیوی غریب کی ہمت ہی نہیں تھی کہ اس کے آگے کچھ بولتی اور بڑے بھائی چودھری فیاض کو وہ کسی خاطر میں ہی نہیں لاتا تھا۔ چودھری فیاض فطرتاً بھی ذرا سیدھا سادہ آدمی تھا چنانچہ چھوٹے بھائی کی بدتمیزی سے گھبرا کر جلد اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ اس کے اس ڈھیلے پن نے چودھری نیاز کو مزید شہ دی اور وہ خاندانی دولت کو اپنی عیاشیوں میں دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے بعد زمینوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا۔ نشے کی حالت میں اس نے سونا اگلنے والی زمینیں کوڑیوں کے بھاؤ بیچنا شروع کر دیں۔ چودھری فیاض اس کو پہلے پہل تو خود سمجھاتا رہا لیکن وہ کہاں اس کے قابو میں آنے والی چیز تھا۔ آخرکار چودھری فیاض نے خاندان کے بڑے بوڑھوں کو بٹھا کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ پنچایت بیٹھی تو چودھری نیاز صاف مکر گیا کہ زمینیں اس نے بیچی ہیں۔ اپنے ہر جرم سے انکاری وہ الٹا اس بات پر بضد ہو گیا کہ بچی کھچی زمینوں کو دونوں بھائیوں میں برابری سے تقسیم کر دیا جائے۔ ان کے ہاں زمین تقسیم کرنے کا رواج نہیں تھا لیکن سب جانتے تھے کہ شرعاً و قانوناً اس عمل کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ چودھری نیاز نے دھمکی بھی دے دی تھی کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو وہ عدالت سے رجوع کرے گا۔ اس موقع پر چودھری فیاض ایک بار پھر جھک گیا اور زمینوں کی تقسیم کے فیصلے پر راضی ہو گیا۔ زمینیں تقسیم ہو گئیں تو چودھری نیاز کی عیاشی کو مزید پر لگ گئے اور مختصر عرصے میں اس نے سب کچھ اجاڑ کر رکھ دیا۔ وہ اتنا بے حس تھا کہ اسے اپنی فرمانبردار بیوی اور معصوم بچی کا بھی خیال نہیں تھا۔ خیال تو دور کی بات الٹا اس کی بیوی کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہیں قلاش ہونے کے بعد وہ اس کا اور اس کی بیٹی کا ہی سودا نہ کر بیٹھے۔ یہ نوبت بھی شاید آ ہی جاتی لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک روز کسی طوائف کے کوٹھے پر وہ اپنے ہی جیسے ایک قماش بین سے الجھ پڑا۔ دونوں کے دماغوں پر ام الخبائث حاوی تھی اور دونوں ہی بے نتھے بیل کی طرح کسی کے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ اب یہ اتفاق تھا کہ چودھری نیاز کا داؤ چل گیا اور اس نے شراب کی ٹوٹی بوتل سے اپنے مقابل کے سر اور پیٹ پر ایسے مہلک وار کیے کہ وہ وہیں لمبا لیٹ گیا۔ نیاز کے موقع سے فرار ہونے سے قبل ہی پولیس وہاں پہنچ گئی اور وہ آلۂ قتل سمیت رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ مقدمہ چلا اور ایسے زوردار طریقے سے چلا کہ نیاز کی پیروی کرنے والے وکیل کو دانتوں پسینا آ گیا۔ اس کا سب سے اہم موقف یہ تھا کہ چودھری نیاز نے ذاتی دفاع میں قتل کیا۔ یہ جوش میں ہونے والا ایک جھگڑا تھا جس میں کسی بھی فریق کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور اتفاقاً چودھری نیاز کا مقابل مارا گیا لیکن وکیل اور نیاز دونوں کی بدقسمتی تھی کہ ان دلائل کے حق میں گواہ پیش نہیں کیے

جاسکے۔ مقتول کا تعلق بڑی پگڑی پارٹی سے تھا اور وہ لوگ ہر حال میں چودھری نیاز کو پھانسی کے پھندے پر جھولتا دیکھنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے پیسا پانی کی طرح بہا کر گواہوں کو توڑنے کے ساتھ ساتھ قانون کو بھی اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔ یہ ایسا موقع تھا کہ چودھری فیاض اپنے چھوٹے بھائی کے معاملات سے کسی طور لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے اپنی بھاوج اور ننھی بھتیجی سے بھی دلی ہمدردی تھی اس لیے بھائی کی جان بچانے کے لیے میدان میں اترنے کے ساتھ ساتھ حریفوں کے خلاف ان ہی کے حربے بھی استعمال کرنے پڑے۔ اسے بھی پیسا پانی کی طرح بہانا پڑا اور اس پیسے کے حصول کے لیے اپنی زمینیں بیچنی پڑیں کہ نیاز کے پلے تو کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔ اس کی اتنی دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیاز پھانسی چڑھنے سے بچ گیا اور عدالت نے اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنا ڈالی۔

چودہ سال کم نہیں ہوتے لیکن ایک آس تو بندھ گئی کہ چودھری نیاز ایک روز اپنے خاندان میں واپس لوٹ آئے گا۔ اس مقدمے نے اس کے کس بل بھی نکال دیے تھے اور اس نے ہاتھ جوڑ کر بڑے بھائی سے اپنی گستاخیوں اور زیادتیوں کے لیے معافی مانگی تھی۔ نرم دل چودھری فیاض کے لیے کیسے ممکن تھا کہ اپنے بھائی کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو نظرانداز کردیتا۔ اس نے نہ صرف اسے کھلے دل سے معاف کردیا بلکہ اپنی بھاوج اور بھتیجی کو بھی اپنے گھر لے آیا۔ بھتیجی کے لیے اس نے اعلان کردیا کہ وہ اس کے بیٹے چودھری دلاور کی دلہن بنے گی۔ نیاز کی بیٹی زینب تھی تو سانولی سلونی لیکن نقوش باپ کی طرح تیکھے اور خوبصورت تھے۔ دلاور کی ماں زہرہ کے دل میں اپنے دیور کے لیے رنجش تھی اور بے جا نہیں تھی کہ وہ جب سے بیاہ کر آئی تھی یہی دیکھ رہی تھی کہ دیور کی وجہ سے سب کچھ برباد ہوتا چلا جارہا ہے۔ ایسے شخص کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے کے خیال سے اسے الجھن بھی ہوتی تھی لیکن شوہر کے فیصلے کے خلاف آواز اس لیے نہیں اٹھاتی تھی کہ دل وجان سے اس سے محبت کرتی تھی اور یہ بات جانتی تھی کہ اس کا شوہر چودھری فیاض بڑی پیاری اور نرم طبیعت کا مالک تھا۔ وہ جب سے بیاہ کر آئی تھی اس نے اسے پھولوں کی طرح رکھا تھا اور کبھی بلند آواز یا تلخ لہجے میں بات نہ کی تھی۔ ایسا شخص اگر اپنے خونی رشتوں کی محبت میں دیوانہ تھا تو اسے بے وقوف نہیں فطرت وطبیعت سے مجبور سمجھنا چاہیے تھا۔ زہرہ نے بھی ایسا ہی کیا اور خاموشی سے دیورانی اور بھتیجی کی اپنے گھر میں موجودگی کو قبول کرلیا لیکن اس کی یہ خاموشی سسرال کی چاردیواری کی حد تک ہی تھی۔ عورتوں کی عمومی فطرت سے مغلوب وہ میکے والوں کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے باز نہیں رہ پاتی تھی اور صاف صاف کہتی تھی کہ اگر اسے چودھری فیاض کا خیال نہ ہوتا تو ہرگز بھی زینب کی نسبت اپنے بیٹے سے طے نہ ہونے دیتی۔

دلاور سے پانچ چھ سال بڑی سکینہ بھی ادھر ادھر کھیلتے کودتے اور چلتے پھرتے پھوپی کی یہ باتیں سنتی رہتی تھی اور پھوپی سے فطری محبت کے تحت اسے وہ لوگ برے لگنے لگے تھے جو اس کی پھوپی کے لیے باعثِ آزار بنے ہوئے تھے۔ بچپن کی یہ معمولی سی ناپسندیدگی آنے والے وقت میں کس انتہا کو پہنچنے والی تھی اس کی کسی کو خبر نہیں تھی اور وقت اپنی چالیں چلتا چلا جارہا تھا۔ اس وقت نے چودھری فیاض کو جو سب سے بڑا دکھ دیا وہ نیاز کی موت کا تھا۔ وہ قید کے دوران ہی نمونیہ کا شکار ہوا تھا اور مناسب علاج معالجہ نہ ہونے کے سبب زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ نیاز کی موت نے چودھری فیاض کو جیسے اندر سے توڑ دیا تھا جس بھائی کی زندگی بچانے کے لیے اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اسے پھانسی کے پھندے سے بچا لانے کے باوجود وہ اس کی زندگی نہیں بچا سکا تھا۔ بھائی چلا گیا تو اس کی توجہ اور محبت زینب کے لیے کچھ اور بھی بڑھ گئی اور وہ ہر وقت اس فکر میں مبتلا رہنے لگا کہ زینب کو اس کی یتیمی کا احساس نہ ہونے پائے۔ اس فکر میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب نیاز کی موت کے محض تین سال بعد اس کی بیوی بھی ایک روز حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث چپکے سے چل بسی۔ اس غریب نے شادی کے بعد کوئی سکھ نہیں دیکھا تھا اور موت کی آغوش میں سمانے کے بعد ہی غموں سے نجات پائی تھی۔ وہ گئی تو چودھری فیاض، زینب کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دینے کی فکر میں ایسے مبتلا ہوئے کہ بیوی اور بیٹے کو بھی ہر دم زینب کا خیال رکھنے کی نصیحتیں کرنے لگے۔ ان کا بیٹا چودھری دلاور ان ہی کی طرح نرم اور مہربان طبیعت کا مالک تھا سو ان کی نصیحت پر جی جان سے عمل کرتے ہوئے ہر پل زینب کا خیال رکھنے لگا۔ چودھرائن کا رویہ البتہ لاتعلقی والا تھا۔ وہ نہ تو زینب پر کوئی ظلم وستم کرتی تھی اور نہ ہی اس پر پیار ومحبت کے ڈونگرے برساتی تھی۔ اس کے خیال میں یہ کام باپ بیٹا پہلے ہی ضرورت سے زیادہ کررہے تھے اور جو چیز ضرورت سے زیادہ ہو وہ اپنا کوئی نہ کوئی تو منفی اثر دکھاتی ہی ہے۔

زینب کی طبیعت میں بھی اس بے جا لاڈ پیار نے خودسری پیدا کردی۔ منہ سے نکلی بات کو پورا کروانے کی ایسی

عادت پڑی کہ پھر "نہ" سننے کی عادت ہی نہ رہی۔ یہ اس کی بے جا ضد ہی تھی کہ میرٹ نہ بننے کے باوجود اس پر ڈاکٹر بننے کی ضد سوار ہوگئی اور چودھری فیاض کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس کی ضد ٹال دیں۔ سیلف فنانس پر زینب کا میڈیکل کالج میں داخلہ کروایا گیا۔ ہاسٹل میں رہنے، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے اخراجات الگ تھے۔ بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ چودھری دلاور کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا خواب پورا کرنا مشکل ہوگیا۔ بیٹا بھی اسی کی طرح ایثار پسند تھا باپ کی مجبوری دیکھ کر خود ہی پیچھے ہٹ گیا اور فیصلہ سنا دیا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے بجائے زمینداری میں باپ کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہے۔ بیٹے کے اس ایثار پر چودھری فیاض کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے لیکن اسے کوئی احساس نہیں ہوا جس کے لیے یہ سب ہوا تھا اور کیا گیا تھا۔ الٹا اس نے تمسخر اڑایا کہ زمینیں رہ ہی کتنی گئی ہیں جو دلاور کو تعلیم چھوڑ کر زمینداری کا شوق چرایا ہے۔ اس موقع پر کسی نے اسے نہیں جتایا کہ یہ سب تمہارے باپ کے کرموں کا ہی نتیجہ ہے۔ نہ ہی یہ حقیقت بتائی گئی کہ اس کی ضد پوری کرنے کے لیے دلاور نے یہ قربانی دی ہے۔ ان کے نزدیک وہ بس ایک معصوم اور ناسمجھ بچی تھی جس کی ہر فرمائش پوری کرنا دونوں باپ بیٹا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس وقت ان دونوں کو یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی کہ جسے ہر وقت یوں دیا جاتا رہے وہ لینے کو اپنا حق جاننے لگتا ہے اور نہیں سمجھ پاتا کہ خود اس پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ زینب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دلاور کی منگ ہے اور دلاور کی آنکھوں میں اس کی محبت کے دیے جلتے ہیں پھر بھی شہر کی چکا چوند میں سب کچھ بھلا بیٹھی۔ میڈیکل کے دوسرے ہی سال میں اس کو اپنا ایک سینئر کالج فیلو اتنا بھایا کہ سارے رشتے ناتوں کو بھلا کر اس سے شادی کر بیٹھی۔ دلاور کو وہ شام آج بھی یاد تھی جب نک سک سے تیار زینب نیاز نے ایک اجنبی مرد کے ساتھ حویلی کی چوکھٹ پر قدم رکھا تھا۔

☆☆☆

"یہ ڈاکٹر کمال ہیں تایا جی۔ یہ بھی اسی کالج میں پڑھے ہیں جہاں میں پڑھتی ہوں۔ بہت ذہین اور قابل ڈاکٹر ہیں اور سارے پروفیسرز اور ٹیچرز ان کی تعریف کرتے ہیں۔" زینب ایک اجنبی مرد کے ساتھ بدلے بدلے روپ میں حویلی آئی تھی تو ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔ کسی انہونی کے اندیشے سے لرزتا دلاور اس کے پیچھے خود کو چودھری فیاض کے کمرے میں جانے سے نہیں روک سکا تھا جہاں وہ بڑے اطمینان سے حیران و پریشان بیٹھے چودھری فیاض سے اپنے ساتھ آئے مرد کا تعارف کروانے میں مصروف تھی۔ اسے اپنے تایا کی اس حیرت کی بھی پروا نہیں تھی کہ اگر کمال بہت ذہین اور قابل ڈاکٹر تھا تو بھی اسے حویلی لانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ یہاں کوئی ایسا بیمار تو موجود نہیں تھا جسے کسی قابل اور لائق ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی۔

"کمال کے والد ایک بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ شہر میں بہت نام ہے ان کے خاندان کا۔ کمال کا رجحان میڈیکل کی طرف تھا اس لیے انہوں نے بزنس کی لائن نہیں پکڑی، فی الحال یہ ایک سرکاری اسپتال میں ہاؤس جاب کر رہے ہیں لیکن ان کا ذاتی اسپتال بھی زیر تعمیر ہے۔ ہاؤس جاب مکمل ہونے تک اسپتال کی تعمیر مکمل ہوجائے گی تو یہ اسے سنبھال لیں گے۔" زینب کی طرف سے تعریف و توصیف پر مبنی کمال کا تعارف کروانے کا سلسلہ جاری تھا۔

"ماشاء اللہ۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے اور مزید ترقی دے۔" سادہ مزاج چودھری فیاض اپنی جگہ الجھے ہوئے تو تھے لیکن مسلسل خاموشی بھی مناسب معلوم نہیں ہو رہی تھی اس لیے اور کچھ نہیں سوجھا تو سادگی سے ڈاکٹر کمال کو دعا ہی دے بیٹھے۔

"دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ میرے تایا جی بہت نائس انسان ہیں اور کبھی کسی کا برا نہیں چاہتے۔ مجھ سے تو اسپیشلی بہت محبت کرتے ہیں اور میری خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ دیکھو جب ہی تو تمہیں اتنے پیار سے دعائیں دے رہے ہیں۔" وہ چودھری فیاض کے دو جملوں پر ہی یوں خوشی سے چہک کر بولی جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ ادھر چودھری فیاض ناسمجھی کے عالم میں ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔ دلاور اپنی جگہ گم صم کھڑا تھا۔ جو کچھ سمجھ میں آرہا تھا اسے سمجھنے سے انکاری اندر ہی اندر ہراساں وہ اپنے اندازوں کو غلط قرار دے رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ زینب نے کمال کو اشارہ کیا ہے کہ اب وہ بات کو آگے بڑھائے۔ اس کا اشارہ پا کر کمال دھیرے سے کھنکھارا اور نرم لہجے میں بولا۔

"میرے والد مزاج کے بہت سخت ہیں اور اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ اولاد کو کھلا ڈ سونے کا نوالہ لیکن دیکھو شیر کی نظر سے اس لیے جب زینی مجھے آپ کے بارے میں بتا رہی تھی تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ آپ اتنی سوفٹ نیچر رکھتے ہوں گے۔ زمینداروں وغیرہ کا تو ویسے ہی ہمارے ہاں یہی تصور ہے نا کہ وہ بہت سخت مزاج اور انا پرست

ہوتے ہیں لیکن اب آپ سے مل کر مجھے یقین آ گیا ہے کہ زینی بالکل ٹھیک کہتی تھی۔'' وہ ان کی زینب کو اتنی بے تکلفی سے ''زینی'' پکار رہا تھا کہ چودھری فیاض اور دلاور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئے لیکن اسے ٹوک نہیں سکے کہ اتنی سمجھ تو رکھتے تھے کہ ڈاکٹر کمال کی اس بے تکلفی کے پیچھے زینب کی حوصلہ افزائی ہے ورنہ ایک غیر مرد کی کیسے جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے تایا اور منگیتر کے سامنے یوں اسے پکارتا لیکن طرزِ تخاطب سے بھی زیادہ غور طلب بات تو یہ تھی کہ ایک غیر مرد اس حویلی کی بیٹی کے ساتھ حویلی کی دہلیز سے گزر کر اندر آ گیا تھا اور اس وقت حقیقتاً اس آن بان والی حویلی کی بنیادیں کسی خوف کے تحت لرز رہی تھیں۔

چودھری فیاض نے برے حالات میں بہت کچھ بیچ ڈالا تھا اور عرصے سے چھوٹے زمین داروں میں شمار ہونے لگے تھے لیکن اپنے بزرگوں کی آن بان کی نشانی اس حویلی کو فروخت کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچ سکے تھے کہ یہ حویلی ان کے عہدِ گزشتہ کی شان و شوکت کی امین تھی۔ اپنے موجودہ حالات میں ان کے لیے اس اتنی بڑی حویلی کا نظم و نسق چلانا بھی آسان نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح یہ بار اٹھائے ہوئے تھے کہ اس حویلی میں رہ کر وہ اب بھی خود کو وہی چودھری فیاض محسوس کرتے تھے جس کی ماضی میں بڑی آن بان تھی اور جو اپنے باپ کے ساتھ زمینوں کے معائنے کے لیے نکلتا تھا تو صبح سے شام ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

''آپ کی نرم مزاجی اور معاملہ فہمی کو دیکھتے ہوئے میں بڑی امیدوں کے ساتھ آپ کے سامنے ایک درخواست پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔'' باپ بیٹے کی حالت و کیفیت سے بے خبر ڈاکٹر کمال اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھا۔ چودھری فیاض نے اس کی طرف ان نظروں سے دیکھا جیسے اسے آگے بات کرنے سے روک دینا چاہتے ہوں لیکن وہ ان سے نظر ملا کر بات ہی کہاں کر رہا تھا کہ ان کی نظروں کا پیغام وصول کر پاتا۔ وہ تو سر جھکائے اپنی ہی بولنے میں مصروف تھا۔

''بات یہ ہے تایا جی کہ میں اور زینی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی دعاؤں کے سائے تلے شرعی طور پر ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی بن جائیں اسی لیے میں خود زینی کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔'' وہ تو اپنی جگہ بہت قرینے سے اور دھیمے لہجے میں درخواست پیش کر رہا تھا لیکن حویلی کی بنیادوں میں تو دھماکے سے ہونے لگے تھے اور چودھری فیاض کو لگا تھا کہ حویلی کی چھت ان کے سر پر آ گری ہو۔ دلاور خود اپنی جگہ لرز کر رہ گیا تھا۔ سلونی رنگت اور تیکھے نقوش والی زینب کو تو اس نے ہمیشہ اپنا سمجھا تھا۔ اس کے حوالے سے اس کی آنکھوں میں کئی خواب سجے تھے۔ محبتوں کا ایک جہان تھا جو اس نے اپنے دل میں زینب کے لیے آباد کر رکھا تھا لیکن کبھی اظہار اس لیے نہیں کیا تھا کہ اس کے خیال میں ابھی اظہار کے لیے مناسب وقت نہیں تھا۔ اظہار کی جلدی بھی نہیں تھی کہ ایک اطمینان سا تھا کہ زینب اسی کی ہے اور وہ اپنے دل کی ہر بات اسی وقت اس کو بتائے گا جب وہ شرعاً اور قانوناً اس کی بنا دی جائے گی لیکن یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ جسے اپنی زینب سمجھتا تھا وہ نہ جانے کب اور کیسے کسی اور کی زینی بن گئی تھی اور وہ غیر شخص زینب کی عطا کی گئی جرأت کے سہارے اس کے باپ کے سامنے بیٹھا اس سے اس کے بیٹے کی منگ کو طلب کر رہا تھا۔ دلاور نے اس مطالبے پر ہراساں سا ہو کر اپنے باپ کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ اب ڈاکٹر کمال کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے مضطرب سی بیٹھی زینب تھی۔

''زینب.....!'' چند ثانیے کے وقفے کے بعد انہوں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں زینب کو پکارا تو زینب بہ مشکل ہی نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھ سکی۔

''تم نے ڈاکٹر کمال کو بتایا نہیں دھیے کہ تم دلاور کی بچپن کی منگ ہو اور یہ رشتہ تمہارے ماں پیو کی حیاتی میں ان کی رضامندی سے طے پایا تھا۔'' وہ درحقیقت زینب سے سوال نہیں کر رہے تھے بلکہ اسے جتا رہے تھے کہ دلاور کی منگ ہوتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کمال کو اپنا سوالی بنا کر حویلی لانے کی جرأت کیسے کی لیکن زینب نے اس روز ثابت کر دیا تھا کہ۔ بے شک اس کا چودھری دلاور سے خون کا رشتہ ہے لیکن بیٹی اسی سرکش و ضدی چودھری نیاز کی ہے جس نے ہمیشہ اپنی ہی بات منوائی اور کبھی کسی کے جذبات اور خاندان کی عزت کا پاس نہیں کیا۔ وہ چودھری دلاور کی بات کے جواب میں نہایت نخوت سے بولی۔

''معاف کیجیے گا تایا جی! میں بچپن کے اس رشتے کو نہیں مانتی جو آپ بزرگوں نے اپنی مرضی سے طے کر لیا تھا۔ کسی کی ناسمجھی کی عمر میں اسے کسی کے ساتھ منسوب کر دینا بڑا ظالمانہ عمل ہے۔ میں کوئی جاہل اور ان پڑھ لڑکی ہوتی تو شاید آپ کے اس فیصلے کے آگے سر جھکا دیتی لیکن ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی کی حیثیت سے میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔

شریعت اور قانون مجھے اس بات کا حق دیتے ہیں کہ میں اپنی پسند کا جیون ساتھی منتخب کر سکوں اور وہ میں نے کر لیا ہے۔ آپ خود بھی ایمانداری سے فیصلہ کریں تو جان لیں گے کہ ڈاکٹر کمال جیسے ذی حیثیت اور تعلیم یافتہ شخص کے مقابلے میں دلاور کا رشتہ قطعی موزوں نہیں ہے۔ آپ جو مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں کیا یہ چاہتے ہیں کہ میں کمال جیسے شخص کے ساتھ ایک اچھی اور پرتعیش زندگی گزارنے کے بجائے دلاور جیسے کم تعلیم یافتہ اور کم حیثیت شخص کے ساتھ روتی اور سسکتی ہوئی زندگی گزاروں۔ کیا یہی آپ کی محبت ہے تایا جی اور کیا میری جگہ آپ کی سگی بیٹی بھی ہوتی تو آپ اس کے لیے ایسا غیر منصفانہ فیصلہ کرتے۔'' اپنے حق میں دلائل دیتے دیتے وہ چودھری فیاض کی محبت کو کٹہرے میں گھسیٹ لائی تھی۔ صدمے سے چودھری فیاض کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی اور آنکھوں میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا لیکن زینب نے کچھ نہ دیکھا اور ان کے سامنے تن کر کھڑی رہی۔ اس کے یوں تن کر کھڑے ہونے پر چودھری فیاض کے شانے جھک گئے اور وہ نہایت پست آواز میں غمگین لہجے میں بولے۔

''تو خود کو پڑھی لکھی اور باشعور بولتی تو ہے دھیے لیکن آدمی کو کاغذ کے ٹکڑے اور سونے چاندی کے وزن میں تول کر تو نے ثابت کر دیا ہے کہ تجھے کچھ بھی عقل نہیں ہے۔ یہ دلاور جسے تو آج معمولی گردان رہی ہے سونے سے بھی تولو تو اس کا بھاؤ نہیں لگ سکتا کیونکہ آدمی کا اخلاق اور کردار دو ایسی چیزیں ہیں جو دنیا جہاں کی دولت لٹا کر بھی مول نہیں لیے جا سکتے لیکن تو ابھی ناتجربے کار ہے تو نہیں سمجھ سکے گی ان دو انمول اوصاف کی اہمیت کو۔ تجھے یہی لگے گا کہ جیسے ہر باپ کو اپنی اولاد سب سے پیاری لگتی ہے ویسے ہی میں بھی اپنے دلاور کی بے جا تعریف کر رہا ہوں۔ تیری تسلی کے لیے میں دلاور کی بات کو ایک طرف رکھتا ہوں تو بھول جا اس کے اور اپنے رشتے کو پر اپنی زندگی کا فیصلہ لینے میں بھی اتنی جلدی نہ کر۔ ابھی تیری تعلیم ادھوری ہے اسے مکمل کر پھر ذرا اطمینان سے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنا۔ اس وقت تک شاید تجھے اس بات کی بھی سمجھ آجائے کہ ہر چمکتی شے سونا نہیں ہوتی۔''

چودھری فیاض کوئی روایتی زمیندار ہوتے تو اس وقت حویلی کے در و دیوار ان کے طیش و غضب سے لرز رہے ہوتے لیکن انہوں نے اس نازک موقع پر بھی صبر و ضبط سے کام لیا تھا اور دعاؤں میں مجھے یہاں سے رخصت کرتے ہیں یا مجھے اور کمال کو عدالت کا راستہ دیکھنا ہوگا۔'' اس پر ان کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس کی اس درجے سرکشی نے چودھری فیاض جیسے نرم مزاج شخص کو بھی طیش دلا دیا اور وہ سرد اور سخت لہجے میں بولے۔

''اگر تیری یہی ضد ہے تو ٹھیک ہے میں تیرے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہوں لیکن یاد رکھنا کہ اس کے بعد تیرا اس حویلی سے ہر ناتا ٹوٹ جائے گا اور تجھے کبھی یہاں لوٹ کر آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ میں تجھے اپنا مرا ہوا منہ دیکھنے کی اجازت بھی نہ دوں گا۔''

''میں یہ سب نہیں چاہتی لیکن اگر کمال کو پانے کی یہی شرط ہے تو میں راضی ہوں۔'' وہ اتنی بے درد ہوگئی تھی کہ ان کڑی شرطوں کو بھی خاطر میں نہ لائی اور سپاٹ لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''مولوی عبدالخالق کو پیغام بھجوا دے دلاور! کہنا آج عصر کے بعد آ کر زینب کا ڈاکٹر کمال سے نکاح پڑھوا دیں۔ زینب اب اس حویلی میں ایک رات بھی اور نہیں گزار سکتی۔'' اس حویلی نے شاید پہلی بار چودھری فیاض کا یہ لہجہ سنا ہوگا۔ فیصلہ سنا کر انہوں نے وہاں موجود تینوں افراد کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا اور یہ بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کس پر ان کے فیصلے کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ دلاور فیصلہ سننے کے بعد ایک پل کے لیے وہاں نہیں رکا تھا اور اپنے خون ہوتے دل کے باوجود باپ کے حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کمال پر بھی اس اچانک فیصلے کے اثرات مرتب ہوئے تھے اور وہ یوں بار بار اپنے لبوں کو کھول رہا تھا... جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن بولنے کے لیے الفاظ سجھائی نہ دیتے ہوں۔ اس کے برعکس زینب کسی اضطراب کا شکار نہیں تھی اور اس کی آنکھوں سے اپنی بات منوا لینے کا غرور جھانک رہا تھا۔ یہی غرور کبھی اس کے باپ کی آنکھوں سے بھی جھانکا کرتا تھا اور حویلی کے در و دیوار گواہ تھے کہ یہ غرور ہمیشہ تباہی لایا تھا لیکن زینب یہ بات سمجھ سکتی تو کیسے ثابت ہوتا کہ وہ چودھری نیاز کی بیٹی ہے۔

☆☆☆

زینب ڈاکٹر کمال سے نکاح پڑھوا کر حویلی سے چلی گئی تھی اور یوں لگتا تھا کہ حویلی کے در و دیوار بھی اس کے

پریوں دیرانی نہیں چھاتی تھی کہ ایک امید، ایک آس ہوتی تھی کہ اسے پھر لوٹ کر یہاں آنا ہے۔ اب لوٹ کر آنے کی آس ہوتی تو کیونکر کہ جس شخص کو سب سے زیادہ اس کی واپسی کا انتظار ہوتا تھا اسی نے حویلی کے دروازے ہمیشہ کے لیے زینب پر بند کردیے تھے اور اس واقعے سے ہونے والے غم کو سینے سے لگائے اندر ہی اندر گھلتا رہتا تھا۔ زینب کے نکاح نامے پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کرنے والے دلاور کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ باپ بیٹے کی ان قلبی کیفیات نے حویلی کو اجاڑ سا کردیا تھا اور چودھرائن زہرہ بولائی بولائی سی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتی جب اور کچھ نہیں کر پاتی تھی تو زینب کو بددعائیں دینے لگ جاتی تھی جس نے احسان فراموشی کی انتہا کردی تھی اور اس کا اچھا بھلا ہنستا بستا گھر ویران کردیا تھا۔ شوہر اور بیٹا بس یہی دونوں تو اس کی زندگی کا مرکز تھے اور جب وہ خوش نہیں تھے تو وہ کیسے خوش رہ سکتی تھی۔ وہ رہ رہ کر آہیں بھرتی اور جب جب میکے جانا ہوتا خوب جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی۔

ایک طرف اسے شوہر سے شکوہ تھا کہ کیوں اپنے خبیث بھائی کی اولاد کو اتنا سر چڑھایا کہ وہ اپنی حیثیت ہی بھول گئی تو دوسری طرف بیٹے سے خفا رہتی تھی کہ کس لیے ایک بدکردار لڑکی کی بے وفائی پر آہیں بھرتا رہتا ہے اور خود کو روگ لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ زینب کا پسند کی شادی کرلینا اس کے نزدیک بدکرداری کے زمرے میں ہی آتا تھا۔ نوجوان سکینہ جو حسن و جمال میں یکتا تھی اپنی پھوپی کی اس ہرزہ سرائی کو سنتی تو دل ہی دل میں اسے زینب سے حسد محسوس ہوتا۔ وہ اتنی حسین ہوکر بھی پہاڑی جوانی کے شب و روز تنہا کاٹنے پر مجبور تھی کہ خاندان برادری میں اس کے جوڑ کا کوئی مرد تھا ہی نہیں اور باہر سے آنے والے رشتے اس کے سرپرستوں کی نظروں میں نہیں جچتے تھے اور سانولی سلونی سی زینب کی گڈی اتنی اونچی ہواؤں میں اڑ رہی تھی کہ ایک طرف تو شہر کے بڑے بزنس مین کا قابل بیٹا ساری رکاوٹیں عبور کرکے اسے بیاہ کر لے گیا تھا تو دوسری طرف چودھری دلاور اس کے عشق میں فنا ہوا جارہا تھا۔ اب یہ اس کی قسمت کا ہیر پھیر تھا کہ زینب کا عاشق اس کے نصیب میں لکھ دیا گیا اور وہ نکاح کے بندھن میں بندھ کر سارے حقوق حاصل کرلینے کے باوجود بھی اس بات کو نہیں بھلا پائی کہ چودھری دلاور کی پہلی محبت زینب تھی۔ اس کی اس سوچ کے پیچھے حالات کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ایک طرف وہ دلاور کی زینب سے محبت سے واقف تھی تو دوسری طرف اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ دلاور کے لیے اس کا رشتہ خود اس کے اپنے باپ نے اپنے منہ سے مانگا ہے۔ دلاور اس سے عمر میں چند برس چھوٹا تھا لیکن اچھے قد کاٹھ کی وجہ سے دونوں برابری کے ہی محسوس ہوتے تھے۔ ویسے بھی ان کے ہاں اتنے فرق کو معمولی گردانا جاتا تھا اور ایسی شادی بے جوڑ قرار نہیں دی جاتی تھی۔ سکینہ واقف تھی کہ ماضی میں اس کے خاندان کی عورتیں دودھ پیتے بچوں کے نکاح میں بھی دی گئی ہیں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے بوڑھوں سے بھی ان کا نصیب پھوٹا ہے اس لیے وہ اس اعتبار سے خوش قسمت ہی ہے کہ اس کے باپ نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا اور اس کی پھوپی زہرہ سے اپنی بیٹی کے لیے اس کا بیٹا مانگ لیا۔ رشتہ مانگتے ہوئے اس کے باپ نے ایک ہوشیاری یہ دکھائی تھی کہ پھوپی کو بتادیا تھا کہ وہ اپنی دھی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کرے گا اور جائداد میں سے جو اس کا شرعی حصہ بنتا ہے اسے اس کا نام لگادے گا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ ان کے ہاں بیٹیوں کو عالیشان جہیز بے شک دیا جاتا تھا لیکن جائدادیں ان کے نام نہیں لگائی جاتی تھیں۔ خود پھوپی زہرہ کو زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملا تھا لیکن سکینہ کو یہ سب ملنے والا تھا تو پھوپی نے شوہر اور بیٹے سے اس رشتے کے لیے ہاں کروانے میں اپنی ساری توانائی صرف کردی تھی۔ سکینہ تک اڑتی اڑتی یہ بات پہنچی تھی کہ دلاور ابھی شادی کے لیے راضی نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ اسے سنبھلنے کے لیے کچھ مہلت دے دی جائے لیکن اسے مہلت کے بجائے طعنہ دیا گیا کہ وہ اس عورت کے لیے اپنی زندگی برباد کررہا ہے جو اسے اس کی اوقات جتا کر ٹھوکر مار گئی ہے۔ سکینہ سے شادی کرکے کم از کم دلاور کی اوقات بدل سکتی تھی سو اسے اس شادی کے لیے ہامی بھرنا پڑی۔ شادی ہوگئی لیکن یہ اور بات تھی کہ دلہا اور دلہن دونوں کے دل اپنی اپنی جگہ بجھے رہے۔ ایک ابھی تک اپنی محبت کو کھودینے کے غم سے نہیں نکلا تھا تو دوسرے کو یہ دکھ تھا کہ اسے ایسے نامراد عاشق کو سونپ دیا گیا ہے جو اس کے حسن کو خراج ہی پیش نہیں کرسکتا۔

دلاور شریف النفس تھا لیکن اس سے یہ چوک بہرحال ہوگئی تھی کہ اس نے اپنی زبان سے سکینہ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرلیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے روپ میں ہمیشہ زینب کو ہی سوچتا رہا تھا اس لیے اسے سکینہ کے لیے جگہ بنانے کے لیے کچھ وقت لگے گا۔ اپنے طور پر وہ کچھ وقت کے بعد سنبھل بھی گیا تھا لیکن سکینہ کے دل میں زینب کے نام پر جو کانٹا گڑ... چکا تھا وہ ساری عمر نہ نکل سکا۔ اللہ کی طرف سے اولاد کی نعمت عطا کیے جانے میں بھی قدرے

تاخیر ہوگئی ورنہ وہ اولاد کی ڈور سے بندھ کر ہی ایک دوسرے سے قریب ہوجاتے۔ چودھرائن زہرہ اکلوتے بیٹے اور پیاری بھتیجی کی اولاد دیکھنے کی حسرت دل میں لیے، اپنی دعاؤں اور ٹوٹکوں ٹونکوں میں ناکام ایک روز معمولی سوکھی بخار میں ہی زندگی کی بازی ہار گئی اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ چودھرائن کے دسویں والے روز ہی سکینہ کو خوشخبری سننے کو ملی کہ وہ خیر سے دوسرے جی سے ہے۔ دلاور جیسے اپنے بیاہ پر بجھا بجھا تھا ویسے ہی اتنے انتظار کے بعد ملنے والی اس خوشخبری کو سن کر بھی بجھا بجھا ہی رہا کہ ابھی ماں کو مرے صرف دس دن ہوئے تھے اور ماں جیسے قیمتی رشتے کو کھو کر وہ اس لائق نہیں تھا کہ اس کی موت کے دسویں دن کسی خوشی کو پوری طرح محسوس کر پاتا۔ سکینہ اس نکتے کو سمجھنے سے بھی قاصر رہی تھی اور اس کے دل میں یہی خیال آیا تھا کہ جیسے دلاور کو مجھ سے دلچسپی نہیں ہے اسی طرح میرے بطن میں سانس لینے والا بچہ بھی اس کے لیے غیر اہم ہے۔

ایک طرف وہ حمل کی مدت جلتے کڑھتے گزارنے لگی تو دوسری طرف دلاور ماں کے بعد بالکل ہی ڈھے جانے والے باپ کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے پر مجبور ہوگیا اور سکینہ کے دل میں پنپتے منفی خیالات کو جاننے اور سمجھنے کی اسے مہلت ہی نہ مل سکی۔ مہلت تو اس بے چارے کو کسی بھی معاملے میں نہ مل سکی۔ ماں کو مرے پانچواں ہی مہینا تھا کہ باپ بھی راہی ملک عدم ہوا۔ آنسوؤں کو ضبط کرتا وہ باپ کے جنازے کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ زینب روتی بلکتی حویلی کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی اور فلک شگاف چیخوں کے ساتھ اپنے تایا جی کو پکارنے لگی۔ دلاور کو لگا کہ اسے کہیں سے چودھری فیاض کے مرنے کی خبر مل گئی تھی اور وہ پابندی کے باوجود خود کو یہاں آنے سے نہ روک سکی تھی۔ اسے اپنے باپ چودھری فیاض کے الفاظ اچھی طرح یاد تھے کہ انہی نے زینب کو اپنا مرا ہوا منہ بھی دکھانے کی ممانعت کردی تھی لیکن وہ زینب کی حالت دیکھ کر باپ کی وصیت پر عمل نہیں کرسکا اور وہ ان کی لاش سے لپٹ لپٹ کر روتی اور دہائیاں دیتی رہی۔ اس نے ان کے مردہ وجود سے معافیاں بھی مانگیں مگر اب یہ سب بے سود تھا کہ معافی دینے والے لب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے تھے۔

چودھری فیاض کا جنازہ اٹھ گیا۔ رسم قل بھی ادا ہوگئی اور پُرسے کے لیے آنے والوں کا ہجوم بھی چھٹ گیا لیکن زینب واپس شہر نہیں لوٹی۔ وہ اس کمرے میں ہی رہتی رہی جو شادی سے پہلے اس کے زیر استعمال تھا اور جسے اس کے جانے کے بعد بھی نہیں چھیڑا گیا تھا۔ اتنے بے شمار کمروں والی وسیع حویلی میں اس کے ایک کمرے کا کسی کو کرنا بھی کیا تھا جو کوئی اسے چھیڑتا یا پھر شاید یہ بات تھی کہ پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں کو اب بھی یہ موہوم سی آس تھی کہ کبھی نہ کبھی زینب واپس لوٹے گی اور واقعی زینب لوٹ آئی تھی اور اپنے کمرے کو ایک بار پھر آباد کرلیا تھا لیکن اس کی اس واپسی پر چودھرائن سکینہ کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے اور وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ ابھی دلاور اپنے باپ کی موت کے صدمے میں ڈوبا ہوا ہے روز اس بات پر اس سے جھگڑا کرتی تھی کہ زینب یہاں سے کب واپس جائے گی۔

دلاور اسے روز یہ بات سمجھاتا تھا کہ زینب حویلی میں مہمان ہے اور وہ اتنی بد اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرسکتا کہ مہمان سے اس کی واپسی کی بابت سوال کرے۔ سکینہ کو بھی اس نے سختی سے اس بات کی تاکید کردی تھی کہ وہ زینب سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرے گی۔ آخر تو اسے یہاں سے واپس جانا ہی تھا جب اس کا دل چاہے گا چلی جائے گی لیکن زینب کا وہاں قیام کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا تھا۔ چالیسواں ہوجانے کے بعد بھی وہ وہاں سے نہیں گئی تھی خود دلاور کا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ اس کا یہاں قیام اتنا طویل کیسے ہوگیا ہے۔ اس کا یہاں رہنے کا ڈھنگ بھی عجیب تھا۔ وہ سارا وقت اپنے کمرے میں ہی گھسی رہتی تھی اور ملازمائیں تینوں وقت کا کھانا اسے اس کے کمرے میں ہی پہنچا دیتی تھیں۔ کسی وقت اگر بھول چوک ہوجائے تب بھی وہ کمرے سے باہر نہیں آتی تھی۔ دلاور کو حویلی کی سب سے پرانی ملازمہ کی زبانی معلوم ہوا کہ زینب اپنے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں لے کر آئی ہے اور اپنے پرانے کپڑوں کو ہی ڈھیلا کر کے پہن رہی ہے۔ کپڑے ڈھیلے کر کے پہننے کی نوبت اس لیے آرہی تھی کہ خیر سے زینب بھی دوسرے جی سے تھی اور اس حالت میں اسے کنوارپنے کی نازک اور دبلی پتلی سی زینب کے کپڑے پورے نہیں آسکتے تھے۔ اس اطلاع کے بعد دلاور کو شدت سے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس گڑبڑ کا پتا لگانے کے لیے اس نے زینب سے ملاقات کا فیصلہ کیا اور اسے اس سلسلے میں پیغام بھجوادیا۔ زینب کی طرف سے اسے ملاقات کی اجازت دے دی گئی اور باپ کی میت والے دن کے بعد وہ پہلی بار زینب کے روبرو ہوا تو دیکھا اس نے اپنا سارا وجود ایک بڑی سی سفید چادر میں لپیٹ رکھا ہے۔ چادر پیشانی پر بھی یوں جھکی ہوئی تھی کہ دلاور بہ مشکل اس کی آنکھیں، ناک اور ہونٹوں کا کچھ حصہ دیکھ پایا۔ ایک نظر

ڈالنے کے بعد دوسری اس نے بھی نہیں ڈالی اور نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔ پرائی عورت کو غور سے دیکھنا اس کی شرافت کی توہین تھی۔ جو اس کی زینب تھی اسے اس کو نظر بھر کر دیکھنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا ایک ایک نقش اسے ازبر تھا اور جب دل چاہتا تھا آنکھیں بند کر کے دل میں جھانک لیتا تھا۔

''کیسی ہو زینب! یہاں تمہیں کسی شے کی کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟'' زینب نے سلام کے بعد اس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا چنانچہ اس نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

''تکلیف صرف ایک بات کی ہے دلاور کہ اب تایا جی اس حویلی میں نہیں ہیں۔ وہ ہوتے تو کوئی تکلیف، تکلیف نہیں رہتی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے ناراض تھے لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر میں تکلیف میں انہیں پکارتی تو وہ میری پکار کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اسی ایک مان کے تحت تو میں سیدھی یہاں آئی تھی لیکن میری قسمت نے ساتھ نہ دیا اور تایا جی میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی یہ دنیا چھوڑ گئے۔'' وہ بے شک رو نہیں رہی تھی لیکن اس کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا غم واندوہ تھا۔ اس کے الفاظ بھی اس امر کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ کسی مشکل میں گرفتار تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے غم اور پریشانی پر دلاور کا دل نہ تڑپتا۔ وہ فوراً ہی تڑپ کر بولا۔

''بے شک تم نے لوٹ کر آنے میں دیر کر دی زینب لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ابا جی نہیں ہیں تو یہاں کوئی تمہارا مان رکھنے اور تمہاری تکلیفوں کا احساس کرنے والا بھی موجود نہیں ہے۔ میں نے صرف ابا جی کی پگ اپنے سر پر نہیں رکھی ہے ان کا کردار و اخلاق بھی وراثت میں پایا ہے۔ تم اپنا ہر دکھ درد بالکل ویسے ہی میرے سامنے بیان کر سکتی ہو جیسے ابا جی کے سامنے۔ بس ایک بار کہہ کر تو دیکھو۔'' جواب میں وہ سر جھکائے کچھ پل اپنی انگلیوں کو مروڑتی رہی پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''مجھے معلوم ہے کہ میرا اس حویلی پر کوئی حق نہیں ہے پھر بھی میں یہاں رہنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گے دلاور؟''

''اجازت کی تمہیں کیا ضرورت ہے زینب اور تم یہ کیوں سمجھ رہی ہو کہ تمہیں یہاں رہنے کا حق نہیں ہے۔ تم پورے مان اور حق سے جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔'' دلاور کے ذہن میں بہت سے اندیشے اور سوال جنم لے رہے تھے لیکن کسی ایک کو بھی زبان پر لائے بغیر اس نے زینب کا مان رکھ لیا۔

''میں مرتے دم تک یہیں رہنا چاہتی ہوں دلاور بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں چاہوں یا نہ چاہوں اب میرے پاس اس حویلی کے سوا کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں ہے۔'' اس کی آواز بھرا سی گئی اور دلاور کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ تڑپ کر پوچھنے لگا۔

''تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے زینب۔ تم کیوں اتنی اجڑی ہوئی اور ویران دکھائی دے رہی ہو۔ تمہارا شوہر ڈاکٹر کمال کہاں ہے؟''

''کمال نے مجھے چھوڑ دیا ہے دلاور! اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' زینب کے لبوں سے ایک سسکی سی نکلی اور دلاور کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ کمال نے چھوڑ دیا ہے، کمال نے زینب کو چھوڑ دیا ہے لیکن کب اور کیوں؟ کیا بھلا کوئی زینب کو بھی چھوڑ سکتا ہے؟ سوالات تھے کہ اس کے دل و دماغ میں بھونچال پیدا کیے ہوئے تھے لیکن وہ ایسا دم بخود ہوا تھا کہ کسی سوال کو ہونٹوں پر لانے کی ہمت نہیں تھی۔ زینب خود ہی بولنے لگی۔

''جب میں نے تایا جی کے سامنے کمال کا رشتہ رکھا تھا تو انہوں نے مجھے کتنا سمجھایا تھا۔ مجھے میری ناتجربے کاری کا احساس دلا کر بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہر چمکتی ہوئی شے سونا نہیں ہوتی لیکن اس وقت میں کمال کی محبت کے نشے میں مبتلا کسی اور ہی زعم میں تھی اور انہیں جانے کیا کچھ کہہ گئی تھی۔ وقت نے بہت جلد مجھ پر ثابت کر دیا تھا کہ تایا جی درست اور میں غلط تھی۔ حویلی سے نکلنے کے بعد میں اور کمال شہر پہنچے تو کمال نے مجھ سے کہا میں ایسے ایک تنہا لڑکی کو بیوی کی حیثیت سے اپنے ماں باپ کے سامنے نہیں لے جا سکتا۔ وہ اس طرح کی شادی پر راضی نہیں ہوں گے اس لیے بہتر ہے کہ ہم دونوں تھوڑا صبر کریں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں کمال کے کرائے پر لیے گئے ایک دو کمروں کے فلیٹ میں رہنے لگی۔ کمال وہاں مجھ سے روزانہ ملنے تو آتا تھا لیکن مستقل ساتھ نہیں رہ سکتا تھا کہ اپنے والدین کو اپنے گھر سے غیاب کی کیا وجہ بتاتا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسپتال کی تعمیر مکمل ہونے اور چارج اپنے ہاتھ میں آنے تک کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا لیکن اس کی اتنی احتیاط بھی کام نہیں آئی اور اس کے والد کو ہماری شادی کا علم ہو گیا۔ انہوں نے فوری طور پر کمال کو گھر سے نکال دیا اور وہ ساری سہولیات بھی لے لیں جو انہوں نے اسے دی تھیں۔

کمال شروع سے لگژری لائف اسٹائل کا عادی تھا اور اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ قلیل آمدنی میں گزارہ کر پاتا۔ وہ جلد ہی چڑچڑے پن اور بدمزاجی کا مظاہرہ کرنے لگا اور مجھے الزام دینے لگا کہ اگر میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کر کے اسے اپنے تایا سے ملوانے نہ لے جاتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا ہے۔ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہوئے اس نے ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ اس کی وارفتگیاں اور بے قراریاں ہی تو تھیں جو میں اپنے کیریئر کے آغاز میں ہی شادی جیسی بڑی ذمے داری اپنے سر لینے کو تیار ہوگئی تھی۔ میں لاکھ بری سہی لیکن تایا جی کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ جوانی کے جوش میں ہم سے کوئی ایسی غلطی ہوجائے جو مجھے اپنی ہی نظر میں گرادے۔ میں نے اس کے اور اپنے درمیان قانونی اور شرعی رشتے کا مطالبہ کر کے کوئی غلطی نہیں کی تھی لیکن میرا یہ جائز مطالبہ ہی میرے لیے سزا بن گیا۔ میں یہ سوچ کر اس کی ایسی باتیں سنتی رہی کہ وہ ڈپریشن کا شکار ہے اور حالات ٹھیک ہوں گے تو وہ بھی ٹھیک ہوجائے گا۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنی والدہ کو منالینے میں کامیاب ہوگیا تو میری یہ سوچ ٹھیک ثابت ہوئی۔ اپنی والدہ کی طرف سے ملنے والی مالی سپورٹ نے اسے کافی سہارا دیا اور اس کا سوڈ ٹھیک رہنے لگا لیکن یہاں مجھے ایک بہت بڑی قربانی بھی دینی پڑی۔ مجھے میڈیکل کی تعلیم چھوڑنی پڑی کیونکہ کمال نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اتنی بھاری فیسیں اور اخراجات ادا کرسکے۔ اسی دوران میں پریگننٹ بھی ہوگئی تو میں نے بھی اس پر زور نہیں دیا۔ میرے پاس کوئی ملازمہ نہیں تھی اور ایسی حالت میں، میں گھر کی کل ذمے داریاں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ میڈیکل کی کٹھن تعلیم کو وقت نہیں دے سکتی تھی۔ میں ایک مکمل ہاؤس وائف بن گئی لیکن کمال وہ شوہر نہ بن سکا جس کی توجہ اور محبت کا مرکز صرف اور صرف اس کا گھر ہوتا ہے۔ اس کا اچھا پہننا اوڑھنا، کھانا پینا اور گھومنا پھرنا سب اپنی ماں کی سپورٹ کے سہارے ایک بار پھر جاری ہوگیا اور میں ایک محدود بجٹ میں چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے اور گزارہ کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کٹوتی کے مینڈک جیسی زندگی نے میری اس محبت کا نشہ اتار دیا جو میرے خیال میں مجھے کمال سے تھی اور یہ تلخ حقیقت میرے سامنے آئی کہ مجھے کمال سے محبت نہیں تھی بلکہ میں اس کی خوبصورت شخصیت، سحر انگیز گفتگو اور اسٹیٹس سے متاثر تھی اور شادی کے بعد چونکہ کمال سمیت مجھے کچھ بھی میسر نہیں آیا تھا اس لیے محبت بھی اڑنچھو ہوگئی تھی اور صرف سمجھوتا باقی رہ گیا تھا کہ واپسی کے دروازے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے بند کر کے آئی تھی۔ ان بیزار کن دنوں میں، میرے پاس اگر کچھ باقی رہ گیا تھا تو وہ یہ چھوٹی سی امید تھی کہ باپ بن جانے کے بعد کمال کے اندر تبدیلی آجائے گی اور وہ اپنے بچے کی خاطر مجھے اور گھر کو وقت دینے لگے گا لیکن میری قسمت کی خرابی کہ میرے ہاں مردہ بچہ پیدا ہوا اور اس صدمے کے باعث میں اتنی اپ سیٹ ہوئی کہ اپنے آپ سے بھی غافل ہوگئی۔ کمال اس مشکل وقت میں مجھے جذباتی سہارا دینے کے بجائے مجھ سے مزید دور چلا گیا اور پہلے سے بھی زیادہ گھر سے باہر وقت گزارنے لگا۔ نتیجتاً ہماری لڑائیاں ہونے لگیں۔ میں اس سے اس کی توجہ اور وقت کا مطالبہ کرتی اور وہ صاف کہہ دیتا کہ اسے مجھ جیسی ڈل اور اجاڑ صورت عورت کے ساتھ وقت گزارنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان حالات میں میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں خود کو سنبھالوں اور ایک بار پھر خود کو کمال کے لیے قابل توجہ بناؤں۔ میں نے اس سلسلے میں سر توڑ کوشش کی۔ کمال پر اس کے اثرات بھی مرتب ہوئے اور کافی حد تک ہمارے تعلقات بہتر ہونے لگے۔ اللہ نے ایک بار پھر مجھے خوشخبری سنائی لیکن ساتھ ہی میری طبیعت بہت زیادہ خراب رہنے لگی اور میں اس لائق نہیں رہی کہ خود پر توجہ دے سکوں۔ کمال نے ایک بار پھر گھر سے باہر رہنے کا دورانیہ بڑھا دیا اور اس حد تک اپنی بیرونی سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا کہ بعض اوقات اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ میرا آج ڈاکٹر کے ساتھ اپائنٹمنٹ ہے۔ حمل کے آٹھویں مہینے میں ایک روز میں چیک اپ کروا کر واپس آرہی تھی کہ مجھے زور کا چکر آگیا اور میں سیڑھیوں سے گر گئی۔ اس حادثے میں، میں نے اپنے بچے کو جو کھویا سو کھویا میری اپنی جان بھی بڑی مشکل سے بچ سکی۔ بہرحال میں ایک بار پھر کسی نہ کسی طرح لوٹ پوٹ کر تندرست ہوگئی اور زندگی کی وہی روٹین شروع ہوگئی۔ کمال کا رویہ وہی دھوپ چھاؤں جیسا تھا کبھی بہت مہربان تو کبھی بالکل اجنبی۔ ان ہی حالات میں مجھے اپنے تیسری بار امید سے ہونے کا علم ہوا۔ دو بار کے نقصان کے بعد میں بہت محتاط تھی اور کمال کی فکر میں گھلنے کے بجائے اپنے آپ کو توجہ دینی شروع کردی تھی۔ اس بار میں ہر حال میں بچہ حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ میری تنہائی کا مستقل حل نکل سکے اور کمال کے پیر میں بھی زنجیر پڑ جائے کیونکہ میں محسوس کر رہی تھی کہ کمال کے انداز میں ایک

تبدیلی سی آگئی ہے۔ گھر سے باہر رہنا تو چلو اس کا معمول تھا لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ بن ٹھن کر کہاں جاتا ہے۔ یہ معما بھی ایک دن حل ہوگیا۔ کمال نے خود ہی ساری بات کھول دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی ممی نے اسے آفر کی ہے کہ اگر وہ مجھے طلاق دے کر ان کی بھانجی سے شادی کے لیے ہامی بھرلے تو وہ اس کے ڈیڈی کو منالیں گی۔ اس کی وہ کزن جس سے اس کی ممی اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں، ذرا کم صورت لیکن بہت امیر تھی اور کمال ہی کی طرح ڈاکٹر بھی تھی لیکن کسی اور جگہ ملازمت کرنے والی نہیں بلکہ اپنے ذاتی اسپتال کی مالک تھی۔ میں نے یہ سنا تو پہلے تو گنگ ہوگئی اور کمال کو احساس دلانا چاہا کہ اگر اس نے اپنی ممی کی یہ پیشکش قبول کرلی تو میں کہاں جاؤں گی اور اس بچے کا کیا ہوگا جو چند ماہ بعد اس دنیا میں آنے والا ہے لیکن کمال فیصلہ کرچکا تھا اور مجھے صرف آگاہ کررہا تھا۔ اس نے صاف الفاظ میں مجھ سے کہہ دیا کہ تم سے شادی کرنا میری ایک جذباتی حماقت تھی اور اس حماقت کے نتیجے میں، میں اس لائف اسٹائل سے محروم ہوگیا ہوں جس کی مجھے بچپن سے عادت ہے۔ میں ساری زندگی اس محرومی کے ساتھ نہیں گزار سکتا چنانچہ چاہتا ہوں کہ جو ایک چانس مجھے مل رہا ہے میں اس سے فائدہ اٹھالوں۔ رہی بچے کی بات تو پہلے دو کون سے جی پائے جو اس کے بارے میں کوئی امید رکھی جائے۔ بہرحال تم ایسا کرنا کہ اپنے تایا جی کے پاس واپس لوٹ جانا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود تمہیں معاف کردیں گے۔ وہاں رہ کر تم بھی اس زندگی سے نجات پالوگی جو میرے ساتھ اس چھوٹے سے فلیٹ میں سسک سسک کر گزار رہی ہو۔ میں اس بات کی ذمے داری لیتا ہوں کہ اگر آنے والا بچہ زندہ رہا تو میں اس کے کل اخراجات اٹھاؤں گا اور تمہیں بچے کی پرورش کے سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اس کے بعد اس نے مجھے طلاق نامہ تھما دیا اور میرے پاس حویلی لوٹ کر آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تایا جی مجھ سے اتنے ناراض ہیں کہ مجھے معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں دیں گے اور یوں روٹھے روٹھے دنیا سے چلے جائیں گے۔'' وہ جو بغیر رکے قدرے غیر جذباتی انداز میں اپنے سارے حالات زندگی سناتی چلی گئی تھی، چودھری فیاض کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑی اور اس کے رونے پر ہمیشہ کی طرح دلاور نے اپنے دل میں تکلیف محسوس کی اس لیے بے ساختہ ہی بولا۔

''ایسا مت سوچو زینب! میں جانتا ہوں کہ ابا جی اپنے دل میں تمہیں معاف کرچکے تھے۔ اگر موت نے ان کو مہلت دی ہوتی تو تم خود دیکھ لیتیں کہ وہ تمہیں کیسے سب کچھ بھول بھال کر گلے لگا لیتے۔ وہ نہیں رہے یہ اللہ کی رضا ہے لیکن ان کے جانے سے تمہارا اس حویلی پر حق ختم نہیں ہوگیا۔ تم اب بھی پورے حق سے یہاں رہو اور جس چیز کی ضرورت محسوس کرو بلا جھجک بتا دو۔ میں خود بھی تمہاری خبر گیری کرتا رہوں گا۔''

''شکریہ دلاور! تم نے ثابت کردیا کہ تایا جی یوں ہی تمہاری تعریف نہیں کیا کرتے تھے۔ میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' اس کے لہجے میں ابھی تک نمی گھلی ہوئی تھی۔

''ایسی باتیں کرکے مجھے شرمندہ نہ کرو زینب۔'' دلاور نے فوراً اسے ٹوک دیا پھر گھڑی دیکھتا ہوا قدرے عجلت سے بولا۔

''فی الحال مجھے اجازت دو۔ مجھے ایک کام سے جانا ہے، دوبارہ پھر کبھی تمہاری خبر گیری کے لیے آؤں گا لیکن تم بھی اپنا خیال رکھا کرو اور یوں کمرے میں بند ہوکر بیٹھنے کے بجائے باہر نکل کر سب کے ساتھ ہنسا بولا کرو۔''

''میں عدت میں ہوں دلاور!'' اس کی نصیحت کے جواب میں زینب دھیرے سے بولی تو اسے دھچکا لگا اور سمجھ میں آگئی کہ وہ کیوں اس طرح بڑی سی چادر میں خود کو چھپا کر اس کے روبرو بیٹھی تھی۔ اسے طلاق ہوئی تھی اور شرعاً وضع حمل تک اسے عدت کرنی تھی۔

''سوری زینب! پہلے مجھے علم نہیں تھا لیکن اب احتیاط کروں گا۔ تمہیں جب کبھی کوئی ضرورت یا کام ہو تو رسولاں سے پیغام بھجوا دینا۔ اچھا اللہ حافظ۔''

اس بار اس نے زینب کے چادر میں لپٹے ہوئے وجود پر بھی نظر نہیں ڈالی اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس ملاقات کی خبر سکینہ کو بھی مل جائے گی۔ اپنے کاموں سے فارغ ہوکر وہ زینب کے دکھوں کا بوجھ دل پر لیے جب شام ڈھلے حویلی واپس لوٹا تو سکینہ دل میں ڈھیروں غصہ اور کدورت جمع کیے اس کی منتظر تھی۔ وہ اس کی اداسی اور دکھ کو تو کیا خاطر میں لاتی الٹا طعنے تشنے دینے اور الزام تراشیاں کرنے لگی۔ اس کے لیے یہ بات قطعی ناقابلِ برداشت تھی کہ دلاور نے اتنی دیر تنہا، اپنی سابقہ منگ جو صرف منگ ہی نہیں اس کی محبوبہ بھی تھی کے کمرے میں وقت گزارا۔ دلاور نے اسے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے کسی جذبے کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ زینب کی خبر گیری کے لیے گیا تھا لیکن سکینہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی اور

اس کی ایک ہی ضد تھی کہ زینب سے کہو واپس اپنے گھر لوٹ جائے۔ مجبوراً دلاور کو اسے بتانا پڑا کہ زینب کو طلاق ہو گئی ہے اور اب وہ یہیں اسی حویلی میں رہے گی۔ اس خبر نے تو سکینہ کے دل کو جیسے آگ ہی لگا دی۔ اسے لگا کہ جس زینب کے آسیب نے پہلے اس کے شوہر کو پوری طرح اس کا نہیں بننے دیا، وہ زینب اب اس سے اس کا آدھا ادھورا شوہر بھی چھیننے کے لیے آ گئی ہے۔ اس کا بی پی شوٹ کر گیا۔ ایسی حالت میں بی پی شوٹ کر جانا معمولی بات نہیں تھی۔ چودھری دلاور کو تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ فطرتاً نرم طبیعت کا مالک تھا اور سکینہ کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ دوسری طرف اسے اپنے ہونے والے بچے کی بھی فکر تھی۔ جو دنیا جہان کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا اسے اپنے خون کی فکر نہ ہوتی، یہ کیسے ممکن تھا چنانچہ جب سکینہ نے طبیعت ذرا سنبھل جانے کے بعد اس مطالبے کو دہرایا کہ زینب کو اس حویلی سے نکال دیا جائے تو وہ اس سے زیادہ بحث نہیں کر سکا اور اس کے مطالبے کو اس شرط کے ساتھ قبول کر لیا کہ زینب وضع حمل تک اسی حویلی میں رہے گی کیونکہ وہ عدت میں ہے اور عدت کے عرصے میں اسے یہاں سے جانے کو نہیں کہا جا سکتا۔ سکینہ نے بادل ناخواستہ اس شرط کو منظور کر لیا لیکن اس کے بعد چودھری دلاور کی چوکیدار بن گئی۔ وہ جتنی دیر حویلی میں رہتا اس کی نظروں کے پہرے میں رہتا۔ یہ صورت حال اس کے لیے تکلیف دہ تھی لیکن سکینہ سے شکایت نہیں کی کہ اسے کچھ سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانا تھا۔ دوسرے وہ اس کی طبیعت سے بھی ڈرتا تھا لیکن اسے زینب کی بھی فکر تھی۔ وہ بھی اسی دور سے گزر رہی تھی اور کوئی نہیں تھا جو اس سے اس کا دکھ درد بانٹتا۔ عدت کی پابندی کی وجہ سے وہ خود بھی زینب سے ملنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا تھا لیکن ملازماؤں کے ذریعے اس کی خیر خبر تو لے سکتا تھا۔ سکینہ کی پہرے داری کی وجہ سے یہ بھی ممکن نہ رہا کہ مبادا وہ اس پر ملازماؤں کے ذریعے عشق لڑانے کا الزام لگا دے۔ اس نے بہت سنبھل کر زندگی گزاری تھی اور کبھی خود پر کوئی انگلی نہ اٹھنے دی تھی پھر یہ کیسے گوارا کرتا کہ کوئی زینب پر کیچڑ اچھالے سو خود پر کڑا ضبط کیے وقت کاٹتا رہا۔ سکینہ کو تو اس کی خاموشی بھی گوارا نہیں ہوتی تھی اور فوراً اس وہم میں مبتلا ہو جاتی تھی کہ وہ خاموش رہ کر زینب کو سوچ رہا ہے۔ ایسے میں وہ زبان سے زینب کے لیے فکرمندی کا اظہار کرتا بھی تو کیسے؟ سکینہ کا یہ حال تھا کہ پہرے داری کے باوجود پوری طرح مطمئن نہیں ہوتی تھی اور اس بے اطمینانی کے ہاتھوں اپنی ہی طبیعت خراب کرتی رہتی تھی۔ چودھری دلاور نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے اسے آنے والے بچے کے لیے تیاری کی مصروفیت میں لگا دیا۔ یہ مصروفیت اس کے لیے اچھی ثابت ہوئی۔ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا چنانچہ بچے کے لیے تیاری کا سلسلہ شروع ہوا تو حویلی میں سامان کا ڈھیر لگ گیا۔ گاؤں کے ہنرمندوں کے ہاتھوں کی تیار کردہ اشیا کے علاوہ ایک بڑا ذخیرہ شہر سے منگوائے گئے سامان کا بھی تھا لیکن ہر شے میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ سارا کا سارا سامان لڑکے کے لیے تھا۔ ایک دن چودھری دلاور نے سکینہ کو ٹوک ہی دیا اور ہنس کر بولا۔

''بھلیے لوگ! تو ہر شے کاکے کے حساب سے جمع کر رہی ہے اگر رب سوہنے نے اپنی رحمت بھیج دی تو پھر کیا کرے گی؟''

''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے خاندان کی روایت ہے کہ پہلا بچہ ہمیشہ لڑکا ہی ہوتا ہے۔ دائی صغراں نے بھی مجھے یہی بتایا ہے کہ میرے ہاں پتر آئے گا۔ صغراں بڑی سیانی ہے اس کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا اس لیے تم بدشگونی کی باتیں نہ کرو اور مجھے میرے پتر کے لیے تیاریاں کرنے دو۔'' سکینہ اس کے ٹوکنے پر کیا کچھ سمجھتی، الٹا اسے ہی ٹوک دیا کہ وہ بدشگونی کی باتیں نہ کرے۔ اس کے بعد دلاور کے پاس حسب معمول خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

اس سال کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی لیکن چودھری دلاور موسم کو خاطر میں لائے بغیر پابندی سے فصلوں کی نگرانی کا کام خود انجام دے رہا تھا۔ سکینہ جہیز میں مربعے لائی تھی، یہ بات اپنی جگہ تھی لیکن ان سے سونے جیسی فصل حاصل کرنے کا سہرا دلاور ہی کے سر تھا۔ کام بے شک مزارعین کرتے تھے لیکن کام کا معیار تو اس کی نگرانی ہی کے مرہون منت تھا۔ اس روز بھی وہ صبح ہی سے گھر سے نکل گیا تھا۔ سکینہ کی طبیعت آج کل ذرا زیادہ خراب رہنے لگی تھی اور کسی بھی وقت بچے کی پیدائش متوقع تھی اس لیے اس کی طرف سے مسلسل ایک فکر سی رہتی تھی۔ اس نے تو چاہا تھا کہ سکینہ کو شہر لے جائے اور وہاں کسی بڑے اسپتال میں بچے کی پیدائش ہو لیکن سکینہ ہی نہیں مانی۔ اسے دائی صغراں پر بڑا بھروسا تھا اور اس کے آگے وہ کسی بڑی سے بڑی ڈاکٹرنی کو کچھ نہیں گردانتی تھی سو چودھری دلاور کو اپنی خواہش سے دستبردار ہونا پڑا اور احتیاطاً صغراں کو آخری دنوں میں مستقل حویلی میں قیام کا حکم دے دیا۔ اسے معلوم تھا کہ سکینہ کی طرح

زینب بھی اسی حالت سے گزر رہی ہے لیکن اس کی مکمل خبر گیری کرنے سے قاصر تھا۔ ایک طرف زینب کی عدت کی مجبوری تھی تو دوسری طرف سکینہ کی نگرانی۔ بس ایک بار اس نے رسولاں کو اس کے شوہر کے ذریعے پیغام بھیج کر ڈیرے پر بلوایا تھا اور اسے زینب کا خیال رکھنے کے سلسلے میں ہدایات دی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا ایک بار کا کہنا ہی بہت ہے اور رسولاں اپنی بساط بھر ہر ممکن اس کے حکم کی پیروی کرے گی، اس لیے دوبارہ بھی اسے بلوانے کی زحمت نہیں کی تھی، یوں بھی اسے یہ چوری چھپے کے معاملات پسند نہیں تھے۔ زینب اس کی محبت تھی یہ سچ تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اب ان کے درمیان کزنز ہونے کے سوا کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور وہ خفیہ پیغام رسانیوں کے ذریعے اس کا اور اپنا نام بدنام ہونے کا کوئی خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ ایسی بندشیں اور ایسی احتیاطیں ان ہی کا شیوہ ہوتی ہیں جو سچی محبت کرتے ہیں اور یہ بندشیں اور احتیاطیں ہی محبت کا اصل حسن ہیں۔ بے باک محبت باعزت نہیں ہوتی اور شریف آدمی کے لیے عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ چودھری دلاور بھی اپنی اور زینب کی عزت سنبھالے بیٹھا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ آج صبح سے ہی دھیان بار بار اس کی طرف چلا جاتا تھا۔ طبیعت میں ایک بے چینی سی تھی جو آنکھ کھلتے ہی اس نے اپنے اندر محسوس کی تھی اور فجر سے لے کر عشا تک ہر نماز میں خصوصیت کے ساتھ زینب کے لیے دعا مانگتا رہا تھا۔ آج معمول کے مطابق مغرب تک حویلی واپسی بھی نہیں ہو سکی تھی۔ شہر سے پھلوں کا ایک آڑھتی آیا ہوا تھا۔ چودھری دلاور ہر سیزن میں اپنے باغات کے پھل اسی کے ذریعے شہر میں فروخت کرتا تھا اس لیے اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اس دوستی اور مہمان نوازی کا تقاضا تھا کہ سرِ شام آنے والے اس مہمان کو رات کا کھانا کھائے بغیر رخصت نہ ہونے دیا جائے بلکہ چودھری دلاور نے تو اسے رات رکنے کی بھی دعوت دی تھی لیکن وہ راضی نہ ہوا اور بات رات کے کھانے پر آ کر ٹھہر گئی۔ مغرب کے فوراً بعد رات کا کھانا کھا لیا گیا تھا لیکن قہوے اور حقے کے شغل کے بعد مہمان کو رخصت کرنے میں مسجد سے عشا کی اذان بلند ہونے لگی تھی۔ چودھری دلاور نے عشا پڑھ کر ہی حویلی واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ عشا کی نماز کے بعد وہ مسجد سے نکلا تو رسولاں کے شوہر کو گمبھیر تاثرات کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ وہ اپنے ساتھ موجود لوگوں سے الگ ہو کر اس کے قریب پہنچا تو اس نے سرگوشی میں بتایا۔

''رسولاں کہندی اے سرکار زینب بی بی دی حالت ٹھیک نہیں ہے، دائی کو بلانا ہوگا۔'' گاؤں میں دائی کے ہاتھوں بچوں کی پیدائش ایک عام معمول تھا اس لیے دلاور سمجھ گیا کہ زینب کے ہاں بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔

وہ بولا۔ ''دائی صغراں وہیں حویلی میں تو ہے رسولاں نے اسے کیوں نہیں بلایا؟''

''آپ کی اجازت چاہیے تھی سرکار۔ رسولاں کو وڈی چودھرائن کا ڈر تھا۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر دو مختصر جملوں میں وضاحت کر دی۔

''ٹھیک ہے وقت ضائع نہیں کرو اور جا کر رسولاں سے بولو کہ صغراں کو بلا لے۔'' وہ شخص اس کے حکم کی تعمیل میں حویلی کی طرف دوڑ گیا۔ اس نے بھی تھکے ہوئے اعصاب کے ساتھ حویلی کا رخ کیا لیکن ظاہر ہے وہ زینب کا حال احوال نہیں لے سکتا تھا۔ بس چودھرائن کے ساتھ بیٹھا اس کی باتوں پر توجہ مرکوز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ طبیعت اس کی بھی ٹھیک نہیں تھی اور مسلسل کسی نہ کسی تکلیف کی شکایت کر رہی تھی۔ چودھری دلاور اپنے طور پر اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ذہن زینب کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے جا کر اس کی آنکھ لگی تو وہ کمرے سے باہر نکلا۔ باہر ٹھٹھرا دینے والی سردی تھی لیکن اسے اس وقت خود سے زیادہ زینب کی فکر تھی۔ اتنے گھنٹے گزر چکے تھے لیکن اس کی کوئی خبر ہی نہیں ملی تھی۔ وہ کوئی گرم شال وغیرہ اوڑھے بغیر ہی باہر نکل آیا۔ زینب کا کمرا حویلی کے جس حصے میں تھا وہاں تک پہنچنے کے لیے کھلے صحن میں سے گزرنا پڑتا تھا، صحن میں سردی اور بھی شدت کی تھی لیکن اس کے سارے محسوسات زینب کی خیریت پر مرکوز تھے اس لیے اس سردی کو قطعی خاطر میں نہ لایا اور صحن پار کر گیا۔ دوسری طرف کے برآمدے میں قدم رکھتے ہی اس کے کانوں نے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ اس کے قدم خود بخود ہی تیز ہو گئے لیکن پھر وہ سامنے سے آتی رسولاں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ رسولاں ہی تھی جو بری طرح روتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اس کی نظر جیسے ہی چودھری دلاور پر پڑی رونے کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی۔

''کجھ نئی باقی رہا چودھری صاحب! اسیں لٹ گئے تے برباد ہو گئے سی۔'' وہ رونے کے ساتھ ساتھ بین بھی کرنے لگی اور دلاور کو جیسے کسی نے برف کے مجسمے میں تبدیل کر دیا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ رسولاں کوئی ایسی زبان بول رہی ہے جسے وہ سمجھنے سے قاصر

ہے۔ درحقیقت جو بچہ میں آرہا تھا اسے سمجھنے کو وہ راضی نہیں تھا۔ رسولاں کے پیچھے ہی صغراں بھی باہر آگئی۔ رسولاں کی آواز سن کر اسے چودھری دلاور کی وہاں موجودگی کا علم ہو گیا تھا۔ وہ آنسو بہاتی زرد چہرے کے ساتھ کانپتی ہوئی آئی اور دلاور کے قدموں میں گر گئی۔

''مینوں ماف کردو چودھری صاحب! مینو بوہت کوشش کیتا سی پر وڈا اوکھا کیس تھا۔ وڈے آپریشن سوائے کوئی چارہ ای نہیں تھا او میں کیسے کر سکدی تھیں۔'' صغراں اس کے پیروں میں گری بہت کچھ کہہ رہی تھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ماں کے پیٹ میں بچے کی پوزیشن ایسی تھی کہ آپریشن کے بغیر بچے کی پیدائش کسی طور ممکن نہیں تھی۔ صغراں نے اس مشکل کیس پر اپنی تمام مہارت صرف کر دی اور بچہ ڈلیور کروانے میں بھی کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو گئی لیکن اس مشکل سے گزرتی زینب خون کے بے پناہ اخراج کے باعث زندگی کی بازی ہار گئی۔ صغراں کو گلہ تھا کہ پیدائش کا وقت آنے سے قبل ایک بار بھی زینب کا اس سے معائنہ نہیں کروایا گیا اگر ایسا کیا جاتا تو وہ اپنے تیر بہ ہدف نسخوں کو استعمال کر کے قبل از وقت معاملے کو ڈھب پر لے آتی اور اگر ایسا نہ بھی ہو پاتا تو کم از کم زینب کو شہر کے بڑے اسپتال میں لے جانے کی صلاح تو دے ہی دیتی۔ یہ ساری وہی باتیں تھیں جو ہر موت، ہر حادثے کے بعد کی جاتی ہیں کہ یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا اور یوں ہوتا تو یوں نہ ہو پاتا۔ اصل بات تو بس اتنی سی ہوتی ہے کہ جانے والے کو ہر صورت جانا ہوتا ہے اور ہونی کو ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جاڑے کی اس بے حد سرد رات میں زینب کا اپنی نشانی چھوڑ کر چلے جانا بھی طے تھا سو وہ صغراں پر کوئی الزام دھر کر کیا پاتا۔ وہ بس اس ننھی جان کو دیکھتا رہا جسے رسولاں گرم کمبل میں لپیٹ کر اس کے سامنے لے آئی تھی۔ اس پل اسے لگا کہ زینب بس اپنی اسی نشانی کو سونپنے کے لیے حویلی لوٹی تھی۔ اس نے نم آنکھوں سے اس ننھی جان کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ حقیقتاً اس وقت وہ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا لیکن نہیں رو سکتا تھا کہ اب وہ کوئی نوعمر لڑکا نہیں اپنے خاندان کا سرپرست تھا۔ اسے سب کے سامنے اپنا بھرم رکھنا تھا سو گریہ وزاری کو تنہائی کی دستیابی پر سنبھال رکھا اور وہ فرائض انجام دینے لگا جو اس پر بحیثیت سربراہ عائد ہوتے تھے۔ نومولود کے کان میں اذان دینے، اسے شہد چٹانے اور زینب کی تدفین کے سلسلے میں ہونے والے انتظامات کی ذمے داریاں سب ہی تو اسے نبھانا تھیں۔

جاڑے کی وہ ٹھٹھرا دینے والی سرد رات شاید اس کے احساس ذمے داری کا امتحان لینے ہی کے لیے آئی تھی جب ہی تو فجر سے پہلے چودھرائن سکینہ نے بھی دردِ زہ سے تڑپنا شروع کر دیا تھا۔ تھکی ہاری صغراں مالکن کی مشکل کو آسان کرنے کے لیے پوری مستعدی سے کمربستہ ہوئی۔ یہ اس کا کیس تھا جسے سنبھالنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس نے بھی اس روز حق نمک ادا کیا اور بدلے میں ہاتھ کے ہاتھ انعام سے نوازی گئی۔ اس نے جیسے ہی بیٹے کو چودھرائن کے پہلو میں لٹایا! نئی زندگی کو جنم دینے کی جدوجہد میں نڈھال ہو جانے والی چودھرائن آسودگی سے مسکرائی اور ہاتھ میں پہنے بھاری کڑے اسے دان کر دیے۔ اس سخاوت پر صغراں خوش تو ضرور ہوئی لیکن کھل کر خوشی کا اظہار کرنے سے قاصر رہی کہ آج کی رات صرف خوشیوں کی رات نہیں تھی اور چند گھنٹے قبل ہی حویلی کی ایک بیٹی نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ بیٹے کی پیدائش پر جشن منانے کا ارادہ رکھنے والی چودھرائن سکینہ تک کو کھل کر خوشی کا اظہار کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ چودھری دلاور کے احساسات کی پروا چھوڑ بھی دیتی تو دنیا داری کے تقاضے تو بہر صورت نبھانا تھے اور یہ تقاضے کہتے تھے کہ ایک جوان جنازے کی حویلی سے رخصتی کے ساتھ کوئی خوشی یہاں تک کہ برسوں کے انتظار کے بعد دنیا میں آنے والے حویلی کے وارث کی پیدائش کی خوشی بھی نہیں منائی جا سکتی۔ خوشی منانے سے وہ رک گئی تھی لیکن دل میں یہ قلق ہمیشہ کے لیے رہ گیا تھا کہ ساری حیاتی اس کی خوشیوں کو کھانے والی زینب اس کی اس خوشی کو بھی کھا گئی تھی۔

☆☆☆

وقت آگے بڑھ گیا تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ دونوں بچے بڑے ہو گئے تھے۔ چودھرائن کے تمام تر بغض، عناد اور عداوت کے باوجود بلقیس حویلی میں مزے سے رہ رہی تھی۔ چودھری دلاور نے ابتدا میں ہی اس سے کہہ دیا تھا۔ ''دیکھ سکینہ! میں جانتا ہوں کہ تجھے زینب سے بڑا جلاپا ہے اور تو یہاں تک اس کے لیے دل میں بغض رکھتی ہے کہ عین اپنے پتر کی پیدائش والے دن اس کے مر جانے پر بھی اسے کوستی ہے کہ اس منحوس نے مجھے میری سب سے بڑی خوشی بھی نہیں منانے دی۔ میں تیرے دل سے اس بغض اور نفرت کو دور نہیں کر سکتا لیکن تجھے ایک بات اچھی طرح سمجھا دینا چاہتا ہوں کہ اپنی نفرت میں زینب کی بیٹی کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ

مرتے دم تک پچھتائے گی۔ وہ بچی یہیں اسی حویلی میں بالکل ویسے ہی پلے گی جیسے قاسم۔ تجھے اگر میرے اس فیصلے سے اختلاف ہے تو آج سے اپنی اور میری راہیں جدا سمجھ۔ تیرے جہیز میں لائے مربعے اور برسوں کے انتظار کے بعد ملنے والا بیٹا مل کر بھی اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ بلقیس کو میری شفقت کے سائے سے محروم رکھ سکیں، یوں سمجھ کہ بلقیس حویلی میں ہے تو تیرا میرا رشتہ بھی قائم ہے۔ بلقیس کو حویلی میں رکھنے سے انکار کرے گی تو تیرے لیے بھی اس حویلی میں جگہ نہ ہوگی۔'' یہ زندگی میں پہلا موقع تھا جب چودھری دلاور نے اس سے اس لب و لہجے میں بات کی تھی۔ چودھری کی باتیں سن کر وہ نفرت کے زہر سے اندر تک نیلی پڑ گئی تھی لیکن مصلحتوں نے کسی انتہائی قدم سے باز رکھ کر چودھری دلاور کی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہاں محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے اس حویلی میں لانے والی پھوپی رہی تھی نہ میکے میں اس کا سائبان بنا رہنے والا باپ۔ وہ اکڑ دکھاتی تو کس کے بل پر۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جن مربعوں کو جہیز میں لانے کا احسان چودھری دلاور کو جتاتی رہتی ہے، ان مربعوں کی وجہ سے اس کے بھائی کے دل میں اس کے لیے بال ہے۔ وہ اپنے باپ کے آگے پر نہیں مار سکا تھا لیکن اسے دل میں سخت شکوہ تھا کہ رواج کے خلاف سکینہ کو جائداد میں سے اس کا شرعی حصہ کیوں دیا گیا۔ سکینہ کے جہیز میں مربعے لے جانے سے اس کے مربعوں کی تعداد گھٹ گئی تھی۔ وہ دلاور سے ناراض ہو کر اپنے بھائی کے پاس چلی جاتی تو وہ مربعوں کی واپسی پر خوش ہو جاتا لیکن قاسم کا کیا ہوتا۔ اس کے حصے میں تو فقط محرومی ہی آتی۔ دلاور اور اس کا تعلق کیسا ہی سہی یہ حقیقت وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتی تھی کہ دلاور بیٹے پر جان چھڑکتا ہے اور ایک جان چھڑکنے والے باپ سے بڑھ کر کوئی اپنے بیٹے کے مستقبل کا تحفظ نہیں کر سکتا۔ بیٹے کے مستقبل کے لیے وہ بلقیس نام کی کڑوی گولی نگلنے کے لیے تیار ہو گئی اور یوں وہ عیش و آرام کے ساتھ حویلی میں پلتی بڑھتی رہی۔ چودھرائن، چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے کے مصداق موقع دیکھ کر اس کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ اور تلخ بات کر لیا کرتی تھی لیکن بلقیس فطرتاً لاابالی تھی اور زیادہ دیر اس کی کسی بات کو دل سے لگا کر نہیں رکھتی تھی۔ اس کی یہ بے پروا فطرت ہی تھی جس کے باعث وہ مزے سے زندگی گزار رہی تھی اور کبھی اس حسد میں مبتلا نہیں ہوئی تھی کہ قاسم کے اس سے زیادہ لاڈ اٹھائے جاتے ہیں۔ چودھرائن تو ظاہر ہے ہر پل ہی اپنے بیٹے پر واری صدقے ہوتی رہتی تھی۔ چودھری دلاور کے لیے بھی وہ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔ محبت وہ بلقیس سے بھی کرتے تھے اور اس کی ہر ضرورت بن مانگے ہی پوری ہو جاتی تھی لیکن وہ قاسم والی بات پھر بھی نہیں تھی۔ کچھ سکینہ کی وجہ سے بھی انہیں احتیاط برتنی پڑتی تھی کہ کہیں لاڈ پیار کے بہت زیادہ مظاہرے پر اس کی برداشت کی حد ہی نہ ختم ہو جائے اور وہ مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر بلقیس کو کسی ناقابل تلافی نقصان سے دوچار نہ کر دے۔ وہ بلقیس کو رقابت کی اس آگ سے بچائے رکھنا چاہتے تھے جو زینب کی موت کے اتنے برسوں بعد بھی سکینہ کے دل میں پوری آب و تاب سے جل رہی تھی اور جس کی لپک کبھی کبھی چودھری دلاور کو دیکھنے کو مل ہی جاتی تھی جیسے اس روز ہوا تھا۔ اپنی مصروفیات اور کچھ احتیاط کے باعث انہوں نے بہت عرصے بعد بلقیس کو غور سے دیکھا تھا اور دیکھتے ہی رہ گئے تھے کہ وہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اس کی من موہنی ادائیں بھی ان کے دل پر اثر انداز ہوئی تھیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح چودھرائن نے جتایا تھا۔ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ بلقیس کے لیے ان کے دل میں کیسے جذبات تھے اور ان کی نظریں جب بھی اس پر اٹھتی تھیں پدرانہ محبت و شفقت سے اٹھتی تھیں لیکن وہ اس بات کو بھی جانتے تھے کہ لاکھ وضاحتیں دے لیں، سکینہ کے دل میں آئی بات نہیں نکال سکتے۔ انہوں نے ایک بار اس کی فضول بکواس سن لی تھی دوبارہ سننے اور سہنے کا یارا نہیں تھا اس لیے خود پر پابندیاں عائد کر لیں اور بلقیس کی طرف نظر بھر کر دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ ان کے نظر کے لیے اتنا اطمینان بھی کافی تھا کہ وہ ان کے آس پاس ہے اور ان کے زیر سایہ پل بڑھ رہی ہے۔

☆☆☆

بلقیس لاابالی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ چودھرائن کی نفرت کو محسوس نہ کر پاتی، وہ محسوس کرتی تھی لیکن کسی کو احساس نہیں ہونے دیتی تھی کہ یہ رویہ اسے تکلیف دیتا ہے۔ خاص طور پر ماں کے حوالے سے دیے جانے والے طعنے تشنے تو سیدھے اس کے دل پر لگتے تھے۔ چودھری دلاور نے لاکھ چودھرائن پر پابندیاں لگائی ہوئی تھیں لیکن وہ چوبیس گھنٹے حویلی میں رہ کر اس کی نگرانی تو نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی غیر موجودگی کے اوقات میں اگر بلقیس کا چودھرائن سے سامنا ہو جاتا تو وہ کوئی نہ کوئی دل دکھا دینے والی بات کہہ ہی دیتی تھی۔ یہ صرف چودھری دلاور کا احسان اور محبت تھی کہ بلقیس اپنی مری ہوئی ماں کے لیے چودھرائن کی زبان سے

بدچلن اور بدکردار کے طعنے بھی خاموشی سے سن لیتی تھی اور پھر تنہائی میں پہروں آنسو بہاتی رہتی تھی۔ ذہین اور علم کی شوقین ہونے کے باوجود وہ ایف اے کے بعد اپنا تعلیمی سلسلہ بھی اس لیے جاری نہیں رکھ سکی تھی کہ گاؤں میں کوئی ڈگری کالج نہیں تھا اور اس کے مزید تعلیم کے لیے شہر جانے کا ذکر آتے ہی چودھرائن نے طعنہ دے دیا تھا کہ جیسے ماں نے تعلیم کے نام پر شہر جا کر چن چڑھایا تھا، یہ بھی چڑھائے گی۔

بلقیس کو معلوم تھا کہ اس سے زینب جیسی غلطی نہیں بھی ہوئی تو ہمیشہ اس پر شک تو لازماً کیا جاتا رہے گا اور وہ اپنے کردار کو شک کی دھند سے بھی دور رکھنا چاہتی تھی، اس لیے مزید تعلیم کے لیے شہر جانے سے اپنی زبان سے انکار کر دیا۔ اس کے انکار پر چودھری دلاور نے تو اصرار نہیں کیا لیکن قاسم مسلسل زور دیتا رہا کہ اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہیے اور یوں گھر بیٹھ کر اپنی ذہانت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خود شہر کے ایک اچھے کالج میں داخلہ لے چکا تھا اور عزم ظاہر کیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے ماں باپ کا سر فخر سے بلند کر دے گا۔ بیٹے کی باتیں سن کر چودھرائن خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی اور اس کے صدقے واری جاتی رہتی تھی۔ اللہ نے قاسم کے بعد اسے دوسری کوئی اولاد بھی نہیں دی تھی، اس لیے قاسم میں اس کی جان تھی اور بس نہیں چلتا تھا کہ اس کے قدموں کے نیچے اپنی پلکیں بچھا دے۔ اتنے پیارے بیٹے سے اسے بس ایک ہی شکوہ تھا کہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے بلقیس سے دور رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ جتنا اسے بلقیس سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی وہ اتنا ہی اس کی طرف ہمکتا تھا۔ حویلی میں بلقیس کے سوا کوئی اور بچہ ہوتا تو شاید وہ رک بھی جاتا۔ وہ ایک اکلوتی ہم عمر ساتھی سے دور رہنا کیسے قبول کرتا۔ چودھرائن کو بھی بحالت مجبوری اس حقیقت کو قبول کرنا پڑا۔

بچپن سے گزر کر لڑکپن کی عمر کو پہنچنے کے بعد بلقیس نے خود ہی قاسم سے تھوڑا دور دور رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی پرورش کی ذمے داری سنبھالنے والی رسولاں ہی نے اسے یہ سمجھ دی تھی۔ چودھری دلاور کے علاوہ رسولاں ہی تھی جو اس کی سچی ہمدرد اور غمگسار تھی اور اسے ہر وہ بات سمجھاتی تھی جو ایک ماں اپنی بیٹی کو سکھاتی اور سمجھاتی ہے۔ اس عمر میں بلقیس کی اس احتیاط کو قاسم بھی اس لیے محسوس نہیں کر سکا تھا کہ اس کی اپنی دلچسپی حویلی سے باہر بڑھ گئی تھی اور اسے حویلی میں بند رہنے کے بجائے باہر دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے میں زیادہ لطف آتا تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بلقیس سے بالکل بے خبر ہو جاتا.... اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بلقیس پڑھنے لکھنے کی شوقین اور محنتی لڑکی ہے، اسی لیے تعلیمی سلسلہ مزید آگے بڑھانے کے لیے اس پر زور دیتا رہا تھا اور اس کے نہ ماننے پر ذرا ناراض ناراض سا حویلی سے رخصت ہو کر شہر چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بلقیس کئی دن بولائی ہوئی حویلی میں ادھر سے ادھر پھرتی رہی تھی لیکن پھر رسولاں نے طریقے سے اسے گھرداری کے دھندوں میں الجھا لیا تھا۔ وہ محنتی لڑکی تھی اس لیے ان کاموں سے بھی جی نہ چرایا اور ہر جگہ اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑنے لگی۔ اس کے ہاتھ کا پکا کھانے والے اپنی انگلیاں چاٹنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو کڑھائی سلائی کے نمونوں پر بھی نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ فارغ اوقات میں وہ علم کی پیاس بجھانے کے لیے کتابوں کا مطالعہ کرتی تھی اور مختصر عرصے میں ڈھیروں کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ کتابوں سے اس دلچسپی نے اس کی شخصیت میں نکھار پیدا کر دیا تھا اور وہ پہلے کی طرح لاابالی لڑکی کے بجائے ایک قدرے سنجیدہ اور متین لڑکی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے چودھری دلاور خود اسے اچھی اچھی کتابیں منگوا کر دیتے تھے۔ نوجوانی میں انہیں بھی مطالعے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا لیکن پھر زمینداری کی الجھنوں میں پھنس کر اس شوق کی آبیاری کے لیے وقت ہی نہیں رہا اور بلقیس کا شوق پورا کر کے وہ اپنے اندر کی تشنگی مٹانے لگے۔ بلقیس ان کی مہربانیوں کے لیے دل سے قدردان تھی اور کبھی کبھی اس کے دل میں حسرت سی جاگ اٹھتی تھی کہ کاش اس کی ماں نے اتنے پیارے انسان کو مسترد کر کے ڈاکٹر کمال سے شادی نہ کی ہوتی۔ ڈاکٹر کمال کو دیکھے اور ملے بغیر ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے یہ امر ہی کافی تھا کہ اس بے حس انسان نے کبھی پلٹ کر یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ اپنی کوکھ میں اس کا بچہ لے کر آنے والی زینب نے لڑکے کو جنم دیا تھا یا لڑکی کو۔ اتنے برس گزر گئے تھے اور اسے ایک بار بھی اپنے خون کی کشش نے نہیں کھینچا تھا کہ وہ اسے دیکھنے اور ملنے کے لیے آ جاتا۔ ایسے بے حس اور بے پروا انسان کے لیے بلقیس کے دل میں بالکل بھی محبت نہیں تھی اور وہ چودھری دلاور کو ہی اپنا سرپرست تسلیم کرتی تھی۔ ڈاکٹر کمال اور چودھرائن جیسے پتھر دل لوگوں کا تجربہ ہونے کے باوجود اگر وہ انسانیت سے مایوس نہیں ہوئی تھی تو اس کی وجہ چودھری دلاور تھے۔ چودھری دلاور کا یہ نقش اس کے دل میں اتارنے میں رسولاں نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ اسے بتاتی اور سمجھاتی رہتی تھی کہ

چودھری صاحب اس سے بہت محبت کرتے ہیں اور انہیں اس کی بہت فکر رہتی ہے لیکن چودھرائن کی وجہ سے زیادہ کھل کر اس سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتے۔ اس نے ان کی مجبوری کو سمجھ لیا تھا اور جو مل رہا تھا وہ اس پر قانع ہو گئی تھی لیکن سب کچھ پالینے والی چودھرائن سکینہ کا قناعت سے واسطہ نہیں تھا۔ اس نے چودھری دلاور جیسے ہیرا صفت انسان کو پایا تھا جو اس کی خامیوں سمیت اس سے خاموشی سے نبھا کرتا رہا تھا اور کبھی دوسرے دولت مند مردوں کی طرح بیوی سے بیزار ہو کر باہر دلچسپی کا سامان نہیں ڈھونڈا تھا۔ وہ اس حویلی کی بے تاج ملکہ تھی اور یہاں سب کچھ اس کے حکم پر ہوتا تھا پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھی۔ کئی برسوں کی تشنگی کے بعد اولاد کی نعمت پانے اور اس نعمت سے خوشیاں کشید کرنے کے باوجود اسے شکر کی توفیق نہیں ہوتی تھی اور بلاوجہ کے واہمات میں گھری اپنی زندگی کو مشکل بنائے رکھتی تھی۔ اب اسے ایک نئی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اصل میں اس نے نوٹ کر لیا تھا کہ قاسم جب جب چھٹیوں میں حویلی آتا ہے اس کی نظریں بلقیس کی ہی تلاش میں رہتی ہیں۔ بلقیس اس کے سامنے زیادہ نہیں آتی تھی لیکن جب بھی وہ اسے نظر آجاتی وہ اس پر سے اپنی نگاہیں ہٹانا بھول جاتا تھا۔ ردعمل میں چودھرائن کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے تھے۔ آخر برداشت نہ ہوا تو چودھری دلاور سے بات کرنے کی ٹھانی اور ایک روز بڑی تنی سے ان سے بولی۔

”اپنی لاڈلی کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے یا نہیں۔ کب تک اسے میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے یہاں بٹھا کر رکھو گے؟ کوئی بر دیکھو اس کے لیے اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماں کی طرح کوئی چن چڑھائے اسے کسی ٹھکانے لگا دو۔“

جوان لڑکیوں کی شادی کی فکر کی ہی جاتی ہے لیکن جن الفاظ اور لہجے میں چودھرائن نے بات کی تھی، وہ چودھری دلاور کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ انہوں نے غضب بھری نگاہوں سے سکینہ کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولے۔

”بلقیس میری ذمے داری ہے۔ تمہیں اس کی فکر میں دبلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سب سوچ رکھا ہے اس کے لیے۔“

”میں بھی سنوں کہ کیا سوچا ہے تم نے؟“ چودھرائن اس کی آنکھوں کی تپش سے متاثر ہوئی اور نہ لہجے کی سرد مہری سے اور چمک کر سوال کیا۔

”جب تیرا اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے تو اس کے بارے میں جان کر کیا کرے گی؟“ چودھری نے اس کا

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس فون نمبر 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

سوال ٹالنے کی کوشش کی۔

''مجھے تمہاری نیت پر بھروسا نہیں ہے اور میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم اسے میرے پتر کے سر لگانے کی تو نہیں سوچ رہے۔'' چودھرائن اپنے اندر کے اندیشے کو زبان پر لے آئی۔

''ایسے کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے تیرے پتر میں۔ میری بلقیس کے لیے رشتوں کی کیا کمی ہے۔ اتنی سوہنی کڑی ہے جس کے لیے ہاں بولوں گا وہ اپنے نصیب پر ناز کرے گا۔''

چودھری دلاور نے بے نیازی سے شانے جھٹکتے ہوئے اسے جواب دیا تو وہ بڑبڑائی۔

''اس کی سوہنی صورت سے ہی تو ڈر لگتا ہے۔ ماں تو سانولی سلونی تھی پر یہ تو ایسا لگتا ہے مکھن ملائی سے گوندھ کر بنی ہے۔ اپنے ڈاکٹر باپ پر گئی ہوگی۔ تم نے تو دیکھا تھا اس ڈاکٹر کو۔ کیسا تھا؟'' فکرمندی آخر میں تجسس میں ڈھل گئی اور چودھری دلاور کی آنکھوں میں بے ساختہ ہی اونچے لمبے، گورے چٹے ڈاکٹر کمال کا سراپا گھوم گیا۔ ساتھ ہی دل میں ایک تلخی سی جاگی۔ اس خوبصورت اور قابل شخص نے اپنی شخصیت کے سحر میں جکڑ کر ہی تو زینب کو برباد کر دیا تھا۔ زینب تو پھر بھی موت کی آغوش میں چھپ کر سارے دکھوں سے نجات پا گئی تھی لیکن اس کے حصے میں ساری عمر کی آبلہ پائی آئی تھی۔ اپنی من چاہی ہستی کو کھو کر چودھرائن سکینہ جیسی بدمزاج اور شکی عورت کے ساتھ ساری عمر بتانا کوئی آسان نہیں تھا۔ سکینہ کی حرکتوں نے اس کی خوبصورتی کو بھی گہنا دیا تھا اور وہ کبھی چودھری دلاور کے دل میں وہ جگہ نہیں بنا سکی جو عموماً خوبصورت عورت اپنے مرد کے دل میں بنا لیتی ہے۔

''فیر کیا سوچا ہے تم نے۔ کہیں گل چاؤ کڑی کی۔'' چودھرائن نے زیادہ دیر اسے ماضی کی بھول بھلیوں میں نہ رہنے دیا اور کھینچ کر حال میں واپس لے آئی۔

''وقت آنے پر سب ہو جائے گا تو کیوں ہتھیلی پر سرسوں جمانے پر تلی ہے۔'' چودھری دلاور نے ایک بار پھر بات کو ٹالا۔

''قاسم کے تعلیم سے فارغ ہونے سے پہلے بلقیس کو اس کے گھر کا کر دو تو اچھا ہے۔ آگے میں نے بھی نوں لے کر آنی ہے۔ آج کل کی کڑیاں کہاں نند کو برداشت کرتی ہیں تو فیر یہ باہر کی لڑکی کدھر برداشت ہوگی۔'' چودھرائن نے ناک سکیڑتے ہوئے نخوت سے جواب دیا۔

''باہر کی لڑکی نہیں ہے بلقیس میری دھی ہے۔''

چودھری دلاور نے اس کے الفاظ کا سخت برا منایا۔

''کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سگی دھی ہی بس دھی ہوتی ہے۔'' چودھرائن اور کسی بات کو مان لیتی یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ چودھری دلاور کو ہی خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

☆☆☆

چودھرائن کے اندیشے غلط نہیں تھے۔ قاسم واقعی بلقیس کے حسن کا اسیر ہو چکا تھا اور یہ اس کے دیدار کی پیاس ہی تھی جو اسے ہر چھٹی پر لازماً حویلی واپس لے آتی تھی۔ آج کل بھی وہ چھٹیوں میں گاؤں آیا ہوا تھا حالانکہ اس کے گروپ کے سارے لڑکے پروگرام بنا کر نیلم ویلی گھومنے گئے ہوئے تھے۔ اس سے بھی بہت اصرار کیا تھا لیکن اسے خوب صورت نظاروں سے زیادہ بلقیس کو دیکھنے کی خواہش تھی سو دوستوں کو ٹال کر حویلی دوڑا آیا تھا۔ وہ جب جب حویلی آتا تھا چودھرائن اس کی خاطر مدارت کے لیے سب کو ہلکان کر ڈالتی تھی۔ اب بھی اس نے ماہی رحمتے سے اصلی گھی میں باداموں والا حلوا بنوایا تھا اور قاسم کی نہ نہ کے باوجود اپنے ہاتھ سے اسے حلوا کھلا رہی تھی۔

''بس کردو اماں ''اتنا'' اور ''ایسا'' کھاؤں گا تو پہلوانوں جیسا موٹا اور بے ڈول ہو جاؤں گا۔'' حلوے کی لبالب بھری پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاسم نے دہائی دی۔

''چپ کر کے کھا۔ یہی عمر ہوتی ہے کھانے پینے اور جان بنانے کی۔ شہر میں رہ کر تو تیری صحت ہی خراب ہوتی جا رہی ہے۔ تیرے پیو کو تجھے پڑھانے لکھانے کا اتنا شوق نہیں ہوتا تو میں کبھی تجھے خود سے اتنی دور نہیں بھیجتی۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنے جتنوں سے تجھے پالا ہے۔ پیدا ہوا تھا تو اتنا کمزور سا تھا۔ بھوری (بھینس) کا دودھ تک نہیں لگ سکا تھا تجھے۔ الٹی موشن کر کر کے مرے جیسا ہو گیا تھا۔ وہ تو تیرے اباجی تجھے شہر کے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور اس نے دواؤں کے ساتھ سب سے مہنگا والا دودھ کا ڈبا لکھ کر دیا تو تیری حالت سنبھلی۔ سال بھر کا ہونے کے بعد تو کہیں جا کر تو نے جان پکڑی تھی اور میرے دل کو قرار آیا تھا لیکن تو ایک بار پھر شہر جا کر اپنی صحت کو گنوا بیٹھا ہے۔ میں تو تجھے ان چھٹیوں میں خوب کھلاؤں گی، پلاؤں گی تاکہ کچھ تو جان بنے تیری۔'' اس کی دہائیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چودھرائن نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو قاسم ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ شہر میں فٹنس کلب جوائن کر کے اس نے اپنا اضافی وزن گھٹایا تھا اور وزن گھٹنے کی

وجہ سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہینڈسم لگنے لگا تھا لیکن چودھرائن کی ممتا اس بات کو نہیں سمجھتی تھی۔ قاسم بچپن سے ہی یہ سب دیکھتا آرہا تھا۔ اصل میں اس کی پیدائش کے بعد چودھرائن اسے اپنا دودھ نہیں پلا سکی تھی۔ اللہ ہی نے اسے یہ سعادت نہیں دی تھی کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا سکے چنانچہ قاسم نے اوپر کے دودھ پر پرورش پائی تھی اور چودھرائن کو اس کا بڑا قلق تھا۔ اسے یقین تھا کہ ماں کا دودھ نہ پی سکنے کی وجہ سے قاسم کے اندر کمزوری رہ گئی ہے اور اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے وہ ہر وقت جتن کرتی رہتی تھی۔ اسی حویلی میں بلقیس بھی ماں کے دودھ کے بغیر ہی پلی تھی لیکن اس کے بارے میں چودھرائن نے کبھی ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔ اللہ کی شان تھی کہ بلقیس کو بھوری کا دودھ بڑی آسانی سے موافق آگیا تھا اس لیے وہ چودھرائن کی توجہ کے بغیر بھی آسانی سے پل بڑھ گئی تھی۔

''چھیتی چھیتی یہ حلوا کھا کر ختم کرلے تو فیر میں تیرے لیے ناشتا لگواتی ہوں۔ اصلی گھی میں بکرے کا مغز بنوایا ہے تیرے لیے۔ باداموں کی طرح مغز بھی بڑا فائدہ دیتا ہے دماغی کام کرنے والوں کو۔ پڑھنے لکھنے میں کوئی کم دماغ خرچ ہوتا ہے بندے کا۔'' اپنے ہاتھ سے قاسم کو حلوا کھلاتے ہوئے وہ اسے آگاہ کررہی تھی اور اس بات کو سن کر قاسم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوتی بلقیس نے یہ منظر دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایک نظر ڈالنے پر ہی اسے ساری صورتِ حال سمجھ آگئی تھی اور جان گئی تھی کہ قاسم کس مشکل سے دوچار ہے۔ ادھر اس کی آمد سے بے خبر قاسم صدمے کی سی کیفیت میں ماں سے کہہ رہا تھا۔

''کیا کہا آپ نے۔ اس اتنے ہیوی حلوے کے بعد ابھی ناشتے کی کسر بھی باقی ہے؟''

''ہاں تو فیر یہ تو حلوا ہے کوئی ناشتا تو نہیں۔ ناشتا تو تجھے کرنا ہی پڑے گا۔ شہر جا کر دیسے ہی تیری عادتیں بگڑ گئی ہیں۔ اتنی دیر نال جاگا ہے کہ دھوپ چڑھ آئی ہے۔ ابھی اتنی دیر سے ناشتا کرے گا تو فیر دوپہر کا کھانا پتا نہیں کب کھائے گا۔ ایسی بے پروائیوں سے ہی تو، تو نے اپنی صحت برباد کرلی ہے۔'' اس کے دہشت زدہ ہو کر کیے گئے سوال پر چودھرائن نے اسے گھرکا۔ بلقیس نے اس ''برباد صحت'' کو دیکھا تو اس کی ہنسی نکل گئی۔ اچھا بھلا قاسم ماں کی ممتا کو کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ ہنسی نکلنے کی ایک وجہ قاسم کی حالت بھی تھی، وہ یوں دہشت زدہ نظر آرہا تھا جیسے چودھرائن اسے کھلانے پلانے کے بجائے ذبح کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ ہنسی کی آواز پر قاسم اور چودھرائن دونوں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن دونوں کا ردعمل مختلف تھا۔ چودھرائن کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں جبکہ قاسم کی آنکھوں میں روشنیاں سی جگمگانے لگی تھیں اور وہ یک ٹک بالکل سادہ نیلے سوٹ میں ملبوس سر پر نیلا ہی جارجٹ کا دوپٹا اوڑھے بلقیس کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نیلے رنگ میں اس کی گوری رنگت زیادہ ہی دمک رہی تھی۔

''ادھر کون سے لطیفے سن لیے تو نے جو یوں منہ کھول کر ہنس رہی ہے؟'' چودھرائن نے بیٹے کی ان نظروں کو تو دیکھا ہی نہیں تھا جنہوں نے بلقیس کو چھوئی موئی کی طرح خود میں سمٹنے پر مجبور کردیا تھا اور محض ہنسنے کے جرم میں اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کررہی تھی۔

''وہ..... وہ میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ ادھر یہ جو چھوٹے پھول ہیں انہیں نیلے دھاگے سے کاڑھ دوں کیا۔ آپ نے سرخ رنگ لگانے کو کہا تھا لیکن دوسرے دھاگوں کے ساتھ سرخ سے زیادہ نیلے کا کنٹراسٹ اچھا لگ رہا ہے۔'' اس وقت وہ چودھرائن کے لہجے کی سختی سے زیادہ قاسم کی نگاہوں کی حدت سے پزل ہو رہی تھی لیکن خود کو انجان ظاہر کرنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے چودھرائن سے مخاطب تھی۔

قاسم واقعی بہت دیر سے سو کر اٹھا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت چودھرائن اسے اپنے پاس بٹھائے کھلانے پلانے میں مصروف ہوگی۔ اس کے حساب سے تو قاسم کو اس وقت حویلی سے باہر ہونا چاہیے تھا۔ وہ چھٹیوں میں جب بھی حویلی آتا تھا تو صبح چودھری دلاور کے ساتھ ہی باہر نکل جاتا تھا پھر واپسی اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتی تھی۔ چودھری دلاور اس خیال سے کہ آگے چل کر اسے ہی زمینوں وغیرہ کے معاملات دیکھنے ہیں، موقع ملنے پر اسے اپنے ساتھ لے جاتے رہتے تھے لیکن آج وہ جاگا ہی نہیں تھا تو وہ اسے ساتھ کیسے لے جاتے اور بلقیس کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔

''لاؤ کھا۔ دیکھ کر بتاتی ہوں۔'' اس کی حالت سے بے خبر چودھرائن نے نخوت سے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تو وہ سہج سہج چلتی ان کے قریب پہنچی اور بڑے سے فریم میں لگا کپڑا ان کے سامنے کیا۔ کشیدہ کاری کے اس خوبصورت نمونے میں ابھی چھوٹے سائز کے بہت سے پھول کاڑھنے باقی تھے اور صرف دو پھولوں کو الگ الگ نیلے اور سرخ رنگ کے دھاگے سے کاڑھا گیا تھا۔ چودھرائن بغور دونوں کا جائزہ لینے لگی۔ نیلے رنگ کے دھاگے سے کاڑھا گیا پھول نمایاں طور پر زیادہ خوبصورت

لگ رہا تھا لیکن چودھرائن کو اپنے تجویز کردہ رنگ کے مقابلے میں دوسرے رنگ کو ترجیح دینے میں تامل تھا۔ یہ اسی کی قمیص تھی۔ بلقیس کے ہاتھ کی صفائی اور نفاست کی وجہ سے وہ اکثر اپنے دوپٹے اور قمیص اسے کشیدہ کاری کے لیے دیتی رہتی تھی اور بلقیس بغیر ماتھے پر شکن لائے ہر بار یہ نازک اور پُرمشقت کام انجام دے ڈالتی تھی۔

''نیلا رنگ ٹھیک رہے گا اماں۔ نیلے رنگ کی تو دمک ہی الگ محسوس ہو رہی ہے۔'' ماں کے قریب بیٹھے قاسم نے بظاہر نیلے پھول کے حق میں ووٹ دیا لیکن جس طرح اس کی نظریں بلقیس پر جمی تھیں، وہ سمجھ گئی کہ پھول کو نہیں اسے سراہ رہا ہے۔ نیلے دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ فریم ہاتھ میں پکڑے غور و فکر کرتی چودھرائن کو اس چور لمحے کا تو پتا نہیں چلا لیکن قاسم کے بولنے پر ایک دم ہی احساس ہوا کہ اس کی موجودگی میں بلقیس کا اتنی دیر یہاں ٹھہرا رہنا مناسب نہیں ہے۔ سخت لہجے میں بولی۔

''نیلا ٹھیک لگ رہا ہے، تو نیلا ہی دھاگا لگا دے۔ اتنی سی بات پوچھنے کے بہانے ادھر آنے کی کیا لوڑ تھی۔'' جواب میں بلقیس یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ آپ کی اجازت کے بغیر میں اپنی مرضی کا رنگ استعمال کرنے کی جرأت کیوں کر سکتی تھی؟ اس نے خاموشی سے فریم اور اس میں لگا کپڑا چودھرائن کے ہاتھ سے لیا اور کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑ گئی۔ اب قاسم کی نظر اس کی پشت پر ٹکی تھی۔ بھورے بالوں کی لمبی چٹیا پشت پر پھیلے دوپٹے سے بھی نیچے تک آ رہی تھی اور اس کے ہر قدم کے ساتھ بڑے ردھم سے تھرک رہی تھی۔ اس بار چودھرائن بھی اس کی نظروں سے بے خبر نہیں رہ سکی اور دانت کچکچا کر رہ گئی۔ بس چلتا تو بلقیس کے کمرے سے نکلنے سے قبل ہی اسے مچھریا مکھی بنا ڈالتی تاکہ وہ قاسم کو نظر ہی نہ آئے لیکن بس ہی تو نہیں چلتا تھا۔

☆☆☆

''میں غلط تھا۔ سرخ کی دمک کے آگے تو نیلا کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ اسے کھوجتا ہوا پائیں باغ میں آیا تھا۔ سبز پودوں کے بیچ لکڑی کے جھولے پر سرخ لباس میں بیٹھی بلقیس اسے کسی بیر بوٹی کی طرح لگی تھی اور بے ساختہ ہی لبوں سے یہ جملہ پھسلا تھا۔ بلقیس جس کے ہاتھوں میں اس وقت بھی فریم اور سوئی دھاگا موجود تھا اس کی آواز پر اس بری طرح چونکی کہ سوئی انگلی میں چبھ گئی۔ فوراً ہی خون کا ایک ننھا سا قطرہ اس کی انگلی کی پور پر ابھرا۔

''یہ کیا کر لیا۔ لاؤ دکھاؤ۔'' قاسم نے یوں بے چینی سے اس کا ہاتھ تھاما جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ اس کی بے چینی جتنی ہی سرعت سے بلقیس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالا اور دوپٹے کا پلو انگلی کی پور پر رکھ کر ہلکے سے دبایا۔ خون کا ننھا سا قطرہ سرخ آنچل میں یوں گم ہو گیا کہ اس کا نشان بھی ملنا مشکل تھا۔

''سارا وقت سوئی دھاگا ہاتھ میں لیے اپنی آنکھیں کیوں پھوڑتی رہتی ہو۔ بازار میں سب کچھ مل جاتا ہے پھر کیا ضرورت ہے خود اتنی تکلیف اٹھانے کی؟'' اس کی انگلی کی پور پر ہوتی چبھن قاسم اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا سو اسے ٹوک بیٹھا۔

''یہ مامی کی قمیص ہے۔ انہیں اس جمعے کو ملک صاحب کے گھر میلاد میں پہن کر جانی ہے اس لیے ذرا زیادہ وقت لگانا پڑ رہا ہے ورنہ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے اور میں اپنی سہولت کے حساب سے بہت شوق اور آرام سے کر لیتی ہوں۔'' بلقیس اس کی کیفیت کو سمجھ رہی تھی چنانچہ نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے مجھ سے چھپ کر بیٹھنے کے لیے یہ کام پکڑا ہوا ہے۔ میں تمہاری ایک جھلک کے لیے بھی ترس جاتا ہوں۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ میں صرف تم سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کی خاطر دوستوں کے ساتھ تفریح کا پروگرام چھوڑ کر گاؤں آیا ہوں۔'' ناراض لہجے میں کیے جانے والے اتنے واضح اظہار نے بلقیس کو کپکپا کر رکھ دیا۔ اس کی نظروں کے پیغام تو وہ کافی عرصے سے پڑھ اور سمجھ رہی تھی لیکن وہ یوں زبان سے بھی اپنے دل کی بات کہہ جائے گا اس کا اندازہ نہیں تھا۔

''ایسے سر جھکا کر کیا بیٹھی ہو۔ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتیں۔'' اسے خاموش پا کر قاسم کچھ اور بھی شیر ہوا اور اسے ہلکے سے گھرکا۔

''پلیز قاسم! میرے ساتھ ایسے بات مت کرو۔'' اس نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے آنکھوں میں آئے آنسو روکنے کی کوشش کی اور بھرائی ہوئی آواز میں التجا کی۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں تم سے محبت کرنے سے باز رہوں؟'' قاسم نے بھی بات کو زیادہ گھمایا پھرایا نہیں اور سیدھا سوال کر لیا۔

''ہاں باز رہو کیونکہ تمہیں اس کی اجازت نہیں مل سکتی۔'' سوال سیدھا تھا تو جواب بھی سیدھا ہی دیا گیا۔

''محبت کسی کی اجازت لے کر نہیں کی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ ہر پابندی کو توڑ کر تم تک آ سکوں فی الحال بس اس لیے خاموش ہوں کہ وقت آنے پر ہی یہ جنگ شروع

کروں گا لیکن تم تو مجھ سے یوں بے رخی سے پیش نہ آیا کرو۔ مسافر ہوں زادِ راہ کے طور پر اپنے دیدار اور مسکراہٹ کا تحفہ دے دیا کرو۔'' قدرے تیز لہجے میں بولتا وہ بات کے اختتام تک ریشم میں ڈھل گیا تھا۔

''مجھے اس آگ میں مت کھینچو قاسم! میں کسی جنگ کا حصہ نہیں بننا چاہتی کیونکہ میرے سارے ہتھیار تو میری ماں کی جوانی کی جسارت نے پہلے ہی کند کر رکھے ہیں۔ میں ''ماں جیسی'' ہونے کا طعنہ نہیں سننا چاہتی۔'' وہ بولنے کے بجائے جیسے کراہی تھی۔

''تم سے جنگ لڑنے کا کہہ ہی کون رہا ہے۔ ہم ہیں نا یہ جنگ لڑنے کے لیے تم تک تو گرم ہوا کا ایک تھپیڑا بھی نہیں آنے دیں گے۔'' وہ اب مکمل طور پر پرسکون تھا اور اس کو بڑے میٹھے لہجے میں تسلی دے رہا تھا۔

''ہم؟'' بلقیس ساری بات میں صرف اس ایک لفظ پر اٹک گئی تھی۔

''ہاں ہم۔ میرا مطلب ہے میں اور ابا جی۔ ابا جی نے میرے شہر جانے سے پہلے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا تھا۔ دیکھ قاسم! میں اپنی اور تیری خواہش کی تکمیل کے لیے تجھے شہر بھجوا تو رہا ہوں لیکن یاد رکھنا کہ تجھے لوٹ کر ادھر ہی آنا ہے اس لیے شہر میں اپنا دل نہ لگانا۔ تیرے لوٹنے تک میں بلقیس کو تیرے نام پر بٹھا کر رکھوں گا۔ اس کے سوا کسی اور کا سوچا بھی تو یاد رکھنا تیرا میرا رشتہ وہیں ختم ہو جائے گا۔ میں ابا جی کو یہ تو بتا نہیں سکتا تھا کہ آپ کی بات پر میرا دل جھوم اٹھا ہے اور دل چاہتا ہے خوشی میں آپ کے سامنے بھنگڑا ڈالوں بس سعادت مندی سے اتنا ہی کہہ سکا کہ جیسا آپ کا حکم ابا جی!'' وہ اس وقت کو یاد کر کے اب بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا لیکن بلقیس مجسم حیرت بنی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میری بات پر یقین نہیں آیا کیا؟'' قاسم نے اس کی آنکھوں کی بے یقینی پڑھ کر پوچھا تو اس نے جھٹ سر کی جنبش سے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔

''یہ بات ہے تو چلو چل کر ابا جی سے تصدیق کروا دیتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر یوں کھینچنے لگا جیسے اٹھا کر اپنے ساتھ چودھری دلاور کے پاس لے جانا چاہتا ہو۔

''پاگل ہو گئے ہو۔ میں کیسے ماما جی کے پاس ایسی بات کی تصدیق کے لیے جا سکتی ہوں۔'' اس نے خفگی دکھانے کی کوشش کی تھی لیکن حیا کے بوجھ تلے آواز کانپ گئی تھی اور عارض دہک اٹھے تھے۔ گندمی رنگت والا نوجوان قاسم جو نگاہوں میں پیار کے پیغام لیے اسے دیکھا کرتا تھا خود اسے بھی تو اچھا لگتا تھا لیکن حالات سے ڈر کر وہ اپنے آپ سے بھی اس بات کو چھپاتی تھی اور اب یہ خوش خبری ملی تھی کہ اس کا اور قاسم کا ساتھ طے کیا جا چکا ہے تو دل بے طرح دھڑکنے لگا تھا اور دل کی اس سرشاری میں اسے قاسم کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ ایک طرح سے اس نے اقرار کر لیا تھا کہ چودھری دلاور سے تصدیق کروائے بغیر بھی اسے قاسم کی بات کا اعتبار ہے۔ اتنا تو وہ اسے جانتی ہی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا اور باپ کا نام لے کر تو کوئی جھوٹ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''میں تو بس ایسے ہی تمہیں چھیڑ رہا تھا، ورنہ اتنا پاگل تو واقعی نہیں ہو گیا ہوں کہ اس بات کی تصدیق کے لیے تمہیں ابا جی کے پاس لے جاؤں اور جواب میں وہ ایسی چھترول کریں کہ مجھے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔'' وہ اس کی ناراضی کے جواب میں بولا اور ہنستا ہوا اس کے ساتھ ہی جھولے پر بیٹھ گیا۔ بلقیس کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

''اب تم یہاں سے جاؤ قاسم۔ کسی نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔'' اسے بھی قاسم کا اپنے پاس بیٹھنا اور ہاتھ میں ہاتھ لینا اچھا لگ رہا تھا لیکن مصلحت کے تقاضوں کو بھی اچھی طرح سمجھتی تھی سو آہستہ سے اسے ٹوکا۔ قاسم جو اس کے ہاتھ کے گداز اور وجود کی خوشبو سے مدہوش ہوا جا رہا تھا یکدم ہوش میں آیا اور آہستہ سے بولا۔

''ٹھیک ہے جاتا ہوں لیکن یاد رکھنا تم میری ہو اور تم پر بس میرا حق ہے۔'' بات کے اختتام پر اس نے بلقیس کے ہاتھ کی پشت پر ایک دم بوسہ دے کر گویا مہر بھی لگا دی یہ بوسہ یوں بلقیس کے مساموں میں جذب ہوا کہ جسم کے ایک ایک خلیے نے اس کی حدت کو وصول کیا اور وہ صرف بلقیس نہ رہی ''قاسم کی بلقیس'' ہو گئی۔

☆☆☆

کہنے والے سچ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ بلقیس کا عشق بھی مشک کی طرح اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا تھا۔ بنانے والے نے اسے رچ کر سوہنا بنایا تھا لیکن اب تو لگتا تھا اس حسن میں بجلیاں سی کوندتی ہوں۔ آنکھیں ایسے چمکنے لگی تھیں جیسے کسی نے ان میں ستارے کوٹ کر بھر دیے ہوں۔ گلابی ہونٹوں کی مسکراہٹ آمدِ بہار کا سندیس تھی تو چال کی مستی ہرنوں کو مات دیتی تھی۔ ہمیشہ ایک جد میں رہنے والی قدرے اداس سی لڑکی ہر وقت یوں خوش نظر آنے لگی تھی جیسے زندگی بھر کبھی غم سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ یہ اس کی خوشی کی انتہا ہی تھی کہ وہ چودھرائن سکینہ کی تلخ باتوں اور رویوں پر بھی اداس

ہونا بھول گئی تھی۔ بدتمیزی اور حکم عدولی تو پہلے بھی کبھی اس نے نہیں کی تھی لیکن اب تو لگتا تھا کہ چودھرائن کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ چودھرائن کی طرف سے حکم جاری ہو، نہ ہو ہر رات سونے سے قبل اس کی ٹانگیں دبانا، ہر تیسرے دن بالوں میں تیل کا مساج کرنا، ہفتہ وار ناخن تراشنا، دھلے کپڑے سنبھال کر رکھنا، سب اس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ پہلے بھی وہ یہ کام اکثر کرتی رہتی تھی لیکن خود سے نہیں تعمیلِ حکم میں۔ چودھرائن اس کی ان تبدیلیوں کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھی اور جوں جوں غور کرتی جا رہی تھی اس کے دل میں شکوک و شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔ جوان قابل بیٹوں کی مائیں تو ویسے بھی ان معاملات میں بہت حساس ہوتی ہیں اور فوراً تاڑ لیتی ہیں کہ ان کا بیٹا ہتھیانے کے لیے یہ ساری تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ چودھرائن کو تو ویسے ہی شک تھا کہ قاسم، بلقیس کے حسنِ جہاں سوز پر فدا ہے، سو اسے یہی لگا تھا کہ اس بار جو قاسم گاؤں آنے کے بعد واپس گیا ہے تو بلقیس کو یہ پٹی پڑھا کر گیا ہے کہ میری ماں کی خدمت کر کے اس کا دل مٹھی میں لے لو تو میں تمہارا ہو جاؤں گا لیکن ایسا مرتے دم تک نہیں ہو سکتا تھا۔ بلقیس، زینب کی بیٹی تھی اور چودھرائن کے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ وہ اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بلقیس کو طوعاً و کرہاً حویلی میں رہنے تو دیا تھا لیکن زینب کے حصے کی نفرت اس سے نبھاتی رہی تھی ادھر بلقیس کا معاملہ بالکل جدا تھا۔ چودھرائن کے سخت اور تلخ رویے کے باوجود اس نے کبھی ان سے نفرت نہیں کی تھی۔ ہاں بچپن میں ڈرتی بہت تھی لیکن جب بڑی ہوئی اور ان کی خود سے نفرت کی وجوہات کو سمجھا تو وہ اسے زیادہ غلط محسوس نہیں ہوئیں۔ اس نے ہمیشہ ان کے رویوں کے لیے انہیں مارجن دیا اور اب تو بات ہی اور ہو گئی تھی۔ وہ قاسم کی بلقیس ہو گئی تھی سو قاسم کی ماں سے محبت کو بھی اس نے اپنا فرض مان لیا تھا۔ وہ ان کا دل موم کرنے یا قاسم اور اپنے رشتے کی راہ ہموار کرنے کے لیے یہ ساری خدمت گزاری نہیں کرتی تھی بلکہ اسے ایسا کر کے دلی خوشی ہوتی تھی لیکن جن کے اپنے دلوں میں کھوٹ ہو وہ دوسروں کی کھری محبت کو بھی پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چودھرائن کو بھی بلقیس کے رویوں میں کھوٹ نظر آتا تھا اور اس کھوٹ کی جڑ پکڑنے کے لیے اس نے اپنی خاص ملازماؤں کی ذمے داری لگا دی تھی۔ ملازماؤں کو یہ کھوجنے میں زیادہ نہ لگی۔ انہوں نے رات کے پچھلے پہر بلقیس کو پائیں باغ کے جھولے پر بیٹھ کر قاسم سے باتیں کرتا سن لیا۔ اصل میں یہ موبائل فون قاسم ہی شہر جاتے وقت اسے دے گیا تھا کہ جب چاہوا کا تمہاری آواز سن لیا کروں گا۔ اعتراف کے مرحلے سے گزرنے کے بعد فریقین کے پاس انکار کی گنجائش نہیں رہتی سو بلقیس نے وہ موبائل فون رکھ لیا تھا اور اب خود بھی قاسم کی پیار بھری باتوں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا یہی ایک عادت مصیبت بن جائے گی۔ چودھرائن کے لیے ملازماؤں کی پہنچائی ہوئی رپورٹ اپنے شک کی تصدیق ثابت ہوئی اور یہ تصدیق برسوں سے حسد میں جلتے اس کے دل کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے قبل کہ قاسم، بلقیس کو بیوی بنانے کی فرمائش لے کر اس کے سامنے کھڑا ہو، اسے یہ فتنہ ہی ختم کر دینا چاہیے۔ بلقیس کی شادی کروا کر اسے منظر سے ہٹانے کی کوشش کو وہ پہلے ہی ناکام ہوتا ہوا دیکھ چکی تھی اور سمجھ گئی تھی کہ زبان سے چودھری دلاور نے بھلے ہی کچھ کہا تھا لیکن اس سارے معاملے میں وہ بیٹے کا ہی ساتھ دے گا اور اپنی لاڈلی بلقیس کو خوشی خوشی اس سے بیاہ دے گا۔ وہ اپنی زندگی میں اس دن کو آتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی چنانچہ راست اقدام کا فیصلہ کیا اور یہ اس کے کیے کا ہی نتیجہ تھا کہ عصر سے ذرا پہلے ساری حویلی رسولاں کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ چودھری دلاور بھی اس وقت حویلی نہیں آتے تھے لیکن اس روز جانے کیوں دل عجیب بوجھل سا تھا اور کسی کام میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دل کی بےچینی سے گھبرا کر وہ ذرا دیر آرام کے خیال سے جلد حویلی لوٹ آئے تھے لیکن مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی رسولاں کی چیخوں نے دل دہلا دیا تھا۔ صورتِ حال کی کھوج بھی فوراً مل گئی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولے کے لیے لیٹ جانے والی بلقیس کو اچانک ہی الٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔ آج کے کھانے میں اس کا پسندیدہ بھنڈی گوشت کا سالن بھی شامل تھا اور اس نے کھانا معمول سے ذرا زیادہ ڈٹ کر کھایا تھا۔ اس لیے خود اسے اور رسولاں کو الٹیاں شروع ہونے پر پہلا خیال یہی آیا کہ کھا کر سونے سے بدہضمی ہو گئی ہے۔ رسولاں نے اپنے آزمودہ نسخے استعمال کروا کر اس کی الٹیاں روکنے کی کوشش کی لیکن وہاں تو یہ حال تھا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ گھبرا کر رسولاں نے اسے ڈاکٹر کو دکھانے لے جانے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ اگلی الٹی نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ اس الٹی میں خون کی ایک بڑی مقدار شامل تھی۔

''میرا کلیجا کٹ رہا ہے اماں۔'' بلقیس کراہی اور رسولاں نے ہوش سے بیگانی ہو کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ بے شک اس نے بلقیس کو جنم نہیں دیا تھا لیکن پالا تو ایک ماں کی طرح ہی تھا۔ اسے اس سے محبت نہ ہوتی یہ کیسے ممکن تھا۔ بلقیس کی اس حالت پر تڑپنے والا دوسرا دل چودھری دلاور کا

تھا۔ انہیں اپنے دل کی سارے دن کی بے چینی کی وجہ بھی سمجھ آ گئی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی بلقیس کو اپنی بانہوں میں بھر کر دوڑ لگائی تھی اور گاڑی میں ڈال کر سیدھا اسپتال لے گئے تھے۔ ان کی جدوجہد سے گاؤں میں قائم ہونے والا یہ اسپتال اس روز ان کی نیکی کا صلہ بن کر بلقیس کی زندگی بچانے کا وسیلہ بن گیا تھا۔

''زہر خورانی کا کیس ہے چودھری صاحب! ہم نے معدہ واش کر دیا ہے اور ضروری دوائیں بھی دے رہے ہیں لیکن فوری طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ دعا کریں کہ اللہ بی بی کو زندگی دے۔ آئندہ چھتیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔'' ڈاکٹر نے ایمرجنسی سے باہر آ کر انہیں اطلاع دی تو وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔

''زہر خورانی..... لیکن میری بلقیس کیوں کھانے لگی زہر؟'' ان کے لہجے میں حیرت سی حیرت تھی۔

''زہر خود کھایا جائے ضروری تو نہیں، کوئی دھوکے سے کھلا بھی سکتا ہے۔'' ڈاکٹر نے ان کی سوچ کو ایک نئی راہ دی تو وہ چونک گئے۔ بلقیس سے اتنی نفرت کون کرتا ہے جو اس سے اس کی زندگی چھیننے کی کوشش کرے؟ وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

''قاسم پتر! ابھی اور اسی وقت گاؤں آ جائیں بہت کلا (اکیلا) ہوں، مجھے تیری ضرورت ہے۔'' انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے قاسم کا نمبر ملایا اور اسے پکارا۔

''سب ٹھیک تو ہے ابا جی! کیا ہوا ہے مجھے بتائیں؟'' قاسم ان کے لہجے پر چونک گیا۔ یوں بھی ان کا اس طرح فون کرنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ انہوں نے بھی اس انداز میں اسے کال نہیں کی تھی۔

''بس کہا نا تو آ جا مجھے تیری ضرورت ہے۔'' اس بار چودھری نے اپنے لہجے کو حتی الامکان سنبھال لیا۔ قاسم گاؤں سے دور تھا اور اسے ایک لمبی ڈرائیو کر کے شہر سے یہاں آنا تھا۔ وہ اسے کسی بری خبر سے آگاہ نہیں کر سکتے تھے۔

''اماں تو ٹھیک ہیں نا اور بلقیس.....؟'' چودھری دلاور اس سے گفتگو کر رہے تھے اس لیے اس نے حویلی میں موجود اپنی باقی دو اہم ہستیوں کی بابت استفسار کیا۔

''کیا کسی کے ٹھیک نہ ہونے کی خبر ہی آئے گا۔ باپ کی پکار پر نہیں آ سکتا؟'' چودھری دلاور نے بڑے طریقے سے اس کا سوال گول کر دیا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ابا جی! میں بس ابھی نکلتا ہوں۔'' قاسم اس کے جذباتی حملے کی مار نہ سہہ سکا اور اپنے سارے سوال جواب چھوڑ کر جواب دیا تو چودھری دلاور کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کتنا پیار اپنا تھا وہ کہ اس کے ہوتے دنیا کی ہر شے خوبصورت لگنے لگتی تھی لیکن چودھرائن جیسی ناشکری عورت اس نعمت کو پا کر بھی ماضی کے دھندلکوں میں گھومتی اپنے اندر نفرت کا زہر پالتی رہی تھی اور آج اس نے یہ زہر بلقیس کے اندر اتار دیا تھا۔ چودھرائن کا خیال آیا تو انہوں نے اپنے ساتھ اسپتال آنے والی رسولاں کو وہیں چھوڑا اور خود اسپتال سے نکل کھڑے ہوئے۔

''کیسی ماں ہے تو کہ کبھی تجھے اس معصوم پر رحم نہ آیا۔ ایسا کیا جرم کیا تھا اس نے کہ تو نے اس سے اس کی زندگی چھیننے کی کوشش کی؟'' سکینہ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ سوال کرتے ہوئے نہ وہ غصے میں تھے اور نہ طیش میں۔ بس ایک ہاری ہوئی کیفیت تھی۔

''یہ تم مجھ پر کیسا جھوٹا الزام لگا رہے ہو چودھری دلاور! میں کیوں دینے لگی اسے زہر اور میں دے بھی کیسے سکتی ہوں۔ میں کیا اپنے ہاتھ سے اسے نوالے کھلاتی ہوں جو نوالے میں زہر ملا کر اسے کھلا دیا۔'' چودھرائن نے چمک کر اسے جواب دیا۔

''نہ جھوٹ بول سکینہ! مجھے اچھی طرح خبر ہے کہ تیرے ایک اشارے پر ادھر سب کچھ ہو جاتا ہے۔ غیر تجھے کیا لوڑ

پاگل خانہ

پاگل خانے میں آتے ہی ایک شخص بے تحاشا ہنسنے لگا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے جو اس طرح ہنس رہے ہو؟''

پاگل نے جواب دیا۔ ''میں اور میرا بھائی ہم شکل تھے، کلاس میں شرارت وہ کرتا اور ماسٹر صاحب سزا مجھے دیتے۔ بازار میں چوری وہ کرتا اور سزا مجھے بھگتنی پڑتی۔ ایک لڑکی سے منگنی میری ہوئی اور شادی اس نے کر لی۔ آج میں نے تمام زیادتیوں کا بدلہ لے لیا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''وہ اس طرح کہ مر تو میں گیا تھا، لیکن لوگوں نے دفن اس کو کر دیا۔ ہاہاہا۔''

مرسلہ۔ محمد اسلم، کراچی

پڑی تھی اپنے ہاتھ سے زہر ملا کر اسے نوالہ کھلانے کی۔"

"جھوٹ میں نہیں بول رہی تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ ساری نوکرانیوں سے پوچھ تاچھ کرلی ہے میں نے۔ بلقیس کدھری مصروف تھی اور آج اس نے سب سے آخر میں خود اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر کھایا تھا۔ کھانے میں کچھ ہوتا تو پہلے ہم لوگوں کو ہوتا۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ یہ عاشقی معشوقی میں پڑنے والے کب کیا کر جائیں، کسی کو پتا نہیں ہوتا۔ جانے کس سے موبائل پر باتیں کرتی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے دھوکا دے دیا تمہاری لاڈلی کو اس کے عاشق نے اور اس نے مایوس ہو کر خودکشی کرلی۔" سکینہ کے لہجے میں بلقیس کے لیے زہر تھا۔ چودھری دلاور کو اس زہر نے نہیں اس کے الفاظ نے جو لگایا اور سر اٹھاتے لہجے میں پوچھنے لگے۔

"تجھے کیسے خبر ہوئی اس بات کی؟"

"مجھے نہیں ہوگی تو غیر کسے ہوگی۔ مالکہ ہوں میں اس حویلی کی، یہاں پتا بھی کھڑکے تو مہینوں خبر ہو جاتی ہے۔" چودھرائن نے فخر سے جواب دیا۔

"پھر تو تجھے اس بات کی بھی خبر ہوگی کہ بلقیس کو موبائل فون قاسم نے لاکر دیا تھا اور وہ فون پر اسی سے باتیں کیا کرتی تھی۔" براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے چودھری دلاور کی نظروں میں ایسی سرد مہری تھی کہ چودھرائن کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی اور وہ کوشش کے باوجود اپنے لبوں سے "نہیں" کا لفظ ادا نہیں کرسکی۔

"تجھے پوری خبر تھی سکینہ! تو سب جانتی تھی اسی لیے تو نے میری بلقیس کو زہر کھلا دیا۔ یہ تو نے خود پر بڑا ظلم کیا۔ اپنے ہاتھوں اپنی کوکھ اجاڑ دی۔" چودھری دلاور کے الفاظ تھے کہ کسی نے سکینہ پر میزائل داغ دیے تھے۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے چودھری دلاور کو ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل جانے کا سوچ رہی ہو لیکن وہاں جو تحریر لکھی تھی اس نے اس ہلا کر رکھ دیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو چودھری دلاور!" بہ مشکل اس کے لب یہ سوال کرسکے۔

"وہی جو سچ ہے۔" چودھری دلاور کے لہجے میں ذرا بھی لرزش نہیں تھی۔

☆☆☆

دسمبر کی وہ سرد رات چودھری دلاور پر بہت بھاری تھی۔ اس رات زینب نے اپنی جان گنوائی تھی اور اپنی ایک نشانی بیٹے کی صورت چھوڑ گئی تھی۔ وہ پریشان تھے کہ زینب کی اس نشانی کو کیسے سنبھال سکیں گے کہ چودھرائن کی طبیعت بگڑنے کی خبر ان تک پہنچی۔ اچانک ہی انہوں نے ایک بالکل انوکھا فیصلہ کیا۔ انہوں نے دائی صغراں اور رسولاں کو حکم دیا کہ چودھرائن جس بچے کو جنے اسے زینب کے بچے سے بدل دیا جائے۔ دونوں اس حکم کو سن کر ششدر رہ گئیں لیکن جن نمک کی ادائیگی کی شرط اس حکم کی تعمیل ٹھہری تو دونوں ہی کے لیے انکار ممکن نہیں رہا۔ دونوں نے تازندگی اس بات کو راز رکھنے کا عہد دیا اور چودھرائن کی خدمت میں پہنچ گئیں۔ چودھرائن نے صبح دم ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا تو ان کے لیے چودھری دلاور کے حکم کی تعمیل اور بھی آسان ہوگئی۔ دونوں ہی اس حقیقت سے واقف تھیں کہ چودھرائن صرف اور صرف بیٹے کی ماں بننے کا یقین رکھتی تھی۔ اگر اسے خبر دی جاتی کہ اس کے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتی۔ ان دونوں خصوصاً صغراں میں اس کا غصہ سہنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے خود کئی بار چودھرائن کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ بیٹا ہی ہے لیکن پیدا کرنے والے کے فیصلے نے اس کے تجربے کو شکست دے کر چودھرائن کو بیٹی کی ماں بنا دیا تھا۔ چودھری دلاور کے حکم کی تعمیل ویسے بھی واجب تھی۔ چودھرائن نے بیٹی کو جنم دیا تو اسے بیٹے سے بدلتے ہوئے ان کے دل کا بوجھ بھی کم ہوگیا۔ چودھرائن حسبِ توقع بیٹے کو پاکر بہت خوش ہوئی۔ بچہ شکل وصورت میں ننھیال پر گیا تھا اس لیے اسے گمان بھی نہیں ہوا کہ وہ زینب کے بیٹے کو پال رہی ہے۔ وہ تو یہی سمجھتی رہی کہ اس کے بیٹے نے ددھیال والوں کے نقوش چرائے ہیں۔ بیٹے میں کھو کر اسے کبھی اس بات کی فرصت نہیں ملی کہ بلقیس کے اندر اپنا آپ کھوجتی۔ اس کی وہ گوری رنگت، گھنے بال اور سرو قامتی سب ماں ہی کی تو وراثت تھے لیکن اس نے ہمیشہ یہی سوچا کہ سانولی سلونی زینب کی بیٹی اپنے ڈاکٹر باپ پر گئی ہے۔ قدرت نے بھی چودھری دلاور کی محبت اور ایثار کی لاج ایسے رکھی تھی کہ بلقیس کو نین نقش چودھرائن سے بالکل مختلف عطا کیے تھے۔ وہ اپنی ماں کی طرح خوبصورت تو تھی لیکن ماں جیسی نہ تھی کہ اس کی شکل لوگوں کو چونکا دیتی۔ اس کا مزاج بھی ماں جیسا نہیں تھا۔ وہ چودھری دلاور کی طرح نرم مزاج، صابر اور قانع تھی اس لیے اماں رسولاں کی محبت اور چودھری دلاور کی تھوڑی سی توجہ کے سہارے ہی آرام سے پروان چڑھ گئی تھی۔ اس نے چودھرائن کی نفرتوں کو بھی یوں سہہ لیا تھا جیسے جنگل میں پھوٹنے والا خودرو پودا موسم کی سختیوں کو سہہ لیتا ہے۔

"میں جانتا تھا سکینہ کہ تو زینب کی اولاد کو کبھی نہیں سہہ

سکے کی اس لیے بچہ بدلنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ دل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ تو بلقیس کو زینب کی بیٹی سمجھ کر اس سے نفرت کرے گی بھی تو تیری ممتا تیری راہ روک لے گی۔ بڑے بوڑھوں سے ہمیشہ ہی یہ سنتا آیا تھا کہ خون کی اپنی کشش ہوتی ہے اور خون، خون کو پہچان لیتا ہے خاص طور پر ماں کے دل میں تو اللہ نے ایسا کچھ فٹ کر رکھا ہے کہ بنا جانے بھی اس کے دل میں اپنی اولاد کے لیے محبت کا ابال اٹھنے لگتا ہے لیکن تیری نفرت نے ساری باتوں کو فیل کر دیا۔ تیری نفرت اتنی بڑی تھی کہ تیری ممتا سے بھی ہار گئی اور تو نے اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کی موت کا سامان کر دیا۔''

چودھری دلاور اس کے سامنے بیٹھ کر یہ سب کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور سکینہ میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ اپنے ساتھ کیے جانے والے اس دھوکے پر ان کا گریبان پکڑ لیتی۔ کس نے کیا کیا اس وقت وہ یہ سوچنے کے لائق ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ صرف ایک نکتے پر اٹکے ہوئے تھے کہ بلقیس اس کی بیٹی ہے۔ اس نے اس کی اپنی کوکھ سے جنم لیا ہے اور آج وہ اس کے ہی ہاتھوں لب گور پہنچ گئی ہے۔ ہاں یہ وہی تو تھی جس نے بلقیس کو قاسم کی زندگی سے نکالنے کے لیے بڑے طریقے سے منصوبہ بندی کی تھی۔ اس روز اس نے بلقیس کو اتنی بری طرح کاموں میں الجھا لیا تھا کہ اسے سب سے آخر میں ہی کھانا کھانے کی فرصت ملی تھی۔ بلقیس کو ان نخروں کی عادت نہیں تھی کہ کوئی کھانا اس کے سامنے پیش کرے۔ دیر سویر ہونے پر وہ خود بھی کھانا لے کر کھا لیتی تھی سو اس روز بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ بھنڈی گوشت کا بچا ہوا سالن خاص اس کی موت کا سامان کرنے کے لیے موجود ہے۔ وہ مر جاتی تو چودھرائن کے پاس خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے بہت سے دلائل تھے۔ حویلی میں سب نے وہی کھانا کھایا تھا اور بلقیس نے اپنے ہاتھ سے خود اپنے لیے کھانا نکالا تھا۔ یہ دو نکات ہی اس کے نزدیک کافی تھے۔ دیگچی میں بچا ہوا سالن پھینک کر اسے دھونے کا فریضہ بھی اس کی وفادار ملازمہ ہاتھ کے ہاتھ ہی انجام دے چکی تھی اور چودھرائن کے حساب سے اس کے جرم کا کوئی ثبوت اور نشان باقی نہ رہا تھا لیکن چودھری دلاور پر اس کی کسی دلیل اور منطق نے اثر نہیں کیا تھا اور وہ چودھرائن کے جرم کو ایسے جان گئے تھے جیسے ان پر یہ سب الہام ہوا ہو۔ اس الہام کے بعد انہوں نے چودھرائن پر حقیقت کا انکشاف کر کے ایک ہی جھٹکے میں ان ساری تکلیفوں کا بدلہ لے لیا تھا جو وہ چودھرائن کے بلقیس کے ساتھ روتے پر محسوس کرتے تھے۔ قاسم، زینب کا بیٹا ہونے کی وجہ سے انہیں پیارا تھا تو بلقیس اپنی بیٹی ہوتے ہوئے کیوں پیاری نہ ہوتی لیکن اس بیٹی کو جو انہیں بہت پیاری تھی، وہ کبھی کھل کر پیار نہیں کر سکے تھے کہ چودھرائن کی نفرت کو یہ منظور ہی نہ تھا۔

''تم یہاں سے جاؤ چودھری دلاور! میں اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔'' چودھری دلاور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ ان کے دل میں ملال سا بھی تھا کہ کیونکر انہوں نے اس رات ایسا کڑا فیصلہ کیا کہ بلقیس سے جیتے جی اس کے ماں باپ چھن گئے اور بالآخر وہ اپنی ماں کے ہاتھوں ہی موت کی دہلیز تک پہنچ گئی لیکن ان کے مقابلے میں چودھرائن کی آنکھوں میں نمی تک نہیں تھی۔ وہ کسی پہاڑ کی طرح ساکت اور سپاٹ بیٹھی ہوئی تھی اور اسی سرد و سپاٹ لہجے میں اس نے چودھری دلاور سے یہ بات کہی تھی۔ چودھری نے اس کے جملے پر اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک ماں اتنی بے حسی کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے لیکن وہ سکینہ تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ چودھری دلاور نے اس پر لعنت بھیجی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی پہاڑ ٹوٹا اور ٹوٹ کر بکھرنا شروع ہو گیا بالکل ایسے جیسے پہلے ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو چکا ہو۔ یہ ریزہ ریزہ پہاڑ فریاد کرتا ہوا اپنے رب کے آگے جھکا تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ رب سے بیٹی کی زندگی مانگی جاتی۔ وہاں صرف توبہ طلب کی جا رہی تھی۔ ندامت میں ڈوبی ایسی توبہ جو سیدھی عرش تک پہنچتی ہے اور رب اپنے قہار اور جبار ہونے کی صفت پر رحمٰن و رحیم ہونے کی صفت کو ترجیح دے ڈالتا ہے۔

☆☆☆

''قاسم!'' چودھری دلاور نے آہستہ سے آواز دی تو کھڑکی سے باہر کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے قاسم ان کی طرف پلٹا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی اور خالی پن تھا۔ حقیقت کے انکشاف کے بعد سے وہ کچھ ایسی ہی گم صم سی کیفیت میں رہنے لگا تھا۔ بلقیس کی زندگی کے لیے تڑپتے چودھری دلاور نے خود اسے سب کچھ بتایا تھا۔ چھپانے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے وہ جھوٹ تخلیق کیا گیا تھا جب اسی پر حقیقت آشنا ہو گئی تو باقی کرداروں سے حقیقت کو چھپا کر کیا حاصل کرنا تھا لیکن قاسم کے لیے وہ دن بہت بھاری ثابت ہوا تھا۔ ایک طرف اس کی جان پر بنی ہوئی تھی جو اسے جان سے بھی پیاری تھی تو دوسری طرف یہ فخریہ مان چھن گیا تھا کہ وہ چودھری دلاور کا بیٹا ہے۔ اس پوری رات وہ اسپتال کی لکڑی کی بنچ پر کسی مجسمے کی طرح

ساکت بیٹھا رہا تھا اور جب صبح دم ڈاکٹر نے بلقیس کی زندگی خطرے سے باہر ہونے کی نوید سنائی تھی تو خاموشی سے اٹھ کر اسپتال سے باہر نکل گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے آج تک کسی نے اسے ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ ہنسنا مسکرانا تو دور کی بات وہ تو جیسے بولنا بھی بھول گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں بلقیس نے اس حقیقت کو بہت آسانی اور خوشی سے قبول کرلیا تھا۔ وہ خوش تھی کہ جس چودھری دلاور کے اپنا باپ ہونے کی تمنا کیا کرتی تھی' وہ سچ مچ اس کا باپ تھا۔ وہ بہت تیزی سے خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور اپنی قانع اور صابر طبیعت کی وجہ سے کسی سے بھی کوئی شکوہ کرنے کی عادی نہیں تھی۔ اب بھی اس نے چودھری دلاور سے شکوہ نہیں کیا تھا کہ کیوں اس کی جگہ کسی اور کو دے کر اسے ساری زندگی یتیم اور مسکین کی حیثیت سے پلنے کے لیے چھوڑ دیا۔ شکوے کے بجائے اسے الٹا چودھری دلاور کے ایثار پر فخر تھا اور وہ برملا کہتی تھی کہ ان کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ایک بے سہارا و مسکین لڑکا حویلی میں ظلم کی چکی میں پستا اور حویلی سے ساری خیر و برکت اٹھ جاتی کیونکہ جہاں مجبور اور بے کسوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہو وہاں رب کا قہر برستا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کے ایثار نے حویلی کی خیر و برکت کو بچالیا تھا جب ہی تو چودھری دلاور آج ماضی سے کئی گنا زیادہ بڑے زمیندار تھے اور ان کی وسیع زمینداری میں چودھرائن کے جہیز میں لائے مربعے ویسے ہی گم ہوگئے تھے جیسے چودھرائن کے دل میں موجود نفرت اور حسد کے جذبات.....

اس روز کے بعد سے چودھرائن بھی بالکل بدل گئی تھی۔ اپنی اونچی ناک کی پروا کیے بغیر اس نے ان تینوں سے معافی مانگ لی تھی اور بہت دیر تک بلقیس اور قاسم کو اپنے ساتھ لگائے اپنی محبت کا اظہار کرتی رہی تھی۔ اسپتال کا عملہ چودھری دلاور کے کہنے میں تھا اس لیے اس معاملے میں پولیس کو ملوث ہی نہیں کیا گیا تھا اور بلقیس کی زہر خورانی کو فوڈ پوائزننگ کے کھاتے میں ڈال کر بات سنبھال لی گئی تھی لیکن چودھرائن کے اپنے اندر تو احساسِ جرم تھا اور اس احساس کی بنا پر بھی وہ اپنے رب کے آگے معافی طلب کرتی تھی تو کبھی شکرانے کے نفل ادا کرتی تھی کہ اس غفور الرحیم اور ستار العیوب نے اسے اپنی ہی اولاد کے قتل کے بوجھ سے بچانے کے ساتھ ساتھ اس کا پردہ بھی رکھ لیا۔ اب وہ جاہ و جلال کے ساتھ حویلی پر حکمرانی کرنے والی چودھرائن سکینہ نہیں' عاجزی اور انکساری سے اپنے رب کے آگے جھکی رہنے والی بندی بن چکی تھی۔ ایک بڑے حادثے سے بچ نکلنے کے بعد حویلی میں زندگی آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگی تھی لیکن اگر کچھ معمول پر نہیں آیا تھا تو وہ قاسم تھا۔ چودھری دلاور اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے اسے سنبھلنے اور خود کو مجتمع کرنے کے لیے مہلت دے دی تھی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ قاسم اپنی الجھن سے خود سے نہیں نکل پا رہا تو اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے کمرے میں چلے آئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ان کی ایک پکار پر مؤدب سا ان کے سامنے کھڑا ہوگیا لیکن انہیں لگا کہ یہ وہ قاسم نہیں تھا جسے انہوں نے اس کی پیدائش کی رات سے لے کر بلقیس والے حادثے کے دن تک دیکھا تھا۔ اس قاسم کی آنکھوں میں زندگی پوری آب و تاب سے انگڑائیاں لیتی تھی جبکہ اس قاسم کی آنکھوں میں ویرانی سی ویرانی تھی۔ اس ویرانی کو دیکھ کر ان کے دل پر گھونسا سا پڑا۔

''یہ کیا حال بنالیا ہے تو نے اپنا پتر! کیا اپنے ابا جی کو اس کے کیے کی سزا دے رہا ہے؟'' اس سے یہ سب کہتے ان کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ قاسم تڑپ ہی تو اٹھا۔

''ایسے نہ بولیں ابا جی! میں ایسا سوچوں بھی تو اس دھرتی پر دوسرا سانس نہ لے پاؤں۔''

''مجھے قصور وار نہیں جانتا تو فیر یہ سب کیا ہے؟ تو اتنا بدل کیوں گیا ہے؟ بھول جا ہر بات کو اور بس یہ یاد رکھ کہ میں اور تیری ماں آج بھی تجھے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔'' چودھری دلاور نے گویا اس سے التجا کی۔

''مجھے آپ کی اور اماں کی محبت پر کوئی شک نہیں ابا جی! آپ دونوں سے تو مجھے اتنا پیار ملا ہے جس کا حق دار بھی نہیں تھا۔'' اس کی جھکی نگاہوں میں ہلکی سی نمی تیری تو چودھری دلاور کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ بھیگی آواز میں ذرا خفگی سے بولے۔

''بکواس نہ کرا دے۔ تجھے کیا معلوم کہ کیا تیرا حق تھا اور کیا نہیں۔ یہ جو پیار ہوتا ہے نا یہ سوہنا رب بندے کے دل میں ڈالتا ہے اور بندہ اس پر لٹانے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے جس کے لیے رب نے دل میں پیار ڈالا ہوتا ہے۔ میں نے اور تیری اماں نے تجھ پر اپنا پیار لٹایا تو کوئی احسان نہیں کیا بس رب کی مرضی پوری کی۔''

''تیرے ابا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں قاسم۔ یہ ساری سوہنے رب کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ کسی کے دل میں کسی کے لیے کتنا پیار ڈالتا ہے۔ ہم بندے تو ایویں پھڈے ڈالتے رہتے ہیں کہ ہمیں فلاں سے بڑھ کر کیوں نہیں چاہا جاتا یا

ہمارا حق زیادہ ہے۔ حق اسی کا زیادہ ہوتا ہے جس کے نام رب نے لکھ دیا ہوتا ہے۔ جو رب کی مرضی میں راضی نہ ہو وہ ناشکرا کہلاتا ہے اور ناشکروں کے دلوں میں ہی نفرت اور حسد کے بھانبھڑ جلتے ہیں۔ میں نے ایک عمر اس آگ کو اپنے سینے میں جلتے دیکھا ہے اور اس آگ میں ان ساری خوشیوں کو جلا کر راکھ کیا ہے جو شکر گزار اور قانع ہونے کی صورت میں مجھے مل سکتی تھیں۔ یہ تو میرے رب کا مجھ پر احسان ہے کہ اس نے میری اتنی ناشکری کے باوجود مجھ پر رحم کیا اور مجھے بلقیس اور تم دونوں لوٹا دیے۔

''میں بلقیس کو دیکھتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ اس نے مجھ جیسی ناشکری عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ کتنے ظرف والی ہے وہ کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کٹہرے میں نہیں کھڑا کیا اور جو ہوا اسے رب کی مرضی جان کر اسی خوشی قبول کر لیا۔ تو بھی اب سب کچھ بھول جا اور گزرے وقت کو بھول کر آنے والے کل کی خوشیوں کے بارے میں سوچ۔'' چودھرائن سکینہ کب کمرے میں داخل ہوئی تھی وہ دونوں نہیں دیکھ سکے تھے لیکن اب پوری توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ بلقیس کی زندگی بچ جانے کی خوشی میں چودھری دلاور اسے پہلے ہی معاف کر چکے تھے۔ انہیں ساری خبریں مل گئی تھیں کہ کیسے وہ سجدوں میں گڑگڑا کر روتی رہی ہے اور کیسے اس نے بلقیس کی زندگی کے لیے بے تحاشا صدقہ وخیرات اپنے پاس سے ادا کیا ہے۔ وہ ویسے بھی معاف کر دینے والے آدمی تھے اور اگر دل میں کوئی بال رہ بھی گیا تھا تو آج کی گفتگو کے بعد اس کا وجود بھی نہیں رہا تھا۔ جو غلطی مان لے اس کے ساتھ نرمی برتنا لازمی ہو جاتا ہے۔ چودھری دلاور کے دل میں بھی اس کے لیے نرمی اتری۔

''میں آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کروں گا اماں! انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میرا پور پور آپ لوگوں کی محبت کا مقروض ہے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کیسے اس نے مجھ بے آسرا کو اتنا نوازا کہ کہیں کوئی کمی نہیں رہی لیکن کیا کروں بندہ بشر ہوں اور دل میں گڑی ایک پھانس نے اتنا بے کل کر رکھا ہے کہ اس کے نکلے بغیر شاید ہی کھل کر سانس لے سکوں۔''

''کیسی پھانس پتر؟'' چودھرائن اور چودھری بیک وقت حیران ہوئے۔

''میرے دل میں بار بار خیال آتا ہے کہ اس دنیا میں کہیں میرا سگا باپ بھی موجود ہے لیکن اسے میرے وجود کی خبر نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایک بار اس کے سامنے جاؤں اور اس سے اس کی بے حسی کا حساب لوں۔'' وہ بات اب بھی نظر جھکا کر کر رہا تھا لیکن بے ساختہ ہی بھنچ جانے والی مٹھیاں اس کے رنج اور غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔

''جانے دے پتر! کچھ نہیں رکھا ان حسابوں کتابوں میں۔ میرے خیال سے تو یہ بندے کا کام ہی نہیں ہے۔ رب سوہنا سارے حساب کتاب خود ہی کر لیتا ہے۔'' چودھری دلاور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ کہتے ہیں تو نہیں کرتا حساب کتاب لیکن ایک نظر اس شخص کو دیکھ لینے کا تو حق دار ہوں نا جو مجھے دنیا میں لانے کا سبب بنا۔ آپ کے پاس کوئی پتا، فون نمبر وغیرہ ہو تو مجھے عنایت کر دیں۔'' وہ نظریں اور سر جھکائے ان سے درخواست کر رہا تھا۔ چودھری دلاور نے ایک بے بس سی نظر چودھرائن پر ڈالی۔ اس نے اشارہ کیا کہ قاسم کی فرمائش مان لی جائے۔

''مجھے زیادہ کچھ خبر تو نہیں ہے۔ میں پہلی اور آخری واری بس تب ہی ملا تھا اس سے جب وہ زینب سے رشتے کی بات کرنے حویلی آیا تھا۔ اس کے بعد کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ اس سے رابطہ کیا جائے۔ ہاں زینب کی ایک ڈائری امانت پڑی ہے میرے پاس۔ اس میں کچھ نام پتے وغیرہ لکھے ہیں۔ تو دیکھ لے اسے۔ شاید تیرا کام بن جائے۔'' چودھری دلاور نے تھکے تھکے سے انداز میں اسے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ چودھرائن بھی اس کے پیچھے ہی تھی۔

''اتنے چپ اور اداس کیوں ہو چودھری دلاور؟'' اپنے کمرے میں واپس آ کر بھی وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے تو سکینہ نے ان سے پوچھا۔

''اگر قاسم جا کر واپس نہ آیا تو.....؟ خون کا رشتہ ہے اس کا کمال سے اور یہ رشتہ بڑا زور آور ہوتا ہے۔ بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی کھنچ جاتا ہے۔'' ان کے کھوئے کھوئے سے لہجے میں خوف بھی تھا۔ قاسم کو گنوا دینے کا خوف۔

''نہ ڈرو دلاور چودھری! تم تو رب کی مرضی میں راضی رہنے والے بندے ہو جیسے پہلے ہر معاملہ اس سوہنے رب پر چھوڑا ہے یہ بھی چھوڑ دو۔ مجھے یقین ہے کہ قاسم لوٹ کر ہمارے پاس ضرور واپس آئے گا۔'' چودھرائن نے انہیں دلاسا دیا تو وہ اس کی یقین بھری نگاہوں میں دیکھتے رہ گئے۔ ان کے یوں دیکھنے پر چودھرائن مسکرائی تو وہ چونک گئے۔ بے شک وہ ان عورتوں میں سے تھی جو ہزاروں نہیں لاکھوں میں ایک ہوتی ہیں لیکن ساری زندگی رویوں کی بدصورتی نے شکل کی خوبصورتی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیا تھا۔

''میں نے ساری حیاتی بتا کر اس عمر میں رب کی رضا میں راضی رہ کر خوشی پانے کا نسخہ پایا ہے چودھری صاحب اور مجھے اپنے اس نسخے پر بڑا بھروسا ہے۔ بیتا وقت لوٹانا میرے کیا کسی کے بھی بس کی بات نہیں لیکن مجھے اپنے رب سے پوری امید ہے کہ وہ ہمیں ہمارے بچوں کی خوشیاں دکھائے گا اور ان کی خوشیوں میں ہم بھی اپنی کھوئی ہوئی خوشیاں پالیں گے۔'' چودھرائن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی چمک تھی۔ اس چمک نے چودھری دلاور کے نرم دل کو مزید گداز کیا اور وہ آہستہ سے بولے۔

''اللہ تیری زبان مبارک کرے۔ انشاءاللہ تیری ہر بات پوری ہوگی۔'' چودھرائن سن کر مسکرادی۔ یہ زندگی میں پہلی بار تھا کہ وہ دونوں ایک طرح سے سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

قاسم نے اپنے سامنے بستر پر موجود اس لاغر وجود کو دیکھا۔ وہ زندہ تھے لیکن مردہ سے بھی بدتر حالت میں۔ وہ بہت ڈھونڈ ڈھانڈ کر اور کئی دروں کی خاک چھان کر یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا اور اب اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا کہ اس زندہ لاش سے کیا حساب لے جو اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دینا تو دور کی بات، بولنے پر بھی قادر نہیں تھی۔ اسے یہاں تک پہنچانے والے ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ ایک حادثے میں ان کی ریڑھ کی ہڈی اتنی بری طرح ڈیمیج ہوئی تھی کہ پورا جسم معذور ہوگیا تھا۔ جوانی میں دماغ تھوڑا بہت کام کرلیتا تھا لیکن بڑھاپے میں وہ بالکل ہی اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے تھے اور اب بستر پر پڑے بس اپنی سانسیں پوری ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ قاسم جتنی تلاش کے بعد ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا اس کے دوران اسے ان کے حالات سے اچھی خاصی واقفیت ہوگئی تھی لیکن آگاہ ہونے اور اپنی نظروں سے دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر سخت شاکڈ تھا۔ اسے کمال احمد کے چند پرانے دوستوں اور رشتے داروں کی زبانی جو حالات پتا چلے تھے ان کے مطابق زینب کو طلاق دینے کے بعد انہوں نے فوراً اپنی کزن سے شادی کرلی تھی اور زندگی کے عیش وعشرت میں گم ہوکر انہیں یاد بھی نہیں رہا تھا کہ زینب نام کی کوئی عورت ان کی زندگی میں آئی بھی تھی لیکن ان کے عیش وعشرت کی یہ مدت زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی اور ایک روز وہ اپنے والدین کے ساتھ ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے خوفناک حادثے کا شکار ہوگئے۔ حادثہ اتنا خوفناک تھا کہ ان کے والدین تو موقع پر ہی ہلاک ہوگئے اور وہ خود کئی روز تک موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا اسپتال میں پڑے رہے۔ موت کا خطرہ ٹلا تو معلوم ہوا کہ ٹل جانے والی موت اصل میں انہیں زندوں اور مُردوں کے بیچ لٹکا کر چلی گئی ہے۔ ان کی ڈاکٹر بیوی نے ملک اور بیرونِ ملک سب جگہ ان کی رپورٹیں بھیج کر معلومات حاصل کرلیں اور جب یہ طے ہوگیا کہ ڈاکٹر کمال احمد ناقابلِ علاج ہیں تو ساری زندگی اس زندہ لاش سے تنہی رہنے کی حماقت میں مبتلا رہنے کے بجائے اپنی راہیں جدا کرلیں۔ راہیں جدا کرنے سے قبل اس نے واحد وارث کی حیثیت سے کمال احمد اور ان کے والدین کی تمام جائداد پر قبضہ کرلیا تھا اور کمال احمد پر یہ احسان کرگئی تھی کہ ان کے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کردیا تھا جس کے تحت تازندگی ان کے علاج معالجے اور دیکھ بھال کے لیے رقم فراہم کی جاتی رہتی۔ اسی رقم کے سہارے کمال احمد نے بستر پر پڑے پڑے دو دہائیوں سے زیادہ وقت بتادیا تھا اور آج ان کے سرہانے کھڑا قاسم سوچ رہا تھا کہ کیا یہی تھی وہ عیش بھری زندگی جس کے لیے انہوں نے وفا کی ساری رسمیں ترک کرکے اس کی ماں کو اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ یہاں اپنے باپ کے نیم مُردہ جسم کے سرہانے کھڑے اس پر نصیب کی حقیقت پوری طرح کھلی تھی۔ نصیب میں جو نہ ہو اس کے لیے آدمی کتنی ہی جان مارلے اسے پا نہیں سکتا خاص طور پر وہ شخص جس کی نیت میں کھوٹ اور عمل میں بے ایمانی ہو۔ ڈاکٹر کمال احمد نے بھی زندگی میں کبھی راست عمل نہیں کیا تھا، اس لیے نہ تو وہ اپنی من چاہی عورت کے ساتھ رہ سکے تھے اور نہ ہی اس عورت کو چھوڑ کر دولت کے عیش وعشرت دیکھ سکے تھے۔ یہیں کھڑے ہوکر اسے چودھری دلاور کی وہ بات بھی یاد آئی تھی جو انہوں نے باپ کا پتا معلوم کرنے پر اس سے کہی تھی۔ وہ مان گیا تھا کہ واقعی حساب کتاب لینا بندے کا کام نہیں تھا۔ انصاف کرنے والے رب نے سارے حساب کتاب خود کرلیے تھے۔ وہ اس زندہ لاش سے کچھ کہتا بھی تو کیا چنانچہ خاموش لبوں اور جھکے شانوں کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔ واپس پلٹنے میں ہی بھلائی تھی کہ اسے معلوم تھا وہ لوٹے گا تو یقیناً محبت بھرے دل اس کے لیے اپنی بانہیں وا کیے کھڑے ہوں گے۔ اس نے محبت کی ناقدری کرنے والوں کے انجام ایک ایک کرکے دیکھ لیے تھے، سو وہ یہ غلطی اور نہیں کرسکتا تھا۔ اسے رب کی رضا میں راضی رہنا تھا اور بغیر کسی جھگڑے کے عاجز دل کے ساتھ زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرنا تھیں۔ بے شک رب کی رضا میں راضی رہنے والے ہی خوشیاں پاتے ہیں۔